امیر تیمور گورگاں

حصہ اوّل

PDFBOOKSFREE.PK

الماس

ایم۔ اے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

پاکستان ورچوئل لائبریری پر موجود تمام کتابیں قارئین کے مطالعے اور دعوتی واصلاحی مقاصد کے لئے اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، اور ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

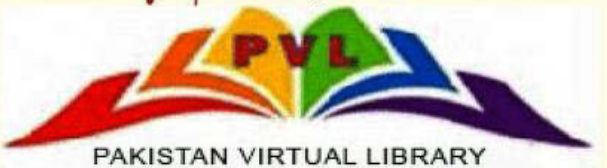

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پیش لفظ

جس طرح مولوی نذیر احمد نے مراۃ العروس لکھ کر اردو ناول نویسی کی بنیاد رکھی۔ اسی طرح مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی نے اسلامی تاریخی ناول کا آغاز کیا۔ تاریخ اور ناول اگرچہ دو متضاد نثری اصنافِ سخن ہیں لیکن شرر لکھنوی نے ان متضاد اصناف اور اسلوب کو اس انداز سے ملایا کہ یہ حقیقت اور تخیل کے امتزاج کا ایک نادر نمونہ بن گیا۔ تاریخی ناول کے بارے میں یہ جواز درست ہے کہ شرر لکھنوی نے اسکاٹ جیسے مغربی متعصب ناول نگاروں کے جواب آں غزل کے طور پر یہ قدم اٹھایا تھا۔ دراصل یورپ اور ایشیا کی صلیبی جنگوں نے مغربی ناول نگاروں کو اپنے صلیبی سورماؤں کا قصیدہ خواں بنا دیا تھا۔

صلیبی جنگ ان مذہبی جنگوں کو کہا جاتا ہے جن میں ایک طرف تثلیث پرست (عیسائی) اور دوسری طرف ایک خدائے واحد کے پرستار مسلمان میدانِ جنگ میں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوتے تھے۔ ہم اسے جہاد کا نام بھی دیتے ہیں۔ صلیبی جنگوں میں تین صلیبی جنگیں بہت مشہور ہوئیں۔ جہاں تک جہاد کا تعلق ہے تو یہ چونکہ مسلمانوں کے فرائض میں سے ایک فریضہ ہے۔ اس لیے یہ آغازِ اسلام سے جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔

جہاد مختلف صورتوں میں، مختلف انداز میں کیے جاتے ہیں۔ سب سے بڑا جہاد تو جان کا جہاد ہے۔ جب مسلمان اسلام کی سربلندی یا اسلامی اقدار کی حفاظت کے لیے میدانِ جنگ میں سر سے کفن باندھ کر نکلتا ہے۔ جہاد دراصل برائیوں کے خلاف ایک جنگ ہے جسے ہر مسلمان ہر وقت اختیار کیے رہتا ہے۔ ہم اگر برائیوں کے خلاف مضامین اور کتابیں لکھتے ہیں تو اسے قلم کا جہاد کہا جاتا ہے۔ اگر برائیوں کا انسداد لکچروں اور بیانات و تقریروں سے کرتے ہیں تو اسے زبان کا جہاد کہتے ہیں اور اگر ہم راہِ حق میں اور عوام الناس کی فلاح و بہبود کے لیے اپنی جائز کمائی سے خرچ کرتے ہیں تو اسے مال کے جہاد کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چنانچہ مسلمانوں نے وہ تمام جنگیں جو اشاعتِ اسلام یا حفاظتِ اسلام کے لیے غیر مسلموں سے لڑیں ان سب کو جہاد کہا جاتا ہے۔ ہمارے علمائے کرام نے بغیر تلوار کے بھی اشاعتِ اسلام کا بہت بڑا کام کیا ہے اور دنیا کے وہ حصے جہاں مجاہدینِ اسلام نہ پہنچ سکے وہاں اسلام کو پھیلانے کا کام ہمارے عالموں اور مسلمان تاجروں نے کیا ہے۔

مولوی شرر لکھنوی نے اسلامی ناول دراصل متعصب مغربی ناول نگاروں کے جواب میں لکھے تھے۔ ان مغربی ناول نگاروں نے، جن میں بہت سے مورخ بھی شامل ہیں، اسلام، اسلامی جنگوں اور مسلمان بادشاہوں کے خلاف زہر اگلا ہے اور ایسی غلط سلط باتیں لکھی ہیں جنھوں نے اسلام اور مجاہدین کو سخت بدنام کیا ہے۔ مولوی شرر لکھنوی کے سامنے جب ایسے ناول پہنچے جن میں صلیبی جنگوں میں حصہ لینے والے مسلمان سرداروں اور بادشاہوں کو بزدل، عیاش، مکار اور ظالم کے ناموں سے پکارا گیا تھا تو اُن کا خون کھول اٹھا۔ چنانچہ انھوں نے عیسائیوں کے خلاف قلم کو بنا کر قلم کا جہاد شروع کیا اور یہ جہاد آج تک جاری ہے۔

مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی کے اسلامی تاریخی ناولوں کی سخت مخالفت کی گئی۔ اس وقت برصغیر پاک و ہند پر انگریز قابض تھے۔ وہ مسلمانوں کے پہلے ہی مخالف تھے کیونکہ انگریزوں سے پہلے برصغیر پاک و ہند پر مسلمانوں نے تقریباً آٹھ سو سال تک حکومت کی تھی اور انگریزوں نے مسلمانوں ہی سے یہ حکومت دھوکہ بازی، مکاری، مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر اور نفاق پیدا کر کے حاصل کی تھی۔ مسلمانوں کے ہاتھ سے حکومت تو نکل گئی تھی مگر انہوں انگریزوں کو کبھی معاف نہیں کیا اور انہیں جب بھی موقع ملا وہ انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس مسلمانوں نے برصغیر کی دوسری قوم ہندو کے ساتھ مل کر اور کبھی تنہا انگریزوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا اور آ کے لیے اپنے خون کا نذرانہ پیش کیا۔

انگریزوں کے خلاف جن لوگوں نے کھل کر جنگ کی ان میں جنگِ پلاسی کے سراج الدولہ، دکھن ہند ٹیپو سلطان، سید احمد اور اسمٰعیل شہید اور جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء (جسے انگریز بغاوت کہتے ہیں) کے ہزاروں شہداء شامل ہیں جنھوں نے انگریزوں کو برصغیر سے نکالنے کے لیے اپنی جانیں قربان کر دیں۔

پس مسلمانوں نے عیسائیوں یا دوسری قوموں کے خلاف جو مذہبی جنگیں لڑیں وہ سب ہمارے اسلامی ناولوں کے موضوعات ہیں جن پر ہمارے بزرگوں نے قلم اٹھایا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی جو ایک مورخ بھی ہیں اور جنھوں نے اسلامی تاریخی ناولوں کے علاوہ بہت رومانی اور معاشرتی ناول بھی تحریر کیے ہیں، ان کے بعد اسلامی تاریخی ناولوں کا کوئی باقاعدہ سلسلہ دکھائی نہیں برصغیر کے مختلف شہروں سے تاریخی یا نیم تاریخی ناول لکھے گئے۔ پھر بھی بعض ایسی ہستیاں نظر آتی ہیں جنھوں باقاعدگی سے اسلامی ناول تحریر کیے۔

ان بزرگوں میں نسیم حجازی، ایم اسلم، رشید اختر ندوی، رئیس احمد جعفری اور صادق احمد صدیقی سردھنوی نمایاں نظر آتے ہیں۔ صادق احمد صدیقی سردھنوی اس میں سرِفہرست ہیں۔ انھوں نے تاریخ کو اپنا خاص موضوع بنایا اور بے شمار ناول تحریر کیے۔ اب تاریخی ناول لکھنے والوں کا نیا دور آتا ہے۔ اس دور میں تاریخی ناول کے ساتھ ساتھ ڈائجسٹوں نے ایک زبردست مقبولیت حاصل کی اور وہ پورے اردو ادب پر چھا گئے مگر اردو ڈائجسٹوں نے بھی اسلامی تاریخ کو اہمیت دی اور اسے ڈائجسٹوں کا باقاعدہ حصہ بنا دیا۔ ان ڈائجسٹوں میں عام طور پر تاریخی کہانیاں لکھی جا رہی ہیں۔

ڈائجسٹوں میں الیاس سیتاپوری، زیب ملیح آبادی، قمر اجنالوی، اسلم راہی ایم۔ اے، محترمہ منورہ نوری اور الماس ایم۔ اے شامل ہیں۔ یہ تمام لکھنے والے تعلیم یافتہ اور اپنے اپنے اسلوب کے بادشاہ ہیں۔

زیرِ نظر ناول امیر تیمور گورگاں ایک خوبصورت تاریخی ناول ہے جس میں صاحبقراں امیر تیمور گورگاں کی پیدائش سے لے کر انتقال تک کے مکمل حالات اور اس عظیم فرمانروا کی جدوجہد آزادی اور فتوحات کا ذکر بڑے رومانوی انداز میں موجود ہے۔ یہ ایک تاریخ بھی ہے اور ایک ناول بھی۔ اس ناول میں خود امیر تیمور کی داستانِ عشق کے علاوہ اور بہت سی رومانی کہانیاں موجود ہیں۔

ناول کی زبان بے حد شستہ اور بامحاورہ ہے۔ الماس ایم۔ اے کو زبان پر پوری قدرت حاصل ہے اس لئے کہ ان کا تعلق لکھنؤ کے مردم خیز خطے سے ہے۔

امیر تیمور گورگاں کے بارے میں یہ اظہارِ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ یہ ناول نئے افق ڈائجسٹ گروپ آف پبلی کیشنز کے مالک مشتاق احمد قریشی اپنے ڈائجسٹ "مینارۂ" میں قسط وار شائع کرتے رہے ہیں۔

محمد علی قریشی
مکتبہ القریش
لاہور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شہر سبز کی شہزادی

تیز رفتار سوار، گھوڑا روکتے روکتے الجائی خاتون سے دس گز آگے نکل گیا۔ پھر اس نے گھوڑا موڑا، الجائی کے پاس آیا اور اسے ادب سے سلام کیا۔

الجائی خاتون نے پوچھا:

"اس طرح بے تحاشا کیوں بھاگ رہے تھے؟"

"مغربی سرحد سے لٹیرے گھس آئے ہیں۔" سوار نے سانس پر مشکل قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

"خدا خیر کرے"۔ الجائی خاتون گھبرا گئی۔ پوچھا: "لٹیروں کی تعداد کتنی ہوگی؟"

"سو کے اوپر"۔ سوار جواب دے کر آگے بڑھنے کے لیے تیار ہو گیا۔

الجائی ایک لمحہ رک کر بولی:

"تم کہاں جا رہے ہو؟"

"سرائے سالی۔ امیر کو خبر کرنے"۔ سوار جانے کے لیے بے چین تھا۔

الجائی کو اس کی بے چینی پر غصہ آ گیا۔ سختی سے بولی:

"تم سرائے سالی جاؤ گے۔ امیر کو خبر دو گے۔ پھر کمک لے کر واپس آؤ گے۔ اس وقت تک دشمن آور لوٹ مار اور قتل و غارت کر کے واپس بھی جا چکے ہوں گے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بات سوار کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے تھکے لہجہ میں کہا:

"پھر آپ ہی بتائیے۔ ہمارے پاس نہ ہتھیار ہیں نہ گھوڑے۔ حملہ آور خیموں کو آگ لگا چکے ہیں اور انہوں نے ہمارے گھوڑے پکڑ لیے ہیں۔"

الجائی کچھ سوچتے ہوئے بولی:

"اچھا تم جاؤ لیکن جلد واپس آنا۔"

امیرِ سمرقند قزغن کی پوتی الجائی خاتون شکار کے لیے آئی تھی۔ اس کے ساتھ پانچ سہیلیاں پانچ کنیزیں اور پانچ ہی غلام تھے۔ الجائی اور اس کی سہیلیاں ترکش و تلوار سے مسلح تھیں۔ غلام سردار کے پاس نیچہ (چھوٹی تلوار) تھا۔ بقیہ غلاموں اور کنیزوں کے پاس صرف خنجر تھے۔

چودھویں صدی عیسوی کے چوتھے عشرے میں جب یورپ کی عورتیں، قانون بانی اور کشیدہ کاری میں اپنا وقت گزارتی تھیں۔ اس وقت تاتاری عورتیں، جنگ آزماؤں اور شہسواروں کے دوش بدوش میدانِ جنگ میں حصہ لیتی تھیں۔ وہ سپاہی بچوں کی پرورش بھی کرتیں اور مردوں کے تمام کاموں میں شریک رہتیں۔ گھر گرہستی کے بقیہ تمام کام عمر رسیدہ عورتوں کے سپرد تھے۔ اس کے زمانہ میں تاتار عورتوں کا محبوب مشغلہ شکار کھیلنا تھا۔

تیز رفتار سوار دیکھتے دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ الجائی کی نظریں سوار پر لگی تھیں جب اس کے گھوڑے کی ٹاپوں سے اٹھنے والی گرد ہوا میں تحلیل ہو گئی تو اس نے پلٹ کر اپنے ساتھیوں کو دیکھا۔

ایک طرحدار کنیز گھوڑا بڑھا کر الجائی کے پاس آئی اور بولی:

"ہمیں اپنے مظلوم بھائیوں کی مدد کرنا چاہیے۔ یہ کتنی بزدلی ہے کہ انھیں ہمارے سامنے لوٹ جائے۔"

الجائی خاتون، کنیزوں اور غلاموں کو دیکھ رہی تھی۔ ان کے چہرے فق تھے۔ سوائے سردار غلام کی آنکھوں سے شجاعت کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ اس کا ہاتھ بار بار نیچہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

الجائی خاتون نے پژمردہ چہروں سے نظریں پھیرتے ہوئے کہا:

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن ہمارے پاس صرف چھ تلواریں اور ایک نیچہ ہے اور دشمن پوری ٹکڑی"

دوسری سہیلی تلوار کھینچ کر بولی: "لیکن ہماری غیرت نیام کے اندر کیسے رہ سکتی ہے!"

الجائی نے متانت سے کہا:

"لیکن غیرت اندھی تو نہیں ہوتی۔ سات تلواریں، ایک سو سے ٹکرائیں گی تو انجام کیا ہوگا؟"

سہیلی نے جھلا کر باہر نکالی ہوئی تلوار، نیام میں ڈالی اور غصہ سے بولی:

"الجائی! آج تم پہلی بار ہمیں بزدلی کا سبق پڑھا رہی ہو۔"

الجائی خاتون کا بدن دہک اٹھا۔ اسے چنگاریاں سی لگنے لگیں۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ بولی:

"نہیں نہیں۔ تاتاری عورت کو بزدلی کا سبق نہیں پڑھایا جا سکتا۔"

الجائی خاتون نے تلوار بلند کر لی۔ اس نے گھوڑے کا منہ مغربی سرحد کی طرف موڑا۔ چھ اور تلواریں اُس کی تقلید میں باہر نکل آئیں۔ غلاموں اور کنیزوں کے بے رنگ چہروں پر غیرت کے خون کی سرخی دوڑ گئی انھوں نے کمر میں اڑسے ہوئے خنجر کھینچ کر ہاتھوں میں لے لیے۔

الجائی خاتون نے پانچ سہیلیوں اور دو کنیزوں کو اپنے ساتھ لے کر ایک ٹولی بنائی۔ باقی غلاموں اور کنیزوں پر مشتمل دوسری ٹولی ترتیب دی۔

الجائی نے غلام سردار کو سمجھایا:

"ہمارے پاس تلواریں ہیں۔ جو ہم کریں گے۔ تم پشت پر رہ کر ہماری حفاظت کرنا۔"

غلام نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

اسی وقت شمال مشرق میں گرد اڑتی دکھائی دی۔ سب کی نظریں اُدھر اٹھ گئیں۔ امید و بیم سے بھری نظریں۔ وسوسے اور امیدیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔

ایک غلام چلایا: "سرائے سالی سے کمک آ گئی۔"

"الحمدُ للہ" الجائی خاتون کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

گرد کا سینہ چاک ہوا۔ وہ کمک نہ تھی۔ گرد کی چادر سے صرف دو سوار نمودار ہوئے۔ دیکھنے والوں کی امیدیں ڈوبنے لگیں۔

دونوں سوار بھاگتے چلے آ رہے تھے۔ الجائی خاتون نے سب کو خبردار کیا۔ "کیا پتہ وہ بھی دشمن ہوں۔"

سوار، الجائی خاتون کے پاس آ کر رک گئے۔ ان میں ایک دبلا پتلا سا نوجوان اور دوسرا ادھیڑ عمر کا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نوجوان کا چہرہ سپاٹ تھا لیکن وضع قطع سے طرحدار معلوم ہوتا تھا۔ نرم چمڑے کے گھٹنوں تک کے جوتے نمدے کی سفید نوکدار ٹوپی۔ اعلیٰ قسم کے باریک چمڑے کی آدھی آستین کی جاکٹ۔ کمر میں بھاری چمڑے کا پٹکا جس پر چاندی کا کام تھا۔ اور فیروزے ٹکے ہوئے تھے۔ نوعمر لڑکے کا لباس معمولی تھا۔ گھریلو ملازموں جیسا۔

الجائی خاتون، اجنبی لباس اور اجنبی صورتوں کو حیرت اور دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ الجائی نے ایک سہیلی کو اشارہ کیا۔

سہیلی نے نووارد جوان سے پوچھا:

"تم کہاں سے آرہے ہو؟"

جوان بڑی لاپروائی سے بولا:

"دریائے آمو کے شمال میں شہر سبز میرا وطن ہے۔ ترکان گورگانی قبیلہ برلاس کا نام لیوا ہوں میرا نام تیمور اور یہ لڑکا میرا لے پالک زاد عبداللہ ہے۔"

الجائی خاتون کی دلچسپی اور حیرت بڑھ گئی۔ تیمور نے ایک سوال کے جواب میں تمام ضروری باتیں بیان کر دیں تاکہ دوسرے سوال کی گنجائش ہی نہ رہ جائے۔ یہ اس کی ذہانت کی دلیل تھی۔ الجائی خاتون کا دل آپ ہی آپ اس کی طرف کھنچنے لگا۔

الجائی نے خود سوال کیا:

"اے نوجوان! تم نے سب کچھ بتانے کے باوجود یہ نہیں بتایا کہ ادھر کس مقصد سے آئے ہو اور کہاں جارہے ہو؟"

"مرائے سالی کے امیر قزغن نے مجھے اپنے دربار میں طلب کیا ہے۔" اب تیمور کے لہجہ میں لاپروائی کے ساتھ اکتاہٹ بھی پیدا ہوگئی تھی۔ اس نے مزید سوالات سے بچنے کے لیے اپنا گھوڑا بڑھایا اور بولا:

"میں قبیلہ برلاس کے سردار قراغانی کا بیٹا ہوں۔ اگر سوالات ختم ہوگئے ہوں تو میں آگے بڑھوں؟"

الجائی خاتون کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ بولی:

"تیمور! تم دربارِ قزغن میں جارہے ہو اور میں امیر قزغن کی پوتی الجائی خاتون ہوں۔"

تیمور نے فوراً گھوڑے کی راسیں کھینچ لیں اور پہلی بار مشتاق نظریں الجائی کی طرف اٹھیں۔ اس نے

دیکھا ایک پندرہ سالہ سرو قامت، سیمیں بدن ماہ پارہ اسے شریر نظروں سے دیکھ رہی ہے۔

تیمور کی عمر سترہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ شمشیر زنی اور تیر اندازی اس کے محبوب مشغلے تھے لیکن اچھی صورتیں اسے بھی اچھی لگتی تھیں۔ پھر الجائی خاتون تو چاند کا ٹکڑا اور حسن کا ترشا ہوا پیکر تھی۔

تیمور نظار آلود نظروں سے الجائی خاتون کو گھورتا رہا پھر "ماشاءاللہ" اس کی زبان سے آپ ہی آپ نکل گیا۔ الجائی کی نظریں تیمور کی نظروں سے متصادم تھیں۔ تیمور کی آواز پر اس نے شرما کر سر جھکا لیا۔

تیمور کو فوراً امیر قزغن کا خیال آگیا۔ اس نے اپنا گھوڑا تھوڑا پیچھے ہٹایا۔ پھر ادب سے بولا:

"میں شہزادی کی خدمت میں سلام پیش کرتا ہوں"۔ پھر ذرا ٹھہر کر کہا: "میں نووارد ہوں۔ کیا شہزادی مجھے مرائے سالی جانے کا سیدھا راستہ بتائیں گی؟"

الجائی اور زیادہ شرماتے ہوئے بولی:

"تیمور! تم مرائے سالی نہیں جاؤ گے؟"

"جی!" تیمور، الجائی خاتون کو حیران نظروں سے دیکھنے لگا۔

شہزادی نے کہا:

"ہاں تیمور۔ ہماری مغربی سرحد میں کچھ ایرانی گھس آئے ہیں۔ میں اور میرے یہ تمام ساتھی ادھر ہی جارہے تھے۔ اچھا ہوا کہ تمہارے جیسا ایک بہادر ہم میں اور شامل ہوگیا۔"

تیمور کے لیے لڑائی اور جنگ کے الفاظ اتنے ہی مرغوب تھے جتنے بچوں کے لیے کھلونوں کے نام ہوتے ہیں۔ اس نے تمکنت سے گردن اونچی کرتے ہوئے کہا:

"اگر تیمور کا ترکش و تلوار، شہزادی کے کچھ کام آسکے تو یہ میری عزت افزائی ہوگی۔"

"اب ہمیں دیر نہیں کرنا چاہیے۔" شہزادی نے کہا اور اس کا گھوڑا مغرب کی طرف بھاگنے لگا۔ الجائی کا گھوڑا مشکی تھا لیکن تیمور کو سفید رنگ زیادہ پسند تھا۔ اس کی ران کے نیچے عربی سفید مرکب تھا۔ تیمور کا گھوڑا بار بار آگے نکلنے کی کوشش کرتا لیکن تیمور اسے روکتا۔ اسے شہزادی کے حفظِ مراتب کا خیال تھا۔

ایک گھنٹے بعد انہیں سامنے کی طرف شعلے اٹھتے ہوئے دکھائی دیے۔ شہزادی الجائی خاتون نے گھوڑا روک لیا۔ باقی لوگ بھی رک گئے۔

الجائی نے تیمور سے کہا: "ہم نے آٹھ آٹھ کی دو ٹولیاں بنائی ہیں۔ پہلی ٹولی کے ساتھ میں حملہ کروں گی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تم دوسری ٹولی کے ساتھ رہنا اور پشت سے میری حفاظت کرنا۔"

تیمور کا چہرہ اب بھی سپاٹ تھا لیکن آنکھوں کی پُتلیاں سرخ ہو کر پھڑک رہی تھیں۔ اس نے بائیں طرف کمان اور دائیں جانب ترکش پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"شہزادی میری گستاخی معاف کریں۔ حملہ میں خود کروں گا۔ شہزادی چاہیں تو پشت پر رہ کر حفاظت کر سکتی ہیں۔"

الجائی خاتون تیمور کا منہ دیکھ کر رہ گئی۔ اس کا دل چاہا کہ پکار کر کہے کہ اے تیمور۔ تیرا سپاٹ چہرہ تو کچھ نہیں کہتا لیکن تیری بدلتی ہوئی آنکھیں، اندر چھپی ہوئی شجاعت کی چغلی کھا رہی ہیں۔

حملہ آور جھونپڑیاں جلا چکے تھے۔ لوٹ کا مال گاڑیوں پر بار کیا ہوا تھا اور مویشیوں کے گلّے کے گلّے کھلے میدان میں جمع تھے۔ حملہ آور بڑے اطمینان سے واپسی کی تیاریاں کر رہے تھے کہ انہوں نے مشرق سے گرد کا ایک بگولہ اٹھتا دیکھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس بگولے سے تیروں کی بارش شروع ہو گئی۔ حملہ آور خطرہ محسوس کرتے ہی دو حصوں میں بٹ گئے۔ پچاس سوار مویشیوں کے گرد حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے اور باقی پچاس مقابلے کے لیے ایک طرف کھڑے ہو گئے۔

تیمور نے چھوٹی ڈھال بائیں بازو کے ذرا اوپر کس لی تھی۔ اس کے بائیں ہی ہاتھ میں کمان تھی اور دایاں ہاتھ بجلی کی طرح ترکش سے تیر نکالتا اور ترکش میں جوڑ کے اسے چھوڑ رہا تھا۔ ترکش سے ایک تیر نکلنے کے بعد دوسرا تیر اس طرح ترکش میں جُڑ جاتا جیسے وہ ترکش سے خود اچھل کر وہاں تک پہنچ گیا ہے تیمور اور تاتاریوں کے حملے کا یہی طریقہ تھا۔ وہ پہلے دُور سے بڑی تیزی کے ساتھ تیر برساتے پھر قریب پہنچ کر تلوار سے کام لیتے۔

تیمور کے پیچھے الجائی خاتون اپنے سواروں کے ساتھ گھوڑا بڑھاتے چلی آ رہی تھی۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے اٹھنے والے گرد کے بگولے اس طرح بلند ہو رہے تھے کہ سامنے کھڑے حملہ آوروں کے لیے یہ مشکل ہو رہا تھا کہ وہ آنے والوں کی تعداد کا صحیح اندازہ کر سکیں۔

تیمور نے قریب پہنچتے ہی کمان پشت پر ڈال لی اور تلوار کھینچ کر پچاس کی اس ٹکڑی پر حملہ آور ہوا جو مقابلے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ حالانکہ بظاہر مویشیوں اور سامان کے محافظوں پر حملہ کرنا زیادہ آسان اور مفید معلوم ہوتا تھا۔ تیمور کے حملہ کرتے ہی شہزادی الجائی خاتون بھی اس کے پاس پہنچ گئی۔

بہور کا خانہ زاد غلام عبداللہ دیکھنے میں ایک نوعمر لڑکا تھا لیکن جب وہ شمشیر کھینچ کر حملہ آوروں پر ٹوٹا تو دیکھنے والے عش عش کر اٹھے۔ وہ حملہ کرنے کے ساتھ ساتھ تیمور کی پشت کی طرف سے حفاظت بھی کر رہا تھا۔

لڑائی نے زیادہ طول نہ کھینچا اور فیصلہ منٹوں میں ہو گیا۔ تیمور کی شمشیر آبدار سے کئی حملہ آور جہنم رسید ہو گئے۔ کچھ ہی دیر بعد ان میں سراسیمگی اور گھبراہٹ پیدا ہوئی اور ان کے قدم اکھڑ گئے۔ ان کے وہ پچاس ساتھی جو مویشیوں کے پاس تماشہ دیکھ رہے تھے انہیں چاہیے تو یہ تھا کہ اپنے ساتھیوں کی مدد کو پہنچتے لیکن وہ انہیں بھاگتا دیکھ کر مال متاع چھوڑ کر خود بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ تیمور اور الجائی خاتون نے ان کا مرحد پار تک تعاقب کیا۔

واپسی پر الجائی نے تیمور سے پوچھا:

"تیمور۔ تم نے ان حملہ آوروں کو پہلے نشانہ کیوں نہ بنایا جو مویشیوں کی حفاظت کر رہے تھے ان کی دوہری ذمہ داری تھی۔ انہیں ہراساں کرنا زیادہ آسان تھا۔"

تیمور نے اپنی ہلکی خود جس کی زنجیریں اس کی گردن اور شانوں پر لٹک رہی تھیں، سر سے اتاری اور جواب دیا:

"شہزادی! مجھے علم تھا کہ اگر میں نے مویشیوں کے محافظوں کا رخ کیا تو لڑنے کے لیے تیار حملہ آور ان کی مدد کو پہنچ جائیں گے۔ اس لیے میں نے لڑنے والوں کو پہلے نشانہ بنایا اور آپ نے دیکھا کہ ان کے لگتے ہی مویشیوں کے محافظ لڑے بھڑے بغیر بھاگ کھڑے ہوئے۔"

الجائی خاتون، تیمور کی بہادری کے ساتھ اس کی ذہانت اور فوجی سوجھ بوجھ کی بھی دل سے قائل ہو گئی۔

جھونپڑیوں کی اس آبادی کے نہتے لوگ حملہ آوروں کو آتے دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے اور رجا کر کھیتوں اور جھاڑیوں میں چھپ گئے تھے۔ جب حملہ آور شکست کھا کر بھاگ گئے تو یہ لوگ بھی واپس آ گئے اور انہوں نے لشکر کے طور پر تیمور اور دوسرے لوگوں کے سامنے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

الجائی خاتون نے انہیں ان کا سامان اور مویشی واپس کر دیے۔ پانچ تلواریں اور پانچ ترکش کمانیں بھی انہیں دی گئیں تاکہ وہ ایک حفاظتی گروہ بنائیں۔ الجائی خاتون نے انہیں یہ بھی یقین دلایا کہ وہ بہت جلد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس علاقہ میں ایک فوجی چوکی قائم کرا دے گی تاکہ دوبارہ حملے کا خطرہ باقی نہ رہے۔

○

تیمور سے سو سال پہلے، سمرقند اور اس کے اطراف کے تمام علاقے پر، جس میں سرائے شامل تھا۔ چنگیز خان کے منجھلے بیٹے، چغتائی خان کی حکومت تھی۔ چغتائی کے قبضہ میں جنوب کی جانب کاشغر اور تخت سلیمان کی پشت کے کوہستانی علاقے بھی تھے لیکن چغتائی کی اولاد زیادہ اہل ثابت نہ ہوئی۔ صرف شراب و شکار سے دل لگا بیٹھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے تاتاری صوبیدار یکے بعد دیگرے خود مختار ہوتے گئے اور چغتائی خوانین پسپا ہو کر شمال میں جا بسے۔

الجائی خاتون کے دادا قزغن کو ایک چغتائی خان نے سمرقند کا حاکم مقرر کیا تھا۔ خوانین دولت کی ہوس میں اکثر و بیشتر سمرقند کے اطراف میں لوٹ مار کرتے رہتے۔ قزغن ان کی اس روش سے بڑا پریشان تھا۔ تاتاری نسل کا تھا اور تقریباً تمام تاتاری قبائل اسلام قبول کر چکے تھے جبکہ چغتائی خوانین اب تک چنگیزی رسم کے پابند تھے۔ مذہب کے اس اختلاف کی بنا پر بھی تاتاری، چغتائیوں سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بڑا خوددار، عادل اور منصف مزاج انسان تھا۔ وہ تاتاریوں پر خوانین کے ظلم و ستم زیادہ دن برداشت نہ کر سکا اور تمام قبائل کو اکٹھا کر کے بغاوت کر دی۔

یہ جنگ بہت طول کھینچ گئی۔ اس دوران چغتائیوں کے "خان" کا انتقال ہو گیا اور اس کے جانشین قزغن کو سمرقند کا واحد حاکم تسلیم کر لیا۔

قزغن بلا کا ذہین تھا۔ اسے معلوم تھا کہ خوانین اسے چین سے نہ بیٹھنے دیں گے اور موقع پاتے ہی حملہ کریں گے۔ اس فتنہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی اس نے ایک عجیب تدبیر کی۔ اس نے تمام تاتاری سرداروں کو اکٹھا کیا اور انہیں سمجھا بجھا کر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ خاندانِ چنگیز کی طرح ایک شہزادے کو جانشین نامزد کریں اور اسے برائے نام بادشاہ مان لیں۔

اس بات کو تمام سرداروں نے تسلیم کر لیا۔ اس طرح قزغن نامزد شہزادے کے نام پر سمرقند کا مالک بن گیا۔

شہزادی الجائی، شمالی علاقہ میں اپنے باپ کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ اس کا باپ قبیلے کا سردار تھا۔ قزغن نے اپنی خانگی دور کرنے کے لیے الجائی کو شمال سے اپنے پاس بلوا لیا تھا۔ شہزادی اپنی پانچ سہیلیوں کے ساتھ ہمیشہ کے لیے اپنے دادا کے پاس آ گئی تھی۔ اس وقت قزغن دو ہزار تاتاری سرداروں، سپہ گروں اور جوانانِ قوم کے ساتھ سرائے سالی کے قریب ایک جنگل میں خیمہ زن تھا۔ وہ سال میں ایک بار اپنے تمام علاقوں کا دورہ کرتا تھا۔ جنگل میں یہ اجتماع اس کے دورے کا ایک حصہ تھا۔

پھر ایک دن جب اسے ایک تیز رفتار قاصد نے آ کر اطلاع دی کہ مغربی سرحد عبور کر کے ایرانی اس کے علاقے میں لوٹ مار کر رہے ہیں تو اس کی واحد آنکھ غصے سے سرخ ہو گئی۔ اس کی ایک آنکھ خوانین کے مقابلہ میں تیر لگنے سے ضائع ہو گئی تھی۔ اسے جب سورج سے یہ معلوم ہوا کہ شہزادی الجائی خاتون، مغربی سرحد کے قریب موجود ہے اور حملہ آوروں سے مقابلہ کرنے سرحد کی طرف روانہ ہو چکی ہے تو قزغن کی بے چینی اور بھی بڑھ گئی۔ شہزادی الجائی اسے دل و جان سے زیادہ عزیز تھی۔ اس نے فوراً پانچ سو بہادروں کو سرحد کی طرف روانہ کر دیا۔ یوں تو سب ہی تاتاری بہادر تھے لیکن قزغن نے تمام قبائل سے بہترین جانبازوں کو منتخب کر کے ایک الگ دستہ بنایا تھا اور اس کا نام "بہادروں کا رسالہ" رکھا تھا۔ یہ بہادر جس قدر شجاع تھے اتنے ہی خود سر بھی تھے۔ یہ اپنے خیمے دوسروں سے الگ لگاتے اور اپنی محفل میں کسی "غیر بہادر" کو آنے کی اجازت نہ دیتے۔

برق رفتار "بہادر" تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ انہیں تیمور اور شہزادی الجائی خاتون واپس آتے ملے۔ شہزادی نے انہیں بتایا کہ حملہ آور مار بھگا دیے گئے ہیں۔ ان بہادروں نے شہزادی کے ساتھ ایک ہلکے جسم کے جوان کو بھی دیکھا جس کے چہرے پر چھوٹی سی داڑھی تھی لیکن انہوں نے اس نوجوان کے بارے میں کوئی سوال نہ کیا۔ دراصل "بہادر رسالے" کے سوار نہ تو عام لوگوں سے میل جول رکھتے تھے اور نہ اجنبی لوگوں کے متعلق کسی دلچسپی کا اظہار کرتے تھے۔ ان کا غرور اور خودسری انہیں اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی۔

قزغن، شہزادی کے لیے بہت پریشان تھا۔ وہ اپنے خیمہ کے سامنے ٹہل رہا تھا۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے رکتا اور مغرب کی جانب دیکھ کر اپنی چھدری داڑھی پر ہاتھ پھیرتا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ اسے مغرب سنبھال جا! میں آ رہا ہوں۔ لیکن اسے مغرب میں جانے کی ضرورت نہ پڑی۔ اس کے بھیجے ہوئے پانچ سو سوار اور شہزادی بخیریت واپس آ گئے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ دورِ تیموری میں نہ حسنِ تاتار نقاب کی قید کا پابند تھا اور نہ اس وقت خوا
کو حرم کی چار دیواری میں قید کرنے کا تصور موجود تھا۔ عورتیں، سیر و شکار، سفر اور حضر، امن و جنگ
حج و زیارت ہر موقع پر مردوں کے ساتھ ہوتیں۔ یہی نہیں بلکہ قوم کی یہ بیٹیاں، فتوحات اور حرب و
میں بھی حصہ دار ہوتی تھیں اور جنگ جیتنے کے بعد اپنے سر کو مردوں کی طرح فخر سے بلند کرتی تھیں۔ صحت
ماحول، کھلی ہوا اور آزاد طبیعت کی جولانیوں نے ان کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔ جوان عورتیں آزا
گھومتی تھیں۔ گھر اور گھر کے تمام امور کی ذمہ داری بوڑھی خواتین کے سپرد تھی۔ عمر رسیدہ خواتین جانوروں
دودھ دُہتی اور چمڑے کے موزے تک تیار کرتی تھیں۔

شہزادی الجائی خاتون بڑے بے باکانہ انداز میں ہنستی ہوئی گھوڑے سے اتری اور دادا کے گلے
لگ گئی۔ شہزادی کے بخیریت واپس آنے کی تمام لوگوں کو خوشی ہوئی لیکن اس کے چہرے یا سراپا کی طرف کوئی
نہ ہوا جیسے جمالیات کے کسی انداز یا زاویے سے وہ بالکل نابلد ہیں۔ واپس آنے والے پانچسو بہادروں کے
نے قرغن کے پاس آنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ وہ چپ چاپ اپنے خیموں میں چلے گئے۔

شہزادی الجائی خاتون، دادا سے گلے مل کر الگ ہوئی تو قرغن نے کہا:

"ہم تمہارے لیے بہت پریشان تھے۔ ہمیں جیسے ہی معلوم ہوا کہ تم سرحد کے قریب ہو ہم نے فو
پانچ سو بہادروں کو تمہاری مدد کے لیے بھیج دیا۔"

شہزادی نے ہنس کر کہا:

"اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی دادا جان۔"

قرغن کے چہرے پر تو مسکراہٹ محسوس نہ ہوئی لیکن اس کی آنکھ ہنستی دکھائی دی۔ اس نے کہا:

"بہت خوب! حملہ آور ہمارے بہادروں کو دیکھ کر ہی بھاگ گئے ہوں گے۔"

"اس کی بھی نوبت نہیں آئی۔" شہزادی نے اکتائے لہجہ میں کہا۔ پھر اپنے غلام سردار کی طرف دیکھتے
بولی: "یہ آپ کو لڑائی کی تفصیل بتا دے گا۔"

قرغن چونکا، پوچھا:

"تو کیا تم حملہ آوروں سے لڑنے گئی تھیں۔ کوئی زخم تو نہیں آیا؟"

شہزادی نے جواب دیا: "دادا جان۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ مجھے تو خراش تک نہیں آئی۔ مجھے اجازت

بہت تھک گئی ہوں۔ اپنے خیمے میں جا رہی ہوں۔"

الجائی خاتون، اپنی کنیزوں اور غلاموں کو لے کر اپنے خیمے کی طرف چل پڑی۔ اس نے قرغن کے جواب
کا بھی انتظار نہ کیا۔ مزید گفت گو کے لیے وہ غلام سردار کو وہیں چھوڑ گئی تھی۔

قرغن کچھ سوچتا، سفید نمدے کی مسند کے پاس گیا اور ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ غلام سردار اس کے
سامنے دست بستہ کھڑا تھا۔

قرغن نے پوچھا: "شہزادی حملہ آوروں سے لڑنے گئی تھی؟"

"جی ہاں والیِ سمرقند۔" غلام سردار فخریہ انداز میں بولا: "شہزادی صاحبہ خوب خوب لڑیں۔ بڑا سخت
مقابلہ ہوا۔"

"حملہ آور تعداد میں کتنے تھے؟" قرغن نے پوچھا۔

"دو سو کے قریب۔" غلام سردار نے بالغہ سے کام لیا۔

"دو سو۔" قرغن مسند سے آگے جھک گیا۔ اس نے غلام سردار کو گھورتے ہوئے پوچھا: "تم سب
کی تعداد کتنی تھی؟"

غلام سردار نے دل میں گنتی گنی۔ پھر بولا:

"کُل اٹھارہ لیکن تلواریں صرف آٹھ تھیں۔" اس نے اپنے نیچے پر ہاتھ رکھ کر بڑے غرور سے کہا۔ "اگر
اسے بھی تلوار سمجھ لیا جائے تو تلواروں کی تعداد نو ہو جاتی ہے۔"

قرغن کی سمجھ میں یہ معمہ نہ آیا۔ اس نے بگڑ کر کہا:

"اٹھارہ۔ آٹھ۔ نو۔ کیا بکواس کر رہا ہے؟"

غلام سردار گھبرایا مگر جلد ہی سنبھل گیا۔ بولا: "اے امیرِ سمرقند۔ غلام آپ کے سامنے غلط بیانی نہیں
کر سکتا۔ ہم تمام مردوں اور عورتوں کی تعداد اٹھارہ تھی لیکن ہمارے پاس تلواریں صرف آٹھ تھیں۔ کنیزوں اور
غلاموں کے پاس خنجر تھے۔"

قرغن کو اپنی لاڈلی پوتی کی بہادری پر بڑا تعجب ہوا۔ اس نے سوچا کہ شہزادی صرف حسین و دلربا نہیں۔
بہادر بھی ہے اور بہادر بھی اتنی کہ اس نے آٹھ تلواروں سے دو سو بہادروں کو مار بھگایا اور اسے ایک خراش
تک نہ آئی۔ یہ واقعہ بڑا حیرت انگیز تھا۔ غلام اس کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا لیکن بات ایسی تھی کہ اس کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دل قبول نہیں کر رہا تھا۔

اس نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا:

محلے میں پہل کس نے کی۔ شہزادی نے خود بڑھ کر حملہ کیا یا لٹیروں کو حملہ کرنے کا موقع دیا۔ کس کی طرف سے پہل ہوئی؟"

"پہل کس کی طرف سے ہوئی؟" غلام سردار زیر لب بڑبڑایا۔ پھر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ تیمور اور عبداللہ اس کے قریب ہی کھڑے تھے۔ غلام سردار کے چہرے پر جیسے رونق آ گئی۔ اس نے تیمور کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے قزغن سے کہا:

"اے امیر سمرقند! حملے میں پہل اس نوجوان نے کی۔ یہ وہ فرشتہ ہے جو اگر وقت پر نہ پہنچ جاتا تو آج میں آپ کے سامنے زندہ موجود نہ ہوتا۔"

سب کی نظریں اک دم غلام سردار کے ہاتھ کے اشارہ کی طرف اٹھ گئیں۔ تیمور نظریں جھکائے عبداللہ کے برابر کھڑا تھا۔ نوعمر عبداللہ دل میں بہت خوش ہوا۔ اس نے بڑے فخر سے امیر قزغن سے آنکھیں چار کیں لیکن جلد ہی مرعوب ہو کر گردن جھکا لی۔

امیر قزغن نے جیسے خود سے سوال کیا: "یہ نوجوان کون ہے؟"

غلام سردار نے امیر قزغن کی سنی ان سنی کر دی اور اپنی رَو میں بولا:

"جی ہاں امیر سمرقند! اس نوجوان کے ترکش سے تیر اس طرح نکل رہے تھے جیسے بھری برسات میں اولوں کی بارش ہو۔ اس کی تلوار کوندے کی طرح لپکتی۔ اس کا سفید گھوڑا دشمنوں کے گھیرے میں، سیاہ بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلتے چاند کی طرح چمکتا اور للکارے مار رہا تھا۔ جدھر یہ گھومتا، لٹیرے کائی کی طرح پھٹ جاتے۔"

"مگر یہ ہے کون؟" امیر قزغن کی آواز میں دنیا جہان کی حیرت کا رس گھل گیا۔

امیر قزغن کی آواز سن کر غلام سردار فوراً چپ ہو گیا۔

امیر تیمور نے غلام سردار کو بولنے کا موقع نہ دیا۔ ایک قدم آگے بڑھ کر بولا:

"اے والیِ سمرقند! میں قبیلہ برلاس کے سردار قراقانی کا بیٹا تیمور ہوں۔ آپ کے حکم کی تعمیل میں حاضر ہوا ہوں۔"

امیر قزغن کو جیسے اس پر ڈھیروں پیار آ گیا۔ وہ گردن جھٹک کر بولا: "تیمور! تم صرف قراقانی کے

نہیں ہو، خاندانِ گورگان کے ایک فرد بھی ہو۔ تم ترا (چغتائی) نہیں تاتاری ہو۔"

تیمور نے سر اٹھا کر تیمور کو دیکھا پھر نظریں نیچی کر لیں۔ اس کا قبیلہ برلاس، تاتاریوں کا ایک مشہور قبیلہ تھا۔ امیر نے ٹھیک ہی کہا تھا اس کا تعلق چنگیز خان کی کسی شاخ سے نہ تھا۔

امیر قزغن نے نوجوان تیمور کو اس پہلی ملاقات میں تمام سرداروں کے سامنے پہلا سبق پڑھایا:

"تیمور! تمہاری پیدائش سے سالہا سال قبل تمہارے جدِ امجد نے خاندانِ چنگیزی کے جدِ امجد سے یہ معاہدہ کیا تھا کہ فوج کے سپہ سالار تمہارے خاندان سے ہوا کریں گے لیکن حکومت چنگیز کی اولاد کے ہاتھ میں رہے گی۔ یہ عہد نامہ ایک فولادی تختی پر کندہ کیا گیا تھا جو چنگیزی خوانین کے پاس محفوظ ہے۔ یہ بات تمہارے باپ قراقانی نے مجھے بتائی تھی اور یہی سچ بھی ہے۔"

تیمور کو ان باتوں کا پہلے ہی سے علم تھا۔ تیمور کا باپ مرداری چھوڑ کر گوشہ نشین ہو گیا تھا اور اب اپنی زندگی یادِ الٰہی میں بسر کر رہا تھا لیکن اس نے تیمور کو تاتاریوں اور منگولوں کی پوری تاریخ سے آگاہ کر کے اسے اپنی زندگی کی راہیں خود متعین کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

بہادروں کے جتھے کے جو لوگ شہزادی کی مدد کے لیے بھیجے گئے تھے وہ تو اپنے خیموں میں پہلے ہی پہنچ گئے تھے لیکن امیر قزغن کے پاس اس وقت چند "بہادر" دوسروں سے ذرا الگ اپنا جتھہ بنائے بیٹھے تھے۔ انہیں امیر قزغن کی تیمور پر اتنی زیادہ مہربانی بڑی شاق گزری لیکن وہ خاموش رہے۔ پتہ نہیں تیمور کی اس مہم کا تاثر تھا یا امیر قزغن کی دُور رس نظروں نے تیمور کے بشرے سے اس کے روشن مستقبل کا پتہ لگا لیا تھا کہ وہ پہلی ہی ملاقات میں اس کا والا و شیدا ہو گیا تھا۔

امیر قزغن نے اسی محفل میں ایک اور اعلان کر کے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ اس نے کہا:

"ہم قبیلہ برلاس کے سردار قراقانی کے بیٹے تیمور کو اپنے "بہادروں" کے جتھے میں شامل کرنے کا اعلان کرتے ہیں۔"

اس اعلان کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ تیمور کو مبادر کا خطاب دیا گیا ہے۔ "بہادر" تاتاری سرداروں کا اعلیٰ ترین اعزاز تھا۔ یہ اعزاز مختلف قبائل کے جانباز اور قوی ہیکل افراد کو دیا جاتا تھا۔ تیمور اگرچہ سترہ سال کا دبلا پتلا نوجوان تھا لیکن اس معرکہ نے امیر قزغن کے دل میں کچھ ایسا گھر کر لیا کہ اس نے بے جھجک اور بغیر کسی سفارش کے اسے "بہادروں" میں شامل کر دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قبائلی سرداروں میں سے زیادہ سرداروں نے امیر قزغن کے اس قدم کو سراہا لیکن اس محفل میں شریک "بہادروں" کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ ان کے خیال میں ایک دبلا پتلا جوان خواہ وہ کتنا ہی پھرتیلا کیوں نہ ہو۔ "بہادروں" جیسے گرانڈیل اور خونخوار افراد میں شامل ہونے کا اہل نہ تھا۔ بہادر بے جگری سے لڑنے میں مشہور تھے، رزم اور بزم ہر جگہ وہ خود کو دوسرے شہسواروں اور شمشیر زنوں سے الگ رکھتے تھے۔ وہ میدانِ جنگ کی طرف جاتے اتنے ہی خوش ہوتے جس طرح وہ ضیافت کی محفل میں شریک ہونے جاتے تھے۔

تیمور کو "بہادر" کا خطاب ملا تو اس کے خانہ زاد عبداللہ نے تیمور کے کان کے پاس منہ لے جا کر اسے مبارک باد دی۔

تیمور نے بھی اس کے کان میں کہا: "عبداللہ، بخدا میں جانتا تھا کہ مجھے یہ اعزاز ملے گا!"

عبداللہ حیرت سے تیمور کا منہ دیکھ کر رہ گیا۔ اس وقت گفتگو کا موقع نہ تھا۔ دونوں خاموش ہو گئے۔

امیر قزغن کا فرشی دربار برخاست ہوا۔ تیمور کو "بہادروں" کے خیموں کی قطار میں ایک خیمہ دیا گیا۔ تیمور بڑی تمکنت سے اپنے خیمے کی طرف جا رہا تھا۔ عبداللہ خاموش خاموش کچھ سوچتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

"بہادروں" کے گروہ جگہ جگہ خیموں کے سامنے دس دس پانچ پانچ کی ٹولیوں میں بیٹھے تھے۔ تیمور کی طرف کوئی بھی متوجہ نہ ہوا۔ تیمور نے بھی ان کی پروا نہ کی اور سیدھا اپنے خیمے میں پہنچ گیا۔ نمدے کا چوبخ دار خیمہ۔ اندر قالین بچھا تھا۔ اس کے علاوہ اس میں اور کوئی چیز موجود نہ تھی۔

چودہ سالہ عبداللہ خیمے میں پہنچ کے بھی خاموش تھا۔

تیمور قالین پر مع جوتوں کے پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اس نے پوچھا:

"عبداللہ، تو خاموش ہے۔ کیا تجھے میرے اس اعزاز پر خوشی نہیں ہوئی؟"

"کیوں نہیں میرے آقا!" عبداللہ نے جواب دیا۔ "خانہ زاد کے لیے اس سے بڑھ کر اور کونسی خوشی ہو سکتی ہے لیکن ــ"

"لیکن کیا؟" تیمور نے اس کے کاندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا: "دیکھ عبداللہ! بات دل میں نہیں رکھا کرتے۔ اس سے شک و شبہ پیدا ہوتا ہے۔ بزرگ کہتے ہیں کہ دل پر بوجھ نہ رکھو۔ کوئی اعتماد کے قابل نہ ملے تو دل کا حال دیواروں سے کہہ ڈالو۔ اس سے بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔"

عبداللہ شرمندہ سا ہو گیا۔ بولا: "آقا! آپ سے زیادہ قابلِ اعتماد اور کون ہو سکتا ہے۔ بس ایک بات

مجھ میں نہیں آ رہی۔ سوچتا ہوں کہوں کہ نہ کہوں۔"

"ضرور کہو عبداللہ۔" تیمور نے کہا۔ "تم میرے غلام نہیں چھوٹے بھائی ہو۔"

عبداللہ فرطِ جذبات سے تیمور کے قدموں پر گر پڑا۔ روتے ہوئے بولا:

"آقا! مجھے معاف کر دیجیے۔ میں نے آپ پر خواہ مخواہ شک کیا۔ بات یہ ہے کہ میں نے مسجد کے امام سے یہ سنا تھا کہ آئندہ کا حال صرف خدا جانتا ہے۔ اگر کوئی مستقبل کا حال بتانے کا دعویٰ کرے تو وہ کافر ہے۔ آپ نے کہا تھا کہ اس اعزاز اور خطاب کا حال آپ کو پہلے سے معلوم تھا۔ بس میں اسی الجھن میں مبتلا ہو گیا۔"

تیمور اپنے غلام کے خیالات سے بڑا متاثر ہوا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر کہا:

"عبداللہ! امام مسجد نے بالکل سچ کہا۔ غیب کا حال صرف خدا جانتا ہے لیکن خدا نے ہی انسان کو عقل دی ہے۔ وہ اپنی عقل سے کچھ اندازہ لگاتا ہے۔ اگر اس کا اندازہ درست نکلے تو اسے غیب دانی نہیں کہہ سکتے۔ میں نے جو تم سے کہا کہ میں اس خطاب کے بارے میں پہلے سے جانتا تھا تو اس کی ایک وجہ تھی۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جسے میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ میں اُس وقت مشکل سے دس سال کا تھا۔ ایک دن مسجد کے گوشہ میں بیٹھا قرآن پاک کا پہلا سپارہ پڑھ رہا تھا۔ ایک سفید ریش بزرگ مجھے بڑے غور سے دیکھ رہے تھے پھر وہ اٹھ کر میرے پاس آئے۔ میرا نام پوچھا۔ میں نے بتا دیا۔ انھوں نے سپارے پر جھک کر وہ آیت دیکھی جو میں پڑھ رہا تھا۔ کچھ دیر تک آنکھیں بند کر کے سوچتے رہے پھر مجھ سے کہا:

"بیٹا! جب تک تم اسلام کا تحفظ کرتے رہو گے خدا تمہاری حفاظت کرتا رہے گا۔"

یہ سن کر میں نے اندازہ لگایا کہ خداوند تعالیٰ ضرور مجھے کوئی بڑا مرتبہ دینا چاہتا ہے۔ اس طرح ان بزرگ کی پیش گوئی اور میرا اندازہ درست ہو گیا۔"

عبداللہ کو اطمینان ہو گیا اور وہ خوشی خوشی تیمور کے گھٹنوں تک چڑھے ہوئے نمدے کے جوتے اتارنے لگا۔

○

لال تری، شہزادی الجائی خاتون کی سب سے زیادہ شوخ اور چنچل کنیز تھی مگر تھی بڑی بدقسمت۔ بارہ سال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی عمر میں ایک بانکے غلام سے دل لگا بیٹھی۔ غلام بھی اس پہ ریجھ گیا۔ دونوں نے بھاگ دوڑ کر کے آقا کو راضی کر لیا اور شادی ہو گئی۔ مگر قسمت کی ایسی ہیٹی کہ ایک سال کے اندر ہی اس کا محبوب شوہر چٹ پٹ ہو گیا۔ معمولی نزلہ بخار۔ ابھی دوادارو کی فکر ہو رہی تھی کہ تیسرے دن وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس سانحے کیا اجڑا دنیا اجڑ گئی۔ غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ الجائی خاتون کی خدمت میں آ گئی وہ میں گھل گھل کے خود بھی ختم ہو گئی ہوتی۔ اس کی چہچہاہٹ اور شوخی پھر لوٹ آئی۔

الجائی خاتون کی مار مر چکی تھی اور باپ ایک نئی نویلی دلہن لے آیا تھا۔ الجائی کو تنہائی کا مارا منہ لگا کچھ دنوں بعد اسے لال تری مل گئی۔ پھر دادا کا بلاوا آ گیا۔ اندھا کیا چاہے۔ الجائی کو بہانہ ہاتھ آیا کنیزوں سہیلیوں کے ساتھ دادا کے پاس اٹھ آئی اور یہیں کی ہو کر رہ گئی۔

سردی چپڑ پڑ ہوتے کئی ہفتے گزر چکے تھے۔ الجائی اداس تھی۔ لال تری ہزار جتن کرتی حکایتیں اور لطیفے سناتی۔ چھیڑتی۔ گدگداتی لیکن الجائی کا جیسے منہ پہ مول نہ کھلتا۔ کوئی بات اس کے دل کو کبھی گہرے خیالات میں کھو جاتی۔ کبھی خلاؤں میں گھورنے لگتی۔ لال تری تھک ہار کر رہ گئی۔ جب اس نے دیکھا کہ شہزادی کسی طرح نہیں کھلتی تو ایک رات سر درد کا بہانہ کر کے دوسرے خیمے میں چلی گئی اور صبح کو واپس نہ آئی۔ دن چڑھا تو شہزادی کو فکر ہوئی۔ دوسری کنیز بھیج کر اسے بلایا۔ لال تری آئی لیکن منہ پھلائے، منہ نکالے جیسے کسی سے لڑ کر آ رہی ہو۔

شہزادی سمجھ گئی کہ لال تری اس سے ناراض ہے۔ کتنے دنوں سے شہزادی نے اس سے سیدھے بات نہ کی تھی۔ ناراض نہ ہوتی تو کیا خوش ہوتی۔ شہزادی کا دل پسیجا۔ بولی:

"لال تری! تو نے کسی سے محبت کی ہے؟"

"جی کی ہے۔" لال تری یوں بولی جیسے لڑ رہی ہو۔

شہزادی کو ہنسی آ گئی۔ کہنے لگی:

"بھلا بتا تو کس سے محبت کی ہے؟"

"ہائے شہزادی بی بی۔ یہ قصہ نہ چھیڑ۔" لال تری سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ "میں نے محبت کی اور کی۔ وہ ایک ترخان کو کھانا کھانے پر مامور تھا اور میں ان کی بیگم کی خادمہ تھی۔ آتے جاتے اس کا سامنا چھپ چھپ دیکھنا دکھانا ہی دل کا روگ بن گیا۔ ایک دن وہ نظر نہ آتا تو یوں تڑپتی جیسے جل بن مچھلی۔ پھر جب وہ میں اس سے بات نہ کرتی منہ پھلا کر بیٹھ جاتی۔"

"ایسے ہی نا جیسے آج منہ پھلا کے آئی تھی۔" شہزادی نے اس کی بات کاٹ دی۔

لال تری کھسیانی ہو گئی۔ بولی:

"کیا کرتی۔ مہینہ بھر سے آپ کے آگے پیچھے گھوم رہی ہوں لیکن آپ تو لفٹ ہی نہیں ڈالتیں۔"

"اچھا یہ دکھڑا چھوڑ۔ بتا پھر کیا ہوا۔" شہزادی کو اس کی باتوں میں مزا آنے لگا۔

لال تری سنجیدہ ہو گئی۔ اس نے کہا:

"کچھ دن یہی چکر چلتا رہا۔ وہ جب آتا میرے لیے ایک پوٹلی میں اچھے اچھے کھانے باندھ کر لاتا۔ ہم دونوں خوب مزے لے لے کر کھاتے۔"

"پھر کیا ہوا۔" آگے بڑھ کر شہزادی اس کی ہمت کا انجام معلوم کرنا چاہتی تھی۔

لال تری سنجیدگی سے بولی: "پھر ہماری شادی ہو گئی۔"

شہزادی چونک پڑی! پوچھا:

"تو شادی شدہ ہے۔ تیرا شوہر کہاں ہے؟"

"اللہ میاں کے گھر۔" لال تری نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا: "شادی کے بعد وہ ایک سال بھی زندہ نہ رہا اور اکیلا ہی اللہ کے گھر بھیج گیا۔"

"بڑا افسوس ہوا سن کے۔" شہزادی نے اظہار ہمدردی کیا۔ پھر کچھ سوچ کر پوچھا: "تیری عمر کتنی ہے لال تری؟"

"چودہ سال۔"

"اور شادی کس عمر میں ہوئی تھی؟"

"جب میں بارہ سال کی تھی۔" لال تری نے بتایا۔

"تو بڑی دکھی ہے لال تری۔" شہزادی نے کہا۔ "یہ بات تو نے پہلے کبھی نہیں بتائی۔"

"کیا کرتی بتا کے شہزادی بیگم۔" لال تری اداس ہو گئی۔ "آپ کے پاس آ کے تو میں نے ہنسنا بولنا شروع کیا ہے۔ پہلے تو میں منہ پیٹے پڑی رہتی تھی۔"

لال تری کے غم نے شہزادی کو بھی غمگین کر دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لال تری نے پوچھا: "پر آپ کیوں چپ چپ رہتی ہیں شہزادی؟"

"تو آپ ہی غم کی ماری ہے۔ تجھ سے کیا کہوں۔" شہزادی گہری افسردگی میں ڈوب گئی۔

لال تری نے کہا:

"شہزادی! میری ماں کہتی تھی کہ اپنا مرض حکیم سے اور دل کی بات اچھی سہیلی سے ضرور بتانا چاہیے۔ میں آپ کی سہیلی تو نہیں ہاں کنیز ضرور ہوں لیکن تجربے میں آپ سے آگے ہوں۔ دنیا جو دیکھی ہے میں نے۔"

شہزادی تیمور کے خیال میں کھوئی ہوئی تھی۔ لال تری اسے ہمدرد معلوم ہوئی۔ آخر اس نے راز اگل دیا۔

"لال تری، تیرا اس نوجوان کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

لال تری چونکی۔ پوچھا:

"کون۔ وہ نوعمر جوان؟"

"ہاں ہاں۔ وہی۔" شہزادی کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے خوابوں کا شہزادہ اس کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔ لال تری جیسے مست ہو گئی۔ کہا:

"اس کا کیا کہنا شہزادی صاحبہ! بڑا دل ربا ہے۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ اسے دیکھتے ہی میرے دل پر چوٹ سی پڑی تھی۔ مجھے اپنا شوہر یاد آ گیا۔ ایسا ہی دبلا پتلا چنک منک۔ وہ اس قابل ہے کہ اس سے محبت کی جائے۔ پر میں....."

لال تری کہتے کہتے رک گئی۔ اس نے ہنستے ہوئے شہزادی کو دیکھا۔ شہزادی اسے حیران حیران نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ساتھ ہی غصہ آ رہا تھا کہ یہ ٹکے کی کنیز کتنی ڈھٹائی سے تیمور سے اپنا عشق جتا رہی ہے۔

لال تری بولی:

"شہزادی! اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ وہ مجھے اچھا ضرور لگتا ہے لیکن میں اس سے شادی نہیں کروں گی۔"

شہزادی کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اس کا دل چاہا کہ لال تری کا منہ نوچ لے۔ یہ منہ اور مسور کی دال۔ کہاں برلاس قبیلہ کے سردار کا بیٹا تیمور کہاں یہ کنیز۔ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند۔

شہزادی نے جل کر کہا:

"کرے نا شادی۔ کیا عیب ہے اس میں؟"

لال تری کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔ وہ سمجھی کہ شاید شہزادی بھی یہی چاہتی ہے۔ پہلے ہنستی رہی۔ پھر بولی: "کرتو ٹوں پر جی ڈرتا ہے۔ دودھ کا جلا ماٹھا پھونک کے پیے۔ آنکھ ہوتے مکھی نہیں کھائی جاتی۔"

شہزادی کا خون کھول گیا۔ چیخ کے بولی:

"تو رانی ہے کہیں کی نا۔ کیا برائی ہے اس میں۔ کس بات میں کم ہے تجھ سے؟"

لال تری شہزادی کی لال پیلی نظروں اور لہجہ کی سختی کو پھر بھی نہ سمجھی۔ اٹھلا کر بولی:

"کم تو نہیں ہے۔ عمر میں بھی برابر ہی ہوگا جوڑا اچھا رہے گا۔ پر اب میں نے طے کیا ہے کہ کسی عمر دراز آدمی سے شادی کروں گی۔ جس کے مونچھیں ہوں۔ داڑھی ہو۔ میرے ساتھ چلے تو بھاری بھرکم لگے۔ یہ میرے ساتھ چلے گا تو شوہر کے بجائے بھائی لگے گا۔ پھر ان بارہ چودہ سال کے چھوکروں کا کیا اعتبار۔ ادھر شادی کی ادھر سال کے اندر اندر مر گئے۔"

شہزادی کے چہرے کی عجیب کیفیت تھی۔ کبھی نفرت و غصہ تو کبھی پیار اور خوشی۔ لال تری کی باتوں نے اسے عجیب الجھن میں ڈال دیا تھا۔ اس کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی اور چلتی چلی جا رہی تھی۔

لال تری شہزادی کے اور قریب کھسک آئی اور رازدارانہ انداز میں بولی:

"ابھی تو اس کی مونچھیں بھی نہیں نکلیں۔ مجھے تو وہ چودہ سال سے بھی کم کا لگتا ہے۔"

شہزادی نے ایک لمبی سانس لی۔ اطمینان کی سانس۔ اس کے دل کا بوجھ جیسے ہلکا ہو گیا۔ شہزادی نے مسکراتے ہوئے پوچھا:

"یہ تو اتنی دیر سے کس کی تعریف کیے جا رہی ہے؟"

"لیجیے شہزادی یہ کیا بات ہوئی؟" لال تری نظریں نیچی کر کے بولی۔ "میں تعریف کر رہی ہوں تو اس کا نام لیتے یوں شرماؤں۔ پھر ابھی نکاح کب ہوا ہے کہ ٹوٹ جائے گا۔ آپ سو بار پوچھیں۔ سو بار بتاؤں گی۔ اس کا نام ہے عبداللہ۔ عبداللہ۔ عبداللہ۔"

شہزادی نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔ اس کے قہقہے میں لال تری نے اپنا ہلکا قہقہہ بھی شامل کر دیا۔ شہزادی یوں ہنسی کہ اس کا شک رد ہوا اور دل ہلکا پڑ گیا اور لال تری کا قہقہہ محض قہقہہ تھا۔ اس نے تو شہزادی کو خوش کرنے کے لیے ہنسنا شروع کر دیا تھا۔

"جانتی ہے میں کیوں ہنسی تھی۔" شہزادی انجانی نے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اجی۔ ہنسی کا کیا ہے، بس آ گئی تو آ گئی۔" لال تری نے بے پروائی سے جواب دیا۔

شہزادی اسے پرے دھکیلتی ہوئی بولی:

"نہیں ری۔ میں سمجھی تھی کہ تو تیمور کی تعریف کر رہی ہے۔"

"ہائے۔ یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔" لال تری ٹھنک کے بولی: "مجھ پر آسمان گرے۔ ڈھائی گھڑی کا ہیجڑا جو کبھی ایسا سوچوں بھی۔ وہ تو شہزادہ ہے شہزادہ۔ کیا پھرتیلا جوان ہے۔ یہ جو پہاڑ جیسے ڈیل لیے گھومتے ہیں آپ کے "بہادر"۔ یہ اس کے پیر کی دھول بھی نہیں۔ کیا لڑا تھا اس دن۔ تلوار تھی کہ بجلی۔ تیر تو اس کی کمان سے یوں نکلتے ہیں جیسے آگے پیچھے مگر میں جڑے ہوں۔ پتہ ہی نہیں لگتا۔ کب تیر ترکش سے نکلا، کب کمان پہ جڑا اور کب چلا۔ ایک تانتا باندھ دیا تھا اس نے۔ جیسے ساون چھم چھم برسے۔ تیر یونہی برسائے اس نے میں تو کہتی ہوں۔"

لال تری پھر شہزادی کے قریب سرک آئی۔ بولی:

"میں تو کہوں بس آپ کا جوڑ ہے۔ پورا پورا جوڑ۔ اللہ نے بنا کے آسمان سے اتارا ہے۔"

شہزادی کا انگ انگ جھوم اٹھا۔ کہنے لگی: "تو تیمور تجھے بھی اچھا لگا؟"

"نا بی بی شہزادی۔" لال تری نے منہ بسورا۔ "آپ پھر شبہ میں پڑ جائیں گی۔ شہزادے اچھے ہیں۔ بہت اچھے مگر آپ کے لیے۔"

دونوں دیر تک سر جوڑے باتیں کرتی رہیں۔ کبھی تیمور کی تو کبھی عبداللہ کی۔

شام کو لال تری، تیمور کے خیمے کے گرد منڈلا رہی تھی۔ تیمور کا خیمہ "بہادروں" کے خیموں کی قطار میں تھا۔ بہادر تو پھر بہادر تھے۔ وہ عام سپاہیوں سے بات نہ کرتے لال تری کی طرف کیا توجہ دیتے۔ جگہ جگہ ان کی ٹولیاں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ قصے، کہانیاں۔ ایران توران کی لڑائیوں کی کہانیاں۔ چنگیز کی بربریت اور ہلاکو خان کی سفاکی کی داستانیں۔ ان کہانیوں میں شاید انہیں لطف آتا۔ جب کوئی کہتا کہ چنگیز خاں بڑے بڑے شاہوں کو شکست دے کر ان کی کھوپڑیوں کے پیالے بناتا اور ان میں سفید گھوڑیوں کا دودھ پیتا تھا تو وہ خوب ہنستے اور قہقہے لگاتے۔ پتہ نہیں وہ بربریت کا مذاق اڑاتے یا انسانیت کی بے بسی کا۔

لال تری کو اس طرح سرگوشت کرتے رات ہو گئی۔ ہر خیمے میں شمع روشن تھی لیکن نہ وہ کسی سے بولتی نہ اسے منہ لگاتا۔ تیمور کے خیمے کے اس نے چار پانچ چکر لگائے تھے۔ ایک مرتبہ عبداللہ کی فگر اس پر پڑی تھی

شبہ ہوا کہ یہ شہزادی کی کنیزوں میں شامل تھی۔ عبداللہ نے باہر نکل کر اسے دیکھنا چاہا مگر تیمور نے اسے سختی سے ڈانٹ دیا:

"یہ بہادروں کی خیمہ گاہ ہے دریا کا کنارہ نہیں۔" تیمور کی بھاری آواز خیمے میں گونجی اور عبداللہ دبک کر بیٹھ گیا۔

لال تری کو غصہ آ گیا۔ اس کی انا کی توہین ہوئی تھی۔ وہ ایک گھنٹے سے گھوم رہی تھی اور کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ اسے کسی اور سے تو شکوہ نہ تھا مگر عبداللہ پر تاؤ ضرور تھا۔ بلاوجہ کا تاؤ۔ بھلا عبداللہ اس کا کیا لگتا تھا۔ نہ کوئی رشتہ نہ ناتہ۔ ابھی تو ان دونوں میں بات بھی نہ ہوئی تھی مگر لال تری اپنے ہی طور پر اس پر اپنا حق سمجھتی تھی۔

اس نے تیمور کے خیمہ کا آخری چکر لگایا یہ سوچ کر کہ اگر اس بار بھی عبداللہ نے اسے آواز نہ دی تو وہ واپس چلی جائے گی اور پھر عبداللہ سے کبھی نہ بولے گی۔

لال تری جھک کر خیمہ کے سامنے سے نکلی۔ خیمہ کے دروازے کے بالکل پاس سے۔ اس کا منہ دروازے کی طرف تھا۔ اندر کی روشنی اس کے چہرے پر پڑی تو عبداللہ تڑپ اٹھا۔ وہ چپکے سے اٹھا۔

"کدھر چلا؟" تیمور کی بھاری آواز پھر ابھری۔

"باہر جا رہا ہوں۔" عبداللہ منمنایا۔ "کوئی ملنے آیا ہے۔"

"کون آیا ہے؟" تیمور نے اسے گھورا۔

"وہ۔ وہی۔ شہزادی کی کنیز۔" عبداللہ نے بڑی ہمت کر کے کہا۔

تیمور سوچ میں پڑ گیا۔ شہزادی کی کنیز کیوں آئی۔ کیا شہزادی نے اسے بھیجا ہے۔ مگر کیوں؟ مختلف خیال اس کے ذہن میں پیدا ہوئے۔

تیمور نے پوچھا:

"کیا یہ کنیز پہلے بھی آئی تھی؟"

"نہیں۔ پہلی بار آئی ہے۔" عبداللہ کمزور آواز میں بولا۔ "چلا جاؤں میں؟"

تیمور سوچ ہی رہا تھا کہ عبداللہ تیر سے باہر نکل گیا۔

عبداللہ کو ایک سایہ سا خیمے سے ذرا دور دکھائی پڑا۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا اس کے قریب پہنچا۔ یہ تین

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر لینے کے بعد کہ سایہ کنیز ہی کا ہے وہ زور سے کھنکارا۔ کنیز نے پلٹ کر دیکھا۔ دونوں ساتھ ذرا اور قریب گئے۔ روشنی بہت کم تھی۔ جب دُور کسی خیمہ کے آگے الاؤ سے شعلہ اٹھتا تو ایک لمحہ کے لیے جگمگ پیدا ہو جاتی۔

لال تری مرد کی قربت سے آشنا تھی۔ عبداللہ کو اتنا قریب پا کر اس کی رگیں پھڑکنے لگیں۔ شوخی رخصت ہو گئی۔ غصہ ٹھنڈا پڑ گیا اور جسم جلنے لگا۔

"تو میرے پیچھے کیوں آیا؟" لال تری کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔

عبداللہ ناتجربہ کار، نادان تھا۔ بولا:

"تو نے بلایا۔ میں آ گیا۔ شام سے جو میرے خیمہ کے چکر کاٹ رہی ہے۔"

عبداللہ کے انداز میں بچپنا تھا اور بھولا پن تھا۔ ابھی وہ بچپن اور جوانی کے اتصال پر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کسی عورت سے اس قدر قربت کا احساس، اس کے لیے ایک نیا تجربہ تھا مگر لذت آمیز۔

لال تری نے اس کی فکری کمزوری محسوس کر لی۔ لپک کے اس کا ہاتھ پکڑا اور کھینچتی ہوئی خیموں سے دُور لے گئی۔ عبداللہ نے کوئی احتجاج نہ کیا۔ عورت کے لمس سے اس کے جسم میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔

لال تری، میدان کے کنارے پہنچ کر بیٹھ گئی۔ خیموں کا جنگل اس کی پشت پر تھا اور سامنے کھلا صحرا۔ چاند آہستہ آہستہ اپنا چہرہ ابھار رہا تھا۔

دونوں خاموش تھے۔ کئی لمحے اسی طرح گزر گئے۔ لال تری کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ عبداللہ پُرسکون تھا۔ یہ سکون دراصل ایک ایسا کیف تھا جس میں عبداللہ سر تا پا ڈوبا ہوا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے لال تری کو دیکھے جا رہا تھا اور چاہتا تھا کہ یونہی دیکھتا رہے۔

دور خیمہ گاہ سے کئی بھیانک قہقہے گونجے۔ یہ "بہادروں" کے خوشی کے اظہار کا نقطۂ عروج تھا جب وہ کسی بات پر بہت خوش ہوتے تو آواز سے آواز ٹکرا کر خوفناک قہقہے بلند کرتے۔ عبداللہ اور لال تری ایسے قہقہوں کے عادی تھے۔ انہوں نے اس طرف توجہ نہ دی لیکن لال تری کو جیسے اپنی ذمہ داری یاد آ گئی۔

دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ لال تری اس کے قریب کھسک آئی۔ بولی:

"تیرے آقا نے کبھی شہزادی کے بارے میں کچھ کہا؟" اس کی آواز اکھڑی اکھڑی تھی۔

عبداللہ کو اس کی زلفیں اپنے شانوں پر لہراتی محسوس ہوئیں۔ اس نے مستی کے عالم میں کہا:

"شہزادی کیا چیز ہے تو اپنی بات کر۔ میرے پاس کیوں آئی ہے تو؟"

لال تری کی نسوانی حیا جیسے عود کر آئی۔ بولی:

"میں کیوں آنے لگی تیرے پاس۔ تجھ میں کیا لعل ٹکے ہیں۔ میں ایسے ویسوں کو تو منہ بھی نہیں لگاتی۔ تجھے اچھی نہیں لگتی تو ابھی چلی جاؤں گی۔"

عبداللہ بوکھلا گیا۔ اس کا مقصد لال تری کو ناراض کرنا نہیں تھا۔ محبت سے بولا: "اتنی جلدی کیا ہے۔ ذرا اپنا نام تو بتا مجھے؟"

"لال تری۔" لال تری مچلتے ہوئے بولی۔ اس کی زلفیں پھر عبداللہ کے شانے پر آ گئیں۔

"لال تری۔ بڑا پیارا نام ہے۔" عبداللہ جیسے جھوم اٹھا۔

لال تری کا سر، عبداللہ کے شانے پر ٹک گیا۔ بولی:

"میں اچھی لگتی ہوں تجھے؟"

"بہت اچھی۔" لال تری کی ایک زلف کھل کر عبداللہ کے چہرے پر ٹک پڑی۔ عجیب سی مہک تھی اس کے بالوں میں۔

"کیوں آئی ہے میرے پاس؟" عبداللہ نے بے تکا سا سوال کیا۔

لال تری کا سر، عبداللہ کے شانے پر تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ اس نے اپنا سر ایک ہلکے جھٹکے کے ساتھ عبداللہ کے شانے سے ہٹایا۔ پھر مصنوعی غصہ طاری کرتے ہوئے بولی:

"تجھے بے تکی باتیں ہی آتی ہیں یا کوئی اور کام بھی آتا ہے؟"

"اور کام؟" عبداللہ سوچنے لگا۔ بولا: "ہاں اور بہت سے کام جانتا ہوں۔ تلوار چلانا۔ تیر پھینکنا۔ گھوڑے کی مالش کرنا۔ آقا کے پیر دبانا۔"

اس کا ناپختہ ذہن بس یہیں تک سوچ سکا۔ لال تری کی اڑان اس سے بہت آگے تھی۔ اس نے محسوس کر لیا کہ عبداللہ تو ابھی پر پھڑپھڑانا بھی نہیں جانتا۔ وہ اس کے ساتھ کیسے اڑ سکے گا!

لال تری نے کہا:

"میں نے پوچھا تھا تیرا آقا کبھی شہزادی کا ذکر نہیں کرتا۔"

"تو یہ بار بار کیوں پوچھ رہی ہے۔" عبداللہ الجھتے ہوئے بولا۔ "آقا کو کیا پڑی ہے کہ شہزادی کو پوچھتا پھرے وہ خود شہزادہ ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کبھی نہیں پوچھا شہزادی کو؟" لال تری نے مایوسی سے پوچھا۔

"تو کیوں افسوس کرتی ہے۔ میں جو تجھے پوچھتا ہوں۔" عبداللہ لال تری کا سر اپنے شانہ پر جھکاتے ہوئے بولا۔

"اماں نے ایک دن کہا تھا عبداللہ تجھے شہزادی کیسی لگتی ہے۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا۔ مجھے شہزادی سے کیا مطلب۔ مجھے تو۔" عبداللہ، لال تری کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

"تو تیرے آقا نے شہزادی کو پوچھا تھا؟" لال تری کو جیسے اطمینان ہو گیا۔

لال تری جانے لگی تو عبداللہ نے کہا:

"ذرا اور بیٹھ۔ باتیں کریں گے۔"

لال تری منہ بنا کر بولی: "تیرے تو ابھی دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے۔ تو کیا جانے مرد کس طرح باتیں کرتے ہیں۔"

اور لال تری، لپ جھپ کرتی۔ یہ جا۔ وہ جا۔ عبداللہ دیکھتا رہ گیا۔

لال تری کو دو ڈھائی گھنٹے لگ گئے تھے۔ شہزادی الجائی خاتون، بے چینی سے خیمہ میں ٹہل رہی تھی۔ اُسے خوف تھا کہ کوئی مہم پر "لال تری سے الجھ نہ پڑے۔ لال تری واپس آئی تو جیسے اس کی جان میں جان آئی۔

"اتنی دیر لگا دی۔" شہزادی نے شکایت کی مگر اپنائیت کے انداز میں۔

لال تری کھلی پڑ رہی تھی۔ اس نے ہنس کر کہا،

"کیا بتاؤں شہزادی بیگم۔ وہ تو بس چمٹ کے رہ گیا۔"

"کون تجھے چمٹ گیا؟" شہزادی بھی مسکرائی۔

"وہی عبداللہ۔" لال تری بیٹھتے ہوئے بولی۔ "بس زرا چھیڑ کر ہی ہے ابھی۔ گو ایران کی سنتا ہے توران کی۔ مگر ہے جیدار۔ گھنٹہ بھر اکیلے میں بیٹھا مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ اسے ذرا ڈر نہ لگا۔ بہادر قریب بیٹھے تھے لگے رہے اور وہ مجھ سے لگا بیٹھا رہا۔"

"تجھ سے لگا بیٹھا رہا؟" شہزادی کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "تجھے ذرا بھی شرم نہیں آئی؟"

شہزادی جی! جس نے کی شرم۔ اس کے پھوٹے کرم۔" لال تری نے کہہ دیا۔ پھر سوچ میں پڑ گئی۔ بولی: "جی میرے تو کرم پھوٹے ہی ہے۔"

اور پھر جو لال تری نے اپنی ملاقات کی باتیں شروع کیں تو چپ ہونے کا نام ہی نہ لیا۔ ایک ایک مکالمہ۔ اور ایک ایک لفظ یاد کر کے شہزادی کو سنایا۔ جو گزرا تھا وہ بھی اور جو نہ گزرا تھا وہ بھی نمک مرچ لگا کر مزے لے لے کر بیان کر ڈالا۔ شہزادی بے چاری چپ چاپ سنتی رہی مگر قسم لے لو جو لال تری نے ایک بار بھی تیمور کا نام لیا ہو یا اس کی طرف اشارہ تک کیا ہو۔

لال تری نے بولتے بولتے اٹھ کر پانی پیا۔ شاید وہ تھک گئی تھی۔

شہزادی نے غنیمت جانا۔ بولی: "کسی اور کی بھی بات کی تھی تیرے عبداللہ نے؟"

لال تری کو جیسے سب کچھ یاد آ گیا۔ اپنی بکواس پر اس نے کوئی اظہارِ ندامت نہ کیا۔ سینہ تان کر بولی:

"لو جی۔ بات کیوں نہ کرتا۔ شہزادے تیمور تو آپ کے لیے دن رات آہیں بھرتے ہیں۔ آپ کی تصویریں ہر دم، آنکھوں میں گھوم رہی ہیں۔ ایسی ایسی تعریفیں کرتے ہیں آپ کے حسن کی کہ کیا کوئی شاعر کرے گا۔ بس آپ ہی کا خیال انہیں گھیرے۔ ہتھا ہے مگر یہ ان کا خانہ زاد، عبداللہ بالکل نکھٹو ہے۔ ایک بار بھی میری تعریف نہیں کی کمبخت نے۔ گھنٹہ بھر کندھے سے کندھا ملائے بیٹھا رہا اور کوئی بات تک نہ کی۔"

شہزادی دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی۔ خوش ہونا ہی تھا اسے۔ تیمور تمام بہادروں سے نرالا، طرحدار اور شجاع تھا۔ اس کے جوہر وہ میدانِ جنگ میں دیکھ چکی تھی۔

○

افغانستان کی شمالی سرحد سے نکلنے والا دریا سے آمو، مدتوں قدیم ایران اور توران کے درمیان حدِ فاصل کا کام دیتا رہا۔ دریائے آمو، چونے کی چٹانوں میں بل کھاتا جب ہموار علاقوں میں پہنچ کر انگور کی بیلوں اور شہتوت کے درختوں سے لپٹی ہوئی وادی میں پہنچتا تو اس کی رفتار سست پڑ جاتی۔ اس میں سے چھوٹی چھوٹی نہریں نکالی گئی تھیں جو دھان، جَو اور ترکاریوں کے کھیتوں کو سیراب کرتیں۔ اس کے جنوب میں خراسان کا مشہور شہر آباد ہے جہاں فارسی بولنے والے عمامہ پوش کاشت کار ایشیائے قدیم کے شریف طبع، درویش صفت لوگ کہلاتے تھے۔

دریا پار شمال کی طرف توران تھا۔ یہیں سے گھوڑے اور مویشی پالنے والے خانہ بدوش ابھرے تھے۔ ان کے سروں پر خود نما ٹوپیاں ہوتی تھیں۔ ایران اور توران میں اس کے سوا اور کوئی حدِ فاصل نہ تھی۔ دریا کی سرزمین کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماوراء النہر یعنی دریا پار کا علاقہ کہتے ہیں۔

سمرقند جانے والوں کو یہاں سے ندیا عبور کرنا پڑتا۔ وہ ایک تنگ درّہ سے گزرتے، اس کا نام باب الحدید تھا۔ اس تنگ و تاریک راستہ سے دو سے زیادہ اونٹ ایک ساتھ گزر سکتے تھے۔ باب الحدید سے گذرنے کے بعد سرسبز و شاداب علاقہ آتا تھا جس کے گرد اگرد پہاڑ کھڑے تھے اور چاروں طرف خندقیں تھیں جو پانی سے بھری رہتی تھیں۔ اس مقام کا نام شہر سبز تھا۔ تیمور یہیں پیدا ہوا۔ تیمور کا مورثِ اعلیٰ قراچار نویان اور چنگیز خاں ایک دادا کی اولاد سے تھے۔

قراچار و چنگیز ابنِ عم اند
بکشور کشائی قسر بیں ہم اند

قراچار کا بیٹا ایجل خاں، عقل و دانش اور خدا شناسی میں مشہور تھا۔ ہلاکو خاں نے ایجل کو تبریز کا حاکم مقرر کیا تھا۔ یہ اس کی خدا شناسی تھی کہ اس کا لڑکا ایلنگر خاں، مشرف بہ اسلام ہو کر امیر الامراء کے عہدے پر سرفراز ہوا۔ ایلنگر خاں کا پوتا امیر طراغائی تھا۔ یہی تیمور کا باپ تھا۔

بعض تواریخ تاتار، تیمور کی ماں تگینہ خاتون کو چنگیزی نسل سے ظاہر کرتی ہیں۔ بہرحال یہ طے ہے کہ تیمور تاتاری النسل تھا۔

تیمور ۱۳۳۶ء میں شہر سبز (سبزوار) میں ایک ایسے مکان میں پیدا ہوا جو لکڑی اور کچی اینٹوں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس مکان کے چاروں طرف کھیت تھے اور قریب ہی مسجد تھی جس سے بلند ہونے والی آواز تیمور کے کانوں میں پانچوں وقت آتی رہتی تھی۔

اس علاقے کے بچے گھوڑوں اور تلواروں کے سائے میں جوان ہوتے تھے۔ بچوں کا محبوب کھیل جنگ تھا۔ انہوں نے مٹی کو جھکی ہوئی ایک چٹان کے نیچے ایک غار کو اپنا قلعہ بنایا تھا۔ نصف بچے لکڑی کی تلواریں لے کر قلعہ کی حفاظت کرتے اور نصف اس قلعہ پر حملہ کرتے۔ تیمور کبھی حملہ آور فوج میں شامل ہوتا تو کبھی قلعہ کی حفاظت کرنے والوں میں۔ مگر ہر دفعہ وہ سردار کا کردار ادا کرتا۔

جب تیمور ذرا جوان ہوا تو اسے سچ مچ کی تلوار دی گئی۔ شہسواری میں وہ پہلے ممتاز تھا۔ شمشیر زنی میں مہارت حاصل کی کہ اس کے ساتھی اس کا لوہا مان گئے۔ امیر طراغائی بیٹے کو شہسواری اور شمشیر زنی کرتے دیکھتا تو تیمور میں قائدانہ صلاحیتیں نظر آتیں۔ رات کو سونے سے پہلے وہ تیمور کو نماز، روزہ حج اور زکوٰۃ کی تلقین کرتا۔

اس نے تیمور کو اپنا مستقبل بنانے کی پوری آزادی دے دی تھی۔ گفتگو کے آخر میں طراغائی کہتا:

"مرد کے سامنے صرف ایک راستہ ہوتا ہے"

اور اس راستہ کی طرف تیمور آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔

تیمور کی ماں اس کے بچپن ہی میں مر گئی تھی۔ وہ اس کر بناک تنہائی کو اپنے گھوڑے، کتے اور باز سے دور کرتا تھا۔ وہ انہیں لے کر نکل جاتا اور سیر و شکار کرتا رہتا۔ کبھی تیمور اپنے بچپن کے قلعہ میں جا بیٹھتا اور سمرقند جانے والی سڑک پر گزرنے والے قافلوں کو دیکھتا رہتا۔

تیمور کا برلاس قبیلہ بھی نسلاً تاتاری تھا۔ برلاس قبیلے والے اونچے قد، چوڑے چکلے اور مضبوط ہاتھ پیر کے ہوتے تھے۔ ان کے چہروں پر داڑھیاں ہوتیں۔ وہ پیدل ہوں یا سواری پر، ان کی چال میں ایک خاص تمکنت ہوتی۔ چھت کے نیچے مرنا ان کے لیے توہین کے مترادف تھا۔

طراغائی باوجود مسلمان ہونے کے اب تک اپنا رشتہ چنگیز خاں سے جوڑنے پر فخر کرتا تھا۔ وہ بڑے افسوس سے منگولوں کا انجام بتاتے ہوئے کہتا:

"لیکن خان بزرگ چنگیز خان، تسخیرِ عالم سے پہلے ہی مر گئے۔ تقدیر میں یونہی لکھا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انہوں نے ساری دنیا (منگولیا، شمالی اور مغربی ایشیا کو دنیا سمجھتے تھے) اپنے چاروں بیٹوں میں تقسیم کر دی۔ انہوں نے منجھلے بیٹے چغتائی خاں کو اس خطہ کی سلطنت بخشی تھی جس میں ہم آباد ہیں لیکن چغتائی خوانین، وسط ایشیا اور سیر و شکار میں الجھ گئے۔ اور تباہ ہو کر شمالی پہاڑوں میں چلے گئے۔ وہاں خان تراہ خیانتیں کھانے اور سیر و شکار میں مصروف رہتا ہے اور سمرقند، تیرجلہ، ماوراء النہر کی حکومت امیر قزغن کے حوالے کر رکھی ہے۔"

تیمور کے باپ نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور قبیلہ برلاس کی سرداری تیمور کے چچا حاجی برلاس کے سپرد تھی۔ حاجی برلاس سخت مغرور، شکی اور آدم بیزار شخص تھا۔ وہ شہر سبز میں بہت کم آتا۔ تیمور کی طرف بھی اس نے کبھی توجہ نہ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قبیلہ کے تمام جنگجو اور بہادر امیر قزغن کے پاس چلے گئے۔

امیر قزغن بہادروں کا قدر دان تھا۔ وہ بہادروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے پاس بلاتا۔ تیمور کے باپ نے بھی امیر قزغن کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔ پس تیمور کو جیسے ہی امیر کا پیغام ملا وہ اپنے گھر اور مویشیوں کا انتظام کر کے امیر قزغن کے دربار میں پہنچ گیا۔

امیر قزغن کی پوتی الجائی خاتون کی وہ رات بڑی اضطرابی تھی۔ اسے کسی پہلو چین نہ آتا۔ ہر کروٹ اسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تیمور ایک نئے انداز سے مسکراتا نظر آتا۔ کبھی اسے گھورتا۔ کبھی ہنستا۔ کبھی اسے محسوس ہوتا جیسے تیمور دونوں ہاتھ کھولے اس کی طرف بڑھ رہا ہے وہ بھی اپنے خیالوں میں اس کی طرف بڑھتی۔ پھر یک لخت خیال کا رشتہ ٹوٹ جاتا اور وہ دل مسوس کر رہ جاتی۔

آدھی رات سے زیادہ گزر گئی لیکن نیند اس کے قریب نہ پھٹکی۔ الجھن زیادہ بڑھی تو الجھ کر اٹھ بیٹھ گئی۔ نرم و گداز مسند اور قالین کا فرش ہی ان خیموں کا بستر تھا۔ لال تری ذرا ہٹ کر اس کے پائنتی فرش پر اوندھی لیٹی تھی۔ شاید وہ بھی جاگ رہی تھی۔ شہزادی کو بیٹھے دیکھا تو خود بھی اٹھ بیٹھی۔

"شہزادی کو نیند نہیں آ رہی ہے کیا؟" لال تری نے بیٹھے بیٹھے انگڑائی لی۔

"تو بھی تو جاگ رہی ہے" شہزادی نے انگڑائی کا جواب انگڑائی سے دیا۔

"میں ــــ میں کب جاگ رہی ہوں" لال تری نے سفید جھوٹ کا سہارا لیا اور شہزادی کے قریب آ گئی۔

شہزادی نے اس کا منہ اوپر اٹھایا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولی: "ان میں نیند نام کی تو کوئی چیز نظر نہیں آتی۔"

لال تری جھینپ گئی۔ بولی: "کیا کروں شہزادی بیگم۔ میری نیند تو جیسے اس کے پاس رہ گئی۔"

"کس کے پاس؟" شہزادی نے اسے چھیڑا۔

"آپ کے شہزادے تیمور کے خانہ زاد عبداللہ کے پاس" لال تری نے پٹ سے جواب دیا۔

شہزادی پوکھلا گئی۔ بولی:

"میرا شہزادہ کیوں ہونے لگا۔ میں اسے کیا جانوں؟"

"پھر کوئی اور ہوگا جس کے لیے آپ اب تک جاگ رہی ہیں" لال تری، حاضر جوابی میں اپنا جواب رکھتی تھی۔ شہزادی زچ ہو گئی۔ ہار مان گئی۔ اسے جواب نہ بن پڑا۔

لال تری نے کہا: "یہ مرد بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ بالکل بھوت۔ جن کو چمٹ جائیں پھر ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔"

شہزادی پھر بھی نہ بولی۔

"شہزادے سے ملاقات کی ایک ترکیب میری سمجھ میں آئی ہے" لال تری نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

"کیا ترکیب ہے؟" شہزادی ایک دم بول پڑی۔

لال تری نے ہنس کر کہا:

"آخر آپ کو بولنا ہی پڑا۔ لیکن آپ تو شہزادے کو جانتی ہی نہیں۔ پھر ترکیب سن کے کیا کریں گی؟"

"نہیں بتاتی ہو تو نہ بتاؤ۔ میں اب نہیں پوچھوں گی۔" شہزادی الجھ کر روٹھ گئی۔ اس نے لال تری کی طرف اپنے پھیلے ہوئے قدم کھینچ لیے۔

لال تری نے بڑھ کے پیر پکڑ لیے۔ بولی:

"اسے میں صدقے جاؤں شہزادی کے۔ آپ روٹھ جائیں گی تو میں زندہ کس کے سہارے رہوں گی۔"

شہزادی کو ہنسی آ گئی۔

"ترکیب بتاؤں؟" لال تری نے پیر دباتے ہوئے کہا۔

"تیری مرضی ہے۔ چاہے بتا چاہے نہ بتا" شہزادی نے لاپروائی اور بے تعلقی ظاہر کرنے کی بہت کوشش کی لیکن کان لال تری کی آواز پر لگا دیے۔

"شہزادے سے ملنے کی ترکیب یہ ہے۔" لال تری کہتے کہتے رکی اور شوخی سے شہزادی کو دیکھا۔ شہزادی ہمہ تن گوش بنی، لال تری کو دیکھ رہی تھی۔

لال تری نے بات دہرائی:

"شہزادے سے ملنے کی ترکیب یہ ہے کہ آپ اس سے شادی کر لیجیے۔"

شہزادی اپنی جگہ پر اچھل پڑی۔ لال تری ہنس رہی تھی۔ لال تری نے واقعی بات ہنسی میں کہی تھی لیکن وہ شہزادی کے دل کو لگ گئی۔

شہزادی سنجیدگی سے بولی: "لال تری۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟"

لال تری اب تک ہنس رہی تھی۔ شہزادی کے سوال پر اس کی ہنسی رک گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ آج ہنسی ہی میں اس کے منہ سے ایک اہم بات نکل گئی ہے۔

لال تری نے پوچھا:

"شہزادی صاحبہ! کیا آپ واقعی شہزادے سے شادی کرنا چاہتی ہیں؟"

"یہی بات میں تجھ سے بہ اللہ کے لیے پوچھوں تو!" اس بار شہزادی نے لال تری کو لاجواب کر دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لال تری جواب دینے کے بجائے دانت نکال کے ہنسنے لگی۔

شہزادی بولی: "کل جمعہ ہے نا؟"

"جی ہاں" لال تری نے جواب دیا۔ "لیکن آپ نے کیوں پوچھا؟"

"کل میں میدان میں جاؤں گی۔" شہزادی نے اعلان کیا۔

لال تری بغیر کچھ سمجھے بولی: "کیا شہزادے سے شمشیر زنی کا ارادہ ہے؟"

شہزادی نے کہا: "تو اس بات کو چھوڑ۔ بس کسی طرح عبداللہ کے ذریعے یہ بات شہزادے تک پہنچا دے۔"

لال تری کی سمجھ میں خاک بھی نہ آیا۔ صرف سر ہلا کر رہ گئی۔

جمعہ کے جمعہ، نماز کے بعد "بہادر" گروہ در گروہ میدان میں جاتے اور جنگ و جدل کی مشق کیا کرتے۔ امیر قزغن بھی تھوڑی دیر کے لیے آتا اور اپنے بہادروں کی بہادری دیکھ دیکھ کے خوش ہوتا۔ تیمور کو بہادروں کا رسم معلوم ہوئی تو وہ بھی جمعہ کو ہتھیار سجا کر میدان میں جانے لگا لیکن اس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ شاید تیمور کو اس قابل ہی نہ سمجھتے تھے۔

بہادر گھڑ سواری اور شمشیر زنی کے کرتب دکھاتے اور چلے جاتے۔ تیمور اُن کا منہ تکتا رہ جاتا۔ وہ بہت کڑھتا۔ کبھی اس کا دل چاہتا کہ کسی بہادر کو مقابلہ کی دعوت دے اور اسے بتائے کہ شمشیر زنی اور گھڑ سواری کیا ہوتی ہے۔ لیکن اپنی نظروں میں اس کا بھی ایک مقام تھا ایک وقار تھا۔ بہادر اس کی طرف سے لاپروا تھے وہ ان کی طرف سے لاپروا ہو گیا۔ کتنے ہی جمعے اس طرح گزر چکے تھے۔

لال تری اور عبداللہ سے ہنستا ہوا شہزادی کا پیغام تیمور تک پہنچا تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے عبداللہ سے کہا:

"دعا کر عبداللہ۔ آج کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔"

عبداللہ نے فوراً جواب دیا: "میری تو دعا ہے کہ پانچ بہادروں کے سر آپ کے قدموں میں ہوں۔"

"انشاء اللہ" تیمور کی زبان سے نکلا۔ "بہادروں کے سروں کے بجائے میں ان کی بہادری اپنے گھوڑے کے قدموں کے نیچے مسلنا چاہتا ہوں۔"

جمعہ کی اذان ہوئی۔ یہاں مسجد نہ تھی۔ امیر قزغن کا پڑاؤ جنگل میں تھا۔ میدان میں ایک طرف چادریں

کھالیں بچھا دی گئیں۔ تاتاری باوجود وحشی، خونخوار اور خود سر ہونے کے نماز کے سختی سے پابند تھے جب تک ان کے سر سجدے میں رہتے ان کے دل گداز رہتے۔ موم کی طرح نرم۔ گم سلام پھیرتے ہی وہ گدازی اور نرمی سے منہ موڑ لیتے تھے۔ وہ ڈرتے تو صرف خدا سے ڈرتے۔ موت انہیں نہ ڈرا پاتی۔ وہ خود ڈر کر ان سے دور رہتی۔

نماز کے بعد "بہادروں" کے گروہ میدان میں آنے شروع ہو گئے۔ ایک سے ایک گرانڈیل، دیو قامت، چلتا پھرتا پہاڑ یا مست ہاتھی۔ ان کے گھوڑے منہ زور، رانوں سے نکلے جاتے۔

خلافِ امید آج امیر قزغن بھی میدان میں آ گیا۔ دراصل شہزادی نے اس سے میدان میں مشق کرنے کی اجازت مانگی تھی۔ عورتوں پر کوئی پابندی نہ تھی۔ امیر قزغن نے اجازت دے دی اور خود بھی تماشہ دیکھنے چلا آیا۔

تھوڑی دیر بعد شہزادی بھی مع اپنی سہیلیوں اور لال تری کے آ گئی۔ بہادروں نے اپنے گھوڑے کنارے کر لیے۔ انہیں معلوم ہو گیا کہ آج شہزادی بھی اپنے کرتب دکھائے گی۔ انہوں نے شہزادی کو پہلے موقع دیا۔

سب سے آخر میں تیمور میدان میں پہنچا۔ وہ اپنے گھوڑے کو کبھی ڈکی کبھی پُویا چال چلاتا بڑی شان سے میدان میں داخل ہوا۔ زین کے بائیں تلوار، دائیں ترکش، کاندھے پر کمان، بازو پر بندھی ہوئی ڈھال، سر پر آہنی بھالردار خود۔ اس وقت اس کے بائیں ہاتھ کی دوسری انگلی میں وہ انگوٹھی موجود تھی جو اسے مولانا زین الدین نے دی تھی۔ اس انگوٹھی کا نگینہ فیروزے کا تھا۔ مولانا زین الدین شہر سبز کے ایک مردم شناس، دانش مند اور رہنما قسم کے بزرگ مشائخ میں سے تھے۔ مولانا نے ایک دن تیمور کو صحن مسجد میں سب سے آخری صف میں نمازیوں کے جوتوں کے پاس بیٹھے دیکھا۔ تیمور بڑی توجہ سے خطبہ سن رہا تھا۔ مولانا کی جوہر شناس نظریں تیمور کے دل میں اتر گئیں۔ انہوں نے اپنے پاس بلا کر تیمور کو اپنی چادر، کلاہ اور فیروزہ کی انگوٹھی دی۔ یہ تیمور اس انگوٹھی کو خاص موقعوں پر پہنا کرتا تھا۔

امیر قزغن کے دونوں طرف بہادر پرے باندھے کھڑے تھے۔ امیر قزغن اگرچہ سن رسیدہ تھا مگر اس کے چہرے سے جلال ٹپکتا تھا۔ یہ اسی کا حوصلہ تھا کہ اس نے تاتاریوں کے مختلف قبائل کو یکجا کر کے شمال کے ترکستان کا مقابلہ کیا تھا اور اب تک ان خونخوار سرداروں کو اپنے قابو میں کیے ہوئے تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سب سے پہلے شہزادی الجائی خاتون نے اپنی گھڑسواری اور شمشیر زنی کا مظاہرہ کیا۔ وہ اپنی پانچوں سہیلیوں کے ساتھ بیچ میدان میں آئی۔ گھوڑے سے اتری اور گھوڑا سہیلی کے حوالے کر دیا۔ سہیلی شہزادی کا گھوڑا لے کے دور چلی گئی اور پھر اسے چابک مار کر شہزادی کی طرف دوڑا دیا۔ گھوڑا بھاگتا ہوا شہزادی کے پاس آیا تو شہزادی جست لگا کر اس پر سوار ہو گئی اور گھوڑے کی بندھی رسیں کھول کر اس پر قابو پا لیا۔

امیر قزغن اپنی پوتی کے اس کرتب پہ مسکرایا۔ بہادروں کے چہروں پر بھی ایک مسکراہٹ پھیل کر فوراً ختم ہو گئی۔ تیمور بہادروں کی سب سے آخری قطار میں کھڑا ہوا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔

اب شہزادی نے اپنی شمشیر زنی کا مظاہرہ کیا۔ پہلے اس نے ایک سہیلی کو دعوتِ مبارزت دی۔ پھر دوسری کو اس کی مدد کے لیے بلایا۔ اس طرح باری باری پانچوں سہیلیاں اس کے مقابلہ پر آ گئیں۔ شہزادی ان سب کا بڑی ہوشیاری سے مقابلہ کرتی رہی۔ کبھی مدافعت کرتی۔ کبھی بڑھ کے خود حملہ کرتی۔

شہزادی کا مظاہرہ ختم ہو گیا۔ اب بہادروں کی باری تھی۔

بہادروں میں سے ایک اپنا گھوڑا میدان میں لے گیا اور تلوار نکال کر بلند کی۔ یہ ایک قسم کا چیلنج تھا۔ اس وقت امیر قزغن موجود تھا اس لیے امیر نے ایک دوسرے بہادر کو اشارہ کیا۔ وہ گھوڑا بڑھا کر پہلے کے مقابل پہنچ گیا۔ دونوں میں تلواریں چلنا شروع ہوئیں۔ ایک ساتھ بیٹھنے والے دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ وہ ایک دوسرے پر بڑھ بڑھ کر حملہ کرتے۔ اس لڑائی میں انہیں زخم بھی آئے لیکن امیر قزغن نے تماشہ پر چوٹ لگوا کر مقابلہ ختم کرا دیا۔

مقابلے کے وقت ایک تماشہ امیر قزغن یا اس کی عدم موجودگی میں سن رسیدہ بہادر کے قریب رکھ دیا جاتا۔ جب وہ دیکھتا کہ دو میں سے ایک مارا جائے گا تو وہ تماشہ بجانے والے کو اشارہ کرتا۔ تماشہ بجایا جاتا۔ اور مقابلہ برابری پر ختم ہو جاتا۔

اس طرح کے دو تین اور مقابلے ہوئے۔ جب مقابلہ خطرناک صورت اختیار کر لیتا تو تماشہ بجا کر مقابلہ ختم کر دیا جاتا۔ پھر ایک گرانڈیل بہادر گھوڑا بڑھا کر میدان میں آیا۔ امیر قزغن نے دونوں طرف نظریں دوڑائیں۔ بعض بہادر اس کے مقابلے سے جان چرانے لگے اور انہوں نے امیر قزغن سے آنکھیں ملانے کے بعد گردنیں نیچی کر لیں۔

امیر قزغن کی نظریں سب کا جائزہ لیتے ہوئے تیمور تک پہنچیں۔ تیمور نے امیر قزغن کی طرف مسکرا کر دیکھ

لیا تھا۔ امیر کی نظریں جیسے ہی تیمور پر ٹھہریں، تیمور نے گھوڑے کو ایڑ دی اور ہوا کی طرح اڑتا ہوا اپنے مدمقابل کے پاس پہنچ گیا۔

بہادروں میں کھلبلی مچ گئی۔

گردن جھکانے والوں نے تیمور کو حیرت سے دیکھا۔ دوسرے بہادروں نے تیمور کو حقارت سے دیکھا۔

شہزادی الجائی خاتون کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کی سہیلیاں آسمان کی طرف دیکھ کر دعائیں مانگنے لگیں۔ مال تری اور عبداللہ جو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر دور ایک پیڑ کے نیچے کھڑے بیادگی باتیں کر رہے تھے۔ ان کے چہروں کا رنگ اڑ گیا۔ اس پورے مجمعے میں صرف امیر قزغن ہی تھا جس کا چہرہ تاثرات سے خالی تھا۔ وہ بڑے غور سے میدان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

گرانڈیل بہادر پوری طرح آہن پوش تھا۔ سر پر آہنی خود گردن کے گرد دوہری زنجیروں کا گلوبند۔ سینہ بند پوشش۔ غرضیکہ وہ تمام مروجہ اسلحہ سے پوری طرح لیس تھا۔ اس نے ایک سترہ سال کے لڑکے کو اپنے مقابل دیکھا تو زور کا قہقہہ بلند کیا اور اپنی بھاری، لانبی تلوار سے تیمور پر ایک بھرپور وار کیا۔ تیمور کے شانے پر ڈھال لٹکی ہوئی تھی۔ تیمور چاہتا تو اس وار کو اپنی ڈھال پر روک سکتا تھا لیکن اسے آج اپنی شمشیر کو شمشیر تیمور ثابت کرنا تھا۔ اس نے تلوار کا وار تلوار پر روکا اور پھر کلائی کو پھرکی کی طرح گھمایا۔ لوگوں نے دیکھا کہ گرانڈیل کی تلوار اس کے مضبوط پنجے سے چھوٹ کر ہوا میں رقص کرتی ہوئی دور جا گری۔

پورے ماحول پر سناٹا طاری ہو گیا۔ لوگ سکتے میں آ گئے۔ ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ طاقت اور شمشیر زنی کا فیصلہ ایک لمحہ میں ہو گیا۔ خود تیمور کا مقابلہ کرنے والا بہادر اپنی جگہ بت بن کر رہ گیا۔ بہادر بڑی دیر پھٹی پھٹی نظروں سے تیمور کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے تیمور سے کچھ کہا۔ تیمور نے اپنی تلوار نیام میں ڈال لی۔ اور دایاں ہاتھ بہادر کی طرف بڑھا دیا۔ گرانڈیل بہادر نے بڑی عقیدت سے سر جھکا کر تیمور کے ہاتھ کو چوم لیا۔

لوگوں کو جیسے ہوش آ گیا۔ انہوں نے نعرہ ہائے تحسین بلند کرنا شروع کر دیے۔ شہزادی الجائی خاتون کا چہرہ غنچہ کی طرح ایک دم کھل گیا لیکن اس کی یہ خوشی پھر گہنا گئی۔ ایک اور بہادر گھوڑا اڑاتا ہوا تیمور کے مقابل پہنچ گیا۔ تیمور کا ہاتھ نیام تک پہنچا ہی تھا کہ بہادر نے تیزی سے حملہ کر دیا۔ تیمور کے ہاتھ میں بجلیاں بھر گئیں۔ اس نے تیزی سے تلوار کھینچی۔ پھر تلواریں اتنے زور سے ٹکرائیں کہ ان میں سے چنگاریاں نکل پڑیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تیمور مقابلے کے لیے پوری طرح تیار نہ ہو سکا تھا اس لیے اسے مدافعت کرنا پڑی لیکن ذرا ہی دیر
تلوار لگ کر کے بہادر پر حملہ کر دیا۔ بہادر نے بھی یہ وار تلوار پر ہی روکا مگر لوگوں کی نظروں میں ایک بار پھر
منظر گھوم گیا۔ بہادر کی تلوار ہوا میں اڑتی ہوئی بہت دور جا گری۔

تیمور نے پانچ بہادروں کی تلواریں اسی طرح اڑا کر اپنی شمشیر زنی کو تسلیم کرایا۔ اب کوئی بہادر خود
اس کے مقابلے پر جانے کو تیار نہ تھا۔

امیر قزغن دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ اس نے تیمور کے مستقبل کے لیے کئی فیصلے کر ڈالے
اس کے اظہار کا وقت نہ آیا تھا۔

امیر قزغن نے دیکھا کہ ہر بہادر تیمور کے سامنے جانے سے کترا رہا ہے تو اس نے ایک بہت خود
سرکش بہادر کو مقابلے کا اشارہ کیا۔ اس نے اپنا گھوڑا میدان کی طرف بڑھایا مگر بڑی بے دلی سے۔ اس کی قسمت
کہ بے عزتی سے بچ گیا۔ اس کی عزت ایک بے زبان جانور بچا گیا۔

بہادر بہت دل سے تیمور کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اس وقت جنگل سے ایک ہرن نکل کر میدان میں بھاگنے
امیر قزغن کے پڑاؤ کی وجہ سے اس جنگل کے تمام جانور اور چرند پرند یا تو بھاگ نکلے تھے یا بہادروں کے تیر
نشانہ بن گئے تھے۔ اس وقت اس ہرن کا اس طرح میدان میں آنا امیر قزغن کو بدشگونی محسوس ہوا۔ تاتاری ہر چیز
مسلمان ہو گئے تھے لیکن آباؤ اجداد کی بعض گمراہیاں ان میں ابھی تک موجود تھیں۔ امیر قزغن نے ہرن کو دیکھ
ہی تیمور کو آواز دی:

"جانے نہ پائے یہ کم بخت!"

اس آواز کے ساتھ تیمور نے اپنا گھوڑا ہرن کے پیچھے ڈال دیا۔ ترکش سے تیر جوڑا مگر ہرن تیر
بچاتا اس کی زد سے دور نکل گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہرن اور تیمور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اس وقت بہادر
صف میں سے دس بارہ بہادر اور نکلے اور وہ بھی تیمور کے پیچھے چل پڑے۔ یہ وہ بہادر تھے جنہوں نے تیمور
بہادری دیکھ کر اس کی عظمت کو تسلیم کر لیا تھا۔ اب وہ اس کے غلام تھے اور اسے آقا سمجھ کر اس کی مدد کو
ہوئے تھے۔

ہرن جھکائیاں دیتا اور تیمور گھوڑا اڑاتا چلا جا رہا تھا۔ تیمور نے کئی بار نشانہ لینا چاہا مگر ہرن زد
آیا۔ میدان ختم ہونے پر چٹانی خطہ آ گیا۔ مگر تیمور نے ہرن کا پیچھا نہ چھوڑا اور آخر اسے جا لیا۔ تیمور نے

ہرن زخمی ہوا اور اس کی رفتار سست پڑ گئی۔ تیمور نے گھوڑا اور تیز کر دیا۔ زمین ہموار نہ تھی۔ اونچی نیچی چٹانوں
پر دونوں آگے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ تیمور ہرن کے بالکل سر پر پہنچ گیا۔ ہرن ایک اونچی جگہ جا کر ٹھہرا۔ پھر
ایک دم دائیں جانب گھوم گیا۔

تیمور اس کے بالکل قریب تھا۔ اس نے تیز رفتار گھوڑے کو روکنا چاہا مگر گھوڑا اس جگہ پہنچ چکا تھا جہاں
سے ہرن گھوما تھا۔ اس اونچائی کے دوسری طرف ایک چوڑا نالہ تھا جو تیمور کو نظر نہ آیا تھا اور اب اس کا گھوڑا نالہ
کے منہ پر تھا۔ اتنا وقت نہ تھا کہ تیمور راسیں کھینچ کر خود کو نالے میں گرنے سے بچا سکے یا اسے دائیں بائیں
گھما سکے۔ تیمور کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ گھوڑے کو نالہ پار کرنے پر مجبور کرے۔ اس نے
تیزی سے گھوڑے کو ہموار کیا۔ وفادار جانور ہوا میں اچھلا اور پوری طاقت سے نالہ پار کرنے کے لیے جست لگائی
لیکن پہاڑی نالہ اس کی جست سے زیادہ چوڑا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گھوڑے کی اگلی ٹانگیں تو دوسرے کنارے پر پہنچ
گئیں لیکن پچھلی ٹانگیں نالے میں جھول گئیں۔

قدرت نے اس وقت تیمور میں طاقت بھر دی۔ اس نے فوراً اپنے دونوں پیر رکابوں سے آزاد کیے اور
گھوڑے سے جست لگا کر دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ تیمور تو بچ گیا مگر اس کا وفادار جانور اس پر قربان ہو گیا۔ گھوڑا
تیس فٹ نیچے نالے میں گر کر مر گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب تیمور کے ہمدرد اور مطیع بہادر اسے تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچے تو انہوں نے دیکھا
کہ تیمور بڑے اطمینان سے دوسرے کنارے پر ٹہل رہا ہے اور اس کا گھوڑا نیچے گہرے نالے میں مرا پڑا ہے۔ وہ بہت
حیران تھے کہ تیمور نے اتنا چوڑا نالہ کیسے پار کیا اور اگر تیمور گھوڑے کی پیٹھ پر تھا تو اس کا بچ جانا معجزہ یا معجزے سے
کم نہ تھا۔ بہادر نالہ کے ساتھ ساتھ دور دور تک چلے گئے۔ ایک جگہ نالے کو پایاب دیکھ کر اسے پار کر کے تیمور
کے پاس پہنچے۔ تیمور نے جب انہیں اس حیرت انگیز حادثہ کی تفصیل بتائی تو وہ فرط محبت سے تیمور سے لپٹ
گئے اور اسے کندھوں پر اٹھا لیا۔

پھر جب میدان میں واپس آ کر بہادروں نے یہ باتیں امیر قزغن کو بتائیں تو اس نے بڑے تجربے کی بات
بتائی۔ اس نے کہا:

"ہر بہادر کے لیے ضروری ہے کہ وہ شمشیر زن اور تیر انداز ہو لیکن ایک قائد کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ
اس میں بجلی کی سی پھرتی اور وقت فیصلہ کی تیزی ہو۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس وقت ہر ایک کی زبان پہ تیمور کا نام تھا۔ شہزادی، لال تری اور عبداللہ تو تیمور کے گرد بھنورے کی طرح منڈلا رہے تھے۔ تیمور، امیر قزغن کے پاس کھڑا تھا اور تمام بہادر اسے گھیرے ہوئے تھے۔ وہ بہادر جو تیمور کی اہلیت کے قائل ہو گئے تھے وہ اسے بڑی محبت اور خلوص سے دیکھ رہے تھے مگر کچھ ایسے بھی تھے جو اسے دیکھ تو رہے تھے لیکن ان کی نظریں حسد اور جلن میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

اس رات امیر قزغن نے خیمہ گاہ کے سامنے تمام بہادروں کی ضیافت کی۔ یہ دعوت دراصل تیمور کے اعزاز میں دی گئی تھی۔ رات گئے جب ضیافت ختم ہوئی تو امیر قزغن نے کھنکتی آواز میں اعلان کیا:

"آج سے پورے پندرہ دن بعد یعنی اگلے جمعے سے اگلے جمعے کو برلاس قبیلے کے سردار طراغائی کے بیٹے تیمور کی شادی ہماری پوتی الجائی خاتون کے ساتھ ہو گی۔"

یہ اعلان بالکل غیر متوقع تھا۔ خود تیمور کو بڑی دیر بعد اپنے کانوں پر یقین آیا۔ ہر بہادر یہ اعلان سن کر حیران رہ گیا لیکن بہادروں کی اکثریت نے اس رشتہ کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ کچھ بہادروں کو یہ رشتہ پسند نہ آیا۔ شاید وہ خود اس کی آس لگائے بیٹھے تھے۔

امیر قزغن نے تاتاری قبائل کی متحدہ قوت کی مدد سے شمال کے "تراخان" کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ قبائلی سرداروں کو یہ زعم تھا کہ قزغن کو ان کی وجہ سے سمرقند کی امارت ملی ہے۔ اس لیے ان میں سے ہر ایک قزغن کے بعد امیرِ سمرقند بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اب تیمور ان کی راہ میں حائل ہو رہا تھا اور ان کے خواب کے تار بکھر گئے تھے۔ امیر قزغن نے قوتِ بازو سے ان سرداروں کو اپنے قابو میں رکھا تھا لیکن اب وہ بوڑھا ہو رہا تھا۔ اسے ایک مضبوط سہارے کی ضرورت تھی۔ یہ سہارا جب تیمور بن کر اس کے سامنے آیا تو امیر قزغن اسے فوراً سینے سے لگانے پر آمادہ ہو گیا۔

○

الجائی خاتون بڑی دیدہ زیب اور جاذب نظر لڑکی تھی۔ اس کا حسن کھلتے شباب کا زمانہ تھا۔ چھریرا بدن، درمیانہ قد، موٹی موٹی غلافی آنکھیں اور عمر برس پندرہ یا کہ سولہ کے سن کے مصداق۔ وہ چلتی تو تتلی جگاتی۔ گلاب کی رسیدہ شاخ کی طرح۔ ہنستی تو پھول برستے۔ ستارہ شناس اس کے درخشندہ مستقبل کی پہلے ہی پیشین گوئی کر چکے تھے۔

آج وہ اس ہستی کی دلہن بننے جا رہی تھی جو تاریخ میں فاتحِ اعظم اور لرزہ جہاں کے نام سے مشہور ہوا۔ سکندر کی فتوحات اس کے سامنے ہیچ ہیں۔

تیمور نے اپنے باپ طراغائی کو شہر سبز سے بلوایا۔ انہیں یہ پیغام بھیجا کہ مولانا زین الدین کو اپنے ساتھ ضرور لائیں۔

میدان میں بچھے ہوئے قالین مہمانوں کے لیے کم پڑ گئے۔ دوسرا فرش بچھایا گیا۔ امیرِ سمرقند کی دعوت سے کون انکار کر سکتا تھا۔

شہزادی الجائی خاتون کو اس کے خیمہ میں دلہن بنایا جا رہا تھا۔ مشاطائیں اسے سنوار رہی تھیں۔ سہیلیاں اور کنیزیں پروانہ وار صدقے ہوئی جاتی تھیں۔ الجائی کو پہلے عرقِ گلاب سے غسل دیا گیا۔ اس کے لانبے بالوں میں پہلے روغنِ کنجد لگایا گیا۔ پھر ان بالوں کو گرم گرم دودھ سے مل مل کر دھویا گیا۔ بال ریشم کی طرح نرم ہو گئے۔ اس کے مرمریں بدن اور دراز بالوں کو نرم کپڑے سے پونچھ کر خشک کیا گیا۔ بالوں میں کنگھی کر کے مانگ نکالی گئی لیکن انہیں نہ تو گوندھا گیا اور نہ میڈھیاں بنائی گئیں۔ جب شہزادی کو زرد وزی کا سرخ عروسی جوڑا پہنایا گیا تو لال تری نے سب سے پہلے دوڑ کر شہزادی کو سینے سے چمٹا لیا۔

شہزادی کا سینہ اس وقت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ لال تری آہستہ سے شہزادی کے کان میں بولی:

"یہ دھڑکنیں جب دھڑکنوں سے ملیں گی تو طوفان رک جائے گا۔"

بھڑکیلے چمکدار عروسی جوڑے پر شہزادی کو ایک گنگا جمنی کام کا لانبا سا جبہ پہنایا گیا۔ شہزادی کے شانوں پر بکھرے ہوئے ریشمی بال، اس کے درمیان دمکتا چمکتا مکھڑا جیسے کالی کالی بدلیوں سے چاند آنکھ مچولی کھیل رہا ہو۔ شہزادی کے کانوں میں آویزے ڈالے گئے اور گلے میں زمرد کا گلوبند، سر پہ طلائی ٹوپی پہنائی گئی جس میں ریشمی پھندنا دائرہ لٹک رہا تھا۔

نکاح شرعی انداز میں محفل میں پڑھایا گیا۔ مولانا زین الدین قاضی کے فرائض ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے دلہا دلہن کے نام آواز بلند پکارے۔ دلہا نے ایجاب و قبول کے فقرے دہرائے۔ نکاح نامہ پر معتبر گواہوں کے دستخط ہوئے۔ نکاح کا خطبہ پڑھنے سے پہلے دلہن کو محفل میں بلوایا گیا۔ لڑکی کی رضامندی معلوم کرنے کا تاتاریوں میں یہی دستور تھا۔ اگر لڑکی محفل میں آ جائے تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ لڑکی عقد پر رضامند ہے۔

دلہن الجائی خاتون سجی دھجی، لجاتی ہوئی، سہیلیوں اور کنیزوں کے جھرمٹ میں محفل میں داخل ہوئی۔ سب کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔

دلہن، محفل میں زیادہ دیر نہ بیٹھی اور خطبۂ نکاح ختم ہوتے ہی پھر اپنے خیمے کے اندر واپس چلی گئی۔

ذرا دیر بعد وہ پھر قینچی اٹھاتی اور جادو جگاتی محفل میں لائی گئی۔ اب اس پر دوسری ہی بہار تھی۔ اس کے مرمریں بدن پر مردی جوڑے کے بجائے صرف شب خوابی کی عبا اور اوپر جبہ تھا۔ چہرے پر آٹے کے بجائے پوڈرا وغازہ لگایا گیا تھا جس سے اس کا حسن اور نکھر آیا تھا۔ اس کی دونوں بھوؤں کے درمیان کسی درخت کے پتے کے عرق سے ایک سیاہی مائل نیلا خط کھینچا گیا تھا۔ اس خط نے اس کی پیشانی کی تابندگی میں چاند لگا دیے تھے۔

دلہن شہزادی جب شراتی، لجاتی اور گھبراتی مہمانوں کے درمیان سے گزری تو امیر قزغن نے مٹھی بھر کے دلہن پر سے موتی نچھاور کیے اور حکم دیا کہ نقاروں پر ضرب لگائی جائے۔ تاتاری، جشن اور جنگ دونوں موقعوں پر نقارے ضرور بجواتے تھے۔

مولانا زین الدین نے بلند آواز سے کہا:

"دلہا اور دلہن پر خدائے تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوں۔"

حاضرینِ محفل نے آمین کہہ کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ دلہن پھر زنانے خیمے میں چلی گئی۔ امیر قزغن اپنے سرداروں اور مہمانوں میں انعام واکرام کی بارش کرتی تلواریں، خنجر، خلعتیں، دیبا و زربفت کے اور بہت سی نفیس نفیس چیزیں۔

تمام مہمان خوش تھے مگر امیر قزغن کو ایک بات کا ملال تھا۔ اس کے دوسرے سردار اس محفل میں شریک ہوئے۔ ایک تو تیمور کا چچا جاہی برلاس۔ دوسرا الجائی کے قبیلہ کا سردار بایزید جلائر۔

جشن کا بازار گرم ہوا۔ مہمان ٹولیاں بنا کر ادھر ادھر جا بیٹھے۔ کچھ قالینوں پر۔ کچھ ہری ہری گھاس فرشِ زمردی پر۔ داستان گوؤں نے چھتارے کی دھیمی دھن پر تاتاریوں کی رزمیہ داستانیں چھیڑ دیں۔ کی جھن جھن اور تن تن میں جب داستان گوؤں کی پاٹ دار آوازیں بلند ہوئیں تو سماں بندھ گیا۔ یہ داستا الفاظ و آواز کے اتار چڑھاؤ میں ہاتھوں اور آنکھوں کے اشارے شامل کر کے داستان میں حقیقت کا بھرتے اور سامعین جھوم جھوم اٹھتے۔

اسی دوران شام ہو گئی۔ غلام مشعلیں اور قندیلیں لے کر آ گئے۔ پھر کیا تھا، درختوں کے نیچے سے دریا کے کنارے تک کہکشاں سی کھنچ گئی۔ پھر سینیوں میں لگا ہر ایک کے سامنے ماحضر پیش کیا گیا۔ گھوڑوں کے پٹھوں کے کباب، گرم گرم بھاپ اٹھتی ہوئی اور بھیڑوں کے سالم بھنے ہوئے بچے، جنہیں دیکھ کر اشتہا بڑھتی ہے۔ روٹیاں موٹی موٹی جَو کے آٹے کی۔ ان روٹیوں پر شہد چپڑا ہوا تھا۔ مہمانوں نے دل بھر کر کھایا اور کھانے کی تعریف کی۔

دلہن شہزادی آخری بار محفل میں آئی۔

اس وقت تیمور محفل میں موجود نہ تھا۔ اسے اس کے خیمہ میں بھیج دیا گیا تھا تاکہ وہ دلہن کے آخری پھیرے میں اسے رخصت کرانے آئے۔

دلہن خراماں خراماں مہمانوں کے درمیان سے گزر کر فرشِ محفل کے آخری سرے پر پہنچ گئی۔

اسی وقت تیمور ایک عربی گھوڑے پر سوار فرشِ قالین تک آیا۔ تیمور کے گھوڑے کی زین کی اونی اور ریشمی جھالریں، قالین کا منہ چومتی معلوم ہوتی تھیں۔

تیمور نے دزدیدہ نظروں سے حاضرینِ محفل کو دیکھا۔ پھر دلہن شہزادی کو پھول کی طرح فرش سے اٹھا کر اپنے آگے بٹھا لیا اور خیمۂ عروسی کا رخ کیا۔

خیمۂ عروسی میں الجائی خاتون کے میکے کی عورتیں، سہیلیاں اور کنیزیں، جہیز کے سامان کو حفاظت سے صندوقوں میں دھر رہی تھیں۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آئی تو وہ جلدی جلدی صندوق بند کر کے دلہن کے استقبال کو کھڑی ہو گئیں۔

تیمور، دلہن کو لیے خیمہ پر پہنچا۔

پہلے دلہن کو اتارا۔ پھر خود گھوڑے سے اترا۔ اس نے دلہن کا ہاتھ پکڑ کر خیمہ کے اندر بھیج دیا۔ اور خود باہر انتظار کرنے لگا۔

خیمہ میں موجود تمام سہاگنوں نے بڑھ کر دلہن کا استقبال کیا۔ پھر انہوں نے دلہن کا جبہ اتار دیا۔ اب شہزادی کے بدن پر صرف کھلی آستینوں کی ایک عبا باقی رہ گئی تھی۔

شہزادی حیا سے پانی پانی ہو گئی۔

عورتیں ایک ایک کر کے باہر نکلیں اور تیمور کو سلام کر کے رخصت ہو گئیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تیمور دبے پاؤں خیمے کے اندر داخل ہوا۔ اس رات الجائی اپنے شوہر کے پہلو میں لیٹی ہو
کی لہروں کے دھیمے نغمے اور نقاروں کا بے ہنگم شور سنتی رہی۔

صبح کو جب وہ امیر قزغن کو سلام کرنے گئی تو سب سے پہلے اس نے امیر سے لال تری اور
کی شادی کی اجازت حاصل کی تھی!

○

ملکوتی

حاکمِ ہرات نے حکم دیا: "سفیروں کو پیش کیا جائے"۔

دو نوجوان قلعۂ ہرات کے اس کمرے میں لائے گئے جہاں ہرات کا خود سر اور خود مختار حاکم ملک معز الدین حسین، اپنے سرداروں کے ساتھ بڑی شان سے بیٹھا تھا۔

یہ نوجوان حکومتِ سمرقند کے امیر قزغن کا ایک ضروری پیغام لے کر آئے تھے۔ دونوں کی عمریں یکساں اور صورتیں بھی تقریباً ملتی جلتی تھیں۔ سفیروں نے حسبِ دستور حاکمِ ہرات کو کورنش (تعظیم) پیش کی اور نظریں نیچی کر کے کھڑے ہو گئے۔

ملک معز الدین نے ایک سفیر سے پوچھا:

"تمہارا نام؟"

"عبداللہ!" سفیر نے جواب دیا۔

ملک دوسرے سفیر سے مخاطب ہوا:

"تمہارا نام؟"

"عبداللہ!" اس نے بھی ادب سے جواب دیا۔

والیِ ہرات کی تیوریاں ایک دم چڑھ گئیں۔ گرج کر بولا:

"بدتمیز۔ ذلیل کُتو! تم والیِ ہرات سے مذاق کر رہے ہو؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک عبداللہ نے کہا:

"اے والیِ ہرات! یہ مذاق ہرگز نہیں۔ ہم دونوں عبداللہ ہیں اور حاکمِ سمرقند امیر قزغن کا ایک اہم پیغام لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ آپ ہماری توہین نہ کیجیے۔ سفیر کی توہین، سفیر بھیجنے والے کی توہین ہوتی ہے۔ اس کے نتائج خراب نکل سکتے ہیں۔"

والیِ ہرات کو اور زیادہ تاؤ آ گیا۔ بولا:

"تم ہمیں دھمکی دے رہے ہو۔ ہم تمہارے ٹکڑے اڑا دیں گے۔ دیکھیں تمہارا امیر ہمارا کیا بگاڑتا ہے۔"

دوسرا عبداللہ جواب دینے والا تھا کہ قلعہ ہرات کا قاضی تاج الملک جو ملک معزالدین کے برابر بیٹھا تھا۔ بول پڑا:

"اے ملکِ ہرات کے خود مختار تاجدار۔ یہ دونوں سفارت کار ہیں۔ ان کا کام اپنے آقا کا پیغام پہنچانا اور جواب لے جانا ہے۔ انہیں نہ تو مذاق کرنے کا حق ہے اور نہ رعب ڈالنے کا حکم۔ ملکی اور سیاسی دستور کے مطابق سفیروں کا پیغام سننا اور اس کا جواب دینا ضروری ہے۔ جو حاکم سفیروں کو قتل کرتے ہیں وہ اپنے ملک کو بدنام کرتے ہیں۔"

قاضی تاج الملک، ملکِ ہرات کا سب سے بڑا مذہبی پیشوا تھا۔ دربار میں سوائے اس کے اور کوئی اس وقت تک گفتگو نہ کر سکتا تھا جب تک ملک معزالدین حسین اسے خود اجازت نہ دے۔ ملک انتہائی اُجڈ اور بد دماغ قسم کا افغان حکمران تھا۔ مغلوں کی جہالت اور تاتاریوں کی سرکشی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی لیکن وہ بڑا شمشیر زن اور رجاہ و جلال کا حکمران تھا۔ جبھی تو وہ نہ شمال کے مغل خانِ اعظم کی پروا کرتا اور نہ سمرقند کے امیر قزغن کو خاطر میں لاتا تھا۔

قاضی کی باتوں کا اس پر تھوڑا بہت اثر تو ہوا لیکن اسے غصہ آجاتا تو اس پر قابو پاتے بھی دیر لگتی تھی۔ منہ بنا کر بولا:

"ملکی اور سیاسی دستور کا خیال تو بعد میں رکھا جائے گا پہلے یہ بتایا جائے کہ دو سفیروں کا ایک نام کیوں رکھا گیا؟"

ظاہر ہے کہ یہ انتہائی جاہلانہ سوال تھا۔ ایک نام کے کتنے ہی آدمی ہوتے ہیں۔ یہ تو محض اتفاق تھا کہ

سمرقند کے دونوں سفیروں کا ایک ہی نام تھا۔

ان سفیروں میں ایک عبداللہ تو امیر تیمور کا خانہ زاد غلام تھا اور دوسرا عبداللہ تیمور کے رسالہ کا ایک مغل سوار تھا۔

جس وقت سمرقند کے حاکم امیر قزغن نے تیمور سے سفارت پر بھیجنے کے لیے دو قابلِ اعتماد آدمی طلب کیے تو تیمور نے ان دونوں کو پیش کر دیا۔ اسے بھی انہیں پیش کرتے ہوئے یہ خیال نہ گزرا کہ ان دونوں کے نام، عمریں اور کسی حد تک صورتیں بھی یکساں تھیں۔ پہلی نظر میں دونوں عبداللہ آپس میں جڑواں بھائی دکھائی دیتے تھے۔

قاضی نے دیکھا کہ ملک معزالدین کا غصہ اب بھی ٹھنڈا نہیں ہوا اور اس نے ایک اور الٹا سوال کر دیا ہے تو بات کو ختم کرتے ہوئے بولا:

"اے تاجدار۔ یہ بے چارے تو سفیر ہیں۔ ایک نام کے دو آدمی بھیجنے کی غلطی تو ان کے آقاؤں سے ہوئی ہے۔ اس کا جواب تو وہی دے سکتے ہیں۔"

ملک معزالدین کو قاضی کے جواب سے اطمینان نہ ہوا۔ ایک سفیر سے پوچھا:

"تیرا آقا کون ہے؟"

جس سفیر سے سوال کیا گیا وہ تیمور کا خانہ زاد غلام عبداللہ تھا۔ اس نے بڑے فخر سے جواب دیا:

"میرا آقا شہر سبز کا سردار تیمور گورگانی ہے۔"

ملک کے جیسے آگ لگ گئی۔ حقارت سے بولا:

"کون تیمور۔ وہ طراغائی کا نالائق بیٹا۔ قبیلہ برلاس کا آوارہ گرد۔ امیر قزغن کا داماد بن جانے سے اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں اس کی گردن مروڑ دوں گا۔"

عبداللہ اپنے آقا کی توہین برداشت نہ کر سکا۔ بگڑ کر بولا:

"والیِ ہرات میرے آقا کی توہین کر رہے ہیں۔ میں بغیر پیغام دیے واپس جانا چاہتا ہوں۔"

"تو واپس نہیں جا سکتا۔"

ملک دانت کٹکٹاتے ہوئے بولا:

"میں تجھے قید میں رکھوں گا۔ تیرے آقا میں ہمت ہو تو چھڑانے آجائے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قاضیِ ہرات اپنی جگہ بڑا جز بز ہو رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ حاکمِ سمرقند کے سفیر ہیں۔ ان کے ساتھ ذرا بھی زیادتی ہوئی تو امیر قزغن ہرات کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ ہرات اگرچہ افغان قبائل کی ایک مضبوط ریاست تھی لیکن امیر قزغن تمام تاتاری قبائل کا حاکمِ اعلا تھا۔ اس سے ٹکر لینا ہرات کے لیے کسی طرح مناسب نہ تھا۔

قاضی نے ملک کو سمجھانے کی کوشش کی:

"اے والیِ ہرات! ایک آزاد و خود مختار تاجدار کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ معمولی سفیروں سے بحث کرے۔ ان سے پوچھا جائے کہ یہ کس کا اور کیا پیغام لائے ہیں۔"

قاضیِ ہرات کا یہ حربہ کام کر گیا۔ ملک معزالدین فوراً بولا:

"قاضی صاحب! آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ ان ادنیٰ اور ذلیل آدمیوں سے ہمیں بحث نہیں کرنا چاہیے۔ یہ تو واقعی بڑی ذلت کی بات ہے۔ آپ نے یہ ہمیں پہلے ہی کیوں نہ بتایا۔"

قاضی صاحب دل میں بہت خوش ہوئے کہ چلو کسی طرح ملک معزالدین حسین کا غصہ ٹھنڈا تو ہوا۔ وہ بولے:

"والیِ ہرات کی کوئی ذلت نہیں ہوتی۔ آپ نے ان سے گفتگو کر کے ان کی عزت افزائی کی ہے۔ یہ آپ کے احسانمند رہیں گے کہ آپ نے انہیں بات کرنے کا اعزاز بخشا۔"

"اچھا اچھا۔ یہ بات ہے۔"

یہ کہتے ہوئے ملک معزالدین نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ قہقہے کی گونج کم ہوئی تو بولا:

"ہاں قاضی صاحب! اب ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔"

قاضی نے جواب دیا:

"ان کو حکم دیجیے کہ یہ پیغام سنائیں۔ اگر پیغام خط کی صورت میں ہے تو خط پیش کریں۔"

عبداللہ نے کہا:

"پیغام زبانی ہے اور جواب بھی زبانی مانگا گیا ہے۔ یہ پیغام حاکمِ سمرقند امیر قزغن کی طرف سے تمام تاتاری قبائل کا سردارِ اعلا ہے۔ جس کی سلطنت ایران سے ماوراءالنہر، بخارا اور ترکستان تک پھیلی ہے۔ جسے بلادِ شمال کے خانِ اعظم نے حکومت کا پروانہ دیا ہے۔ وہ امیر قزغن، والیِ ہرات ملک معزالدین حسین کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے۔"

والیِ ہرات غرور سے اکڑ گیا۔ بولا:

"امیر قزغن واقعی ایک بڑا حاکم ہے۔ میں بھی اس سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔"

دوسرے عبداللہ نے فوراً لقمہ دیا:

"والیِ ہرات، ابھی امیر قزغن کا پیغام مکمل نہیں ہوا۔"

"ہاں۔ پورا پیغام سنایا جائے۔" ملک معزالدین اور اکڑ کر بیٹھ گیا۔

پھر عبداللہ نے کہنا شروع کیا:

"امیر قزغن حاکمِ سمرقند ملک معزالدین حسین کو مطلع کرتا ہے کہ حکومتِ ہرات کے کچھ لیٹرے، حکومت سمرقند کی سرحد میں گھس کر دو سو گھوڑے اور کچھ سامان زبردستی لے آئے ہیں اس لیے امیر سمرقند مطالبہ کرتا ہے کہ چوری کیا ہوا سامان فوراً واپس کیا جائے اور ان لیٹروں کو گرفتار کر کے سمرقند کے دربار میں بھیج دیا جائے۔"

یہ پیغام نہ تھا بلکہ کھلا ہوا الٹی میٹم تھا۔

ملک معزالدین حسین کے دربار میں بیٹھے ہوئے تمام سرداروں کے چہرے غصہ سے سرخ ہو گئے۔ وہ بار بار اپنی تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھتے۔ یہ اشارہ تھا اس بات کا کہ وہ اس الٹی میٹم کا جواب تلوار سے دینا چاہتے ہیں۔ پھر بھی کسی سردار نے نیام سے تلوار نہیں نکالی۔

افغان جاہل ضرور تھے لیکن اُن کے دربار کے کچھ اصول تھے جس کی وہ سختی سے پابندی کرتے تھے افغان قبائل بڑی مشکل سے متحد ہوتے لیکن جب وہ متحد ہو کر کسی ایک کو اپنا حاکم تسلیم کر لیتے تو پھر اس کے سامنے دم نہ مارتے اور اس کے صحیح اور غلط ہر حکم کی تعمیل کرنا اپنا فرض سمجھتے۔ دربار میں اُس وقت تک کوئی تلوار نہ نکال سکتا تھا جب تک والیِ ہرات تلوار نکال کر اعلانِ جنگ نہ کرتا۔

والیِ ہرات ملک معزالدین حسین نے دربار میں بیٹھے ہوئے تمام سرداروں کے چہرے فرداً فرداً دیکھے۔ ملک کا چہرہ خود بھی غصہ سے تمتما رہا تھا۔ اس کے سردار بھی غصے سے کانپ رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

والیِ ہرات آہستہ آہستہ اپنے قریب رکھی ہوئی تلوار پر ہاتھ لے گیا۔ نیام سے تلوار باہر نکالی اور پھر تلوار ہوا میں لہراتا ہوا اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ تمام سرداروں نے اس کی تقلید کی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملک معزالدین سفیروں کو گھورتے ہوئے بولا:

"ہمارا جواب تلوار ہے۔ امیر قزغن سے جا کر کہہ دو کہ ملک معزالدین حسین اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ نبرد آزما ہو چکا ہے۔ اسے حوصلہ ہو تو پھر مقابلے پر آئے۔ حکومت ہرات کے افغان جوان اسے سرحد پر ہی ملیں گے۔"

قاضی تاج الملک کو علم تھا کہ امیر قزغن اور ملک معزالدین حسین میں کئی معرکے ہو چکے ہیں جن میں ملک کا پلہ بھاری رہا ہے لیکن یہ اُن دنوں کی بات تھی جب امیر قزغن محض ایک تاتاری سردار تھا اور اس کے قبضے میں صرف تھوڑا سا علاقہ تھا اور اب تو امیر قزغن حاکم سمرقند تھا۔ تمام تاتاری سردار اسے اپنا امیر اور بادشاہ سمجھتے تھے اس کی طاقت پہلے سے دس گنا زیادہ ہو چکی تھی۔ اگر خدانخواستہ یہ ٹکراؤ ہوا تو ہرات کو یقیناً اس میں شکست ہوگی۔

قاضی ہرات نے جنگی بخار اتارنے کی کوشش کی۔ اس نے کہا:

"تاجدارِ ہرات کا فیصلہ افغان قوم کا فیصلہ ہے۔ امیر سمرقند کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ایک خودمختار حاکم کو چور اور چوری کا مال برآمد کرنے کا حکم دے۔ دو سو گھوڑوں اور کچھ مال کے لیے جنگ کا پیغام بھیجنا اس کے لیے کسی طرح مناسب نہ تھا۔ اتنے گھوڑے تو ہرات کے ایک معمولی آدمی کے پاس بھی ہوتے ہیں۔ اگر امیر سمرقند کو گھوڑوں کی ہی ضرورت تھی تو اس نے کہلا بھیجا ہوتا۔ ہم دو سو کے بجائے چار سو گھوڑے بھیج دیتے۔"

قاضی ہرات کی باتیں ملک معزالدین بڑے غور سے سنتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ قاضی سے زیادہ عقلمند اور ذہین انسان دنیا کے پردے پر موجود نہیں۔ اس لیے وہ قاضی کی اتنی عزت کرتا اور اسے اپنے برابر بٹھایا کرتا تھا۔ قاضی کی باتوں نے اس پر بہت اثر کیا۔

والیِ ہرات نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا:

"قاضی! تم کس قدر ذہین اور عقلمند ہو۔ اگر تم سمرقند کے دربار میں ہوتے تو امیر قزغن محض دو گھوڑوں کے لیے ہم سے جنگ نہ کرتا۔ تم اسے سمجھا کے اس حماقت سے ضرور باز رکھتے۔"

قاضی نے ملک کی باتوں سے فائدہ اٹھایا اور بولا:

"یہ تاجدارِ عادل کی ذرہ نوازی ہے جو ایک حقیر قاضی کو اتنی عزت دے رہے ہیں۔ دو سو گھوڑوں

ہزاروں افغانوں یا تاتاریوں کا خون بہنا نہ تو امیر قزغن کے لیے مفید ہے اور نہ والیِ ہرات کے لیے۔ اگر والیِ ہرات پسند فرمائیں تو اس کی بہترین ترکیب یہ ہے کہ امیر قزغن کو تین سو گھوڑے بطور تحفہ روانہ کر دیے جائیں تاکہ وہ شرمندہ ہو جائے اور والیِ ہرات کی فیاضی اور اعلاظرفی کی تعریف کرے۔"

"لیکن گھوڑے واپس کرنے سے کیا امیر قزغن افغانوں کو بزدل نہیں سمجھے گا؟" ملک معزالدین نے سوال کیا۔

"ہرگز نہیں والیِ ہرات"۔

قاضی نے بات بنانے کی کوشش کی:

"تحفہ بھیجنا بزدلی نہیں بلکہ اظہارِ دوستی ہے۔ اپنے طاقتور پڑوسیوں سے دوستی رکھنا عقل مندی کی دلیل ہے۔"

ملک معزالدین غصہ میں آ کر تلوار تو بلند کر چکا تھا لیکن قاضی کی باتوں میں اسے بڑا وزن محسوس ہوا۔ وہ امیر قزغن کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خوفزدہ تھا اور جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ قاضی کی باتیں اس کے موٹے دماغ میں بیٹھ گئیں۔ اس کا غصہ جاتا رہا اور جنگ کے اڈتے ہوئے بادل چھٹ گئے۔

ملک معزالدین نے حکم دیا:

"تین سو اعلا قسم کے گھوڑے امیر قزغن کو بطور تحفہ روانہ کیے جائیں۔ ایک سفیر تحفہ لے کر سمرقند جائے۔ دوسرا سفیر اس وقت تک مہمان رہے جب تک سمرقند سے جواب نہیں آجاتا۔"

والیِ ہرات کی تلوار کے ساتھ تلوار بلند کرنے والے سرداروں میں سے بعض افغان سردار ایسے بھی تھے جو اس جنگ کے خلاف تھے لیکن دوسروں کی دیکھا دیکھی انہیں بھی تلوار بلند کرنا پڑی تھی۔ ملک کے اس فیصلے سے وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوئے۔ سب سے زیادہ خوشی قاضی تاج الملک کو تھی۔ اس نے اپنی فراست سے جنگ کے خطرے کو فی الحال ٹال دیا تھا۔

⊙

ملکوتی ہرات کی شہزادی تو نہ تھی لیکن اسے شہزادی جیسا مقام حاصل تھا۔ وہ والیِ ہرات کے مرحوم بھائی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملک اعزالدین کی بیٹی تھی۔

ملکوتی باپ کی طرف سے افغان اور ماں کی جانب سے تاتاری تھی۔ ملکوتی کی ماں کی پہلی شادی تاتاریوں کے مشہور قبیلہ اوجائی بوغائی کے سردار سے ہوئی تھی۔ شادی ہوتے ہی سردار کے چھوٹے بھائی نے بغاوت کر دی اور سرداری کا دعویدار ہوا۔ بڑا بھائی نیک نفس اور صلح پسند تھا۔ وہ قبیلہ کی سرداری سے دست بردار ہو گیا اور نئی نویلی دلہن کو ساتھ لے کر ترکِ وطن کر کے ہرات میں پناہ گزیں ہوا۔ ہرات بھی اسے راس نہ آیا اور ایک ہی سال کے اندر حسین و جمیل اور گلاب جیسی بیوی کو چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

جوان جہان عورت، خوبصورت اتنی کہ دیکھنے والا دیکھتا رہ جائے۔ وہ سخت پریشان تھی کہ کیا کرے، کہاں جائے؟ اپنا وطن چھوٹ چکا تھا۔ دیارِ غیر میں کس سے فریاد کرتی۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو روتی پیٹتی والیِ ہرات کے دربار میں پہنچ گئی۔ والیِ ہرات ملک معزالدین حسین نے اس کے شوہر کو پناہ دی تھی۔ اس لئے اس پناہ کی لاج رکھی اور اپنے چھوٹے بھائی سے اس کی شادی کر دی۔ ملکوتی امی بھائی کی بیٹی تھی۔

کہتے ہیں کہ مصیبت تنہا نہیں آتی۔ ملکوتی کی ماں، شاہی خاندان کی بہو بن کر دو سال بھی نہ گزار سکی تھی کہ دوسرا شوہر بھی داغِ مفارقت دے گیا۔

ملکوتی کی ماں نے ننھی ملکوتی کو سینے سے لگا کر قسم کھائی کہ اب وہ شادی نہ کرے گی۔ جب سے اب تک وہ بیوگی کی زندگی گزار رہی تھی۔ وہ بوڑھی ہو گئی تھی اور ملکوتی جوانی کی حدوں میں داخل ہو چکی تھی۔

والیِ ہرات ملک معزالدین حسین کے دو جنوں بیٹے تھے لیکن اللہ نے بیٹی ایک بھی نہ دی تھی۔ ملک نے ملکوتی کی پرورش شہزادیوں کی طرح کی اور اسے بیٹی کی طرح چاہتا تھا۔

ملکوتی، واقعی ملکوتی حسن کا نمونہ تھی۔ ہنستا چہرہ۔ ہر وقت مسکراتی رہتی۔ شوخ و شنگ۔ بذلہ سنج۔ حاضر جوابی میں تو جواب نہ رکھتی تھی۔ مسیحا، مرض کا علاج کرتا ہے لیکن ملکوتی غم کا علاج تھی۔ غمزدہ سے غمزدہ اس سے باتیں کر لے تو اپنا غم بھول جائے۔ والیِ ہرات جس دن آزردہ خاطر ہوتا فوراً ملکوتی کو بلواتا۔ ملکوتی بات کرتے ہی اس کا آدھا غم دور ہو جاتا۔ ملک نے ان ماں بیٹیوں کو الگ محل دے رکھا تھا۔ نوکر چاکر غلام لونڈی، کسی بات کی کمی نہ تھی۔

ملکوتی کی ماں کو خبر ملی کہ والیِ ہرات کے دربار میں دو تاتاری آئے ہیں تو وہ تڑپ اٹھی۔ پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ وطن کی یاد جاگ اٹھی۔ دل چاہا کہ تاتاری سفیروں سے ملے۔ کچھ اپنی کہے کچھ ان کی سنے۔

پوچھے کہ بلخ کا حاکم اب کون ہے؟ وہاں کے لوگ کیسے رہتے بستے ہیں؟ اپنے عزیزوں کے بارے میں دریافت کرے۔ شاید کوئی زندہ ہو؟ مگر یہ سب کیسے ہو؟ تاتاری سفیروں سے کس طرح ملا جائے؟ کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی۔

اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ اسے ملکوتی کا خیال آیا اور اس کے ساتھ ہی تاتاریوں سے ملنے کی ایک ترکیب بھی سوجھی۔ اس نے فوراً ملکوتی کو آواز دی۔ تیرہ چودہ سال کی الھڑ ملکوتی، مسکراتی ہوئی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

ماں نے بیٹی کا ماتھا چوما۔ پاس بٹھایا۔ پھر بولی:

"ملکوتی! تو نے کبھی تاتاری دیکھے ہیں"۔

"نہیں امی!"

ملکوتی نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں:

"میں نے تو کبھی ہرات سے باہر قدم ہی نہیں رکھا۔ جب آپ ملکِ تاتار کا ذکر کرتی ہیں تو مجھے یہ سب ایک خواب سا لگتا ہے"۔

"تو تاتاریوں کو دیکھے گی؟" ماں نے ملکوتی کو ٹٹولا۔

"ضرور دیکھوں گی امی۔ بھلا تاتاری کیسے ہوتے ہیں؟" ملکوتی کے دل میں تاتاریوں کو دیکھنے کے شوق نے انگڑائی لی۔

"بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔ افغانوں سے زیادہ"۔

ماں نے ملکوتی کے شوق کو مہمیز کیا۔

"کہاں ہیں وہ امی۔ ان سے مل کے میں بہت خوش ہوں گی"۔ ملکوتی سوال کر کے بڑی بے چینی سے ماں کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔

اس کی ماں کچھ سوچ رہی تھی۔ اس کی سوچ ہرات سے نکل کر بلخ کے کوچہ و بازار میں گردش کر رہی تھی۔ ملکوتی سے زیادہ انتظار نہ ہو سکا۔ بولی:

"امی۔ آپ بھی تو ان سے مل کر خوش ہوں گی۔ آپ بھی تو تاتاری ہیں"۔

ماں نے ایک سرد آہ بھری۔ کہا:

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں بیٹی! میں تاتاری تھی۔ وہ اک خواب تھا جو اد ھورا رہ گیا۔"

"مجھے ملاؤ نا تاتاریوں سے امی!" ملکوتی نے ضد کی۔

وطن کی یاد آنسو بن کے ملکوتی کی ماں کی آنکھوں سے ٹپک پڑی۔ آنسو پونچھتے ہوئے بولی:

"والیِ ہرات اجازت دے تو ہم تاتاریوں سے مل سکتے ہیں۔ دربار میں دو تاتاری سفیر، سمرقند سے آئے ہوئے ہیں۔"

ملکوتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ چٹکی بجاتے ہوئے بولی:

"والیِ ہرات سے میں ابھی اجازت لے کر آتی ہوں۔"

ملکوتی، ملک معزالدین حسین کے محل میں جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

ماں نے کہا:

"سن بیٹی! اگر ملک اجازت دیدیں تو تاتاریوں کی دعوت کی بھی اجازت مانگ لینا۔ میں انہیں کھانے پکا کر کھلاؤں گی۔"

"اچھا" — کہہ کر ملکوتی مٹکتی، اٹھلاتی چلی گئی۔

ملکوتی محل میں پہنچی۔ دیکھا کہ ملک معزالدین حسین کھانا کھا رہا ہے۔ ہنستی ہوئی قریب جا کر بیٹھ گئی۔ شہزادے ملک کے ساتھ کھانے میں مشغول تھے۔ انہوں نے نظر اٹھا کر بھی ملکوتی کو نہ دیکھا۔ سب ہی ملکوتی کو جانتے تھے۔ ملک معزالدین کی تمام تر نوازشیں اور مہربانیاں ملکوتی پر تھیں۔ شہزادوں کو تو جلنا ہی تھا۔ باپ اپنے کو چھوڑ کر بھتیجی پر مہربان ہو تو انہیں کوفت ہونا لازمی تھا۔

ملکوتی کھانے میں شامل ہو گئی۔ کھاتے ہوئے رک کر بولی:

"سمرقند کے تاتاری آئے ہوئے ہیں؟"

"ہاں!"

ملک نے ہاتھ روک کر کہا:

"تمہیں کیا تاتاریوں کا اچار ڈالنا ہے؟"

ملک نے اس زور کا قہقہہ لگایا کہ اسے اچھو ہو گیا۔

ملکوتی، پہاڑی بکری کی طرح چوکڑی بھرتی ہوئی بولی:

"میں نے تاتاری کبھی نہیں دیکھے۔"

"ہوں۔ تو ان سے ملنا چاہتی ہے۔" ملک معزالدین نے اس کے ہاتھ سے ٹانگ چھین لی۔

ملکوتی پٹ سے بولی:

"ہاں۔ اگر آپ اجازت دے دیں۔"

"تجھے کون روک سکتا ہے ملکوتی۔ تُو تو میری بیٹی ہے۔"

کچھ رک کر پوچھا:

"لیکن ایک بات سچ سچ بتانا ہو گی۔"

"آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گی۔" ملکوتی نے ایک شہزادے کو دیکھا جو اسے بڑی نفرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"تو یہ بتا، تاتاریوں سے تُو ملنا چاہتی ہے یا یہ تیری ماں کی خواہش ہے۔" ملک نے تحقیق کی۔

ملکوتی گھبرا گئی جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ ہنس کے بولی:

"میں یہ نہیں بتاؤں گی۔"

"اب بتانے کی ضرورت بھی نہیں۔ میں جانتا ہوں تیری ماں تاتاری ہے۔" ملک معزالدین نے ٹانگ کی ہڈی بس یونہی اچھال دی۔ ہڈی کھڑکی سے ٹکرائی اور باہر جا گری۔

افغان ہوں یا مغل۔ عرب قبائل ہوں یا تاتاری۔ وحشیانہ جبلّت سب میں قدرِ مشترک تھی۔ بلا دستاں کا چنگیزی شہزادہ تغلق تمور خاں، آج بھی نمدے پر بیٹھا اور سفید گھوڑی کا دودھ پیتا تھا۔ افغان اور تاتاری ملا کر قبول کر چکے تھے مگر ان کا وحشی پن کم نہ ہوا تھا۔ بڑے بڑے محلوں میں رہتے مگر محل کے کھڑکی دروازے روز ٹوٹتے، روز بنائے جاتے۔

ملکوتی ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولی:

"میں ان کی دعوت کروں گی۔"

"یہ بات بھی تیری ماں نے کہی ہو گی!"

ملک معزالدین نے اس کی دوسری چوری پکڑ لی۔

ملکوتی کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مکوتی، ماں کے پاس پہنچ کے اپنی اور ملک معزالدین حسین کی باتیں بتا رہی تھی کہ ایک کنیز ہانپتی
ں کے پاس آئی۔

اس کی حالت دیکھ کے دونوں گھبرا گئیں۔

کنیز سانس روکتے ہوئے بولی:

"شہزادی، ایک جوان، بڑا خوبصورت، کہیں کا شہزادہ معلوم ہوتا ہے۔"

"فراجی، کیا بکواس کر رہی ہے۔" مکوتی کی ماں ڈپٹ کر بولی۔

فراجی سنبھل گئی۔ سر جھکا کے بولی:

"ملک حضور نے کسی کو دعوت کھانے بھیجا ہے۔"

مکوتی کی ماں کو غصہ آ گیا۔ چیخ کے کہا:

"فراجی تیرا دماغ تو ٹھکانے ہے۔ کیسی دعوت۔ کس کو بھیجا ہے ملک حضور نے؟"

مکوتی بات کی تہ کو پہنچ گئی۔ مسکرائی اور بولی:

"امی ناراض نہ ہوں۔ ملک حضور نے تاتاری سفیروں کو بھیجا ہوگا۔ میں نے دعوت کی اجازت
لی تھی۔ میں دیکھتی ہوں جا کر۔"

مکوتی دروازے کی طرف چلی تو ماں نے کہا:

"تاتاری سفیر ہوں تو ذرا عزت سے لانا ان کو۔ مذاق نہ اڑانے لگنا ان کا۔"

مکوتی دروازہ کے باہر آ گئی۔ ایک شکیل، دراز قامت جوان نظر آیا۔ سولہ سترہ سے عمر زیادہ نہ
مسیں ابھی بھیگ رہی تھیں۔ داڑھی میں صرف دو چار بال تھے۔ دونوں کی نظریں ملیں اور ملی رہ گئیں۔ پھ
وہ ایک دوسرے کو کن نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ بس دیکھے جا رہے تھے۔

فراجی کنیز، مکوتی کے پیچھے پیچھے باہر آ گئی تھی۔ اس نے دونوں کو اس قدر انہماک سے دیکھتے
تو کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ مکوتی گڑبڑا گئی۔ فراجی مسکرانے لگی۔

مکوتی نے جھجکتے ہوئے پوچھا:

"شاید تم تاتاری سفیر ہو؟"

"جی..... اور آپ شاید شہزادی ہیں۔" نوجوان کے چہرے پر ہلکی سی مسرت نمودا

"دوسرا سفیر کیوں نہیں آیا؟" مکوتی کو اس کے اکیلے آنے پر تعجب ہوا۔

شہزادی نے نوجوان کو جواب دینے کے بجائے دوسرا سوال کر دیا تو نوجوان کچھ پریشان ہوا۔ اس نے
وچا کہ اس کا سوال شہزادی کو ناگوار گزرا ہے۔ سنبھل کر بولا:

"میرے ساتھی عبداللہ کو والیِ ہرات نے سمرقند بھیجا ہے۔ میں تنہا رہ گیا ہوں۔"

"تمہیں لوگ کس نام سے پکارتے ہیں؟" مکوتی نے بڑے مہذب انداز میں پوچھا۔

"عبداللہ"۔ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

مکوتی کو زور کی ہنسی آئی۔ ضبط کرتے ہوئے بولی:

"جو تاتاری جوان ایک لڑکی کو دیکھ کر اپنے حواس کھو بیٹھے۔ وہ میدانِ جنگ میں کس طرح لڑتا ہوگا؟"

عبداللہ سمجھ تو کچھ نہ سکا لیکن اسے اس گہرے طنز پر غصہ سا آ گیا۔ سوچتے ہوئے بولا:

"اگر آپ کا اشارہ میری طرف ہے تو یقین کیجیے میں بالکل حواس میں ہوں۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"میں نے تمہارا نام پوچھا تھا!" مکوتی نے چڑ کر کہا۔

"میں نے بتا دیا۔"

"کیا نام بتایا تھا تم نے؟" مکوتی کو غصہ آ گیا۔

"عبداللہ۔ یہی نام میں نے پہلے بھی بتایا تھا۔" عبداللہ بھی ذرا تن گیا۔

"تمہارا جو ساتھی سمرقند گیا ہے اس کا کیا نام ہے؟" مکوتی نے اپنی طرف سے تاتاری نوجوان کو لاجواب
کرنے کی کوشش کی۔

عبداللہ فوراً سمجھ گیا کہ سب ناموں کی گڑبڑ ہے۔ ہنس کر بولا:

"میں سمجھ گیا۔ دربار والی غلط فہمی آپ کو بھی ہو گئی۔ یہ غلط فہمی بڑی حسین اور دلچسپ ہے۔ میرا جو ساتھی
سمرقند گیا ہے اس کا نام عبداللہ ہے اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ میرا نام بھی عبداللہ ہی ہے۔ والیِ ہرات کے
دربار میں بھی اس پر بڑی لے دے ہوئی تھی۔ آپ کے سامنے بھی یہی گڑبڑ ہوئی۔ بہرصورت یہ میری غلطی تھی۔
میں معذرت چاہتا ہوں۔"

مکوتی اور فراجی بھی اس انکشاف پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکیں۔

مکوتی نے ہنس کر کہا:

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"غلطی میری بھی تھی۔ میں بھی اس بات کو سمجھ نہ سکی۔ تمہیں پہچاننے میں تو لوگوں کو بڑی دقت ہوا ہوگی۔"

عبداللہ نے مکوتی کو کھل کر بات کرتے دیکھا تو اسے حوصلہ ہوا۔ بولا:

"ہم دونوں کا نام تو ایک ہے لیکن ہم دونوں میں ایک بڑا فرق ہے جس کی وجہ سے ہم فوراً پہچان لیے جاتے ہیں۔"

"وہ کیا؟" مکوتی نے دلچسپی سے پوچھا۔

"سمرقند جانے والے عبداللہ کی شادی ہو چکی ہے اور میں..... میں ابھی....." کہتے کہتے عبداللہ نے نظریں نیچی کر لیں۔

شوخ و شنگ مکوتی کی کنیز فراجی بھی بڑی زبان دراز تھی، فوراً بولی:

"اسے ہے تم تو لڑکیوں کی طرح شرما رہے ہو۔ کہتے کیوں نہیں کہ ابھی تک تمہیں کسی لڑکی نے پسند نہیں لگایا۔"

مکوتی سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

اندر سے آواز آئی:

"مکوتی بیٹی! مہمان کو اندر لے آؤ۔"

مکوتی، عبداللہ کو لے کر اندر آ گئی۔ اس نے عبداللہ کو بتایا:

"یہ میری ماں ہیں اور....."

ماں نے مکوتی کو اشارہ کیا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ عبداللہ نے بڑی بی کو سلام کیا۔

"یہ عبداللہ ہے امی۔ تاتاری سفیر۔" مکوتی پھر بولی۔

مکوتی کی ماں، تاتاری جوان کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھا:

"تم تاتاری ہو؟"

عبداللہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کس قبیلے کے ہو بیٹے؟" ماں نے دوسرا سوال کیا۔

"ہمارا قبیلہ اوجائی بوغائی ہے چچی جان۔" عبداللہ نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً رشتہ جوڑ

مکوتی کی ماں چونک پڑی۔ حیرت بھرے لہجے میں پوچھا:

"اوجائی بوغائی قبیلہ کا سردار سلوز تھا۔"

عبداللہ اس کی زبان سے سلوز کا نام سن کر بڑا حیران ہوا:

"چچی جان۔ سلوز ہمارے قبیلے کا سردار ہے۔ آپ اسے جانتی ہیں؟"

"ہاں بیٹا۔ میں اسے جانتی ہوں۔ سلوز بھی مجھے جانتا ہے۔"

بڑی بی نے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا پھر کہا:

"بیٹے عبداللہ! ذرا میرے قریب آؤ۔"

عبداللہ بڑی بی کے بالکل قریب پہنچ گیا۔

بڑی بی بولیں:

"میں بھی اوجائی بوغائی قبیلے کی ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے بڑی بی نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیے۔ عبداللہ بے جھجک ان کے گلے لگ گیا۔ بڑی بی اسے سینے سے بھینچ کر رونے لگیں۔ مکوتی اور فراجی انہیں حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

کچھ دیر آنسو بہانے کے بعد بڑی بی نے عبداللہ کو سینہ سے الگ کیا۔ آنسو پونچھتے ہوئے بولیں:

"تجھے دیکھ کر مجھے اپنا گھر بار اور بچپن یاد آ گیا۔ سردار سلوز کے کتنے بچے ہیں؟"

"انہیں اللہ نے کوئی اولاد نہیں دی۔"

عبداللہ نے بتایا:

"اسی غم میں گھل گھل کے بوڑھے ہو گئے ہیں۔ کہتے ہیں جوانی میں سردار سلوز بڑے ظالم تھے۔ آپ نے انہیں کب دیکھا تھا چچی جان؟"

"میں نے..... میں نے اسے اس وقت دیکھا تھا جب اس کا ظلم انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔" بڑی بی کی آواز میں کرارا پن آ گیا۔

"خدا ہر ظالم کو سزا دیتا ہے۔"

مکوتی کھڑی کھڑی الجھ رہی تھی۔ بولی:

"امی۔ آپ بھی کہاں کی پرانی باتیں لے بیٹھیں۔ کچھ کھانے پینے کا انتظام کیجیے۔ میں نے عبداللہ کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دعوت پر بلایا ہے۔"

ماضی کی باتوں نے بڑی بی کو جوان بنا دیا تھا۔ مکوتی نے یاد دلایا تو وہ ماضی سے حال میں آ گئیں پھر بوڑھی ہو گئیں۔ دھیمی آواز میں بولیں:

"عبداللہ کی دعوت ضرور ہو گی۔ میں اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے اُزبکی پکا کر کھلاؤں گی۔"

ازبکی، تاتاریوں کا من بھاتا کھانا تھا۔ یہ ایک طرح کا سالن تھا جس میں تمام ترکاریاں سالم شکل میں کے ٹکڑوں کے ساتھ ڈالی جاتیں۔ اس سالن میں پانی کے بجائے پھٹا ہوا دودھ ڈالا جاتا۔ ازبکی کا نام عبداللہ کے منہ میں پانی بھر آیا۔

بڑی بی کھانے کا انتظام کرنے چلی گئیں۔ مکوتی، عبداللہ کو اپنے کمرے میں لے آئی۔ کمرہ چھو سلیقہ سے آراستہ تھا۔

عبداللہ نے کمرے کو دیکھ کر مکوتی کی نفاست پسندی کا اندازہ لگا لیا۔ مکوتی کی خوش سلیقگی کا دل بہت خوش ہوا۔ مکوتی کو تو وہ پہلی ہی نظر میں دل دے بیٹھا تھا لیکن یہ سوچ کر اس کا دل ڈوبنے لگا دس سواروں کا رسالدار عبداللہ اور کہاں ملکِ ہرات کی شہزادی مکوتی۔

عبداللہ نے پوچھا:

"والیِ ہرات آپ کے کون ہیں؟"

"میرے چچا ہیں۔" مکوتی نے ایک اندازِ معشوقانہ سے جواب دیا۔

"ملکِ ہرات تو افغان نسل سے ہیں لیکن آپ کی والدہ اوجاتی بوغائی قبیلے کا نام لے رہی تھیں نے دوٹوک سوال کیا۔

اس نے سوچا کہ بات بڑھنے سے پہلے ہی فیصلہ ہو جائے تو بہتر ہے۔ اگر مکوتی اس کی دسترس سے ہے تو خواہ مخواہ اپنا دل کیوں جلائے۔

مکوتی جواب دینا چاہتی تھی کہ اس کی نظر فراجی پر پڑ گئی۔ وہ ان کے ساتھ ہی کمرے میں آ گئی تھ کچھ دُور کھڑی بڑے غور سے ان کی باتیں سن رہی تھی یا پھر ان کی نظریں پڑھ رہی تھی۔

"تو یہاں کیا کر رہی ہے؟" مکوتی نے فراجی کو ڈانٹ پلائی۔

وہ غریب چپ چاپ کمرے سے نکل گئی۔

مکوتی نے کہا:

"میری امی تمہاری طرح تاتاری ہیں۔ اُن کی داستان بڑی دردناک ہے۔ ان کے پہلے شوہر قبیلہ اوجاتی بوغائی کے بڑے سردار تھے۔ سلوور ان کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس نے بڑے بھائی کے خلاف بغاوت کر دی۔ میری امی اپنے شوہر کے ساتھ ہجرت کر کے ہرات آ گئیں۔ یہاں امی کے شوہر کا انتقال ہو گیا اور والیِ ہرات نے اپنے بھائی کے ساتھ میری امی کی شادی کر دی۔ یوں میں والیِ ہرات کی بھتیجی ہوئی۔ باپ کی طرف سے افغان اور ماں تاتاری ہے۔"

عبداللہ، مکوتی کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔ اس نے کہا:

"یہ باتیں میں نے اپنے باپ سے سنی ہیں۔ بلخ کا ہر بوڑھا آدمی جانتا ہے کہ سلوور نے اپنے بھائی کو بلخ سے نکال دیا تھا لیکن یہ کسی کو معلوم نہیں کہ اس نے ہرات میں پناہ لی تھی۔"

عبداللہ اور مکوتی پہلی ہی ملاقات میں یوں گھل مل گئے جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ ان کی باتیں ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھیں۔

کھانا تیار ہو گیا۔ عبداللہ نے بڑے مزے لے لے کر کھایا۔ ازبکی تو اسے بہت پسند آئی۔

عبداللہ بولا:

"چچی جان۔ ایسی اچھی ازبکی تو میں نے بلخ میں بھی نہیں کھائی۔"

بلخ کے نام پر بڑی بی پھر آبدیدہ ہو گئیں۔ بولیں:

"بلخ تو اب میرے لیے خواب ہے۔ ایک بار اپنا شہر، اپنا وطن دیکھنے کی آرزو ہے لیکن مجھے وہاں کون لے جائے گا۔"

"چچی جان۔ بلخ دکھانے کا تو میں وعدہ نہیں کرتا لیکن بلخ کے تاتاری بہت جلد یہاں آنے والے ہیں۔"

یہ بات بے ساختہ عبداللہ کے منہ سے نکل گئی۔ یہ کہنے کے بعد اسے افسوس ہوا لیکن اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

مکوتی اور اس کی ماں نے حیرت سے عبداللہ کو دیکھا۔ یہ جملہ ایسا نہ تھا جو اپنا اثر نہ کرتا۔

ماں نے پوچھا:

"بیٹا۔ تمہاری بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ بلخ کے تاتاریوں کو کیا پڑی ہے جو مجھ غریب کو دیکھنے وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اتنی دور کا سفر کر کے آئیں۔ پھر میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ میرا ذکر سلوز سے کیا جائے۔ میری عمر تو کٹ چکی جو باقی ہے وہ بھی رو دھو کے کٹ جائے گی۔ اب گڑے مردے اکھاڑنے سے کیا فائدہ؟"

عبداللہ جذبات میں آ کر ایک ایسی بات کہہ بیٹھا تھا جس کا اظہار خطرے سے خالی نہ تھا لیکن اب ملکوتی کی ماں کو مطمئن بھی کرنا تھا۔ وہ ملکوتی کی نظروں میں بھی گرنا نہیں چاہتا تھا۔ اگر وہ بات ٹالنے کی کوشش کرتا تو اس کی ہی ملاقات میں اس کے وقار کے مجروح ہونے کا خطرہ بھی تھا۔ وہ خود تو ملکوتی کے قریب پہنچ ہی گیا تھا لیکن ملکوتی نے اس سے جس بے تکلفی اور لگاوٹ سے باتیں کی تھیں اس سے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ شاید ملکوتی بھی اس کے قریب آنے کی کوشش کر رہی ہے۔

عبداللہ نے مجبوراً زبان کھولی مگر ڈر ڈر کے۔ اُس نے کہا:

"چچی جان۔ یہ ایک راز کی بات ہے۔ آپ وعدہ کریں کہ اس کا ذکر کسی سے نہ کریں گی تو میں کچھ باتیں آپ کو بتاؤں؟"

ماں بولی:

"عبداللہ! تم تاتاری ہو۔ میرے بیٹے کی مانند۔ اگر راز کھولنے سے تمہیں نقصان پہنچ رہا ہو تو میں ہ کرتی ہوں کہ یہ راز ہمیشہ راز ہی رہے گا۔ میں یا ملکوتی اس کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دیں گی۔"

عبداللہ نے رازدارانہ انداز میں کہا:

"چچی جان۔ سمرقند اور ہرات میں جنگ ہونے والی ہے۔ سمرقند کا لشکر لڑائی کی تیاری کر رہا ہے۔ ہرا والوں نے ہماری سرحد میں گھس کر لوٹ مار کی ہے۔ مجھے اور عبداللہ کو والیِ ہرات کے پاس اس لیے بھیجا گیا کہ لوٹ کے مال کا مطالبہ کریں۔ والیِ ہرات نے لوٹ کا مال واپس کرنے کے بجائے امیر قزغن کو ۲۰ گھوڑ کا تحفہ بھیجا ہے۔ امیر قزغن اسے قبول نہ کرے گا اور جنگ شروع ہو جائے گی۔"

ملکوتی اور اس کی ماں اس خبر سے بہت خوفزدہ ہوئیں۔ ماں نے کہا:

"بیٹا۔ کوئی ایسی ترکیب نہیں ہو سکتی کہ یہ جنگ رک جائے۔ ذرا سی بات پر ہزاروں بندگانِ خون بہ جائے گا۔"

"چچی جان! جنگ تو ضرور ہو گی۔ اسے کوئی نہیں روک سکتا۔" عبداللہ نے صاف صاف کہہ دیا۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ لوگوں پر آنچ نہ آنے دوں گا۔"

"مگر بیٹا۔ کیا پتہ کسے شکست ہو۔"

ماں نے ایک اصولی بات کہی:

"ہو سکتا ہے کہ تاتاری ہرات پر قبضہ کر لیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہرات کے افغان، سمرقند تک پہنچ جائیں۔"

"نہیں چچی جان۔ ایسا نہیں ہو گا۔"

عبداللہ نے زور دے کر کہا:

"والیِ ہرات کو سمرقند کی طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔ اس وقت سمرقند کے دربار میں ایک ایسا تاتاری سردار موجود ہے جو ہرات تو کیا، پورے ایران اور افغانستان کو فتح کر سکتا ہے۔"

"کیا وہ سمرقند کے حاکم کا بیٹا ہے؟" ماں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"بیٹے سے بھی بڑھ کر ہے چچی جان۔" عبداللہ نے جواب دیا۔

"اس کا نام تیمور گورگانی ہے۔ سمرقند کے حاکم نے اپنی پوتی کی شادی اس سے کر دی ہے۔ اس وقت وہ ایک ہزار جوان تاتاریوں کا سردار ہے۔ اس نے بڑے بڑے خود سر تاتاری سرداروں کے سر جھکا دیے ہیں ہرات کی مہم کا سردار وہی ہو گا۔ اس کی سرداری فتح کا نشان بن جاتی ہے۔"

عبداللہ نے اپنی باتوں سے ماں بیٹی کو سخت ہراساں کر دیا۔ ان کے چہروں کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے یہ دیکھ کر فوراً کہا:

"آپ بالکل پریشان نہ ہوں چچی جان۔ ہرات میں داخل ہوتے ہی میں اپنے آدمیوں کے ساتھ آپ کے مکان پر آ جاؤں گا۔ آپ کی طرف کوئی نگاہ بھی نہ اٹھا سکے گا۔"

عبداللہ اپنی رَو میں اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے ہرات فتح ہو چکا ہے اور وہ فاتح کی حیثیت سے قلعۂ ہرات کے بڑے پھاٹک سے ابھی داخل ہونے والا ہے۔

افغان، شجاعت اور بہادری میں تاتاریوں سے کسی طرح کم نہ تھے۔ ان کی فوجی طاقت بھی ایسی نہ تھی کہ ہرات پر آسانی سے قبضہ کیا جا سکے۔ والیِ سمرقند کو افغانوں پر صرف اس وجہ سے فوقیت حاصل تھی کہ اس وقت تمام بڑے بڑے تاتاری سردار، حاکمِ سمرقند کے جھنڈے کے نیچے جمع تھے۔ ورنہ اس سے پہلے والیِ ہرات تقریباً تمام تاتاری سرداروں کو فرداً فرداً شکست دے چکا تھا یا کم از کم ان سے اپنی طاقت کا لوہا منوا چکا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دعوت ختم ہو گئی لیکن عبداللہ کی باتوں نے ملکوتی اور اس کی ماں کو اس قدر خوفزدہ کر دیا کہ اب وہ خاموش خاموش اور فکرمند رہنے لگیں۔

عبداللہ جب تک ہرات میں رہا دوسرے تیسرے روز ان سے ملنے جاتا رہا لیکن اس نے اپنی غلطی سے ان کا سکون چھین لیا۔ وہ انہیں لاکھ تسلیاں دیتا لیکن ملکوتی کچھ بجھی بجھی سی رہتی۔

○

والیِ سمرقند امیر قزغن کی پوتی الجائی خاتون سے تیمور کی شادی کیا ہوئی کہ اس کے لیے ترقی کی راہیں کھل گئیں۔ بوڑھا امیر قزغن ایک جوہر شناس حاکم تھا۔ اس کی عمر لڑائیاں لڑتے گزری تھی۔ بڑے بڑے سرداروں اور بہادروں کو اس نے زیر کیا تھا۔ لڑائی کے دوران ہی اس کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی تھی۔

حکومتِ سمرقند کے اصل حاکم ایلا و شمال کے چغتائی مغل تھے۔ مغول خانِ اعظم نے اپنی طرف سے امیر قزغن کو سمرقند کا حاکم مقرر کیا تھا لیکن خانِ اعظم کے لالچی سردار اکثر سمرقند میں لوٹ مار کرنے گھس آتے تھے یہ صورت حال امیر قزغن اور دوسرے تاتاری سرداروں کے لیے بڑی پریشان کن تھی۔

سمرقند کی حکومت کئی تاتاری سرداروں میں بٹی ہوئی تھی۔ خجند پر بایزید جلائر کی حکومت تھی۔ بلخ کا حاکم سلدوز اوباجائی بوغائی تھا۔ شبرغان میں محمد خواجہ اپردی کی عملداری تھی بدخشاں کے پہاڑوں کا سردار ختلان تھا۔ اورارسنگ پر کیخسرو اوبجا نیوا پردی کا قبضہ تھا۔

یہ سب بڑے جنگجو اور بہادر تاتاری سردار تھے۔ ہر سردار کے پاس دس دس ہزار سواروں کی فوج ہر وقت تیار رہتی تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ ان میں اتفاق نہ تھا۔ وہ ہر وقت ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہتے۔ تاتاری سواروں کے آپس کے اختلافات سے شمال کا خانِ اعظم خوب فائدہ اٹھاتا اور جب چاہتا کسی علاقہ کو تاخت و تاراج کرنا شروع کر دیتا۔ دوسرے سردار تماشا دیکھتے رہتے۔

امیر قزغن بڑا جہاندیدہ سردار تھا۔ اس نے تمام تاتاری سرداروں کو خفیہ پیغام بھیجا کہ اگر مغلوں کے ان آئے دن کے حملوں سے بچنا چاہتے ہو تو میرا ساتھ دو۔ کیونکہ تاتاریوں کا متحدہ لشکر ہی مغلوں کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکتا ہے۔

یہ بات تاتاری سرداروں کے دماغ میں بیٹھ گئی۔ ان سب نے اپنے جھگڑے دفن کر کے امیر قزغن کو اپنا سردار اعلا تسلیم کر لیا۔ امیر قزغن نے فوراً خانِ اعظم کے خلاف بغاوت کر دی۔

مغلوں اور تاتاریوں میں بڑی زبردست جنگ ہوئی۔ دونوں طرف کے ہزاروں آدمی کام آئے۔ تاتاری اس قدر جم کے لڑے کہ مغلوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ اسی دوران خانِ اعظم مر گیا۔ نئے خانِ اعظم نے امیر قزغن کو صلح کا پیغام دیا اور اسے سمرقند کا خود مختار حاکم تسلیم کر لیا۔ اس طرح امیر قزغن نہ صرف سمرقند بلکہ تاتاریوں کا بھی حاکم بن گیا۔

تاتاریوں میں یہ صفت تھی کہ جب وہ کسی کو اپنا سردار تسلیم کر لیتے تو پھر اس کے حکم کی بے چون و چرا تعمیل کرتے۔ امیر قزغن کے حاکمِ سمرقند ہو جانے سے شمال کے مغلوں کا خطرہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا اور ہر سردار اپنے علاقہ میں آرام و سکون سے حکومت کرنے لگا۔

تیمور جب اپنا گھوڑا چمکاتا ہوا امیر قزغن کے سامنے آتا تو اسے دیکھ کر امیر کو اپنی جوانی یاد آجاتی۔ وہ تیمور کے پیکر میں اپنی شبیہ دیکھتا۔

امیر قزغن نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ اس نے اپنی پوتی الجائی خاتون کے لیے نہ صرف ایک بہترین شوہر منتخب کیا ہے بلکہ یہ منچلا نوجوان مستقبل کا ایک درخشندہ ستارہ ہے اور اگر یہ بھک نہ گیا تو دنیا میں ضرور نام پیدا کرے گا۔

امیر قزغن نے تیمور کو پہلے چھوٹی چھوٹی لڑائیوں میں آزمایا۔ تیمور نے جلد ہی خود کو اس کا اہل ثابت کر دیا۔ امیر قزغن نے اس کی شجاعت سے متاثر ہو کر اسے مینگ باشی (ایک ہزار سواروں کا کرنل) بنا دیا۔ تیمور کے لیے یہ پہلا اہم اعزاز تھا۔ ہزاروں بہادروں کی موجودگی میں اس اعزاز کے پانے پر سب نے اسے مبارک دی لیکن اس نے دو زبردست دشمن بھی پیدا کر لیے۔ ایک دشمن اس کا چچا حاجی برلاس تھا اور دوسرا بایزید جلائر۔ بایزید خجند کا حاکم تھا اور امیر قزغن کے بعد حاکمِ سمرقند ہونے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ امیر قزغن کا عزیز ہونے کی وجہ سے وہ خود کو حکومت کا حق دار سمجھتا تھا۔

تیمور اپنے دونوں دشمنوں کو خوب جانتا تھا مگر مصلحتاً خاموش رہتا۔ یہ دونوں تیمور کی شادی میں بھی شریک نہ ہوئے تھے۔

تیمور کو اللہ نے جب چلنا سا بیٹا دیا تو قصرِ سفید مہمانوں سے بھر گیا۔ قصرِ سفید ایک قدیم ایرانی قلعہ تھا اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تیمور کے باپ طراغائی خاں کے قبضے میں تھا۔ تیمور نے اس شکستہ قلعہ کے ایک حصے میں اپنے لیے ایک گھر تعمیر کر لیا تھا جسے لڑائیوں میں حاصل ہونے والے بہترین قالینوں اور طلائی ظروف سے آراستہ کیا گیا تھا۔

تیمور نے بیٹے کی پیدائش پر دل کھول کر خرچ کیا اور خوب جشن منایا۔ جشن کا تمام انتظام اس کے غلام عبداللہ کے سپرد تھا۔ عبداللہ نے اتنے سلیقے سے انتظام کیا کہ لوگ عش عش کر اٹھے۔ تیمور نے بڑے چھوٹے تمام سرداروں کو دعوت دی۔ سب نے اس ضیافت اور جشن میں شرکت کی، سوائے اس کے چچا حاجی برلاس اور بایزید جلائر کے۔

جشن کے دن قصرِ سفید میں میلہ سا لگ گیا۔ تاتاری سرداروں نے تیمور کے بیٹے کو حسبِ توفیق تحائف دیے۔ شہر شہر کے کھلونے، پالنے، کپڑے، بستر، تحفوں کا انبار لگ گیا۔ تحفے قیمتی بھی تھے اور معمولی قیمت کے بھی۔ تیمور کو ان کی قیمت کی فکر نہ تھی۔ وہ تو ان تحفوں کے پیچھے چھپے ہوئے تاتاریوں کے اس خلوص کو دیکھ رہا تھا جو ان کے دل میں مینگ باشی تیمور کے لیے پیدا ہو گیا تھا۔

عصر اور مغرب کے درمیان نومولود بچے کو تیمور اپنی گود میں لیے باہر آیا۔ تاتاری سرداروں نے تیمور کے سر پر تلواروں کی توس سی بنا دی۔ یہ تلواروں کا سایہ تھا۔ اس سائے میں تیمور بچے کو لے کر مولانا زین الدین کے پاس آیا اور بچہ ان کی گود میں دے دیا۔

مولانا نے بسم اللہ کہہ کر اس کے کان میں اذان دی اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ تمام حاضرین نے آمین کہہ کر اس میں شرکت کی۔ مولانا نے نومولود کا نام جہانگیر رکھا۔

تاتاری باوجود اکھڑ اور جاہل ہونے کے، نماز کے بڑے پابند تھے۔ تیمور تو بچپن ہی سے نماز کا بہت پابند تھا۔ نمازِ مغرب کے بعد ضیافت شروع ہوئی۔ مسلمان کہیں کا ہو گوشت اس کی مرغوب غذا ہے۔ بھنے ہوئے گوشت کے تھال محفل میں آتے اور خالی ہوتے رہے۔ پرندوں اور شکار کیے ہوئے جانوروں کا گوشت بھی تھا لیکن پہاڑی بکروں کا گوشت زیادہ کھایا گیا۔ بکروں کی آلائش نکال کر انہیں مسلّم بریاں کیا گیا۔ ان کے پیٹ میں طرح طرح کے میوے بھرے ہوئے تھے۔ گوشت اس کثرت سے کھایا گیا کہ بظاہر اس کے بھوک کی کوئی گنجائش نہ تھی لیکن تاتاری ضیافت میں یہ کھانے کا پہلا دور کہلاتا تھا۔

دوسرا دور شروع ہوا تو تھالوں اور سینیوں میں گھوڑے کے پٹھوں کے کباب لائے گئے۔ اس کے ساتھ تنکوں کی موٹی موٹی روٹیاں تھیں جن پر شہد لگایا گیا تھا۔ اسے آج کل کی سویٹ ڈش بھی کہا جا سکتا ہے۔ تا

نے اس دور میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس قدر کھایا کہ ان کے لیے بیٹھنا دشوار ہو گیا۔

مغربی مؤرخوں نے تاتاریوں کی ضیافتوں میں بے دھڑک شراب کا بھی ذکر کیا ہے جو ان کی ذہنی پستی اور تعصب کی دلیل ہے۔ بھلا جن محفلوں میں مولانا زین الدین جیسے بزرگ شریک ہوں وہاں شراب کا دور کیسے چل سکتا تھا لیکن یورپی مؤرخ، مسلمانوں کی کردار کشی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور بغیر کسی سند یا ثبوت کے اُن پر الزام تراشی کرتے نظر آتے ہیں۔

قندیلیں شام ہوتے ہی روشن کر دی گئی تھیں۔ قصرِ سفید کے چپہ چپہ پر قندیلیں آویزاں تھیں۔ در و دیوار اور درختوں کی شاخوں پر دور دور تک قندیلیں لٹکتی نظر آتیں اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے آسمان کی کہکشاں زمین پر اتر آئی ہے۔ کھانے کے بعد تاتاری مہمان، چغیوں، قالینوں اور سبزہ زار پر دراز ہو گئے اور داستان گو نے داستانیں سنانا شروع کر دیں۔ یہ داستانیں تاتاریوں کے آبا و اجداد کے مربوط اور غیر مربوط قصے تھے جنہیں داستان گو دھن اور لے کے ساتھ گاتے تھے۔ ہر قصہ خواں کے ہاتھ میں تاروں کا بنا ہوا چنارہ ہوتا جو ان کی آواز میں شامل ہو کر ایک عجیب سماں پیدا کرتا۔ ہر چند کہ یہ داستانیں ان کی سُنی ہوئی ہوتیں لیکن ہر بار انہیں اس میں ایک نیا مزہ آتا اور وہ جھوم جھوم اٹھتے۔

یہ جشن بچہ کی پیدائش کے چھٹے دن منعقد ہوا تھا۔ اس رات تیمور کی بیوی الجائی خاتون جو خاتونِ آغا کے لقب سے یاد کی جاتی تھی، کو دوبارہ دلہن بنایا گیا۔ مشاطاؤں نے اسے سجا بنا کر چوتھی کی دلہن بنا دیا۔ نصف شب گزرنے کے بعد الجائی خاتون مہمانوں کو سلام کرنے کے لیے محفل میں آئی۔ اس کی کنیز خاص لال تری گود میں ننھے جہانگیر کو لیے اس کے ساتھ چل رہی تھی۔

بزرگ تاتاریوں نے الجائی خاتون کے سر پر ہاتھ پھیر کر جہانگیر کو درازیٔ عمر کی دعائیں دیں۔ دوسرے تاتاری سرداروں نے ان پر سیم و زر کی بارش کی۔

ولیِ عہد قندِ امیر قزغن جنوبی علاقوں میں شکار کھیل رہا تھا اس لیے وہ اس جشن میں شریک نہ ہو سکا۔ امیر قزغن اپنا زیادہ وقت سیر و شکار ہی میں صرف کرتا۔ تیمور کے مل جانے سے ملکی معاملات میں بڑی آسانی ہو گئی تھی۔ اس نے اس ذہین اور نڈر جوان کی صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس کے بڑے بیٹے مُسلّا کا انتقال ہو چکا تھا اور پوتا یعنی الجائی خاتون کا بھائی افغانستان کے شمالی علاقہ کا حاکم تھا۔ امیر قزغن کا چھوٹا بیٹا جس کا نام بھی اتفاق سے عبداللہ ہی تھا، ابھی کمسن تھا۔ اب لے دے کے تیمور ہی اس کے سب سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زیادہ قریب تھا۔

امیر قزغن نے سمرقند واپس آکر نئی فتوحات کا منصوبہ بنایا۔ اس نے پہلے تیمور کو مغربی صحرا کی طرف روانہ کیا۔ تیمور تو ایسے موقعوں کی تلاش ہی میں رہتا تھا۔ وہ پانچ ہزار سواروں کے ساتھ جن میں اس کا ایک ہزار کا ذاتی رسالہ بھی شامل تھا، مغربی صحرا میں جا گھسا اور ان لوگوں کی خوب پٹائی کی جو آئے دن سمرقند کی سرحدوں میں گھس کر لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ یہ لٹیرے کچھ تو تیمور کے لشکر کے ہاتھوں مارے گئے اور باقی دور دور بھاگ گئے۔ پھر انہوں نے سرحد پر فتنہ پیدا کرنے کی کوشش نہ کی۔

○

جب تیمور مغربی صحرا سے کامیاب و کامران، لیڈروں کے چند سرداروں کو گرفتار کر کے امیر قزغن کے دربار میں پہنچا تو امیر نے اسے اٹھ کر گلے لگایا اور کہا:

"کیوں نہ ہو، تیمور تو گورگانِ اعظم کی اولاد میں سے ہے۔"

پھر ایک لمحہ ٹھہر کے کہا:

"حکومت کا حق صرف اسے حاصل ہے جس کی تلوار میں زور ہو۔"

اور تیمور نے امیر قزغن کی یہ بات ہمیشہ کے لیے گرہ میں باندھ لی۔

امیر قزغن کو مغربی صحرا کی طرف سے اطمینان ہوا تو اب اس کی نظر ہرات پر پڑی۔ ہرات کے حا ملک معزالدین حسین اور اس میں دیرینہ دشمنی چلی آرہی تھی۔ دونوں میں کئی معرکے ہو چکے تھے۔ کبھی سرحد جھڑپیں ہوتیں تو کبھی کھلے میدان میں بے مقصد مقابلہ ہوتا۔ اس دور میں تمام لڑائیاں بے مقصد ہی ہوا تھیں۔ حملہ آور کا مقصد محض تاخت و تاراج ہوتا۔ مخالف کے گھوڑے پکڑے جاتے۔ سامان لوٹ لیا جاتا۔ دونوں طرف خاموشی چھا جاتی۔ ملک گیری یا دوسرے کے علاقہ پر قبضہ کرنے کا وہ تصور بھی نہ کرتے تھے۔ ادھر لڑائی ختم ہوتی۔ ادھر دونوں فریق اپنے اپنے علاقوں میں واپس چلے جاتے۔

امیر قزغن اور ملک معزالدین کے مقابلے اکثر برابر رہتے لیکن یہ حقیقت تھی کہ والیِ ہرات کا پلہ لڑائیوں میں بھاری رہا تھا۔ تاہم یہ اس وقت کا ذکر تھا جب تاتاری سردار منتشر حالت میں تھے۔ ان کی

یا حکومت نہ تھی۔ اب صورتِ حال تبدیل ہو چکی تھی۔ امیر قزغن میں اتنی طاقت پیدا ہو گئی تھی کہ اس نے شمال ے خانِ اعظم کو آنکھیں دکھا کر سمرقند پر اپنی حاکمیت تسلیم کرا لی تھی۔ امیر قزغن اور ملک معزالدین میں کئی پہلے صلح کا معاہدہ ہوا تھا جس کی پابندی دونوں حکمران کر رہے تھے لیکن سرحد پر غیر سرکاری جھڑپیں اور ہار ہوتی رہتی تھی۔

پھر ایک دن ہرات کی سرحد سے ملنے والے سمرقندی علاقہ کے کچھ سردار امیر قزغن کے دربار میں آئے ں نے دربار میں بڑا واویلا مچایا۔ ان کے دو سو گھوڑے اور بہت سا سامان ہرات والے لوٹ کر لے گئے ے۔ امیر قزغن اگر پہلے جیسا ہوتا تو شاید وہ ضبط کر جاتا اور انہیں کچھ لے دے کے رخصت کر دیتا مگر ہ اس کی انا کا سوال تھا۔ والیِ ہرات کتنا ہی مضبوط سہی لیکن امیر قزغن بہرصورت اس سے اب زیادہ زور تھا۔

امیر قزغن نے فریادیوں کو مہمان خانہ میں ٹھہرایا اور اپنے چند خاص خاص سرداروں کو مشورہ کے لیے ب کیا۔ ایک ہفتہ کے اندر سب بڑے بڑے سردار سمرقند پہنچ گئے۔ اس اچانک طلبی پر سب ہی حیران سمرقند پہنچ کے انہیں اس کی تو بھنک پڑ گئی تھی کہ والیِ ہرات نے کچھ شرارت کی ہے لیکن تفصیل انہیں ں ہی کی زبانی معلوم ہوئی۔

امیر قزغن نے بڑے بارعب لہجے میں اپنے سرداروں کو مخاطب کیا:

"اے گورگان! ترکمان اور اغرقوم کے جیالو!

تم سے تاتاریوں کی عزت قائم ہے۔ تم نے ہی بلادِ شمال کے خانِ اعظم کو ناکوں چنے چبوائے تھے۔ آج تمہیں پھر للکارا گیا ہے۔ دشمن اپنی محفوظ سرحدوں اور مضبوط قلعوں پر نازاں ہے لیکن تاتاری اب پہلے جیسے کمزور نہیں۔ ان میں انتشار نہیں۔ وہ ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہو چکے ہیں۔ یہ ہمارے اتفاق اور اتحاد کی برکت ہے کہ ہم نے چنگیزی خانِ اعظم کو اس کی شمالی سرحدوں میں محدود کر دیا ہے۔ ہم آنکھ اٹھانے والے کی آنکھ پھوڑ سکتے ہیں۔ ہاتھ اٹھانے والے کے ہاتھ توڑ سکتے ہیں۔"

امیر قزغن نے اپنی پرجوش تقریر ختم کی۔ اپنے سرداروں کے چہروں کا ایک طائرانہ جائزہ لیا اور نظریں نیچی ان کے ردِ عمل کا انتظار کرنے لگا۔ امیر کی اس تقریر پر تاتاری سرداروں نے شدید ولولہ انگیز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ردِعمل کا اظہار کیا۔

علاقہ سرپول کے سردار امیر خطر یسوری نے کھڑے ہو کر تلوار ہوا میں لہرائی اور گرج کر بولا:

"امیر قزغن! ہمیں دشمن کا نام بتائیں۔ ہم اس کے سر کا نذرانہ امیر کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔"

بدخشاں کے سردار نے اور زیادہ سخت رویہ اختیار کیا اس نے کہا:

"ہم دشمن کا سر ہی نہیں لائیں گے بلکہ اس کے علاقہ کو اس طرح پامال کریں گے کہ آبادیوں کا نام و نشان مٹ جائے گا۔"

تیمور بھلا کیوں پیچھے رہتا۔ اس نے کہا:

"میرا خیال ہے کہ امیر کا اشارہ ملک معزالدین حسین والیِ ہرات کی طرف ہے۔ اس کے لشکری اکثر سرحدوں میں داخل ہو کے لوٹ مار کرتے رہتے ہیں۔ اگر میرا خیال درست ہے تو مجھے اجازت دیجیے میں اسے گرفتار کر کے پابجولاں دربارِ سمرقند میں لاؤں تاکہ دنیا دیکھ سکے کہ حاکمِ سمرقند سے گستاخی کرنے والوں کا کیا انجام ہوتا ہے۔"

امیر قزغن نے اطمینان کا سانس لیا۔ بولا:

"ہاں میرے بہادر سردارو! والیِ ہرات کی حرکتیں حد سے زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ ہماری سرحدی بستیاں اس کے لشکریوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بن رہی ہیں۔"

علاقہ شبرغان کا سردار محمد خواجہ بڑا جوشیلا تھا۔ چیخ کر بولا:

"ہرات کو تاراج کرنے کا پروانہ میرے نام کاٹا جائے۔ میں ملک معزالدین کو ایسی سزا دوں گا کہ اس کی سات پشتیں یاد رکھیں گی۔"

امیر قزغن نے جواب دیا:

"میں اپنے سرداروں کے جوش اور جذبہ سے بہت خوش ہوں لیکن اب تاتاریوں نے سمرقند میں ایک حکومت قائم کر لی ہے۔ اس لیے حکومت کا کام حکومت کی سطح پر ہونا چاہیے تاکہ والیِ ہرات یہ نہ کہہ سکے کہ اچانک حملہ کیا گیا۔ ہم دشمن کو للکار کر مارنا چاہتے ہیں۔ جنگ ہرات کی سرزمین پر ہونا چاہیے۔"

"ہم امیر قزغن کے حکم کے منتظر ہیں۔" کئی سرداروں نے یہ جملہ یک وقت ادا کیا۔

امیر قزغن نے اپنے تیار کردہ منصوبہ سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہا:

"کئی سال پہلے ہم نے ہرات سے صلح کا معاہدہ کر لیا تھا۔ ہم اس معاہدہ کی پابندی کرتے ہوئے پہلے والیِ ہرات سے دو سو گھوڑوں اور لوٹے ہوئے سامان کی واپسی کا مطالبہ کریں گے۔ جن لوگوں کے گھوڑے اور سامان ہرات والے زبردستی لے گئے ہیں وہ سمرقند میں فریاد لے کر آئے ہیں۔ اگر والیِ ہرات نے گھوڑے اور سامان واپس کر دیا اور لٹیروں کو ہمارے دربار میں گرفتار کر کے بھجوا دیا تو ہم سمجھیں گے کہ والیِ ہرات کو ہماری طاقت کا اندازہ ہے۔ اگر اس نے انکار کیا تو پھر ہرات کا فیصلہ تلوار سے ہوگا۔"

امیر قزغن کی اس رائے سے ہر سردار نے اتفاق کیا۔ امیر نے سرداروں کو اپنے علاقوں میں واپس جانے کی اجازت دی تاکہ وہ جنگ کی تیاری کر سکیں۔ پھر امیر قزغن نے تیمور سے دو معتبر آدمی طلب کیے جو والیِ ہرات کا پیغام لے کر ہرات جانے کے اہل ہوں۔ تیمور نے اپنے وفادار غلام عبداللہ اور دوسرے جوان کو جس کا نام بھی عبداللہ تھا، اس خدمت کے لیے پیش کیا۔ امیر قزغن نے ان دونوں کے ذریعے والیِ ہرات کو زبانی پیغام بھجوایا۔ دونوں قاصد یا سفیر ہرات جانے لگے تو امیر قزغن نے تیمور سے کہا:

"والیِ ہرات ہمارے پیغام کا جو جواب دے گا اس کا ہمیں علم ہے تم کوچ کی تیاری کرو۔ ہرات کا معرکہ لی تم کو سر کرنا ہے۔"

اور تیمور جنگی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

○

ہرات سے ابھی جواب نہ آیا تھا کہ امیر قزغن نے تیمور کے ایک ہزاری دستے کو تاتاری لشکر کا مقدمۃ الجیش بنا دیا۔

مقدمۃ الجیش یا ہراول دستہ لشکر کے آگے آگے چلتا تھا۔ اس دستہ کی سرداری بھی تیمور کے سپرد کی گئی۔ تیمور کے دستہ میں جو سوار شامل تھے وہ تمام کے تمام نوعمر جوان تھے۔ تیمور خود بھی جوان تھا اس لیے اس نے اپنے دستہ میں چھانٹ چھانٹ کر جوانوں کو شامل کیا تھا۔ وہ نئے خون پر زیادہ اعتماد کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر سازشوں سے بچنا چاہتے ہو تو فوج میں نوجوانوں کو بھرتی کرو۔ وہ اپنے ایک ہزار جوانوں کے ناموں ازبر رکھتا تھا۔ یہ جوان بھی اس پر جان نچھاور کرنے پر آمادہ رہتے۔ تیمور کھانے پر بیٹھتا تو دو چار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سواروں کو مزید اپنے ساتھ دسترخوان پر بٹھاتا۔ کبھی کبھی وہ اپنے جوانوں کی ضیافت بھی کرتا۔ قصرِ سفید شاندار ضیافتیں دینا اسے بہت پسند تھا۔

امیر قزغن کے پیغام کے جواب میں تیمور کا خانہ زاد غلام عبداللہ گھوڑوں کا تحفہ لے کر سمرقند

امیر قزغن کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ چراغ پا ہو گیا۔

قزغن نے کہا:

"ملک معزالدین نے ہماری توہین کی ہے۔ کیا ہم فقیر ہیں جو گھوڑوں کا تحفہ قبول کریں"۔

تیمور نے جواب دیا:

"میں پوری طرح تیار ہوں۔ بس آپ کا حکم چاہیے"۔

امیر قزغن سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر سر اٹھا کر پوچھا:

"گھوڑے لے کر ان کا کوئی سردار آیا ہے تو اسے بلاؤ۔ شاید اس سے کوئی کام کی بات معلوم ہو"

"ہرات سے کوئی سردار نہیں آیا امیر"۔

تیمور نے بتایا:

"ہم نے دو قاصد بھیجے تھے۔ والیِ ہرات نے ایک کو روک لیا ہے اور دوسرے کے ساتھ بھیج دیا ہے۔ گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنے والے مزدور اور سائیس ساتھ آئے ہیں"۔

"یہ تو اور زیادہ توہین ہے تیمور"۔

امیر غصہ سے لال پیلا ہو گیا:

"کسی دربار میں تحفہ بھیجا جاتا ہے تو کوئی معزز سردار تحفہ پیش کرنے کے لیے ساتھ جاتا ہے نے صرف گھوڑے بھیجے ہیں۔ ہم اس کے گھوڑوں کے بھوکے نہیں۔ ہم نے اپنے گھوڑے منگول

تیمور خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔

امیر قزغن نے فیصلہ کیا۔ بولا:

"پانچ ہزار سواروں کے ساتھ ہرات کا رخ کرو۔ ضرورت پڑنے پر مزید کمک روانہ کر دی ہم لشکر لے کر تمہارے پیچھے آ رہے ہیں۔ ملک معزالدین اگر ہتھیار ڈال دے تو اسے گرفتار کر ہرات میں لوٹ مار ہرگز نہ کی جائے"۔

تیمور نے امیر قزغن کے حکم کا ایک ایک لفظ غور سے سنا۔ اپنے ساتھ لے جانے والے پانچ ہزار سواروں کی تفصیل پوچھی اور مطمئن ہونے کے بعد اپنے رسالہ کا رخ کیا۔

○

عبداللہ کو ہرات سے سمرقند گئے جب ایک ماہ سے زیادہ گزر گیا تو والیِ ہرات کو کچھ فکر ہوئی۔ اسے معلوم تھا کہ امیر قزغن بڑا ضدی مرد ہے۔ اگر وہ پکڑے ہوئے گھوڑوں کی واپسی کے مطالبہ سے دست بردار ہوا تو یقینی جنگ ہو گی۔ خوف ناک جنگ۔ اس نے بھی چپکے چپکے جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ سرحدی راستوں پر محافظوں کی نفری میں اضافہ کر دیا اور سرحد کے قریب تازہ دم فوج تعینات کر دی۔ اسے اب اپنی اس غلطی کا احساس ہوا کہ اس نے گھوڑوں کے تحفہ کے ساتھ اپنے ایک دو سرداروں کو کیوں نہ بھیجا جو سمرقند میں ہونے والے واقعات سے اسے آگاہ کر سکتے۔ بہرحال اس نے خود کو کیل کانٹے سے پوری طرح لیس کر لیا اور متوقع حملہ کے پیشِ نظر قلعۂ ہرات سے نکل کر مع لشکر کے، سرحد کے قریب اس سڑک کے کنارے خیمہ زن ہو گیا جو سمرقند اور ہرات کو ملاتی تھی۔ نقل و حرکت کے لیے دونوں شہروں میں یہی واحد راستہ تھا۔

ایک ماہ کی مسلسل رفاقت نے ملکوتی اور عبداللہ کو ایک دوسرے کے بے حد قریب کر دیا۔ ملکوتی کی اور عبداللہ ایک ہی تاتاری قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اس لیے اس کا جھکاؤ بھی فطرتاً عبداللہ کی طرف ہو بڑی بی جہاندیدہ اور زمانہ کے گرم و سرد سے گزر چکی تھیں۔ انہوں نے ملک معزالدین حسین کے بیٹوں کی بھی دیکھی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ہرات کا کوئی شہزادہ ملکوتی کو پسند نہیں کرتا۔ محض باپ کی خاطر وہ ملکوتی کو قبول کرتے تھے۔ ان کا اختیار ہوتا تو وہ ان ماں بیٹیوں کو ہرات سے نکال باہر کرتے۔ انہیں تاتاریوں سے نفرت تھی اور ملکوتی کی ماں تاتاری تھی۔

عبداللہ میں تمام خوبیاں موجود تھیں جو ہر عورت اپنے دلدار میں ڈھونڈتی ہے۔ عبداللہ تمام دن اور زیادہ وقت بھی انہی کے محل میں گزارتا تھا۔ ملکوتی بہت شوخ و شنگ لڑکی تھی لیکن یہ شوخی محض دکھاوا تھی۔ اس کا دل بھی اندر سے دکھا ہوا تھا۔

ایک دن اس نے آہستہ سے عبداللہ سے کہا:

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"عبداللہ! میں نے مسکراہٹ اور شوخی کا یہ لبادہ اپنی ماں کی وجہ سے اوڑھ رکھا ہے ورنہ میں راتوں کو تنہائیوں میں اکثر اپنی قسمت پر روتی ہوں۔"

عبداللہ پریشان ہوگیا۔ پوچھا:

"مکوتی! تمہیں کس بات کی کمی ہے۔ یہ محل، نوکر چاکر۔ والیِ ہرات تم سے محبت کرتا ہے۔ ہر جگہ عزت ہے۔"

"نہیں عبداللہ!"

مکوتی افسردگی سے بولی:

"سولہ سال کے والیِ ہرات کے اور تمام لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں اور وہ اس لیے کہ میری ماں تاتاری ہونا یہاں ایک گالی ہے۔ میری ماں صدمے برداشت کرتے کرتے موت کے قریب پہنچ گئی اسے سب سے زیادہ میرا غم کھائے جا رہا ہے۔ میں خود جانتی ہوں کہ میرا مستقبل تاریک ہے۔ والیِ ہرات آنکھ بند ہوتے ہی میں یہاں سے نکال دی جاؤں گی۔ میں یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی مسکراتی اور قہقہے لگاتی ہوں۔ اگر میں بھی ماں کے ساتھ بیٹھ کے قسمت پر آنسو بہانے لگوں تو اس طرح حالات نہیں بدل سکیں گے یاں کا خاتمہ جلد ہو جائے گا۔"

عبداللہ نے کہا:

"تو کیا تمہیں ہرات کا باشندہ نہیں سمجھا جاتا؟"

"باشندہ کیسا۔ ہمیں تو یہ کتے سے زیادہ بدتر سمجھتے ہیں۔"

"لیکن تمہارا باپ تو ملک حسین کا سگا بھائی تھا۔ نام تو باپ کی طرف سے چلتا ہے۔"

"تمام شہزادے میرے باپ کو بھی برا کہتے ہیں۔"

مکوتی کی آنکھیں بھر آئیں:

"امی کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ وہ اپنے وطن واپس چلی جائیں لیکن یہ کسی طرح ممکن نہیں۔ والیِ تاتاریوں کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتے۔"

"اللہ نے چاہا تو میں چچی جان کو ایک دن ضرور بلخ لے جاؤں گا۔" عبداللہ نے بڑے عزم سے کہا۔ مکوتی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا: "اور اگر تم پسند کرو مکوتی! تو میں تمہیں بھی اپنے ساتھ لے جا سکتا

"میں چاہوں بھی تو یہ کیسے ممکن ہے عبداللہ۔۔۔۔" مکوتی بے چارگی سے بولی۔ "خوشی سے ہمیں کوئی جانے نہ دے گا اور زبردستی کرنے کی ہم میں ہمت نہیں۔"

عبداللہ جذباتی ہو گیا:

"مکوتی تم کم از کم مجھ سے یہ وعدہ تو کر لو کہ اگر قدرت نے بہتر حالات پیدا کر دیے تو تم بھی چچی کے ساتھ میرے وطن چلو گی۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں۔"

مکوتی کی آنکھیں چمک پڑیں۔

"لیکن ایک ناممکن بات کا وعدہ کس کام کا؟"

یہ عبداللہ کی عجلت کا کھلا ہوا اعلان تھا۔ عبداللہ نے چاہا کہ اس خوشی میں وہ مکوتی کو گلے لگا لے لیکن مکوتی کی کنیز فراجی گھبرائی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

فراجی نے ہانپتے ہوئے کہا:

"غضب ہو گیا شہزادی غضب۔ ظالم تاتاری فوج لے کر ہرات پر چڑھا آئے ہیں۔ خبر آئی ہے سرحد پر جنگ شروع ہو گئی ہے۔ تمام فوجی اُدھر بھاگے جا رہے ہیں۔"

عبداللہ کے لیے یہ دوسری خوشی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ امیر قزغن نے والیِ ہرات کا تحفہ قبول نہیں کیا۔ اور چڑھائی کر دی ہے۔ فراجی اتنا بتا کر مکوتی کی ماں کو خبر دینے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

مکوتی نے پریشان نظروں سے عبداللہ کی طرف دیکھا۔ عبداللہ کے لبوں پر بڑی پراسرار سی مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔

مکوتی نے ناگوار انداز میں کہا:

"عبداللہ۔ تم مسکرا رہے ہو۔ کیا یہ خوشی کا موقع ہے؟"

"ہاں مکوتی!"

عبداللہ اطمینان سے بولا:

"یہ خوشی کا موقع نہیں بلکہ خوشی ہرات کی سرحدوں تک پہنچ گئی ہے۔ اب میں چچی جان کو لے کر بلخ جاؤں گا!"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا کہہ رہے ہو عبداللہ۔ کس طرح لے جاؤ گے انہیں؟" مکوتی نے حیرت سے پوچھا۔

"سرحد پر لڑنے والی تاتاری فوج کے سردار میرے آقا تیمور ہوں گے۔"

عبداللہ نے مکوتی کو بتایا:

"تمام اہم لڑائیوں کی سرداری انہی کو دی جاتی ہے۔ جب وہ لڑتے ہوئے اس قلعے تک پہنچ گئے تو چچی جان آزاد ہوں گی۔ انہیں لے جانے سے کوئی نہ روک سکے گا۔"

مکوتی کو اطمینان نہ ہوا۔ بولی:

"تمہیں یہ کیسے یقین ہے کہ تاتاری فتح یاب ہوں گے؟ والیِ ہرات خود اپنے لشکر کی کمان کر رہے ہیں۔ ہرات کی فوج کو شکست دینا بڑا مشکل ہے۔"

یہ مکوتی کا اندازہ اور خیال تھا۔ اس میں شک نہیں کہ والیِ ہرات بہادر اور تجربہ کار تھا۔ اسے ہر سے تازہ دم کمک مل سکتی تھی لیکن اس کے مقابلے پر تاتاریوں کی کمان امیر تیمور کر رہا تھا۔ جہاں عمر اس کی عمر کم تھی لیکن فوجی حکمتِ عملی میں وہ اپنی نظیر آپ تھا۔

تیمور کو امیر قزغن نے صرف پانچ ہزار بہادروں کا لشکر دیا تھا۔ اس کا ذاتی دستہ ایک ہ جانبازوں پر مشتمل تھا۔ اس طرح ہرات جیسی مضبوط طاقت کو زیر کرنے کے لیے اس کے ساتھ چھ ہزار سوار تھے۔ امیر قزغن نے مزید کمک بھیجنے کا وعدہ بھی کیا تھا اور دو ہزار کا لشکر تیمور کی کمک کی صورت میں آ رہا تھا۔

امیر قزغن کو تیمور پر اس قدر اعتماد ہو گیا تھا کہ وہ جس مہم پر تیمور کو بھیجتا اس کی فتح کی خوش لوگوں کو پہلے ہی سنا دیتا۔ اب تک ہوا بھی ایسا ہی تھا۔

تیمور سمرقند سے فوج لے کر چلا تو اس نے وہ گھوڑے بھی ساتھ لے لیے جو ملک معزالدین تحفے کے طور پر امیر قزغن کو بھیجے تھے۔ اس کے جاسوس پہلے ہی ہرات میں داخل ہو چکے تھے۔ جاسو تیمور کو خبر بھیج دی تھی کہ مرو کے ساتھ والیِ ہرات اپنا لشکر لیے شاہراہِ سمرقند پر نظریں جما

تیمور نے ہرات آنے کے لیے وہی راستہ اختیار کیا جو سیدھا ہرات کو آتا تھا لیکن ہرا کے پاس پہنچ کے اس نے پانچ پانچ سو سواروں کے بارہ دستے بنائے اور انہیں دائیں بائیں میل تک پھیلا دیا۔ اس نے اپنے ساتھ صرف دو ہزار سوار رکھے۔ ان میں ایک ہزار سوار تو

خاص دستے کے تھے اور ایک ہزار دوسرے بہادروں کا دستہ تھا۔

اب جو اس نے لشکر کو آگے بڑھایا تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے بیس میل تک ایک عظیم الشان لشکر ہرات کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے۔

والیِ ہرات کے جاسوس تیمور کی اس حکمتِ عملی کو نہ سمجھ سکے۔ انہوں نے بھاگ کر والیِ ہرات کو خبر دی کہ بیس بیس میل تک سمرقندی لشکر پھیلا ہوا ہے جس کی صحیح تعداد کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ ہر طرف لشکر ہی لشکر دکھائی دیتا ہے۔

والیِ ہرات اس اطلاع سے بہت پریشان ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ تاتاری لشکر سیدھی سڑک سے آئے گا اور ایک ہی میدان میں جنگ کا فیصلہ ہو گا لیکن اب میدانِ جنگ بیس میل وسیع ہو گیا تھا۔

تیمور نے اپنی رفتار آہستہ رکھی تاکہ دشمن پر اعصابی دباؤ پڑتا رہے۔ آخری حربہ اس نے یہ استعمال کیا کہ سرپہ پہنچ کر اس نے ساتھ لائے ہوئے گھوڑوں کا رُخ ہرات کی طرف کر دیا اور پھر انہیں چابک مار مار کر بھگا دیا۔

دو سو گھوڑوں کا یہ غول ایک بلائے ناگہانی کی طرح ملک معزالدین کے لشکر میں گھس گیا اور خیموں اور لشکریوں کو روندتا ہوا گزر گیا۔ اس سے ایک طرف تو سامان برباد ہوا۔ دوسری طرف کئی قیمتی جانیں ضائع ہو گئیں ہرات کے لشکریوں نے بڑی مشکل سے ان گھوڑوں پر قابو پایا۔

تیمور بڑھتا ہوا آخر ہرات کے لشکر کے سامنے پہنچ گیا۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ تیمور نے لشکر کو رک کر خیمے لگانے کا حکم دیا۔ ملک معزالدین کا خیال تھا کہ تاتاری فوراً حملہ کر دیں گے لیکن تیمور نے حملے سے گریز کیا۔ اور اطمینان سے دشمن کے سامنے خیمے ڈیرے لگا دیے۔

ملک معزالدین گھبرایا ہوا تھا۔ تاتاریوں کو خیمے لگاتے دیکھ کر اسے کچھ اطمینان ہوا اور امید بندھی کہ شاید تاتاری صلح کی بات چیت کریں گے۔ اس نے بھی حملہ کرنے میں پہل نہ کی بلکہ اسے حملہ کرنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ دراصل ملک معزالدین تاتاری لشکر کی آن بان دیکھ کر ہی ذہنی طور پر شکست کھا گیا تھا اور چاہتا تھا کہ لڑائی کے بجائے اگر صلح ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

رات کو تیمور نے ایک اور غضب ڈھایا۔

اس نے اپنے دستہ کے پانچ سو سواروں کو ہرات کے لشکر پر شب خون مارنے کا حکم دیا۔ تیمور نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خود شب خوں کی قیادت نہیں کی بلکہ باقی ڈیڑھ ہزار سواروں کو تیار کر کے رات بھر جاگتا رہا تاکہ اگر کوئی کارروائی ہو تو اس کی پوری مدافعت کی جا سکے۔

تاتاریوں کے شب خوں نے ہرات کے لشکر پر قیامت ڈھا دی۔ انہیں یہ خیال بھی نہ تھا کہ کوئی لشکر شب خوں کی جرأت کر سکتا ہے۔ شب خوں میں بے شمار ہراتی مارے گئے اور صدہا خیموں میں آگ لگا دی گئی۔ ملک کو امید کی ایک ہلکی سی کرن نظر آئی۔ اس نے قاصد کو بلا کے گفت گو کرنے کا فیصلہ کیا لیکن ضرورت مند دیوانہ ہوتا ہے۔ ملک نے بجائے عبداللہ کو اپنے پاس بلانے کے خود اس کے پاس بھڑک اٹھی۔

تیمور نے ملک معزالدین کو سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔ وہ رات کے نقصان کا اندازہ لگا رہا تھا کہ تیمور نے جوابی کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح وہ عبداللہ پر اخلاقی دباؤ ڈالنا چاہتا تھا۔

صف بندی کر کے عام حملے کا حکم دے دیا۔ نقاروں پر چوٹ پڑی اور تاتاری سواروں نے بیس میل کے محاذ پر حملہ شروع کر دیا۔ تیمور کے لشکر کے برق رفتار سوار مارتے کاٹتے تیزی سے صفوں کو درہم برہم کرتے اور اس کی ماں کے پاس ہی گزرتا تھا۔ جب سے لڑائی کا غلغلہ اٹھا تھا وہ رات کو بھی وہیں رہنے لگا تھا۔ ملکوتی اندر گھس جاتے۔ پھر دائرہ بنا کر ہراتیوں کو گھیر لیتے۔ جو اُن کے دائرے میں آجاتا وہ بچ کر نہ نکل پاتا۔ اور اس کی ماں نے خود اسے وہیں رہنے کو کہا تھا۔ ان کی امیدوں کا واحد سہارا اب عبداللہ ہی تھا۔

ملک معزالدین اس قسم کی جنگ کے لیے تیار نہ تھا۔ بیس بیس میل محاذ پر لشکر پہنچانا اس کے لیے ناممکن ہو گیا۔ تیمور کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ وہ بیس میل کے پورے محاذ پر ایک گھنٹہ میں دو چکر لگا لیتا۔ وہ بے ملکوتی کے محل میں پہنچ گیا۔

اپنے سواروں کے حوصلے بلند کرتا۔ ہر جگہ کے سپاہی یہی سمجھتے کہ تیمور ان کے ساتھ ہی لڑ رہا ہے۔

دوپہر سے پہلے ہی ملک معزالدین نے پسپائی اختیار کر لی۔ اس کوشش میں اس کی فوج کا بیشتر حصہ ہوئی۔ وہ سمجھی کہ کسی نے اس کی شکایت کی ہے اور اب اس پر اور اس کی بیٹی پر کوئی بڑی بلا نازل ہونے والی ہے۔

کام آیا۔ جب وہ اپنی جان بچا کر ہرات کے قلعے میں پہنچا تو اس کے ساتھ صرف چوتھائی فوج رہ گئی تھی۔ باقی یا تو میدانِ جنگ میں ماری گئی تھی یا ادھر اُدھر بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔

والیِ ہرات کو بڑی عظیم شکست اٹھا کر قلعہ بند ہونا پڑا۔ پہلے تو قلعہ میں واویلا مچا۔ سب نے اپنے طور پر رونا دھونا شروع کر دیا۔ ملک نے سب سے پہلے ملکوتی کی خیریت دریافت کی پھر عبداللہ کے بارے میں پوچھا۔ اُسی پر شکست پر آنسو بہائے اور افسوس کیا۔ پھر ہر ایک کو اپنی جان کی فکر پڑ گئی۔ ظاہر تھا کہ تاتاری قلعہ فتح کیے بغیر تو واپس نہ جا سکتے تھے اور قلعہ بچتا نظر نہ آتا تھا۔

شام ہوتے ہوتے تیمور اپنے لشکر کے ساتھ قلعۂ ہرات کے سامنے نمودار ہوا اور آتے ہی قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔

ملک معزالدین صلح پر مجبور ہو گیا۔ اس نے اپنے سرداروں سے مشورہ کیا۔ سب کا دل ٹوٹ چکا تھا کسی میں مقابلہ کی طاقت نہ تھی۔ سب نے ملک کی رائے سے اتفاق کیا مگر مشکل یہ تھی کہ صلح کی گفت گو کس طرح اور کس کے ذریعے شروع کی جائے۔ ملک کو قلعۂ ہرات میں کوئی ایسا شخص نظر نہ آتا تھا جو اس کام کے لیے موزوں نظر آتا۔

سوچتے سوچتے ملک کو اس سمرقندی کا خیال آیا جسے اس نے ایک طرح سے یرغمال کے طور پر قلعۂ ہرات میں روک لیا تھا۔ ملک کو امید کی ایک ہلکی سی کرن نظر آئی۔ اس نے قاصد کو بلا کے گفت گو کرنے کا فیصلہ کیا لیکن ضرورت مند دیوانہ ہوتا ہے۔ ملک نے بجائے عبداللہ کو اپنے پاس بلانے کے خود اس کے پاس

ملک معزالدین حسین والیِ ہرات، تمام آدابِ امارت اور ریاست بالائے طاق رکھ کر بغیر اطلاع

سب سے پہلے اس کی ملاقات ملکوتی کی ماں سے ہوئی۔ وہ والیِ ہرات کو اپنے محل میں دیکھ کر سخت خوفزدہ

ملک اس سے انتہائی خلوص و مروّت سے ملا۔ ملکوتی کی ماں کو اس پر بڑی حیرت ہوئی اور اس کا خوف

پہلے تو قلعہ میں واویلا مچا۔ سب نے اپنے طور پر رونا دھونا شروع کر دیا۔ ملک نے سب سے پہلے ملکوتی کی خیریت دریافت کی پھر عبداللہ کے بارے میں پوچھا۔ اُسی پر شکست پر آنسو بہائے اور افسوس کیا۔ پھر ہر ایک کو اپنی جان کی فکر پڑ گئی۔ ظاہر تھا کہ تاتاری قلعہ فتح کیے بغیر تو واپس نہ جا سکتے تھے اور قلعہ بچتا نظر نہ آتا تھا۔

ملک نے بڑے پیار سے عبداللہ کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ عبداللہ پھٹی پھٹی نظروں سے ملک کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

ملک نے بات شروع کی:

"ہم بڑے خلوص کے ساتھ تاتاری قاصد کو تاتاریوں کی فتح کی مبارک باد دیتے ہیں۔"

عبداللہ کو پسینہ آ گیا۔ وہ سمجھا کہ ملک معزالدین اس پر طنز کر رہا ہے۔ اسے اپنی موت سامنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملک نے زاری کر کہا:

"تم تاتاری ہو۔ ہماری بھاوج بھی تاتاری ہے۔ امید ہے کہ ہماری بھاوج نے تمہاری خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ہوگی۔"

"میں بڑے آرام سے ہوں اور آپ کا شکر گزار ہوں والیِ ہرات۔" عبداللہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

ملک بولا:

"عبداللہ۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ تمہارا آقا امیر تیمور ہے۔"

"کسی نے ٹھیک بتایا ہے والیِ ہرات!" عبداللہ کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ ملک آخر کہنا کیا چاہتا ہے۔

"کیا تمہیں علم ہے کہ امیر تیمور اس وقت کہاں ہے؟" ملک نے پوچھا۔

عبداللہ کو کچھ علم نہ تھا۔ اس نے سادگی سے جواب دیا:

"مجھے ان کے متعلق کوئی خبر نہیں۔"

ملک بولا:

"اگر میں یہ کہوں کہ تمہارا آقا اس وقت قلعہ ہرات کے سامنے موجود ہے تو کیا تم یقین کرو گے؟"

"ضرور یقین کروں گا۔ انہیں اس وقت ہرات ہی میں ہونا چاہیے۔" عبداللہ نے جرأت سے جواب دیا۔

ملک کو اس جواب پر کچھ حیرت ہوئی۔ اس نے کہا:

"تم یہ کیسے کہتے ہو کہ انہیں اس وقت ہرات ہی میں ہونا چاہیے۔"

امیر تیمور کی ہرات کے قلعہ کے باہر موجودگی نے عبداللہ کو اور زیادہ بے خوف کر دیا تھا۔ بولا:

"اے والیِ ہرات! مجھے اس بات کا پہلے ہی خیال تھا۔ امیر سمرقند، ہر اہم مہم پر میرے آقا تیمور کو بھیجتے ہیں۔ کیونکہ تیمور اور فتح ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ ہرات کا معرکہ بھی اہم ہے اس کی سرداری پر امیر تیمور کو مامور ہونا چاہیے۔"

ملک کا دل بیٹھنے لگا۔ اس نے کہا:

"عبداللہ۔ تمہارا آقا کامیاب ہوا اور ہمیں شکست ہوئی۔ ہم امیر تیمور سے باعزت صلح کے خواہشمند ہیں۔ کیا تم اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکتے ہو؟"

اصل بات اب سامنے آئی تھی۔ ملکوتی اور اس کی ماں کو بھی والیِ ہرات کی حالت پر بڑا افسوس ہوا۔

بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ سچ ہے غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے۔ والیِ ہرات کچھ ہی دن پہلے امیر سمرقند کو ذلیل و خوار کر رہا تھا اور اب وہ سمرقند کے ایک معمولی قاصد کے تعاون کے لیے خوشامد کر رہا تھا۔

عبداللہ بولا:

"والیِ ہرات مجھے جو خدمت بجا لانے کا حکم دیں گے میں اس میں عذر نہ کروں گا۔ اگر وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے آقا سے ان کے لیے مراعات کی درخواست کروں تو میں آمادہ ہوں۔ میں اپنے آقا کی خوشامد کروں گا۔ مجھے امید ہے میرا آقا میری بات نہ ٹالے گا۔"

ملک معزالدین شکست کے صدمہ سے نڈھال ہو رہا تھا۔ اس نے کہا:

"عبداللہ! ہمیں کچھ زیادہ مراعات نہیں چاہییں۔ ہماری اور ہمارے اہلِ خاندان کی جان بخشی، قلعہ میں قتل و غارت گری کی ممانعت کے علاوہ ہمیں اور کچھ نہیں چاہیے۔ اس کے بدلے ہم قلعہ امیر تیمور کے حوالے کر دیں گے اور حسبِ طلب زرِ تاوان ادا کریں گے۔"

عبداللہ اپنے آقا سے ملنے پر تیار ہو گیا۔ فوراً سفارت ترتیب دی گئی۔ ملک معزالدین نے اس سفارت میں قاضی سیف الملک کو اپنی طرف سے شامل کیا اور شہزادی ملکوتی، ملک سے ضد کر کے خود اپنے طور پر شامل ہو گئی۔ تین گھوڑوں پر سفید پھریرے آویزاں کیے گئے۔ قلعۂ ہرات کا دروازہ کھولا گیا۔ عبداللہ، قاضیِ ہرات اور ملکوتی سفید پھریرے اڑاتے لشکر کی طرف چلے۔ قلعۂ ہرات کا دروازہ پھر بند کر دیا گیا۔

○

تیمور خود بھی خونریزی کے بغیر قلعہ پر قبضہ کا خواہشمند تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ صلح کے پیغامبر آ رہے ہیں تو خیمہ سے نکل کر اس نے سفارت کا خود استقبال کیا۔ عبداللہ نے اپنے آقا کا استقبال کے لیے موجود دیکھا تو دور ہی سے گھوڑا اچھوڑ کر پیادہ ہو گیا۔ اسے پیدل دیکھ کر قاضی اور ملکوتی بھی گھوڑوں سے اتر پڑے۔

امیر تیمور، عبداللہ کو سفارت کے ساتھ دیکھ کر مسکرایا۔ عبداللہ نے قریب پہنچ کر تیمور کو سلام کیا اور سر جھکا کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ قاضیِ ہرات اور شہزادی نے بھی تعظیم پیش کی۔

تیمور نے کہا: "عبداللہ! ہمیں تمہاری بہت فکر تھی۔ تمہارا ہم نام عبداللہ بھی تمہارے لیے پریشان تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قلعہ والوں نے تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں پہنچائی؟"

"بالکل نہیں میرے آقا!"

عبداللہ ادب سے بولا:

"اس وقت میں والیِ ہرات کی طرف سے آپ کی خدمت میں صلح کا پیغام لے کر حاضر ہوا ہوں۔ ساتھ ہرات کے قاضی صاحب اور شہزادی ملکوتی ہیں۔"

"شہزادی!" تیمور نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا یہ والیِ ہرات کی بیٹی ہیں؟"

"نہیں آقا!"

عبداللہ نے بتایا:

"یہ والیِ ہرات کے مرحوم بھائی کی بیٹی ہیں۔ میں یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس کر رہا ہوں کہ شہزادی کی ماں ایک تاتاری خاتون ہیں اور اس وقت قلعہ میں موجود ہیں۔"

"بہت خوب!"

تیمور نے شہزادی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"تو پھر اس رشتے سے یہ ہماری بھی بیٹی ہوئی۔"

ملکوتی کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اسے ایک فاتح سردار سے اتنے محبت بھرے سلوک کی امید نہ تھی۔

عبداللہ نے کہا:

"اے آقا! والیِ ہرات اپنی شکست تسلیم کرتے ہیں۔ وہ قلعۂ ہرات آپ کے حوالے کرنے کو تیار ہیں لیکن ان کی درخواست ہے کہ والیِ ہرات اور ان کے خاندان کے تمام لوگوں کی جان بخشی کی جائے۔ یہ کہ قلعہ والوں کو عام معافی دی جائے۔ ان کا سامان نہ لوٹا جائے۔ اس کے صلہ میں جس قدر زرِ تاوان کیا جائے گا وہ ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

صلح کی شرائط سامنے آگئی تھیں۔ ذرا دیر سوچنے کے بعد تیمور نے اعلان کیا:

"قلعہ والوں کو امان دی جائے گی۔ قتل و غارت یا لوٹ مار قطعی نہ ہوگی۔ ملک کے تمام خاندان والوں کی جان بخشی کا اعلان کیا جاتا ہے سوائے ملک معزالدین حسین کے۔ ملک معزالدین حسین کی جان بخشی کا نہیں۔ میں اپنی طرف سے ان کی جان بخشی کرتا ہوں لیکن اس کی تصدیق امیرِ قزغن حاکمِ سمرقند کریں گے۔"

ملک معزالدین کو ہمارے ساتھ سمرقند چلنا ہوگا۔ انہیں باعزت طریقے سے سمرقند لے جایا جائے گا۔"

قاضیِ ہرات اور ملکوتی اس حسنِ سلوک سے بے حد خوش ہوئے۔ انہوں نے امیر تیمور کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ سفارت اسی وقت قلعہ واپس گئی۔ ملک معزالدین ان کی واپسی کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ قاضیِ ہرات نے امیر تیمور کے اعلان کے الفاظ اس کے سامنے دہرائے۔ ملک کی تمام باتیں تیمور نے تسلیم کر لی تھیں سوائے اس کی جان بخشی کے۔ تیمور نے اپنی طرف سے اس کی جان بخشی کر دی تھی اس لیے اس نے خود قلعہ کا دروازہ کھلوا دیا۔ اور اپنے سرداروں کے ساتھ قلعہ سے نکل کر امیر تیمور اور تاتاری لشکر کا استقبال کیا۔

چار دن تک قلعہ میں جشن منایا گیا۔ اس دوران عبداللہ نے اپنے دوست عبداللہ (لال تری کا شوہر) سے اپنے اور ملکوتی کے تعلقات کی تفصیل بیان کی اور اس سے امیر تیمور نے سفارش کی درخواست کی۔ امیر تیمور خود ملکوتی کی والدہ سے ملاقات کر چکا تھا۔ ملکوتی کی ماں کی بھی خواہش تھی کہ اس کی بیٹی کی شادی کسی تاتاری جوان سے کی جائے چنانچہ سمرقند واپسی سے قبل ملک معزالدین کی اجازت حاصل کر کے ملکوتی اور عبداللہ کا عقد کر دیا گیا۔

○

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شمال کا خان اعظم

"ہرات فتح ہو گیا!"

یہ تھے وہ الفاظ جو تیمور کے قاصد نے حاکم سمرقند امیر قزغن کے سامنے بڑے جوش سے ادا کیے۔ امیر قزغن، حاکم سمرقند نے اپنا بڑا سا سر اور واحد چندھی آنکھ اس طرح گھمائی جیسے اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ یا پھر وہ قاصد کو پاگل سمجھ رہا ہو۔

تیمور کی روانگی کے وقت امیر قزغن نے اس کے کان میں کہا تھا:

"اے گورگانی سپوت! حوصلے سے کام لینا۔ میں تمہارے پیچھے پیچھے ہرات پہنچ رہا ہوں۔"

امیر قزغن نے صرف چھ ہزار سواروں کے ساتھ تیمور کو ہرات بھیجا تھا تاکہ وہ والیِ ہرات کو الجھائے رکھے جب تک وہ خود اس کی کمک کو نہیں پہنچتا۔ لیکن ہرات کی قسمت کا فیصلہ امیر قزغن کی کمک پہنچنے سے پہلے ہی ہو گیا۔ تیمور نے والیِ ہرات ملک معزالدین کو ایک خونریز لڑائی میں شکست دے کر قلعہ ہرات پر سمرقند کا جھنڈا لہرا دیا۔ والیِ ہرات نے جان بخشی کے وعدے پر خود کو تیمور کے حوالے کر دیا تھا۔

تیمور کا قاصد فتحِ ہرات کا مژدہ امیر قزغن کو سنا رہا تھا۔ امیر قزغن نے تین چار بار تیزی سے پلکیں جھپکائیں۔ یہ امیر کے غصے کی علامت تھی۔ جب وہ غصے میں ہوتا تو کوئی حکم صادر کرنے سے پہلے اسی طرح جلدی جلدی پلکیں جھپکاتا تھا۔ قاصد پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا:

"اے امیر! میں فاتح سردار تیمور گورگانی کا خاص قاصد ہوں۔ مجھے سردار نے آپ تک یہ خوشخبری پہنچانے کے لیے مقرر کیا ہے۔"

امیر قزغن کی پلکیں جھپکنا بند ہو گئیں اور اس کے خوفناک چہرے پر مسکراہٹ کی لکیریں ابھر آئیں:

"کیا تو سچ کہہ رہا ہے قاصد؟"

"بالکل سچ امیر۔ تیمور گورگانی کا قاصد آپ کے سامنے کیسے جھوٹ بول سکتا ہے۔" قاصد نے امیر کے رویے میں تبدیلی دیکھی تو اسے حوصلہ ہوا۔

"تو ایک بار پھر وہی الفاظ دُہرا، جو تُو نے پہلے آتے ہی کہے تھے۔" امیر قزغن نے بڑی محبت کے ساتھ کہا۔

قاصد نے بلند آواز سے الفاظ دہرائے:

"ہرات فتح ہو گیا۔"

امیر قزغن اتنا خوش ہوا کہ اس نے قاصد کا ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر بٹھا لیا اور پوچھا:

"تیرا نام کیا ہے؟"

"عبداللہ۔"

قاصد نے کہا:

"میں خاتون آغا (تیمور کی بیوی) کی کنیز لال تری کا شوہر ہوں۔"

"خدا تیرا بھلا کرے عبداللہ۔"

امیر قزغن نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا:

"میرے چھوٹے بیٹے کا نام بھی عبداللہ ہے لیکن مجھے اس سے کسی خیر کی امید نہیں۔"

عبداللہ خاموش رہا تو کچھ دیر بعد امیر نے خود پوچھا:

"تیرا لشکر میں عہدہ کیا ہے؟"

"دس سواروں کا سردار ہوں۔"

"ہم تیمور سے سفارش کریں گے کہ تجھے سو سواروں کا سردار بنا دیا جائے۔"

امیر قزغن کی سفارش اس بات کا اشارہ تھی کہ اسے اس مژدہ سے بے حد خوشی ہوئی ہے۔ پھر اس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عبداللہ سے پوچھا:

"تُو ہرات کی جنگ میں شریک تھا۔ بتا کہ میرا تیمور کیسے لڑا؟"

"اے امیر! میرے آقا تیمور، دشمن پر اس طرح جھپٹ کر حملے کرتے تھے کہ جیسے شیر، ہرن پر حملہ کرتا ہے۔"

عبداللہ نے کہا اور دیر تک جنگ کی تفصیل بتاتا رہا۔ امیر قزغن اتنے ہی انہماک سے سنتا رہا جس طرح عام تاتاری اپنے آباواجداد کی داستانیں پیشہ ور داستان گو سے سنا کرتے تھے۔

عبداللہ خاموش ہوا تو امیر نے چونک کر پوچھا:

"تو نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ والیِ ہرات کس طرح مارا گیا؟"

عبداللہ مسکرا کر بولا:

"اے امیرِ سمرقند! تاتاریوں کا دشمن والیِ ہرات سردار تیمور کے ہاتھوں گرفتار ہوا ہے اور وہ جان بخشی کے لیے سردار تیمور کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوگا۔"

امیر قزغن نے اتنے زور کا قہقہہ بلند کیا کہ عبداللہ سہم گیا۔ اس قہقہے کی آواز دور دور تک پہنچی۔ سردار نے یہ آواز سنی، اس نے اس کی تقلید میں خود بھی پوری طاقت سے قہقہہ بلند کیا۔

تاتاریوں میں رواج تھا کہ جب حاکمِ وقت خوش ہو کر قہقہہ بلند کرے تو تمام لوگ اس کی آواز میں ملائیں۔ اس طرح دیر تک قہقہوں کا ایک تار سا بندھا رہتا تھا البتہ غصے میں لگائے جانے والے قہقہے نہیں ملائی جاتی تھی۔ وہ تو ایک قسم کا اعلانِ جنگ ہوا کرتا تھا۔ تمام سردار اسے سن کر تلواریں سونتتے اور حاکم کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔

"فاتحِ ہرات تیمور ہے اس لیے والیِ ہرات کی قسمت کا فیصلہ بھی اسی کو کرنا چاہیے تھا۔ چاہے قتل کر دیتا۔ ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوتا۔" امیر قزغن نے کہا۔

"اے امیر! یہ سوال وہاں بھی اٹھا تھا۔"

عبداللہ نے بتانا شروع کیا:

"والیِ ہرات نے قلعہ حوالے کرنے کی یہ شرط رکھی تھی کہ اس کی جان بخشی کا وعدہ کیا جائے۔ تیمور نے جواب دیا کہ وہ سولہ والیِ ہرات کے باقی تمام لوگوں کی جان بخشی کر سکتے ہیں اور اسے

امیر قزغن کے حضور پیش کیا جائے گا۔ اس لیے وہ والیِ ہرات کو گرفتار کر کے آپ کے پاس لا رہے ہیں۔"

"شاباش ہے تیمور۔ . . . . . تو واقعی گورگانِ اعظم کی اولاد ہے۔" امیر قزغن نے کہا۔

وہ اس خبر سے اس قدر خوش ہوا کہ اسی وقت اعلان کرا دیا کہ فاتح تیمور کا شایانِ شان استقبال کیا جائے۔

○

امیر قزغن اپنے لشکر کے ساتھ سمرقند سے سرائے سالی پہنچ چکا تھا۔ سرائے سالی کچی فصیلوں کا ایک پرانا شہر تھا جسے چنگیزی شہزادے، چغتائی نے اپنے دورِ حکومت میں تعمیر کیا تھا۔ مغلوں نے ایشیا اور مشرقی یورپ میں جو شہر خود آباد کیے انہیں سرائے کا نام دیا جیسے روس میں باتو خان نے سرائے باتو اور برقائی خان نے سرائے برقائی تعمیر کی تھی۔

مغل خیمہ نشیں تھے۔ ان کا زیادہ وقت گھوڑے کی پیٹھ پر گزرتا تھا۔ ان کے مفتوحہ علاقوں میں بڑے بڑے محل تھے لیکن وہ ان میں اس لیے قیام نہ کرتے تھے کہ محلوں میں رہنے سے سپاہی کاہل ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے کچے قلعے بناتے تھے۔

سرائے سالی پہنچ کر امیر قزغن نے اپنے تمام ماتحت سرداروں کو آگاہ کر دیا کہ وہ اپنے اپنے لشکر کے ساتھ سرائے سالی پہنچیں تاکہ اس متحدہ لشکر سے ہرات پر بھرپور وار کر کے اس کا قصہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ اب صورتِ حال تبدیل ہو چکی تھی۔ آگے بڑھنا بیکار تھا۔ تیمور نے ہرات کا معرکہ تنہا سر کر لیا تھا۔ اس نے فوری طور پر علاقائی سرداروں کو فتح کی خوشخبری کے ساتھ سرائے سالی آنے سے روک دیا کیونکہ اب ان کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

تمام سرداروں کو امیر قزغن کا دوسرا حکمنامہ مل گیا۔ "فتحِ ہرات" ان کے لیے انتہائی حیرت انگیز خبر تھی۔ تیمور کو فاتحِ ہرات کی حیثیت سے قبول کرنا ان کو سخت ناگوار گزرا۔ حیرت اور ناگواری کے ساتھ وہ تیمور کی بڑھتی ہوئی طاقت سے بھی خائف ہو گئے۔

امیر قزغن کا بڑا بیٹا مسلّا مر چکا تھا۔ چھوٹا بیٹا عبداللہ کمسن ہونے کے ساتھ ساتھ راگ رنگ اور حسین

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عورتوں کا ساتھ تھا۔ اس نے اب تک میدانِ جنگ کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ ان حالات میں ہر قبائلی سردار امیر قزغن کے بعد خود کو حاکمِ سمرقند ہونے کا حقدار سمجھتا تھا۔ اب تیمور کے اس طرح خاتون بننے سے ان کا ایک اور مدِمقابل پیدا ہو گیا تھا۔ امیر قزغن کے منع کرنے کے باوجود کئی سردار لشکر لے کر سراے مالی کی جانب چل پڑے تاکہ سمرقند کے قریب رہ کر حالات کا صحیح اندازہ کر سکیں۔ اور تیمور کو راستے سے ہٹانے کی کوئی تدبیر کریں۔ تیمور کے دو بڑے دشمن یعنی اس کا چچا حاجی برلاس اور جغتائی کا سردار بایزید ان میں پیش پیش تھے۔ یہ سردار تیمور کے واپس آنے سے پہلے ہی سراے مالی پہنچ گئے۔

امیر قزغن کو ان سرداروں کا آنا بہت ناگوار گزرا لیکن وہ مصلحتاً خاموش رہا۔ امیر قزغن، فاتحِ ہرات اور پُرجوش انداز میں استقبال کرنا چاہتا تھا جو ان سرداروں کی موجودگی میں ممکن نہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ سردار، تیمور کے خلاف دل میں کدورت رکھتے ہیں۔ امیر قزغن، تیمور کو بعض اعلیٰ اعزازات سے نوازنا چاہتا تھا لیکن اسے اب یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔

ہرات سے تیمور کی واپسی کی خبر سراے مالی پہنچی تو لوگوں میں جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ وہ تیمور کے استقبال کی تیاریوں میں لگ گئے۔ تیمور کی چہیتی بیوی الجائی خاتون، ننھے جہانگیر کو لے کر سراے مالی آ گئی۔ اس کے ساتھ قصرِ سفید کے بہت سے لوگ، شہرِ سبز کے شہزادے کو خوش آمدید کہنے وہاں پہنچ گئے۔ تیمور کا انتظار ہونے لگا۔ انتظار کی گھڑیاں بڑی سخت ہوتی ہیں۔ لوگوں کو ایک ایک پل کاٹنا مشکل ہو گیا۔

اُدھر تیمور نے اپنے پانچ سو جانبازوں کا دستہ ہرات کی حفاظت کے لیے چھوڑا۔ ملک معزالدین والیِ ہرات کے تمام خاندان والوں کو ایک محل میں پہنچایا گیا تاکہ ان کی طرف سے کوئی فتنہ نہ اٹھے۔ بقیہ لشکر تیمور اپنے ساتھ لے کر سراے مالی کی طرف چل دیا۔

تیمور نے ملک معزالدین کو حسبِ مرضی لباس زیبِ تن کرنے کی اجازت دی۔ اسے جسم پر اسلحہ سجانے سے بھی نہیں روکا گیا اور تیمور نے اس کا گھوڑا اپنے گھوڑے کے برابر رکھا تاکہ نہ تو ملک کو گمان ہو اور نہ دیکھنے والے یہ محسوس کر سکیں کہ ان کا حاکم قیدی کی حیثیت سے جا رہا ہے۔

تمام راستے تیمور، ملک معزالدین کی دلجوئی کرتا رہا اور اسے یقین دلاتا رہا کہ امیر قزغن مزدور اس کی جان بخشی کر دے گا۔

لشکر کے درمیان کچھ بند گاڑیاں بھی تھیں جن میں سے ایک میں ملکوتی اور اس کی والدہ سوار تھیں

باقی گاڑیوں میں ملک معزالدین کی وہ بیگمات اور کنیزیں تھیں جنھوں نے اپنے والی کو اس مصیبت کے وقت تنہا چھوڑنا پسند نہیں کیا تھا اور ضد کر کے اس کے ساتھ ہو لیں۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ ملک کے کسی بیٹے نے سراے مالی جانے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا۔ انھوں نے ہرات میں ٹھہرنے کو ترجیح دی اور باپ کو تنہا تیمور کے ساتھ بھیج دیا۔

امیر قزغن نے اپنے سرداروں کے ساتھ سراے مالی سے ایک میل آگے بڑھ کر تیمور کا استقبال کیا۔ جہاں تک نظر جاتی آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ استقبال کرنے والوں میں حاجی برلاس اور بایزید جلائر بھی تھے لیکن انہیں تیمور کا یہ عروج ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔

تیمور اور ملک معزالدین کے گھوڑے، لشکر کے آگے آگے تھے۔ ملک معزالدین کے ساتھ ہرات سے آنے والا واحد مرد، ہرات کا قاضی سیف الملک تھا۔ اس نے تیمور سے ملک کے ساتھ جانے کی اجازت لے لی تھی۔

امیر قزغن کے قریب پہنچ کر تیمور اور ملک معزالدین گھوڑوں سے اتر پڑے۔ امیر قزغن نے آگے بڑھ کر فرطِ محبت سے تیمور کو گلے لگایا اور اس کی پیشانی کے کئی بوسے لیے۔

والیِ ہرات ملک معزالدین سر جھکائے چپ چاپ کھڑا تھا۔ اس وقت قاضی سیف الملک آگے آئے۔ انہوں نے والیِ ہرات کی کمر میں لگی ہوئی تلوار اتار کر اسے بوسہ دیتے ہوئے امیر قزغن کے قدموں میں رکھ دی۔ یہ اطاعت اور فرمانبرداری کے اظہار کا روایتی طریقہ تھا۔

امیر نے معنی خیز انداز میں تیمور کی طرف دیکھا۔ تیمور نے کسی خاص ردِعمل کا اظہار نہیں کیا جس کا مطلب تھا کہ امیر قزغن چاہے تو والیِ ہرات کو معاف کر دے ورنہ اس کی تلوار سے اسے قتل کر دے۔ امیر قزغن کچھ دیر اپنی اکلوتی آنکھ بند کیے سوچتا رہا۔ پھر اس نے تیمور کو تلوار اٹھانے کا اشارہ کیا۔

تیمور کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ امیر قزغن نے دشمن کی تلوار کو ہاتھ نہیں لگایا تھا یعنی اس نے ملک معزالدین کو تلوار واپس کر کے اسے معاف کر دیا تھا۔ تیمور نے فوراً وہ تلوار زمین سے اٹھائی اور امیر قزغن کے سامنے کر دی۔ امیر قزغن نے تلوار کو چھو لیا۔ یہ قبولِ اطاعت کی مزید تصدیق تھی۔ تیمور نے تلوار قاضی صاحب کے حوالے کر دی۔ قاضی نے تلوار کو اس جگہ سے چھوا جہاں امیر قزغن کا ہاتھ لگا تھا۔ یہی عمل ملک معزالدین حسین نے دہرایا۔ قاضی نے تلوار ملک معزالدین کی کمر میں دوبارہ لگا دی۔ اس طرح سمرقند اور ہرات کی دشمنی ختم ہو گئی اور ملک کو شاہی مہمان کا درجہ حاصل ہو گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس رسم کی ادائیگی کے بعد سب لوگ جلوس کی شکل میں سرائے سالی کی طرف چل دیے۔ اس موقع پر یے شمال کے کوہستانی قبائل نے تیمور کی شان میں نغمے اور گیت موزوں کیے تھے جنہیں وہ جھانجر اور تاشے کی آواز کے ساتھ لہک لہک کر گانے لگے۔

عوام کا یہ خلوص اور محبت دیکھ کر تیمور کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ لوگ اس سے ملنے اور اس کے ہاتھ چومنے کے لیے ٹوٹے پڑتے تھے۔ مجبور ہو کر اس نے سواری چھوڑ دی اور اپنے شیدائیوں کے ساتھ پیدل چلتا ہوا سرائے سالی تک آیا۔

امیر قزغن نے والیِ ہرات کو معاف کر کے جس فراخدلی اور اعلا ظرفی کا ثبوت دیا تھا اس سے سب ہی خوش تھے، سوائے چند اُن امیروں کے، جو تیمور کے ساتھ ہر اہتوں سے نبرد آزما ہوئے تھے۔ عام لڑائیوں کے برعکس ہرات کی لڑائی کا مقصد لوٹ مار اور دولت اکٹھا کرنا ہوتا تھا۔ ایسے خیالات رکھنے والے بعض امیر تیمور کے لشکر میں بھی تھے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ہرات کے خلاف بڑی جانبازی اور بے جگری سے لڑے تھے لیکن جنگ کے بعد صلح ہو جاتے تو اس کی پابندی فرض ہو جاتی ہے۔ امیر تیمور نے ہرات میں لوٹ مار کی ممانعت کر دی تھی۔ اس کی خلاف ورزی کی۔ اس قدر گہری خاموشی طاری ہوئی جیسے وہاں کوئی متنفس سرے سے موجود ہی نہ ہو۔ لوگوں نے جیسے لیے ان امیروں کے ہاتھ کچھ نہیں آیا تھا اور اب امیر قزغن نے والیِ ہرات کو معافی دے دی تھی۔ اس کا بھی انہیں بہت روک لی تھیں۔ امیر قزغن اسی کڑک دار لہجے میں بولا:

تھا کہ ہرات کی حکومت سے تاوانِ جنگ بھی نہیں لیا جائے گا۔

بدظن امیروں نے رات کی ضیافت پر اس کا برملا اظہار بھی کیا۔ کھانے کے بعد ان میں سے ایک امیر نے تم اس کے تلوے چاٹتے تھے اور وہ تمہیں کتوں کی طرح دھتکارتا تھا۔ میں نے تم میں اتفاق پیدا کیا۔ تمہیں نے امیر قزغن سے کہا:

جھنڈے کے نیچے اکٹھا کیا اور تمہارے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال کر خانِ اعظم سے ٹکرا گیا۔ میرے جسم

"اے امیر! ہرات پر فوج کشی کرنے سے ہمیں کیا حاصل ہوا۔ میدان میں ہمارے کتنے ہی آدمی کام آئے، خونوں کے متر نشان ہیں۔ میری آنکھ جنگِ آزادی میں ضائع ہو گئی۔ میں نے تمہیں آزادی دلائی۔ تمہارا وقار

لیکن آپ نے والیِ ہرات کو معاف کر کے اس سے تاوانِ جنگ کا بھی مطالبہ نہیں کیا"۔

یا۔ اور اس کا صدمہ تم میرے رہے ہو کہ دشمن کے سامنے مجھے ذلیل کر رہے ہو۔ تم نے مجھے سمرقند اور تمام

دوسرے امیر کا لہجہ تلخ تھا:

کا سردار تسلیم کیا ہے۔ پھر مجھ سے اختلاف کیوں! میرے فیصلے کے خلاف تم نے آواز بلند کرنے کی کیسے

"والیِ ہرات کا سر قلم کر کے اس کی دولت پر قبضہ کرنا چاہیے"۔

ل؟ یاد رکھو، ہر جنگ دولت کے لیے نہیں لڑی جاتی۔ بعض لڑائیاں عزت اور وقار کے لیے بھی لڑنا

بولنے والوں کا حوصلہ بڑھ گیا:

پ۔ میں نے والیِ ہرات کو معاف کر کے دشمنی کا وہ ناسور بند کیا ہے جو ہماری جنوبی اور مشرقی سرحدوں

"ہرات سے زیادہ کوئی ریاست دولت مند نہیں۔ ہرات کی تمام دولت لشکر میں تقسیم ہونی چاہیے"۔ شندوں کو کھائے جا رہا تھا۔ دشمن اگر دوستی کا خواہاں ہو تو اس سے انکار کرنا مصلحت کے سراسر

تیسرے نے کہا۔ ہے۔"

والیِ ہرات ملک معز الدین حسین اور اس کا قاضی بھی اس دعوت میں شریک تھے۔ انہوں نے امیروں فتنہ بظاہر دب گیا۔ کسی نے امیر قزغن کو جواب دینے کی جرأت نہیں کی۔ امیر قزغن دل میں خوش تھا کہ

ربگڑے دیکھے تو سمجھے کہ اب جان کی خیر نہیں۔

تیمور معزز مہمانوں میں موجود اپنے لالچی امیروں کی اس چھچھوری حرکت سے مارے شرم کے، پانی ہوا جا رہا تھا۔ اسے غصہ بھی بہت آ رہا تھا۔ اگر امیر قزغن موجود نہ ہوتا تو تیمور بے دھڑک ایسے تمام

ں کی گردنیں اڑا دیتا۔

امیر قزغن بھی بڑی ندامت مگر تحمل سے امیروں کی باتیں سن رہا تھا۔ کچھ اور امیروں نے بھی ان کی ہاں

ہاں ملائی۔ والیِ ہرات کا سر قلم کرنے کا مطالبہ کیا اور ہرات کی دولت پر اپنا حق جتایا۔

جب سب اپنی اپنی بولیاں بول کر چپ ہو گئے تو امیر قزغن نے حاضرین پر ایک نظر ڈالی اور شیر کی

"کسی کو کچھ اور بھی کہنا ہے؟"

امیر کا لہجہ اتنا تند و تیز تھا کہ لالچی امیر لرز گئے۔ سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ کسی نے مزید بولنے کی

ہمت نہ کی۔ اس قدر گہری خاموشی طاری ہوئی جیسے وہاں کوئی متنفس سرے سے موجود ہی نہ ہو۔ لوگوں نے جیسے

لیے ان امیروں کے ہاتھ کچھ نہیں آیا تھا اور اب امیر قزغن نے والیِ ہرات کو معافی دے دی تھی۔ اس کا بھی انہیں بہت روک لی تھیں۔ امیر قزغن اسی کڑک دار لہجے میں بولا:

"تم لوگ لالچی اور احسان فراموش ہو۔ تم وہ دن بھول گئے جب تم بلادِ شمال کے چنگیزی خانِ اعظم کے غلام

تھے اور وہ تمہیں کتوں کی طرح دھتکارتا تھا۔ میں نے تم میں اتفاق پیدا کیا۔ تمہیں

جھنڈے کے نیچے اکٹھا کیا اور تمہارے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال کر خانِ اعظم سے ٹکرا گیا۔ میرے جسم

"اے امیر! ہرات پر فوج کشی کرنے سے ہمیں کیا حاصل ہوا۔ میدان میں ہمارے کتنے ہی آدمی کام آئے، خونوں کے متر نشان ہیں۔ میری آنکھ جنگِ آزادی میں ضائع ہو گئی۔ میں نے تمہیں آزادی دلائی۔ تمہارا وقار

لیکن آپ نے والیِ ہرات کو معاف کر کے اس سے تاوانِ جنگ کا بھی مطالبہ نہیں کیا"۔

یا۔ اور اس کا صدمہ تم میرے رہے ہو کہ دشمن کے سامنے مجھے ذلیل کر رہے ہو۔ تم نے مجھے سمرقند اور تمام

کا سردار تسلیم کیا ہے۔ پھر مجھ سے اختلاف کیوں! میرے فیصلے کے خلاف تم نے آواز بلند کرنے کی کیسے

ل؟ یاد رکھو، ہر جنگ دولت کے لیے نہیں لڑی جاتی۔ بعض لڑائیاں عزت اور وقار کے لیے بھی لڑنا

پ۔ میں نے والیِ ہرات کو معاف کر کے دشمنی کا وہ ناسور بند کیا ہے جو ہماری جنوبی اور مشرقی سرحدوں

شندوں کو کھائے جا رہا تھا۔ دشمن اگر دوستی کا خواہاں ہو تو اس سے انکار کرنا مصلحت کے سراسر

ہے۔"

فتنہ بظاہر دب گیا۔ کسی نے امیر قزغن کو جواب دینے کی جرأت نہیں کی۔ امیر قزغن دل میں خوش تھا کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس بڑھاپے میں بھی تاتاری امیروں اور سرداروں پر اس کا رعب و دبدبہ اب تک طاری ہے لیکن تیمور کی حس تیزی سے کام کر رہی تھی۔ اس نے امیروں کے تیور دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ آج کی یہ چنگاری وقت بھڑک کر شعلہ بھی بن سکتی ہے۔

اس نے موقع پا کر امیر قزغن سے کہا:

"اے امیر۔ مجھے بکھرے ہوئے برلاس قبائل کی قیادت سنبھالنے کی اجازت دی جائے۔"

"ابھی کیا جلدی ہے۔"

امیر قزغن نے قدرے ناگواری سے جواب دیا:

"ایک نہ ایک دن تم ہی ان کے سردار بنو گے۔"

○

تاتاریوں میں عبداللہ اور تمور یا تیمور نام بہت عام تھے۔ ہر قبیلے میں یہ نام کئی کئی آدمیوں کے ہوتے۔ بلادِ شمال کے چغتائی خانِ اعظم کا نام تغلق تمور خان تھا۔ تیمور کے دو چھوٹے سردار دوں کے تھے۔ امیر قزغن کے چھوٹے بیٹے کا نام بھی عبداللہ ہی تھا۔ عبداللہ امیر قزغن کی بڑھاپے کی اولاد تھا۔ بڑی شکیل و جمیل صورت پائی تھی۔ عورتیں اسے یوسفِ ثانی کہتیں اور کنواریاں اسے دیکھ کر آہیں بھرتیں۔ عبداللہ کے رنگ ڈھنگ بچپن ہی سے نرالے تھے۔ اسے تلوار کے بجائے ساز پسند تھے۔ گھوڑے پر بیٹھنا اس کے لیے ایک تکلیف دہ بات تھی۔

امیر قزغن نے اس کے بچپن کی شوخیاں تو کسی نہ کسی طرح برداشت کر لیں لیکن جب اس نے جوانی میں قدم رکھا اور اس کے طور طریقوں میں تاتاری شان نہ پیدا ہوئی تو امیر قزغن کے کان کھڑے ہوئے۔ عبداللہ ہی اس کی امیدوں کا چراغ تھا۔ امیر کا بڑا بیٹا عرصہ ہوا مر چکا تھا اور پوتا یعنی الجائی خانزادہ علی حسین دور کابل میں ایک چھوٹے سے علاقے کا حاکم تھا۔ امیر قزغن عبداللہ کو اپنا ولی عہد بنانا تھا لیکن عبداللہ کو شراب و کباب اور شاہدانِ بازاری کی صحبتیں پسند تھیں۔ اس کی نظر میں حسین فتنے لیتیں اور اسے رموزِ مملکت یا امورِ سلطنت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

ایک روز امیر قزغن نے اپنے بیٹے کو سمجھایا:

"عبداللہ! وہی ہاتھ عنانِ حکومت سنبھال سکتے ہیں جو تلوار پکڑنا جانتے ہوں۔"

"ابھی میری عمر ہی کیا ہے..... صرف اٹھارہ سال۔"

عبداللہ نے ہنس کر جواب دیا:

"اللہ آپ کی عمر دراز کرے۔ میں ابھی سے حکومت کی فکر کیوں کروں؟"

امیر قزغن دل مسوس کر رہ گیا۔ اس کا جی چاہا کہ عبداللہ سے کہے کہ اٹھارہ سال کی عمر میں تو طرغائی خان کے بیٹے تیمور نے فاتحِ ہرات کا خطاب حاصل کر لیا ہے مگر وہ یہ نہ کہہ سکا بلکہ اس نے اسے بڑی نرمی سے سمجھایا:

"تو جوان ہو گیا ہے۔ چھوٹی موٹی جنگوں میں حصہ لیا کر۔ میری زندگی کا کیا بھروسہ۔ قبر میں پیر ہیں۔ آج مرا کل دوسرا دن۔"

اسی وقت ایک چنچل اور شوخ ادا کنیز اٹھلاتی ہوئی شہزادے کے پاس آ کر بولی:

"شہزادے بہادر محفل تیار ہے۔ آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔"

شہزادہ باپ کو جواب دیے بغیر کنیز کا ہاتھ تھام کر اٹھ کھڑا ہوا اور یونہی ہاتھ پکڑے ہوئے اس فتنۂ قیامت کے ساتھ چلا گیا۔ امیر قزغن اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ پھر وہ غصے میں پیر پٹختا ہوا اٹھ گیا۔ اس نے قسم کھائی کہ آئندہ وہ شہزادے کے محل میں کبھی نہیں آئے گا۔

سرائے سمالی ایک کچا قلعہ تھا لیکن شہزادے نے اس کے ایک حصے میں اپنے لیے ایک عالی شان محل بنوایا تھا۔ آخر عبداللہ، حاکم سمرقند کا بیٹا تھا۔ اس کا حکم ہر جگہ چلتا تھا۔ اس کے کہنے پر اس محل کو نادر اور نایاب چیزوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ قالینوں کا فرش، ریشمی پردے، گنگا جمنی ظروف۔ غرض یہ کہ آرائش کا ہر سامان موجود تھا۔ سب سے بڑھ کر اس محل کے حسن کو چار چاند لگانے والا ان ماہ لقا اور دل رُبا کنیزوں کا طائفہ تھا جو اس کے حواریوں اور خوشامدیوں نے اس محل میں جمع کر دیا تھا۔ ہر شہر اور ہر قبیلے کی حسین ترین کنیز اس طائفے میں موجود تھی۔ یہ کنیزیں ہنستی اور اٹھکیلیاں کرتی جس سمت سے گزرتیں، یوں معلوم ہوتا جیسے پریاں محوِ پرواز ہیں۔ کنیزیں پریاں تھیں اور عبداللہ راجہ اندر..... رات دن رقص و سرود کی محفلیں جمتیں۔ تقرئی قہقہوں سے فضا گونجتی رہتی۔ قزغن شراب نہیں پیتا تھا اور نہ ہی اس کے دربار میں کسی کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شراب پینے کی اجازت تھی لیکن عبداللہ کو کون روکتا اور اس کا ہاتھ کون پکڑتا۔ وہ تو مستقبل کا متوقع حا
تھا۔

عبداللہ کے اطوار بگاڑنے میں تاتاری قبائل کا سب سے زیادہ ہاتھ تھا۔ ہر قبیلے کا سردار
کے بعد خود کو وارث سمجھتا تھا۔ انہیں اگر کچھ خطرہ تھا تو صرف عبداللہ سے۔۔۔۔۔ اس لیے ان کی اجتما
تھی کہ کمسن شہزادے کو امورِ سلطنت اور میدانِ جنگ سے جس قدر دور رکھا جائے اتنا ہی بہتر
عبداللہ کو رنگ رلیاں منانے کی کھلی چھٹی ایک گہری سازش کے تحت دی گئی تھی۔ عبداللہ کے کارند
سے جنوب اور مشرق سے مغرب، تمام تاتاری علاقوں میں گھومتے پھرتے اور جہاں بھی انہیں کوئی حسین د
دکھائی دیتی وہ اسے زبردستی اٹھا لیتے۔ اس قسم کے واقعے جب مختلف علاقوں میں پیش آتے اور غری
قبیلے کے سردار کے پاس شکایت لے کر جاتے تو متعلقہ سردار اس کا تدارک کرنے یا امیر قزغن کو اس
زیادتی کی خبر پہنچانے کے بجائے کچھ لے دے کے مغویہ کے والدین کو خاموش کر دیتے۔

امیر قزغن کو بیٹے کی بے راہ روی اور عیاشیوں کا تو علم تھا لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ عبداللہ
کنواری لڑکیوں کو ان کے گھروں سے اٹھوانے کا انتظام بھی کر رکھا ہے۔

ظلم اور زیادتی زیادہ دنوں تک نہیں چلا کرتی اور اس کا پردہ ایک نہ ایک دن فاش ہو کر رہتا
اسی دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے نہ صرف امیر کو عبداللہ کی طرف سے بالکل مایوس کر دیا بلکہ
وقار کو بھی زبردست دھچکا پہنچایا۔

والیِ ہرات کے ساتھ مکوتی اور اس کی والدہ بھی سرائے سمالی آئی تھیں۔ عبداللہ نے اس کی
وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے اس کا وطن بلخ دکھائے گا اور اگر ممکن ہو سکا تو قبیلہ اوجاتی بوغاتی کے سردار سلو
بھی اس کی ملاقات کرائے گا۔ سلووز مکوتی کی والدہ کا دیور تھا۔ ہر چند کہ سلووز نے مکوتی کی ماں پر ڈا
کیا تھا اور سرداری کے لالچ میں آ کر اسے بلخ سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن اس بات کو اب
زمانہ گزر چکا تھا اور نفرت کے جذبات ٹھنڈے پڑ چکے تھے۔

عبداللہ نے مکوتی کی ماں کو یہ بھی بتایا تھا کہ سلووز اپنے کیے پر نادم ہے اور اب گوشہ نشی
زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس لیے بھی مکوتی کی ماں کے دل میں سلووز سے ملنے کی خواہش پیدا ہو گئی تھی
عبداللہ مکوتی کا طلب گار تھا اس نے سردار تیمور کو مکوتی اور اس کی والدہ کے بارے میں تمام حالات

سمجھ دیا تھا اور ایک دن موقع پا کر یہ بات تیمور کے کان میں بھی ڈال دی۔

تیمور کے دل میں اس بزرگ تاتاری خاتون کا بڑا احترام تھا۔ اس کی بھی خواہش تھی کہ دیور اور بھاوج کو جلد از جلد ملا کر ان کے درمیان صلح و صفائی کرا دی جائے لیکن والیِ ہرات ابھی تک امیر قزغن کا مہمان تھا اور بعض امیروں کے منہ اب تک ٹیڑھے تھے لہٰذا اس نے عبداللہ کی بات فوراً مان لی اور وعدہ کیا کہ والیِ ہرات کے واپس جاتے ہی نہ صرف ان دونوں کی ملاقات کا بندوبست کر دے گا بلکہ خود ان کے ساتھ بلخ جائے گا۔

والیِ ہرات ملک معزالدین حسین کی مہمانداری کچھ زیادہ ہی طویل ہو گئی اور تیمور نے دیکھا کہ والیِ ہرات کی واپسی کا مسئلہ ابھی کھٹائی میں پڑا ہے تو اس نے عبداللہ کو بلخ جانے کی اجازت دے دی۔ مکوتی اپنی بیمار ماں کو تنہا کیسے سفر کرنے دیتی۔ وہ بھی ساتھ چلنے پہ آمادہ ہو گئی۔ عبداللہ کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا وہ تو دل سے یہی چاہتا تھا۔

مکوتی شہسواری اور شمشیر زنی سے واقف تھی۔ مکوتی کی ماں کو ایک گاڑی میں بٹھایا گیا۔ عبداللہ نے مکوتی کو بھی گاڑی میں بیٹھ کر سفر کرنے پر آمادہ کرنا چاہا مگر وہ نہ مانی اور الگ گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ سفر شروع ہوا۔ عبداللہ اور مکوتی گھوڑے سے گھوڑا ملائے آگے آگے چل رہے تھے۔ یہ لوگ دوپہر کو چلے تھے۔ رات ہوئی تو ایک سرائے میں قیام کیا۔

تیمور نے عبداللہ سے کہہ دیا تھا کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو اپنے ساتھ دو سواروں کو بھی لے جائے۔ مگر عبداللہ نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ اپنا ملک اور دیکھے بھالے راستے تھے پھر ڈر کس بات کا؟ اور وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کی تنہائی میں کوئی مخل ہو۔ عبداللہ کی اس غلط سوچ نے بالآخر اسے ایک ناگہانی میں مبتلا کر دیا۔

رات خیریت سے گزر گئی۔

صبح کو گاڑی تیار کی گئی۔ مکوتی کی ماں کو اس میں سوار کیا گیا۔ عبداللہ اور مکوتی اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر گاڑی کے آگے آگے چلنے لگے۔

یہ لوگ ابھی سرائے سے سو گز بھی دور نہیں گئے تھے کہ پندرہ سوار گھوڑے اڑاتے سامنے سے آتے دکھائی دیے۔ وہ سب کے سب مسلح اور پلے ہوئے سانڈوں کی طرح موٹے تازے تھے۔ انہوں نے آتے ہی عبداللہ اور مکوتی کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ خطرہ محسوس کرتے ہی عبداللہ اور مکوتی نے تلواریں نکال لیں۔ سواروں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کا سردار گھوڑا بڑھا کر عبداللہ کے پاس آیا اور تحکمانہ لہجے میں بولا:

"یہ لڑکی کون ہے؟"

اس کا اشارہ ملکوتی کی طرف تھا۔

"تُو پوچھنے والا کون ہوتا ہے؟" عبداللہ نے بھی اسی سختی سے کہا۔

سردار ایک کمردہ قہقہہ لگا کر بولا:

"میں شہزادہ عبداللہ ولی عہد سمرقند کے محافظ دستے کا سردار ہوں۔ اگر مجھے نہیں جانتا تو تُو تاتاری نہیں تو کوئی کافر بچہ ہے۔"

عبداللہ کو غصہ آگیا۔ کڑک کر جواب دیا:

"منہ سنبھال کر بول۔ ورنہ تیری زبان کھینچ لوں گا۔ تو عبداللہ کے محافظ دستے کا سردار ہے تو بھی تاج ہرات، امیر تیمور کی فوج کا سالار ہوں۔"

تیمور کے نام پر سردار چونک پڑا۔ وہ کچھ دیر عبداللہ کو گھورتا رہا۔ پھر بولا:

"لیکن یہ لڑکی کون ہے اور تُو اسے کہاں سے بھگا کر لایا ہے۔"

ملکوتی کو سردار کی بات بہت ناگوار گزری۔ اس نے چیخ کر کہا:

"تو کیوں بکواس کر رہا ہے۔ مجھ سے پوچھ۔ میں اس کی بیوی ہوں۔"

"میں کیسے یقین کر لوں کہ تو اس کی بیوی ہے۔"

اس وقت ملکوتی کی ماں نے دخل دیا۔ گاڑی سے گردن نکال کر بولی:

"بھائی کیوں الجھ رہا ہے۔ میں بلخ کے سردار کی بھاوج ہوں۔ سردار سلوز سے ملنے جا رہی ہوں۔ یہ میری بیٹی ملکوتی ہے۔"

سردار نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا:

"اتنی حسین لڑکی کی جگہ تو ہمارے شہزادے کی حرم سرا ہے۔ یہ ایک معمولی رسالدار کی بیوی کیسے ہو سکتی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ ملکوتی کی طرف بڑھا۔

ملکوتی کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ اس نے سردار پر بھرپور وار کیا۔ وار جلدی میں کیا گیا تھا۔ ملکوتی کا

سردار پر پڑنے کے بجائے اس کے گھوڑے پر پڑا اور زخمی گھوڑا سردار کو دور بھگا لے گیا۔

شہزادے کے یہ محافظ دراصل اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جنہیں شہزادے نے لڑکیاں پکڑنے کے لیے مقرر کیا تھا۔ یہ لوگ بھوکے بھیڑیوں کی طرح شہر شہر منڈلاتے رہتے اور جو غریب اور بے کس لڑکی ہتھے چڑھ جاتی اسے اٹھا لاتے تھے۔

سردار نے اپنے سواروں کو حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ سوار ان دونوں پر پل پڑے۔ شمشیر چلانا صرف عبداللہ جانتا تھا۔ چلتے وقت اس نے اپنی کمان بھی ساتھ نہیں لی تھی۔ ملکوتی کو تلوار چلانا بس واجبی سی آتی تھی۔ دس پندرہ منٹ کی لڑائی میں عبداللہ کو کئی زخم آگئے اور ملکوتی کو پکڑ لیا گیا۔

ملکوتی کی ماں چیختی چلاتی ہی رہ گئی۔ سوار ملکوتی کو لے کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ عبداللہ نے ان کا پیچھا کرنا چاہا مگر وہ زخموں سے چور تھا اس لیے غش کھا گیا۔

ایک سرائے سامنے ہی تھی۔ اگر سرائے والے ہمت کرتے تو وہاں پندرہ بیس آدمی موجود تھے جو عبداللہ کی مدد کو آسکتے تھے لیکن وہ درندہ صفت لٹیروں سے سبھی واقف تھے۔ سب لوگ سرائے میں دبکے بیٹھے رہے۔ کسی نے باہر آنے کی ہمت نہ کی۔

عبداللہ بے ہوش ہو کر گھوڑی سے لٹک گیا۔ چیختے چیختے ملکوتی کی ماں کا گلا دکھ گیا۔ سوار ملکوتی کو لیکر دور نکل گئے تو سرائے والوں کو کچھ رحم آیا اور وہ ایک ایک کر کے گاڑی کے پاس آئے۔ عبداللہ کو گھوڑی سے جدا کر کے اس پر پانی کے چھینٹے ڈالے۔ اسے ہوش آیا تو اس نے ملکوتی کے بارے میں پوچھا۔ لوگوں نے بتایا کہ ملکوتی کو شہزادے عبداللہ کے سوار لے گئے ہیں۔ ان درندوں سے اسے بچانا یا واپس لانا ممکن نہیں ہے۔ عبداللہ اور ملکوتی کی ماں پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ یکایک عبداللہ کو کچھ خیال آیا۔ اس نے سرائے والوں سے کہا:

"بھائیو۔ میں جانتا ہوں تم شہزادے عبداللہ سے ڈرتے ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ تم اس کی مخالفت مول لو۔ لیکن اگر تمہارے دلوں میں ذرا بھی انسانی ہمدردی ہے تو میرا ایک کام کر دو۔"

"ان سے لڑنے کے علاوہ اور کوئی خدمت ہو تو کہو۔ میں آمادہ ہوں۔" ایک آدمی ہمت کر کے بولا۔

عبداللہ نے کہا:

"بھائی صرف اتنا کرو کہ ایک آدمی سرائے سالار چلا جائے۔ وہاں میرا آقا امیر تیمور موجود ہے۔ اس سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جا کر صرف یہ کہہ دے کہ اس کے رسالدار عبداللہ پر راستے میں قیامت ٹوٹی ہے۔ ہرات کی شہزادی کو شہزادے کے آدمی زبردستی لے گئے ہیں۔ اس کی جان اور عزت کی حفاظت کی جائے۔"

تیمور کا نام سن کر کئی آدمی سرائے سالی جانے پر آمادہ ہو گئے۔ تیمور فاتحِ ہرات تھا۔ اس کا نام دور دور تک مشہور ہو گیا تھا اور لوگ اس سے غائبانہ طور پر محبت کرنے لگے تھے۔ ان میں سے دو آدمی سرائے سے گھوڑے لے کر آ گئے۔ اور سرائے سالی جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

عبداللہ نے ان سے کہا:

"بھائیو۔ اگر ممکن ہو تو کسی ایسے راستے سے جاؤ کہ ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی میرے آنے کی خبر پہنچ جائے تاکہ وہ شہزادی کی حفاظت کر سکیں۔"

"میں ایسا راستہ جانتا ہوں۔"

ایک سوار نے کہا اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ دوسرا سوار بھی اس کے ساتھ ہو لیا۔ دونوں سوار سالی کی طرف روانہ ہو گئے۔ باقی لوگوں نے عبداللہ اور بڑھیا کو سنبھالا۔ انہیں سرائے میں لائے اور ان کی مرہم پٹی کرائی گئی۔ ملکوتی کی ماں غموں سے پہلے ہی نڈھال تھی۔ اس تازہ غم نے اس کی حالت بالکل غیر کر دی۔

عبداللہ خدا سے دعا کرتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر تیمور کو بروقت خبر ہو گئی تو کوئی ملکوتی کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ تیمور، ملکوتی کو ظالموں کے پنجے سے ضرور چھڑا لے گا خواہ اسے اس سلسلے میں امیر قزغن سے کیوں نہ جنگ کرنی پڑے۔

جس وقت تیمور کو عبداللہ کے حادثے کی خبر ملی وہ اپنی بیوی الجائی خاتون کو سرائے سالی سے شہر واپس بھیج رہا تھا۔ تیمور کو بہت کم غصہ آتا تھا اور جب آتا تھا تو وہ خود بھی اس پر قابو نہ رکھ پاتا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ہونٹ پھڑکنے لگے۔ وہ جلدی سے خیمے میں گیا۔ ڈھال بازو پر چڑھائی۔ کمان کندھے پر لٹکائی، نیام خیمے ہی میں پھینک دی۔

الجائی خاتون کلمے پڑھنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ تیمور کی یہ حالت، قیامت کا شاخسانہ ہے۔ نہ معلوم آج کتنے قلم ہوں گے اور کتنا خون بہے گا۔

تیمور نے بیوی کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ بڑھ کر گھوڑے پر بیٹھا۔ قاصدوں کو ساتھ آنے کا

کیا۔ الجائی خاتون نے سفر ملتوی کر دیا۔

تیمور دونوں قاصدوں کے ساتھ سرائے سالی کے اس حصے کی طرف بڑھا جہاں امیر قزغن کے رنگین مزاج بیٹے شہزادے عبداللہ نے اپنی عشرت گاہ تعمیر کی تھی۔

تیمور سرائے سالی کے حالات سے زیادہ واقف نہ تھا اور نہ ہی اس نے عبداللہ کو اب تک دیکھا تھا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ عبداللہ کمسن ہے۔ کمسن کی عمر اس کے ذہن میں دس گیارہ سال سے زیادہ نہ تھی لیکن قاصدوں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ اس کے عشرت کدوں میں چھپی ہوئی تمام داستانیں بے نقاب کر دیں۔

تیمور، عبداللہ کے محل پہنچ کر اندر جانے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ وہ سوار دور سے آتے دکھائی دیے جو ملکوتی کو لا رہے تھے۔ ایک سوار نے زبردستی ملکوتی کو اپنے آگے بٹھا رکھا تھا۔ ملکوتی کو اس حالت میں دیکھ کر تیمور کی جو کیفیت ہوئی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

ملکوتی نے تیمور کو دیکھا تو اس کے آنسو نکل آئے۔ تیمور نے کمان کاندھے سے کھینچی اور پھر یوں محسوس ہوا جیسے تیر خود بخود اس میں آ کر جڑ گیا ہے۔ ٹھائیں کی آواز پیدا ہوئی اور تیر اس سوار کی پیشانی میں پیوست ہو گیا جو ملکوتی کو پکڑے ہوئے تھا۔

تیمور کی تیر اندازی کا کمال تھا کہ ملکوتی سوار کے آگے بیٹھی تھی۔ اس کا سر سوار کے سر سے صرف چھ انچ نیچے تھا اور سوار کی پیشانی صرف تین انچ اوپر تھی لیکن تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا اور سوار لڑکھڑا کر جھول گیا۔

باقی سواروں نے تیمور کو گھیرنے کی کوشش کی لیکن وہ تو چھلاوا اور شعلہ تھا جو کبھی ادھر بھڑکتا تو کبھی ادھر۔ عبداللہ کے سواروں کو تیمور کی طاقت اور مہارت کا اندازہ نہیں تھا۔ انہوں نے صرف اس کا نام ہی سنا تھا۔ ان کے لیے تو جو کچھ بھی تھا وہ شہزادہ عبداللہ تھا جو ان کا اَن داتا اور مالک تھا۔ اسی کے اشارے پر وہ اودھم مچاتے تھے اور دندناتے پھرتے تھے۔ تیمور کے پاس نیام نہیں تھی۔ تیر چلاتے وقت اس نے تلوار دانتوں میں دبا لی تھی۔ سوار اس کے قریب پہنچ گئے تو تیمور نے کمان کاندھے پر ڈالی اور تلوار لیکر ان پر ٹوٹ پڑا۔ چشم زدن میں سات سوار اس کی تلوار کا لقمہ بن گئے۔ پانچ گھوڑے گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے اور تین گھوڑے چھوڑ کر محل میں گھس گئے۔

تیمور خون آلود تلوار لیے ان کے تعاقب میں محل میں داخل ہو گیا۔ کنیزوں اور غلاموں میں بھگدڑ مچ گئی۔ ایک کمرے میں محفلِ عیش جمی ہوئی تھی۔ ساز چھڑے ہوئے تھے اور نازک اندام لونڈیاں ساقی گری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر رہی تھیں اور رقاصائیں محوِ رقص تھیں۔ شہزادہ عبداللہ ساگر ہاتھ میں لیے ان کے درمیان راہ بنا بیٹھا تھا۔ اس نے جو شور و غل سنا تو گھبرا کر کمرے سے نکل آیا۔

سامنے، تیمور بھاگنے والے تینوں سواروں کو گھیرے ہوئے تھا۔ سوار اپنی جانیں بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ جدھر وہ جاتے تیمور کو سدِّ راہ پاتے۔ ان میں سے ایک مارا گیا، اور پھر آخری سوار کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

شہزادہ عبداللہ نے یہ منظر دیکھا تو حواس باختہ ہو گیا۔ سواروں کو ختم کرنے کے بعد تیمور نے رخ کیا تو اس کا جسم اور ہاتھ کانپنے لگے۔ ساغرِ فرش پر گر کر چور چور ہو گیا اور اس کا رنگ ہلدی کی زرد نظر آنے لگا۔ تیمور، خون آلود تلوار لیے عبداللہ کے قریب پہنچ گیا۔ لباس اور وضع قطع سے وہ شہزادہ کے پہچاننے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔

تیمور اسے گھورتے ہوئے بولا:

"تم ہو عبداللہ۔ امیر قزغن کے بیٹے؟"

دہشت کی وجہ سے عبداللہ کی آواز نہ نکلی۔ وہ صرف اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

تیمور گرجا:

"ڈوب مرو چلو بھر پانی میں۔ جس کے باپ کی تلوار، تمام تاتاری سرداروں کو دیا ہے ہوئے کے بیٹے کے ہاتھ میں شراب کا پیالہ۔ لعنت ہے تمہاری بدکاریوں پر۔"

عبداللہ خوف سے کانپتا رہا۔ اس کے منہ سے آواز بھی نہ نکل سکی۔ محل کی کنیزیں کمروں کے دروازوں سے باہر جھانک رہی تھیں۔ مرچی اور غازہ میں لتھڑے ہوئے رقاصاؤں کے چہرے پسینے سے تر ہو کر رنگ گڈمڈ ہو گئے تھے۔ سب کو اپنی اپنی جان کی فکر تھی۔

"اگر تم میرے آقا امیر قزغن کے بیٹے نہ ہوتے تو میں تمہارا سر بھی اسی طرح قلم کر دیتا جیسے تمہارے پندرہ سواروں کے کیے ہیں۔ افسوس وہ شہزادہ جسے تیروں کی بارش میں مسکرانا چاہیے تھا، چنگ و رباب کے تاروں میں ڈھال رہا ہے۔ عبداللہ تم امیر قزغن کے ماتھے کا کلنک ہو۔ تاتاریوں کی بہادری اور شجاعت پر ایک بدنما دھبہ ہو۔"

تیمور گرج رہا تھا۔

شہزادہ عبداللہ، تیمور سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا لیکن اُس نے اس بہادر سردار کے قصے ضرور سُنے تھے۔ تیمور جس وقت تلوار سونتے محل میں داخل ہوا تھا اس وقت ہر طرف "تیمور۔ تیمور" کا شور بلند ہوا تھا۔ عبداللہ نے تیمور کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا کہ یہ شخص سوائے تیمور کے اور کوئی نہیں ہو سکتا ورنہ اس محل میں داخل ہونا تو کجا، لوگ وہاں سے تڑا کے نظارہ کرتے تھے۔

عبداللہ نے بڑی عاجزی سے کہا:

"بہادر تیمور! مجھے معاف کر دو۔ میں واقعی بہت بُرا ہوں۔"

"اگر تم اپنے کیے پر نادم ہو تو ان تمام لڑکیوں کو آزاد کر دو جنہیں تمہارے آدمیوں نے زبردستی حاصل کر کے اس محل میں قید کر رکھا ہے۔ وہ غریب رعیت کی بیٹیاں ہیں لیکن وہ بھی اسی طرح عزت دار اور شریف ہیں جس طرح ہماری اور تمہاری بہنیں اور بیٹیاں۔"

عبداللہ پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ سر جھکا کر بولا:

"تمہارے حکم کی تعمیل ہو گی۔ شام ہونے تک تمام لڑکیاں آزاد کر کے ان کے گھروں کو بھیج دی جائیں گی۔"

عبداللہ نے اس پر عمل بھی کیا۔ اس نے تمام لڑکیوں کو بلا کر ان کے گھروں کے پتے پوچھے اور پھر غروبِ آفتاب سے قبل ہی تمام لڑکیاں، عبداللہ کے محل کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ گئیں۔

تیمور وہاں سے نکل کر باہر آیا تو دو قاصد اور ملکوتی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ تیمور انہیں ساتھ لے کر اپنے خیمے پر آیا۔ الجائی خاتون ڈری سہمی، اب تک اسی جگہ موجود تھی جہاں تیمور اسے چھوڑ گیا تھا۔ الجائی خاتون کو دیکھ کر تیمور کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تو الجائی کا دل بھی کھل اٹھا۔

تیمور نے اپنے سوار ملکوتی اور قاصدوں کے ساتھ کر دیے اور عبداللہ کو پیغام دیا کہ وہ سفر جاری رکھے اور ملکوتی کی ماں کو بلخ تک ضرور لے کر جائے۔ ملکوتی، تیمور کا شکریہ ادا کر کے واپس چلی گئی تو تیمور نے الجائی خاتون کو اس حادثے کی تفصیل بتائی جو ملکوتی اور عبداللہ پر گزرا تھا۔ پھر وہ دونوں دیر تک شہزادے کی بے راہ روی پر افسوس کرتے رہے۔

الجائی خاتون شہر سبز واپس چلی گئی۔

کئی دن گزر گئے لیکن تیمور نے امیر قزغن سے اس واقعے کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ پھر اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بات کو ایک، زمانہ گذر گیا۔ امیر قزغن نے نہ تو کبھی تیمور سے پوچھا اور نہ ہی تیمور نے اسے شہزادہ
ناشائستہ حرکتوں سے آگاہ کیا۔

○

امیر قزغن کا خیال تھا کہ اس کے مخالف امیروں کے جذبات وقت کے ساتھ ساتھ ٹھنڈے
گے اور والیِ ہرات کے خلاف بھڑکے ہوئے جذبات ختم ہو جائیں گے۔ اسی لیے اس نے والیِ ہرات کو
پاس ٹھہرا رکھا تھا لیکن اس کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔

باغی امیروں میں آہستہ آہستہ کھچڑی پکتی رہی اور نفرت کم ہونے کے بجائے بڑھتی چلی گئی۔
نے ہرات جانے والے امیروں کو اپنی طرف سے کافی مال و زر سے نوازا مگر جو نفرت ان کے دل میں
وہ نکل نہ سکی۔ اب تو اسے یہاں تک محسوس ہونے لگا کہ یہ لوگ والیِ ہرات کی ناک میں ہیں اور موقع
ختم کر دیں گے۔ اسے مجبوراً والیِ ہرات کی حفاظت کے انتظامات سخت کرنے پڑے۔ والیِ ہرات کی
کے وقار کا مسئلہ بن گئی تھی اور اس کی ذرا سی کوتاہی کوئی نیا فتنہ کھڑا کر سکتی تھی۔

امیر قزغن اپنے ایام سیر و شکار میں گزارا کرتا تھا۔ ہرات کے حملے کے وقت اس کا خیال تھا کہ
لشکر کے ساتھ تیمور کے قریب رہے گا تاکہ بوقتِ ضرورت اس کی مدد کر سکے۔ پھر ہرات کا جھگڑا ختم ہو
بعد وہ شکار پر چلا جائے گا لیکن حالات نے کچھ اور ہی رُخ اختیار کر لیا۔ تیمور نے اس کی امید سے بہ
ہرات کا قصہ پاک کر دیا۔ اس فکر سے تو امیر قزغن کو چھٹکارا مل گیا لیکن شکار کا شوق پورا نہ ہو سکا جس کے
وہ اب پہلے سے زیادہ بے چین تھا۔

ایک رات امیر قزغن نے تیمور کو اپنے پاس بلوایا اور رازدارانہ انداز میں بولا:

"تیمور۔ تم ان سر پھرے امیروں کی حالت دیکھ رہے ہو۔"

"جی امیر۔ مجھے تو یہ سب کچھ ایک عظیم خطرے کا پیش خیمہ نظر آتا ہے۔" تیمور نے متانت

اس وقت امیر قزغن حالات سے بے حد پریشان تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا پورا رعب و دبدبہ
دھوکے کی ٹٹی یا ریت کی دیوار ہے۔ جوانی کے عالم میں تلوار کے زور پر جو عظمت حاصل کی تھی اوی

کام آ رہی تھی ورنہ تو اب اس کے ہاتھ پیر شل ہو گئے تھے اور اس میں تاتاریوں کی کسی بغاوت کو کچلنے کی
طاقت باقی نہیں تھی۔ ہر تاتاری سردار امیر قزغن کو ایک آڑ یا بزرگ کی حیثیت سے عزت دیتا تھا۔ انہیں بھی علم
تھا کہ امیر قزغن اب پہلے جیسا طاقتور نہیں تھا لیکن وہ اسے ایک ایسی آڑ سمجھتے تھے جس کے باعث وہ قبائلی
جھگڑوں اور عصبیتوں سے محفوظ تھے۔ کہیں دو قبیلوں میں جھگڑا ہوتا تو امیر قزغن فوراً دونوں کو ڈانٹ ڈپٹ
کر ٹھنڈا کر دیتا۔ اس کا حکم مانا جاتا اور اس کا فیصلہ حرفِ آخر ہوتا لیکن عمر کے ساتھ ساتھ یہ رسی کمزور پڑتی
جا رہی تھی۔

"مجھے سارا دکھ اس بات کا ہے کہ یہ کم بخت میرے دیے ہوئے قول کو جھٹلانا چاہتے ہیں۔ اگر
والیِ ہرات ان کے ہاتھوں مارا گیا تو میں کسی تاتاری سردار کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہ رہوں گا۔ اہلِ ہرات
ہمیں کبھی معاف نہ کریں گے اور ہماری سرحد جنگ کا مستقل اکھاڑا بن جائے گی۔"

تیمور نے امیر قزغن کی پریشانی محسوس کر لی اور ادب سے بولا:

"اے حاکمِ سمرقند۔ آپ بالکل دل برداشتہ نہ ہوں۔ کسی کی مجال نہیں کہ آپ کے حکم کی سرتابی کرے۔
اگر کسی نے والیِ ہرات پر ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی تو اسے میں ایسی سزا دوں گا کہ تاتاریوں کی آنکھیں
کھل جائیں گی۔"

"شاباش تیمور۔"

امیر قزغن نے خوش ہوتے ہوئے کہا:

"سچ تو یہ ہے کہ اب میں تیرے ہی بھروسے پر سلطنت کا کام چلائے جا رہا ہوں۔ ورنہ میں جانتا ہوں کہ
سردار دل سے نہ تو میری عزت کرتے ہیں اور نہ ہی مجھے پہلے جیسا طاقتور سمجھتے ہیں۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولا:

"تیمور۔ تو نے کبھی مجھ سے ایک خواہش کا اظہار کیا تھا۔"

تیمور فوراً ہی اس کی بات نہ سمجھ سکا اور بولا:

"اے امیر! آپ کی نوازش سے مجھے سب کچھ مل گیا ہے۔ اب مجھے آپکی زندگی سے زیادہ کوئی طلب
ہے۔"

امیر قزغن کی شفقت اور محبت چھلک پڑی:

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تیمور۔ تُو میرا امردار نہیں بلکہ دست و بازو ہے۔ میرا بیٹا ہے۔ الجائی کا باپ مسلّا میرا بڑا
اس کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ جوانی ہی میں چل بسا۔ چھوٹا بیٹا عبداللہ اٹھارہ سال کا ہونے کے بعد
بچہ ہی تصوّر کرتا ہے۔ اس سے مجھے کوئی اُمید نہیں۔ میں اس کے بارے میں جتنا سوچتا ہوں اتنا ہی
ہو جاتا ہوں۔ پتہ نہیں میرے بعد اس پر کیا گزرے گی۔ تُو تاتاریوں کے اس حقولے سے واقف ہے کہ
حکومت وہی سنبھال سکتا ہے جو تلوار پکڑنا جانتا ہو۔ تلوار پکڑنا تو الگ رہا اس کے ہاتھوں میں تو
کی طاقت بھی معلوم نہیں ہوتی۔"

امیر قزغن اپنے بیٹے کا حال بیان کرتے وقت بے حد جذباتی ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس کے
نکل آئے۔

تیمور نے اسے پہلی بار آنسو بہاتے دیکھا تھا۔ اس کے دل پر بہت اثر ہوا۔

"اے امیر۔ آپ عبداللہ کی طرف سے بالکل پریشان نہ ہوں۔ میں بڑا بھائی بن کر ہر موقع
حفاظت کروں گا۔ وہ جیسا بھی ہے آپ کا بیٹا ہے اور آپ میرے آقا ہیں۔"

امیر قزغن کو تیمور کی باتوں سے بڑی تسلّی ہوئی:

"تیمور! تو نے ایک بار خواہش کی تھی کہ بکھرے ہوئے قبائل کی شیرازہ بندی کی قیادت
کر دوں۔ میں نے اس وقت تجھے ٹال دیا تھا لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ میں یہ اعزاز تیرے سپرد
میں نے تجھ میں وہ خوبیاں محسوس کی ہیں جو ایک قائد اور حاکم میں ہونی چاہییں۔"

"اے امیر۔ میں نے خواہش ضرور کی تھی لیکن میں کسی کا حق نہیں مارنا چاہتا۔ آپ کا پوتا علی
الجائی خاتون کا بھائی کابل میں موجود ہے اور بیٹا عبداللہ سرائے سالی میں۔۔۔۔"

امیر تیمور نے اس کی بات کاٹ دی:

"میں نے ابھی کہا تھا کہ عنانِ حکومت وہی سنبھال سکتے ہیں جو تلوار پکڑنا جانتے ہوں۔ ا
تیرے ہاتھ میں ہے لہٰذا عنانِ حکومت پر بھی تیرا ہی حق ہے۔"

تیمور نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا دل خوشی سے لبریز ہو رہا تھا۔

"تیمور۔ میں سب سے پہلے وادیِ ہرات کے عذاب سے چھٹکارا پانا چاہتا ہوں۔ یہ عزت
ملک پہنچ جائے تو میں سمجھوں گا کہ میرا وقار برقرار ہے۔"

"یہ خدمت آپ میرے سپرد کیجیے۔ میں ایک ایک امیر کو سمجھ لوں گا۔"

"اس طرح نہیں تیمور۔"

امیر قزغن نے نرمی سے کہا:

"یہ جوش کی باتیں نہیں۔ بعض اوقات جوش کو ہوش کے تحت رکھا جاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ سا
مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

"جس طرح آپ مناسب سمجھیں حکم فرمائیے۔ میں تعمیل کے لیے حاضر ہوں۔"

"اس سلسلے میں میں کئی دنوں سے غور کر رہا ہوں۔"

امیر قزغن نے اپنے منصوبے کا انکشاف کیا:

"میں جنوب میں شکار پر جانے کا اعلان کرتا ہوں۔ تم اپنے پچاس جانبازوں کو تیار رکھو۔ جس
صبح کو ہماری روانگی ہونے والی ہوگی، اس شب کو تم والیِ ہرات کو اپنے ساتھ لے کر خاموشی سے سرائے
والی سے نکل جاؤ۔ تاآنکہ لوگ شکار کی تیاریوں میں مصروف ہوں گے۔ والیِ ہرات کی طرف کسی کی توجہ نہ ہوگی۔ اگر
رات بخیر بخیریت سفر کر گئے تو والیِ ہرات خطرے سے باہر ہو جائے گا اور کوئی تمہاری گرد کو بھی نہ پہنچ
سکے گا۔ باغی امیر چیخ چلّا کر رہ جائیں گے۔ پھر یہ بات رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گی۔"

تیمور کو یہ بات پسند آئی اور اس نے دل میں امیر قزغن کی فراست کی داد دی اور بولا:

"میں تو آپ کے حکم کا بندہ ہوں۔ جس طرح آپ نے فرمایا ہے انشاء اللہ اسی طرح ہوگا۔"

○

امیر قزغن نے سرائے سالی سے جنوب کی طرف روانگی کا اعلان کر دیا۔ بہانہ شکار کا تھا۔ تاتاری خوش
گئے کیونکہ وہ جنگ و جدل کے عادی تھے۔ فطرتاً جنگجو تھے۔ کچھ دن لڑائی نہ ہوتی تو ان کی طبیعت مکدر ہونے
لگتی۔ شکار میں انہیں مصروف ہونے کا موقع ملتا تھا اور لاشعور کی تسکین ہوتی تھی۔

خیمے اور سامانِ خورد و نوش گاڑیوں پر بار کر دیا گیا۔ صبح کو روانگی تھی۔ ساتھ لے جانے والے لشکر کی
نمزدگی ہو گئی تھی۔ وہ پوری طرح تیار ہو گیا تھا۔ جو تیاری باقی تھی وہ رات بھر ہوتی رہی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خیمہ گاہ میں لوگ تمام رات جاگتے رہے اور خوب چہل پہل رہی۔ تیمور کے پچاس جوان اس جگہ گئے جس کی نشاندہی تیمور نے پہلے ہی کر دی تھی۔ ہر طرف گھوڑے بھاگتے پھرتے تھے۔ کسی نے تو یہ پچاس سوار ایک جگہ کیوں جمع ہوئے ہیں۔

نصف شب کے بعد امیر قزغن نے والیِ ہرات کو فی امان اللہ کہا اور اسے گلے لگا کر رخصت کیا۔ والیِ ہرات کو خیموں کے پیچھے سے اس جگہ لے آیا جہاں اس کے سوار موجود تھے۔ تیمور اور والیِ ہرات کے گھوڑے تیار تھے۔ دونوں اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور باگیں ہرات کی طرف موڑ دیں۔ پچاس سوار ایک ایک کر کے ان کے پیچھے آ گئے۔

تیمور رات بھر برق رفتاری سے سفر کرتا رہا۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ تیمور کو باغی امیروں کا کوئی ڈر نہ تھا۔ اس کے ساتھ پچاس چیدہ چیدہ محافظ تھے۔ اسے امید تھی کہ اگر پانچ سو باغی امیروں نے بھی اسے گھیرنے کی کوشش کی، تو وہ بچ کر نکل جائے گا۔ مگر تیمور کو والیِ ہرات کی فکر تھی۔ وہ چاہتا تھا والیِ ہرات کو خراش تک نہ آئے۔ اسی میں اس کی کامیابی اور عظمت تھی۔ لڑائی کی صورت میں والیِ ہرات کے زخمی ہونے کا خطرہ تھا۔ اسی وجہ سے تیمور لڑائی سے بچنا چاہتا تھا۔

صبح ہوتے ہی سرائے سالمیں کہرام مچ گیا۔

"والیِ ہرات بھاگ گیا۔"

ہر ایک کی زبان پر یہی جملہ تھا۔ باغی بپھر گئے۔ انہیں امیر قزغن پر سخت غصہ آیا۔ کئی سو امیر قزغن کے دروازے پر آ گئے۔ امیر قزغن کو اس کا پہلے سے اندازہ تھا اور اس نے اس کا بندوبست کر رکھا تھا۔

امیر قزغن کے باہر نکلنے سے پہلے ہی اس کا ایک ہزار سواروں کا خاص محافظ دستہ دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ امیر قزغن آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا جیسے اسے کسی بات کی خبر ہی نہ ہو۔ اسے دیکھتے ہی باغی امیر آگے بڑھ کر بولا:

"والیِ ہرات کہاں ہے امیر قزغن؟"

امیر قزغن نے نظر گھما کر چاروں طرف دیکھا۔ اس کا محافظ دستہ تلواروں کے قبضے پر ہاتھ رکھے منتظر تھا۔ اس نے پُرسکون لہجے میں کہا:

"والیِ ہرات میرا مہمان تھا۔ تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"تم نے اسے بھگا دیا ہے امیر۔" باغی امیر نے تند لہجہ اختیار کیا۔

امیر قزغن نے ہونٹ سکوڑے۔ آنکھ دبائی اور شیر کی طرح دھاڑا:

"تم کون ہوتے ہو مجھ سے سوال کرنے والے۔ ملک معزالدین حسین اپنی مرضی سے سرائے سالم آیا تھا اپنی مرضی سے واپس چلا گیا۔ وہ تمہارا قیدی نہیں تھا اور نہ ہی میں تمہارا غلام ہوں۔ مہمان کو رخصت کرنے کے لیے مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں تھی۔"

باغی امیر بڑا ڈھیٹ تھا۔ امیر کے سخت لہجے کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا:

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا امیر قزغن۔ اس وقت وہ ہمارے ہاتھ سے بچ گیا ہے لیکن ہم اسے زندہ نہ چھوڑیں گے۔"

امیر قزغن کو غصہ تو بہت آیا لیکن اس نے بات کو بڑھانا مناسب نہ سمجھا۔ نرمی اختیار کرتے ہوئے بولا:

"تم تاتاریوں کو آخر یہ کیا ہو گیا ہے۔ تم اپنی روایات اور قبائلی قوانین کو کیوں بھول گئے ہو۔ والیِ ہرات سرائے سالم سے چل کر سرائے سالم آیا تھا۔ چل کے آنے والا مہمان ہوا کرتا ہے۔ تاتاری اپنے مہمانوں کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ اس نے اپنی جان ہمارے ہاتھ میں دے دی۔ اگر ہم اسے قتل کر دیتے تو دنیا کیا کہتی۔ تاتاری بدنام نہ ہو جاتے۔ سب یہی کہتے کہ مہمان کو گھر بلا کر قتل کر دیا۔"

امیر قزغن کی تقریر پُراثر تھی۔

باغی امیر لاجواب ہو گیا۔ اٹھتا ہوا طوفان تھم گیا۔ تلواریں نیاموں سے باہر نہ آئیں اور تیر ترکش میں ہی رہ گئے۔

امیر قزغن نے موقع غنیمت جان کر فوراً روانگی کا نقارہ بجوا دیا۔ لوگوں کی توجہ سفر اور شکار کی طرف ہو گئی۔ تاہم بعض امرا نے دربارِ والیِ ہرات کی رہائی کے معاملے میں امیر قزغن کے خلاف ہو گئے اور اس فتنے کو آگے چل کر کچھ ایسی صورت اختیار کر لی جس سے تاتاریوں کو ناقابلِ برداشت نقصان پہنچا۔ نہ صرف فتوحات کا سلسلہ رک گیا بلکہ موجودہ حکومت کے تانے بانے میں ایسا جھول پیدا ہو گیا جس نے سمرقند کی مستحکم حکومت کو کمزور کر دیا۔

امیر قزغن بے حد عقل مند حکمران تھا۔ اس نے اپنے درباری امرا کے گھڑے ہوئے تیوروں کے پیچھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھپے ہوئے قتنے کی جھلک دیکھ لی تھی۔ دریا نے آمد عبور کر کے جب وہ شکار گاہ میں داخل ہوا تو اس نے ذاتی حفاظت کی تمام تدابیر پیشِ نظر رکھیں کہ کہیں ایسا نہ ہو، شکار کھیلتے کھیلتے وہ خود ہی کسی کا شکار ہو جائے لیکن تاتاریوں کی قسمت کھڑی مسکرا رہی تھی۔

○

تیمور والیِ ہرات معز الدین حسین کو لے کر خیریت سے ہرات پہنچ گیا۔ اس کا جسم تو ہرات میں تھا لیکن دل، سرائے سالی میں لگا تھا۔ باغی امیروں کی طرف سے اسے اطمینان نہ تھا۔ اگر والیِ ہرات کو پہنچانے کا کام نہ ہوتی تو وہ امیر قزغن کو کبھی تنہا نہ چھوڑتا۔ امیر قزغن چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا تھا اور اسے تیز وفادار رفیق کی ضرورت تھی۔

ہرات پہنچتے ہی اس نے سرائے سالی واپس جانے کا ارادہ کیا لیکن والیِ ہرات اتنا بے مروت اور فراموش نہ تھا کہ وہ تیمور کو واپس جانے کی اجازت دے دیتا۔ ہرات کی رعایا اور امرا اپنے والی کی دعائیں مانگ مانگ کر اس کی واپسی کی گھڑیاں گن رہے تھے۔ والیِ ہرات یوں اچانک ہرات پہنچا تو ان کی انتہا نہ رہی۔ انہوں نے اظہارِ تشکر کے لیے ایک حسن ترتیب دے ڈالا۔

ایک ہفتے کے اس جشن میں اظہارِ مسرت کے جتنے بھی طریقے ممکن تھے، شامل کر لیے گئے۔ تیمور والیِ ہرات کی خاطر تمام چیزوں میں شرکت کی مگر بجھے بجھے دل سے۔ اسے کوئی چیز اچھی نہ لگتی تھی۔ اسے خیال آتا کہ اس نے امیر قزغن کو تنہا چھوڑ کر سخت غلطی کی ہے مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ جشن کے اختتام پر صورت ہرات میں ٹھہرا تھا۔

والیِ ہرات اس کی خاطر مدارات میں دل اور آنکھیں فرشِ راہ کر رہا تھا۔ تیمور اس کا محسن تھا۔ اس کے ذریعے والیِ ہرات کو دوسری زندگی ملی تھی ورنہ اہلِ ہرات تو اس کی واپسی سے ناامید ہونے لگے تھے۔ جشن کے تیسرے روز وہ والیِ ہرات کے ساتھ اپنے شہرِ سبز اور سرائے سالی کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا کہ سرائے سالی سے آنے والے ایک سوار کی اطلاع دی گئی۔

تیمور اتنا پریشان ہوا کہ اسے اندر بلانے کے بجائے خود بھاگ کر باہر چلا گیا۔ والیِ ہرات

دوڑا۔ باہر نکل کر تیمور نے دیکھا کہ اس کا خانہ زاد غلام عبداللہ اندر آنے کے لیے پہرے داروں سے جھگڑ رہا ہے۔ تیمور نے اسے دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ عبداللہ کے چہرے پر گرد و غبار کے علاوہ غم کے سائے بھی لہرا رہے ہیں۔

تیمور نے دور ہی سے سوال کیا:

"عبداللہ، خیریت تو ہے؟"

عبداللہ نے نظریں اٹھا کر تیمور کو دیکھا۔ پھر پژمردہ لہجے میں بولا:

"شکار گاہ میں امیر قزغن کو قتل کر دیا گیا۔"

عبداللہ کا یہ جملہ تیمور کے کانوں سے گزر کر دل میں اترتا چلا گیا۔ پھر بھی اس نے خود کو ہمت کر کے سنبھالا اور پوچھا:

"قاتل پکڑے گئے؟"

"نہیں آقا۔ وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔"

"کسی نے انہیں پکڑنے کی کوشش نہیں کی۔" تیمور تقریباً چیخ کر بولا۔

"تعاقب جاری ہے آقا۔"

عبداللہ نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"کچھ سردار ان کے پیچھے شمالی کوہستان کی طرف گئے ہیں۔"

تیمور نے والیِ ہرات کو مخاطب کیا:

"اب مجھے مت روکنا برادر۔"

والیِ ہرات یہ خبر سن کر خود بھی پریشان ہو گیا تھا۔ امیر قزغن اس کا حلیف بن گیا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد تاتاری پھر ہرات پر حملہ آور ہو سکتے تھے۔ اسے اپنی اور ہرات کی فکر پڑ گئی تھی۔ تیمور نے اس کے چہرے سے اس کے خیالات کا اندازہ لگا لیا۔ اور کہا:

"پریشان نہ ہو ملک۔ تاتاری اب ادھر کا رخ نہیں کریں گے۔ اگر ضرورت ہوئی تو میں تمہارا ساتھ دوں گا۔"

والیِ ہرات نے متشکر نظروں سے تیمور کو دیکھا۔ پھر ایک غلام کو تیمور کا گھوڑا لانے کے لیے اشارہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیا۔ تیمور کا گھوڑا آ گیا تو اس نے ہرات میں مقیم تاتاری سواروں کو سرائے سالی چلنے کا حکم دیا اور خود گھوڑے پر سوار ہو کے شکارگاہ کی طرف چل دیا۔ اس کے ساتھ صرف اس کا وفادار غلام عبداللہ تھا۔ اللہ نے جشن کی باقی تقریبات منسوخ کر کے امیر قزغن کا سوگ منانے کا اعلان کر دیا۔

دریائے آمو کے جنوب میں ایک عظیم شکارگاہ تھی۔ امیر قزغن سال میں دو بار وہاں شکار کے لیے کرتا تھا۔ اس سال وہ اپنے ساتھ موت بھی لایا تھا۔

باغی امیر بظاہر خاموش ہو گئے تھے لیکن موقعے کی تاک میں تھے۔ شکار میں ایسے مواقع خود بخود ہو جاتے ہیں۔ لوگ اپنے اپنے طور پر شکار کھیلنے دور دور تک نکل جاتے۔ کبھی گروہ کی شکل میں تو کبھی ہی کسی شکار کے پیچھے گھوڑا ڈال دیتے۔

ایسا ہی واقعہ امیر قزغن کے ساتھ بھی پیش آیا۔ وہ شکار کا پیچھا کرتا ہوا اپنے محافظوں سے دور گیا۔ دشمن اس پر نظر رکھے آس پاس ہی موجود تھے۔ ایک جگہ انہیں موقع مل گیا اور انہوں نے تیر امیر قزغن کا سینہ چھلنی کر دیا۔ امیر قزغن سانس تک نہ لے سکا۔

یہ کام دو باغی امیروں نے انجام دیا جنہیں غالباً بعض قبائلی سرداروں کا تعاون بھی حاصل تھا۔

تیمور نے شکارگاہ میں پہنچ کر حالات کا جائزہ لیا اور معلومات حاصل کیں جس سے اس کا شبہ یقین بدل گیا کہ یہ کام صرف دو امیروں کا نہیں بلکہ اس کے پس منظر میں گہری سازش موجود ہے۔ تیمور کو وہاں امیر قزغن کے وفادار محافظوں کے اور کوئی نہ ملا۔ سب ہی لاش کو بے گور و کفن چھوڑ کر اپنے اپنے علاقے واپس جا چکے تھے۔

اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ چار محافظ قاتلوں کے تعاقب میں بھی روانہ ہو چکے ہیں۔ تیمور ابھی کوئی فیصلہ کر پایا تھا کہ امیر قزغن کا سب سے بوڑھا محافظ اس کے پاس آ کر بولا:

"اے گورگان کی اولاد۔ تو تاتاریوں کی مشہور روایت سے واقف ہوگا۔"

تیمور کے ذہن میں کسی ایسے موقعے کی روایت محفوظ نہیں تھی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے بوڑھے

دیکھا تو محافظ نے مزید کہا:

"روایت یہ ہے کہ مرد وہ ہے جو اپنے ہم قوم کے قاتل کے ساتھ آسمان تلے نہ سوئے۔"

تیمور کو فوراً یاد آ گیا کہ اس کے باپ طراغائی نے یہ روایت اس کے سامنے کئی بار دہرائی تھی۔ اُس وقت تو وہ صحیح مفہوم نہ سمجھ سکا البتہ اس واقعے نے اسے مفہوم سے آشنا کر دیا۔ اس کی نیند حرام ہو گئی۔ اسے جلد از جلد قاتلوں سے انتقام لینا تھا۔ ان کے ساتھ ایک آسمان تلے زندہ رہنا اس پر حرام ہو گیا تھا۔

تیمور نے اپنے محسن اور آقا کی لاش جنگل سے اٹھوائی۔ سرائے سالی آیا اور اسے پورے احترام سے دفن کیا۔ وہ چاہتا تو پہلے اپنی جانشاد کا انتقام کرتا۔ مال و دولت کو محفوظ مقام پر پہنچاتا۔ بیوی بچے کے لیے کوئی معقول بندوبست کرتا لیکن روایت کے الفاظ ہتھوڑا بن کر اس کے دماغ سے ٹکرا رہے تھے۔ تیمور نے کسی کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ کفن دفن کے بعد وہ پھر دریائے آمو عبور کر کے جنگل میں آ گیا۔

اب وہ تنہا تھا۔

بالکل تنہا!!

تیمور نے اپنا گھوڑا اس رخ پر ڈال دیا جدھر قاتلوں اور تعاقب کرنے والوں کو جاتے دیکھا گیا تھا جنگل، دریا، پہاڑ پار کرتا وہ آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ تاتاری سرداروں نے قاتلوں کی حمایت ضرور کی ہوگی مگر اب ان کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنی جان بچاتے آگے ہی آگے بھاگتے جا رہے تھے۔ وہ ہر گاؤں سے تازہ دم گھوڑے حاصل کرتے۔ سامانِ خورد و نوش اکٹھا کرتے اور بلا توقف آگے بڑھتے رہے۔

تعاقب کرنے والے بھی بلا کے جیالے تھے۔ انہوں نے نہ تو قدم روکے اور نہ ہی قاتلوں کا پیچھا چھوڑا وہ بھی پوچھتے پاچھتے قاتلوں کے پیچھے چلے آ رہے تھے۔

تیمور کی برق رفتاری کا یہ عالم کہ وہ دوسرے ہی دن تعاقب کرنے والوں کے پاس پہنچ گیا۔ تیمور کو دیکھ کر انہیں حوصلہ ہوا۔ تعاقب جاری رہا۔ حتیٰ کہ انہیں شمالی کوہستان کی ڈھلانوں پر قاتلوں کے گھوڑے بھاگتے نظر آ گئے۔

تیمور نے اپنے ساتھیوں کو دائیں بائیں سے گھیرا ڈالنے کو کہا اور خود گھوڑے کو ایڑ لگا کر پوری رفتار سے ڈھلان اترنے لگا۔

ڈھلان پہ تیز گھوڑا دوڑانا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا لیکن موت تو جیسے خود تیمور سے بھاگتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ وہ ان کے سروں پر پہنچ گیا۔ وہ دو تھے اور یہ اکیلا۔

انہوں نے پلٹ کر حملہ کیا۔ تلواریں چمکیں۔ چنگاریاں پیدا ہوئیں۔ پھر دو سر بریدہ لاشیں تیمور کے قدموں میں پڑی تھیں۔

تیمور کے ساتھی بھی پہنچ گئے لیکن لڑائی کا فیصلہ ہو چکا تھا۔

○

تیمور نے امیر قزغن کے قاتلوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد شہر سبز کا رخ کیا۔ اس کے گھر والے وہیں موجود تھے لیکن جب تیمور شہر سبز میں داخل ہوا تو وہاں کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔

تاتاری دستور کے مطابق حاکم وقت کی موت کے بعد اس کا بیٹا اس کا جانشین ہوتا تھا لیکن یہ اسی وقت ممکن تھا جب مختلف قبائلی سرداروں کو ایک دوسرے پر کوئی فوقیت حاصل نہ ہو۔ سب کی طاقت برابر ہو اور سب ایک مرکزی حکومت کے ماتحت میں رہ کر اپنے اپنے آزاد علاقوں میں حکومت کر سکیں۔ امیر قزغن اپنا جانشین مقرر کرنے سے پہلے ہی قتل ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہر قبیلے کا سردار خود کو امیر قزغن کا جانشین سمجھتا تھا۔

اگر امیر قزغن کا بیٹا اس قدر طاقتور ہوتا کہ وہ ان سب کو قبضے میں رکھ سکتا تو شاید حالات درست رہتے لیکن شہزادہ عبداللہ تو قالین کا شیر تھا۔ رموزِ مملکت اور میدانِ جنگ سے اس کا دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔ اگر امیر قزغن نے اپنی حیات میں عبداللہ یا تیمور کو اپنا جانشین نامزد کر دیا ہوتا تو بھی حالات میں کچھ بہتری کی توقع کی جا سکتی تھی۔

حکومت سمرقند کی یہ حالت تھی کہ نہ تو قبائلی سرداروں میں اتحاد تھا اور نہ ہی مرنے والے کے بیٹے میں عنانِ حکومت سنبھالنے کی اہلیت تھی۔

ان حالات میں یہی ممکن تھا کہ تمام سردار سر جوڑ کر بیٹھتے اور کسی ایک کو اپنا سردار مقرر کر لیتے۔ تاتاریوں میں یہ بڑی خوبی تھی کہ جب وہ کسی کو اپنا سردار مان لیتے تو پھر اس کی اطاعت سے باہر نہ ہوتے مگر مشکل یہ تھی کہ سب سرداروں کو ایک جگہ جمع کون کرے؟ وہ تو سب کے سب حاکم سمرقند بننے کے خواب دیکھ رہے تھے۔

تیمور نے اس وقت بھی دور اندیشی کا ثبوت دیا۔ اس کے پاس اس وقت بہادروں کا ایک گروہ موجود تھا۔ وہ چاہتا تو آسانی سے سمرقند پر قبضہ کر سکتا تھا لیکن اس نے اپنے کہے کی لاج رکھی اور شہزادہ عبداللہ سے ملنے جا پہنچا۔

عبداللہ کو تیمور کے آنے کی اطلاع ملی تو ننگے پیر بھاگتا ہوا اس کے استقبال کو آیا۔ جھک کر ادب سے سلام کیا۔ شہزادے کے محل کا رنگ بھی بدل گیا تھا۔ نہ کہیں سے پائل کی جھنکار بلند ہوتی تھی اور نہ ہی تاروں کی جھنکار سنائی دیتی تھی۔ شہزادے نے اپنے آپ کو تبدیل کر لیا تھا۔ عبداللہ نے تیمور کو لے جا کر اپنی مسند پر بٹھا دیا اور خود سر جھکا کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

تیمور نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے پاس بٹھا لیا اور کہا:

"شہزادے! تمہارے والد دشمنوں کی سازش کا شکار ہو گئے۔ قاتلوں سے انتقام لیا جا چکا ہے لیکن قاتل صرف دو نہیں تھے۔ ان کی پشت پر دو زبردست سردار معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد یہی سمجھ میں آتا ہے کہ وہ امیر قزغن کو راستے سے ہٹا کر تختِ سمرقند پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔"

"پھر آپ نے کیا سوچا ہے بہادر سردار؟" عبداللہ نے پہلی بار ملکی معاملات میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہم اپنی روایت اور دستور پر عمل کریں گے۔" تیمور نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

عبداللہ سہم گیا۔ وہ تیمور کی بات نہ سمجھ سکا۔

"ہماری روایت کیا ہے سردار؟"

"کیا تم امیر قزغن کے بیٹے نہیں ہو؟" تیمور نے الٹا اس سے سوال کر دیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے سردار۔"

عبداللہ بے بسے لہجے میں بولا:

"مگر لشکر خانے میں طوطی کی آواز کی کیا حیثیت۔ پھر بھی میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتا ہوں تو مجھے حکم دیجیے۔ ضرور تعمیل ہو گی۔"

"ہاں۔ میں تمہیں حکم دوں گا۔"

تیمور باوقار انداز میں بولا:

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں نے اپنے آقا امیر قزغن سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہاری حفاظت کروں گا۔"

عبداللہ کی سمجھ میں پھر بھی کچھ نہ آیا۔ اس نے الجھ کر پوچھا:

"لیکن یہ تو بتلایئے کہ مجھے کرنا کیا ہوگا۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ سمرقند کی حکومت کا شیرازہ بکھرنے پائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب آپ حکومت سنبھالیں۔"

"میں نہیں۔ عبداللہ! سمرقند کی حکومت تمہیں سنبھالنا ہوگی۔"

تیمور نے فیصلہ کن لہجے میں کہا:

"تم حکومت کے حق دار ہو۔ تمہارا حق کوئی نہیں چھین سکتا۔"

عبداللہ حیرت سے تیمور کا منہ دیکھنے لگا۔

تیمور نے اس کے دونوں شانے پکڑ لیے اور جھنجھوڑتے ہوئے بولا:

"تم تاتاری ہو عبداللہ۔ تاتاری اپنا حق نہیں چھوڑا کرتے۔ جسم پر اسلحہ سجاؤ۔ تمہیں سمرقند چلنا ہے۔"

"لیکن سردار۔"

عبداللہ گھبرا گیا:

"سرکش تاتاری مجھ جیسے نااہل کو اپنا حاکم کیسے تسلیم کریں گے۔"

"حاکم تسلیم نہیں کیا جاتا عبداللہ۔ حاکم خود کو تسلیم کراتا ہے۔"

تیمور نے اسے بہادری کا پہلا سبق پڑھایا۔

○

امیر قزغن کے قتل ہوتے ہی سرداروں نے سمجھ لیا کہ اب ایک طویل خانہ جنگی شروع ہو جائے گی۔ کا کوئی جانشین نہیں تھا اور سوائے تیمور کے تاتاریوں میں کوئی ایسا سردار نظر نہیں آتا تھا جو تاتاریوں کو زیر کر کے سمرقند کی حکومت سنبھالے۔

کچھ سرداروں نے اس سلسلے میں تیمور سے رابطہ بھی قائم کیا لیکن تیمور جانتا تھا کہ ہوا کا رخ

مخالف ہے۔ حاجی برلاس اور بایزید جلائر اس کے دشمن ہیں۔ اس نے فی الحال حکومت سمرقند کا سودا اپنے سر سے نکال دیا۔

انھی دنوں اسے خبر ملی کہ تاتاری سردار اپنے اپنے علاقوں میں پہنچ کے جانبازوں اور بہادروں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کر رہے ہیں۔ انہوں نے یہ قدم حفاظتِ خود اختیاری کے لیے اٹھایا تھا لیکن پس پردہ یہ خیال بھی تھا کہ طاقت حاصل ہوتے ہی وہ دوسروں کے علاقے تاراج کریں گے جیسا کہ تاتاریوں میں عام حالات میں ہوا کرتا تھا۔

تیمور نے حالات کو اس نہج پر دیکھا تو اپنے طور پر ایک نہایت دانش مندانہ قدم اٹھایا۔ وہ شہزادے کو لے کر سمرقند پہنچا اور عبداللہ کو حاکمِ سمرقند بنانے کا اعلان کر دیا۔

اس خبر کو سن کر تمام تاتاری سردار حیران رہ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ تیمور خود سمرقند پر قبضے کی کوشش کرے گا۔ دانشوروں کے مطابق تیمور کا یہ قدم قومی جذبے کا ترجمان تھا اور ذاتی مفاد کی ایک زبردست قربانی تھی۔ سب جانتے تھے عبداللہ ایک انتہائی کمزور حکمران ثابت ہوگا جسے وہ بڑی آسانی سے ہٹا سکتے تھے۔ لیکن اسی وقت ممکن تھا جب تمام سردار اپنے میں سے کسی ایک کو سردارِ اعلا تسلیم کرنے پر رضامند ہو جاتے۔ یہ اعزاز صرف تیمور کو دیا جا سکتا تھا لیکن حاجی برلاس اور بایزید جلائر کی موجودگی میں یہ بات ناممکن تھی۔ سب سے پہلے تیمور نے اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا اعلان کیا۔ پھر علاقہ ارمنگ کا سردار کیخسرو اپنے دستوں کے ساتھ سمرقند پہنچ کر عبداللہ کی حاکمیت کا مطیع ہوا۔ علاقہ شبرغان کے سردار محمد خواجہ نے بھی عبداللہ کی اطاعت میں دیر نہ کی اور اپنے دستوں کے ساتھ سمرقند پہنچ گیا۔ بدخشاں کے سردار ختلان اور سرپول کے سردار خیر کیسوری نے بھی عبداللہ کو سردارِ اعلا اور حاکمِ سمرقند تسلیم کر لیا۔ بلخ کا حاکم سلوز اجاقی بوغائی تھا۔ اس کی بھاوج، لڑکی ملکوتی اور عبداللہ بھی بلخ پہنچ گئے تھے۔ سلوز بڑی حد تک گوشہ نشین ہو چکا تھا۔ گمشدہ بھاوج کو پا کر اس نے اپنا سر اس کے قدموں میں رکھ دیا اور معافی کا خواستگار ہوا۔ ملکوتی کی ماں نے دیور کو خلوصِ دل سے معاف کر دیا۔ عبداللہ اور ملکوتی اس کا سہارا بن گئے۔ وہ ان دونوں کی شادی کی فکر ہی کر رہا تھا کہ امیر قزغن کے قتل کی خبر پھیل گئی۔

اگر امیر قزغن کا واقعہ نہ پیش آیا ہوتا تو اب تک ملکوتی اور عبداللہ کی شادی دھوم دھام سے ہو چکی ہوتی سلوز کی صحت بھی بہت خراب ہو گئی تھی۔ وہ سفر کے قابل بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنے قبیلے کے سرداروں کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اکٹھا کر کے حالات سے آگاہ کیا اور اپنی جگہ عبداللہ کو نامزد کر دیا۔

قبیلہ اوجاق بوغاق ایک صلح پسند قبیلہ تھا۔ اس نے بلا عذر عبداللہ کو سردار تسلیم کر لیا۔ عبداللہ نے دربارِ سمرقند میں پہنچ کر بیگ کی نمایندگی کی۔

عبداللہ، تیمور کے ماتحت رہ چکا تھا اور اس کے دل میں تیمور کا بے حد احترام تھا لہٰذا اس نے اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ جب پانچ تاتاری قبیلوں نے سمرقند کے نئے حاکم کو تسلیم کر لیا تو باقی اور حاجی برلاس کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ رہ گیا کہ وہ بھی شہزادے عبداللہ کے سامنے خم کر دیں۔ انہوں نے مصلحتاً حالات سے سمجھوتہ کیا اور اظہارِ اطاعت کے لیے سمرقند پہنچ گئے۔

تاتاری قبائل لاشعوری طور پر چنگیز خان یا اس کی اولاد کو اپنا بادشاہ تسلیم کرتے تھے۔ اسی لیے ان میں بھی چنگیزیوں کی تمام ہی روایتوں پر عمل کیا جاتا تھا۔

چنگیزی دور میں خاقان کے مرنے کے بعد قورلتائی (مجلسِ مشاورت) منعقد ہوتی جس میں نئے خاقان کا انتخاب کیا جاتا۔ تاتاریوں میں بھی کچھ اسی طرح کا رواج تھا اور جو کچھ سمرقند میں ہو رہا تھا وہ اسی رواج کا حصہ تھا۔

جب تمام قبائلی سردار اپنے اپنے دستوں کے ساتھ سمرقند پہنچ کر اظہارِ اطاعت کر چکے تو جشن منایا گیا۔ یہ جشن ایک ہفتے تک جاری رہا اور تمام سرداروں نے ایک تھال میں کھانا کھا کر اپنی یک اتحاد کا مظاہرہ کیا۔ جشن کے اختتام پر تاتاری سردار اپنے اپنے علاقوں میں چلے گئے۔

عبداللہ کے پاس صرف تیمور رہ گیا یا خود عبداللہ نے اسے سمرقند رہنے پر مجبور کیا۔ تیمور حکمت عملی سے سمرقند کا گرتا ہوا ایوانِ حکومت ایک بار پھر سنبھل گیا۔ لیکن بایزید جلائر اور حاجی برلاس اس انتظام سے خوش نہیں تھے۔ وہ جانتے تھے کہ عبداللہ کا تو بس نام ہی نام ہے۔ اصل حکومت تو تیمور کے ہاتھ میں آ گئی ہے۔ پس وہ تیمور کی طاقت ختم کرنے کے لیے موقعے اور وقت کا انتظار کرنے لگے۔

اسی دوران سمرقند میں یہ افواہ اڑی کہ بلادِ شمال کا چنگیزی خانِ اعظم، تغلق تیمور خاں سمرقند پر حملہ کرنے والا ہے۔ اس افواہ سے لوگوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ تیمور کو اس کے باپ طراغائی اور امیر قزغن نے باور کرا دیا تھا کہ تغلق تیمور خاں سمرقند پر کبھی حملہ نہیں کرے گا اس لیے تیمور نے اس افواہ پر کان نہ دھرے۔ عبداللہ سب سے زیادہ پریشان رہتا۔ تیمور نے اسے مطمئن کرنے کی بہت کوشش کی مگر

توہمات کا ہوا سوار ہو گیا۔ اسے ہر وقت اپنی جان سولی پر لٹکی نظر آتی۔ ممکن تھا کہ عبداللہ کے دل کی دہشت دور ہو جاتی لیکن شہرِ سبز میں تیمور کے باپ طراغائی کا انتقال ہو گیا اور تیمور نے وہاں جانے کا قصد کر لیا۔ عبداللہ تیمور کے پیروں سے لپٹ گیا۔

"مردار! مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ خانِ اعظم مجھے مار ڈالے گا۔"

تیمور کو اس کی بزدلی پر بہت افسوس ہوا۔ اس نے کہا:

"عبداللہ ہوش میں آؤ۔ تم ایک بہادر باپ کے بیٹے ہو۔ ان افواہوں پر یقین کرو گے تو حکومت کس طرح کر سکو گے؟"

عبداللہ کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا:

"اگر خانِ اعظم نے حملہ کر دیا تو میں اکیلے اس کا مقابلہ کیسے کر سکوں گا؟"

"حوصلہ رکھو عبداللہ۔"

تیمور نے اسے تسلی دی:

"اگر خانِ اعظم نے سمرقند پر حملہ کرنے کی غلطی کی تو تمام تاتاری قبائل مل کر اس کا مقابلہ کریں گے۔ وہ ہماری متحدہ طاقت کو شکست نہیں دے سکتا۔"

عبداللہ کو پھر بھی اطمینان نہ ہوا:

"عین وقت اگر کسی سردار نے ساتھ نہ دیا تو میں کیا کروں گا؟"

"ایسا نہیں ہو گا عبداللہ۔"

تیمور نے اسے بڑی محبت سے سمجھایا۔

"خانِ اعظم سے تمام تاتاری سردار خائف ہیں۔ اگر انہوں نے تمہیں تنہا چھوڑ دیا تو وہ بھی ایک ایک کر کے ختم ہو جائیں گے یا مغلوں کے غلام بن جائیں گے۔"

عبداللہ، تیمور کو شہرِ سبز جانے سے روک تو نہیں سکتا تھا کیونکہ باپ کے جنازے میں شریک ہونا تیمور کے لیے لازم تھا۔ پھر اس نے تیمور سے درخواست کی:

"سردار۔ میں تمہیں جانے سے روک تو نہیں سکتا لیکن یہ التجا ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے، سمرقند واپس آ جانا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں۔ میں اس کا وعدہ کرتا ہوں۔" تیمور نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہا اور شہر

گھوڑا سرپٹ دوڑا دیا۔

تیمور کے سمرقند سے جاتے ہی عبداللہ کے پیٹ میں کھلبلی مچ گئی۔ اس نے اپنے حوا

کیا۔ تیمور کے علاوہ اس کی مصاحبت میں اور کوئی بہادر نہ تھا۔ ہر ایک خانِ اعظم کے حملے سے

عبداللہ کے حواریوں نے اسے الٹی پٹی پڑھائی۔ انہوں نے عبداللہ کے دل میں یہ بات ڈال دی

باپ کی موت کی آڑ لے کر سمرقند سے بھاگ گیا ہے اور اسے خانِ اعظم کے رحم و کرم پر چھوڑ گیا ہے

یہ بات عبداللہ کے دل میں بیٹھ گئی اور ایسی بیٹھی کہ اس نے راتوں رات خزانے کے

جواہرات جمع کیے اور صبح ہونے سے پہلے ہی سمرقند کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ گیا۔

عبداللہ سمرقند سے ایسا بھاگا کہ پھر اس کی کوئی خبر نہ مل سکی۔ ممکن ہے اس کے حواریوں نے اسے

قتل کر کے اس کی دولت پر قبضہ کر لیا ہو۔

حاکمِ سمرقند کے غائب ہو جانے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح ہر طرف پھیل گئی۔ تیمور نے

بیٹھ گیا۔ اس کے تمام کیے دھرے پر پانی پھر گیا۔ اسے عبداللہ پر اتنا غصہ آیا کہ اگر وہ مل جاتا تو

اڑا دیتا۔ اسے شہر سبز میں آئے دوسرا ہی دن تھا اور ابھی طرغائی کی تجہیز و تکفین بھی نہیں ہوئی تھی

برلاس قبیلے کا سردار تھا۔ اس کی رسومات نرالا انداز میں ہوتی تھیں۔ اس کے قبیلے کو خبر ہوئی

میں حصہ لینے کے لیے آنا شروع ہو گئے تھے۔ تیمور کے لیے اس وقت شہر سبز چھوڑنا مشکل

امیر طرغائی کی موت کی خبر کے ساتھ ہی حاکمِ سمرقند عبداللہ کے سمرقند سے بھاگ جانے

سرداروں تک پہنچی۔ اصولی طور پر انہیں امیر طرغائی کی میت میں شریک ہونا چاہیے تھا لیکن

دیکھ کر سب کے منہ میں پانی آ گیا۔ اب تو عبداللہ کا جھگڑا بھی ختم ہو گیا تھا۔ حکومت کا کوئی دوسرا

موجود نہ تھا۔ تخت کا فیصلہ تلوار سے ہونا تھا۔ تاتاری سرداروں میں یہ روایت گردش کر

"خانِ حکومت وہی ہاتھ سنبھال سکتے ہیں جو تلوار پکڑنا جانتے ہوں۔"

ان سب کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ سب کو تلوار پکڑنے کا سلیقہ تھا۔ دیکھنا صرف یہ تھا کہ

مضبوط ہیں۔

تاتاریوں میں دو ہی سردار زیادہ طاقتور تھے اور دونوں ہی تیمور کے بدترین دشمن

طرغائی کے مرتے ہی قبیلہ برلاس کی سرداری کا اعلان کر دیا جا حالانکہ طرغائی کا بیٹا تیمور موجود تھا اور طرغائی

اپنی حیات میں اسے نامزد بھی کر دیا تھا۔ تیمور، باپ کی رسومات ختم کرنے سے پہلے کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا

اس لیے دل خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

پھر قرعہ پڑا کہ حاجی برلاس، سمرقند کی حکومت کا بھی دعویٰ کر بیٹھا۔ بایزید جلائر بھلا کیسے پیچھے رہتا

اس وقت سمرقند کے قریب تھا۔ عبداللہ کے غائب ہونے کی خبر پاتے ہی وہ اپنے دستوں کے ساتھ سمرقند

قبضہ کرنے کی فکر میں لگ گیا۔

تیمور کی مخالفت میں حاجی برلاس اور بایزید جلائر آپس میں دوست بن گئے تھے لیکن جب سمرقند کی حکومت

سوال اٹھا تو ان کی دوستی، دشمنی میں بدل گئی۔ دونوں ہی سمرقند کے دعوے دار تھے۔ حاجی برلاس نے شہر سبز

مضافات اور قرشی کے علاقے سے دھڑا دھڑ فوجی بھرتی شروع کر دی۔ بایزید جلائر بھی تیاریاں کرنے لگا مگر

ابھی ان کی تیاریاں مکمل نہ ہوئی تھیں کہ بلادِ شمال کے خانِ اعظم کے حملے کی افواہ حقیقت میں تبدیل ہو گئی۔ امیر قزغن کے

تیور ہی خانِ اعظم کی نظر میں سمرقند پر پڑیں۔ امیر قزغن کی زندگی میں اسے سمرقند کی طرف دیکھنے کی بھی جرأت نہ ہوئی

وہ تو بس اسی بات پر خوش تھا کہ امیر قزغن اس کی طرف سے سمرقند کا حاکم ہے لیکن اب حالات بدل گئے تھے۔

امیر قزغن کی موت نے تاتاریوں کا شیرازہ بکھیر دیا۔ ان کی مرکزیت ختم ہو گئی۔ ہر قبیلے کا سردار خود مختار ہو گیا۔ تیمور

کوشش کر کے عبداللہ کو حاکمِ سمرقند بنا دیا تھا۔ اس نے گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دیا تھا لیکن عبداللہ اپنی

بزدلی کی وجہ سے حکومت نہ سنبھال سکا اور سمرقند سے بھاگ نکلا۔

خانِ اعظم کے لیے اس سے بہتر اور کون سا موقع ہو سکتا تھا۔ اسے تاتاریوں کی بغاوت یاد تھی اس لیے دل

تاتاریوں کے لیے پرانی دشمنی موجود تھی۔ پھر وہ اسلام دشمن تھا جبکہ تاتاریوں کے تمام قبائل اسلام قبول کر چکے

سے کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ اس کے محکوم مسلمان اس کی برابری کا دعویٰ کریں۔ خانِ اعظم نے جنوب کی طرف

بڑھنے کا حکم دیدیا۔

کہاں تو حاجی برلاس اور بایزید جلائر سمرقند پر قبضے کے لیے پر تول رہے تھے اور کہاں اُن کا یہ عالم ہوا کہ

اس طرح دبک گئے جیسے بلی کو دیکھ کر چوہے بلوں میں گھس جاتے ہیں۔

خانِ اعظم کے لشکر نے سمرقند کا یوں رخ کیا جیسے ٹڈی دل کھیتوں پر گرتا ہے۔ آگے آگے اس کے

مقدمۃ الجیش کے دستے، گھوڑوں پر سوار، لمبے چمکدار نیزے سنبھالے نمودار ہوئے۔ انہوں نے تاتاری علاقے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

داخل ہوتے ہی لوٹ مار شروع کر دی۔

مغل اپنے ساتھ بار برداری کے جانور بھی رکھتے تھے تاکہ لوٹ کا مال آسانی سے لادا جا سکے۔ ان کے پیچھے سوار دستے تھے جو کھڑی فصلوں کو روندتے ہوئے آندھی کی طرح وادی پر چھا گئے۔ پورے تاتاری علاقے میں بھگدڑ مچ گئی۔ اس مصیبت کے وقت بھی تاتاریوں کو ہوش نہ تھا کہ سب سردار مل کر مغلوں کا مقابلہ کرتے لیکن ہر ایک کو صرف اپنی اور اپنے علاقے کی فکر تھی۔

بایزید جلائر کا علاقہ سمرقند کے راستے میں تھا۔ مغلوں کو اسی راستے سے گزرنا تھا۔ بایزید نے قلعہ بند ہونے کا ارادہ کر لیا۔ کیونکہ دوسرے سردار اپنے اپنے علاقوں میں قلعہ بند ہو گئے تھے۔ ہم نے خانِ اعظم کی اطاعت قبول کر لی اور قیمتی تحائف لے کر اس کے پاس پہنچ گیا۔

تیمور کے دوسرے دشمن حاجی برلاس کا مغلوں کے خوف سے ایسا پتہ پانی ہوا کہ وہ اپنا علاقہ چھوڑ کر اس نے تیمور کو لکھا:

"میں اپنا علاقہ چھوڑ رہا ہوں اور اپنے قبیلے کے ساتھ جنوب میں جا رہا ہوں۔ ممکن ہوا تو ہرات میں پناہ حاصل کروں گا۔"

تیمور کو یہ خط شہر سبز میں ملا۔ وہ مغلوں کی یلغار سے پوری طرح واقف تھا اور جانتا تھا کہ نفاق اور انتشار نے مغلوں کو سمرقند پر قبضہ کی دعوت دی ہے۔ اس نے فوراً حاجی برلاس کو جواب لکھا:

"چچا جان۔ آپ جہاں جانا چاہیں چلے جائیں۔ خطرات سے بھاگنے والے کا چچا خطرہ ہی کیا کرتا ہے۔"

خط بھیج کر تیمور نے اپنے باپ کی تجہیز و تکفین بڑے شاہانہ انداز میں کی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے تیمور مطمئن ہو اور اسے مغلوں کی کوئی پروا نہ ہو۔ لوگ شہر سبز سے بھی بھاگ رہے تھے۔ بعض اپنی مجبوریوں کے باعث شہر نہ چھوڑ سکے۔ تیمور کو مطمئن دیکھ کر وہ اس کے پاس آ گئے۔ انہیں اب بھی تیمور کی شجاعت پر اعتماد تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ غرض کے بندے ہیں۔ ایسے لوگ بھائے فائدہ پہنچانے کے قائل ہی پیدا کیا تھا۔ اس نے ایسے لوگوں کو منہ نہیں لگایا۔

تیمور کو اپنے سے زیادہ تجربہ کار جانگیر اور الجائی خاتون کی فکر تھی۔ اس نے ان دونوں کو رخصت کیا۔ کابل میں الجائی کا بھائی امیر حسین تھا۔ تیمور کو اس وقت کابل سے زیادہ کوئی

تیمور چاہتا تو خود بھی کابل جا سکتا تھا لیکن وہ شہر سبز کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ تیمور بھی اس کی اس خوبی کا قائل تھا کہ تیمور مصیبت کے وقت ہراساں نہیں ہوتا۔ اس نے شہر سبز ہی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

مولانا زین الدین بھی وہیں تھے۔ تیمور انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کرنے پہنچا تو مولانا نے تیمور کو گلے لگایا اور مسکرا کر کہا:

"تیمور۔ تمہارا چچا حاجی برلاس تو شہر سبز کا دعوے دار تھا۔ مصیبت پڑی تو جنوب کی طرف بھاگ گیا۔"

تیمور افسوس سے بولا:

"اگر حاجی برلاس اور دوسرے سردار متحد ہو کر مغلوں کا مقابلہ کرتے تو سمرقند بچ سکتا تھا۔ ان کی طمع اور نہیں لے ڈوبی۔"

زین الدین نے رازدارانہ انداز میں پوچھا:

"تمہارے پاس کتنا لشکر ہے؟"

"صرف چند سو سوار ہیں۔" اس نے حقیقت بیان کر دی۔

"اور جتہ مغل نے کتنے لشکر سے یلغار کی ہے؟"

"بارہ ہزار سے زیادہ سواروں کے ساتھ۔"

مولانا نے فوراً کہا:

"تیمور۔ میں تمہیں مغلوں سے ٹکرانے کی ہرگز اجازت نہیں دوں گا۔ پہاڑ سے ٹکرانا بہادری نہیں ہوا کرتی۔ مطمئن ہو اور اسے مغلوں کی کوئی پروا نہ ہو۔ لوگ شہر سبز سے بھی بھاگ رہے تھے۔ بعض اپنی مجبوریوں کے باعث شہر نہ چھوڑ سکے۔ تیمور کو مطمئن دیکھ کر وہ اس کے پاس آ گئے۔ انہیں اب بھی تیمور کی شجاعت پر اعتماد تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ غرض کے بندے ہیں۔ ایسے لوگ بھائے فائدہ پہنچانے کے قائل ہی پیدا کیا تھا۔ اس نے ایسے لوگوں کو منہ نہیں لگایا۔

تیمور کو اپنے سے زیادہ تجربہ کار جانگیر اور الجائی خاتون کی فکر تھی۔ اس نے ان دونوں کو رخصت کیا۔ کابل میں الجائی کا بھائی امیر حسین تھا۔ تیمور کو اس وقت کابل سے زیادہ کوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شہروں کو لوٹیں گے۔ لوٹ مار سے تو انہیں خانِ اعظم بھی نہیں روک سکے گا۔ تیمور! میں شہر سبز کو
دیکھ سکتا۔ تمہیں اس شہر کو بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا ہوگا"۔

تیمور نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا:

"آپ دیکھتے جائیے مولانا۔ جو آپ چاہتے ہیں انشاءاللہ ویسا ہی ہوگا۔ مغل آپ کے شہر کو
سکیں گے"۔

مولانا زین الدین کی زبان سے "آمین" نکلا۔ لیکن وہ حیرت سے تیمور کو تکنے لگے۔ ان کی سمجھ
مغل سرداروں کو شہر سبز لوٹنے سے تیمور کس طرح روک سکے گا۔

تیمور نے مولانا زین الدین سے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔

مغل شہر سبز تک پہنچ گئے لیکن تیمور نے ایسی تدبیر کی کہ مغل شہر سبز کی کسی چیز کو ہاتھ
نہ لوٹ مار ہوئی اور نہ ہی آگ لگائی گئی۔ تلواریں نیاموں سے باہر بھی نہ آئیں۔ کسی کی نیکسر تک نہ پھوٹی

شہر سبز

مغل خانِ اعظم کے ہراول دستے شہر سبز میں داخل ہو گئے۔

آگے آگے گھڑ سوار لمبے لمبے کچدار نیزے سنبھالے، کاندھوں پر چھوٹی کمانیں، بائیں جانب ترکش،
کے ساتھ لٹکتی ہوئی تلواریں۔

تیمور نے پہلی بار مغلوں کو قریب سے دیکھا تھا۔ اسے ان مغلوں میں اپنی شباہت نظر آئی۔ وہی کھنچی ہوئی تیز
روشن آنکھیں۔ بھاری جسم اور ..... اور سب کچھ تاتاریوں ہی جیسا تھا۔ صرف نام ہی کا فرق تھا۔ دونوں ہی
تاتاری اسلام لے آئے تھے۔ چغتائی مغل ابھی اس نعمت سے محروم تھے۔

خانِ اعظم تغلق تیمور نے شمالی پہاڑوں سے اتر کر سمرقند کے ذرا اوپر اپنا ڈیرہ لگایا تھا۔ اس کے دستے
مار میں مصروف تھے۔ مزاحمت نا کو بھی نہ ہوئی۔ تاتاری سوار قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ خانِ اعظم کو اگر کچھ خطرہ تھا تو
یہ سے تھا۔ اس نے اپنے ہراول دستے شہر سبز کی طرف بھیجتے وقت اپنے سرداروں کو نصیحت کی:

"برلاس قبیلے کے نوجوان سردار تیمور سے ہوشیار رہنا۔ لڑائی میں پہل نہ کرنا۔ جنگ ہو تو یلغار کر کے
دشمن کو ختم کر دینا"۔

لیکن شہر سبز میں کوئی مزاحمت نہ ہوئی۔ مقابلہ پر کوئی نہ نکلا۔ ہراول کا سردار بیگ جب اپنے دستوں
کے ساتھ قصرِ سفید کے سامنے پہنچا۔ اسے بتایا گیا کہ تیمور کا مسکن قصرِ سفید ہے۔ بیگ کو خیال گزرا کہ تیمور
نا یہ اس کی آمد کی خبر سن کر قصرِ سفید چھوڑ کر بھاگ گیا ہے لیکن تیمور قصر میں موجود تھا۔ اسے مغل سردار کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دروازے تک پہنچنے کا انتظار تھا۔

بیک جک کشمکش و پنج میں تھا کہ قصر کا بڑا دروازہ کھل گیا۔ تیمور اپنے پانچ سرداروں کے ساتھ بڑھا کر مغل سردار کے پاس پہنچا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ مغل اسلحہ سے لیس تھے۔ تیمور اور اس کے ساتھ جسم پر کوئی اسلحہ نہ تھا۔

بیک جک کو قدرے تعجب ہوا۔

تیمور مسکراتے ہوئے بولا:

"قبیلہ برلاس کا سردار تیمور اپنے معزز مغل سردار کو خوش آمدید کہتا ہے۔"

بیک جک کا منہ کھل گیا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں تیزی سے گردش کرنے لگیں۔

تیمور پھر بولا:

"معزز مہمان۔ اندر تشریف لے چلیے۔ سفر کی تھکان دور کیجیے۔ کھانا تیار ہے۔"

بیک جک حیرت میں ڈوبا گم سم کھڑا تھا۔ اس کے خوں خوار دستے بھی دریائے حیرت میں غرق تھے۔ سرداروں کا اس انداز سے پہلی بار استقبال کیا جا رہا تھا۔

تیمور کے اشارے پر ایک غلام سر پر ایک خوان اٹھائے باہر آیا۔ تیمور نے خوان پوش ہٹایا۔ ہر چمک دمک سے مغلوں کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

تیمور نے اپنے ایک سردار کو اشارہ کیا۔ سردار نے غلام کے سر سے خوان لے لیا اور تمام جواہر مغل سردار کے اوپر نچھاور کر دیے۔ چھوٹے بڑے جواہر ریزے زمین پر گر کر جھلمل جھلمل کرنے لگے۔ بیک جک کی حیرت اور بڑھ گئی۔

تیمور نے کہا:

"اس صدقہ کو قبول فرمایئے اور اندر تشریف لے چلیے۔"

بیک جک نے خواب آلود نظروں سے تیمور کو دیکھا اور سحر زدہ انسان کی طرح گھوڑا بڑھا کر قصر میں داخل ہوا۔

قصر سفید کے سبزہ زاروں میں حد نظر تک قالینوں کا فرش بچھا تھا۔ درمیان میں سفید سنگ مرمر کی ایک چوکی تھی۔ نمدے کی مسند مغلوں کو بہت پسند تھی۔ تیمور نے اسی لیے یہ انتظام کیا تھا۔ چار ہزار مغل سوار

بیٹھ گئے۔ بیک جک نے بلا تکلف مسند سنبھال لی۔ مغلوں کے بیٹھتے ہی سرپوش ڈھکی سینیاں آنے لگیں۔ سینیوں میں منہ بند تھیلیاں قرینے سے رکھی تھیں۔ غلاموں نے ہر مغل کے سامنے ایک ایک تھیلی رکھ دی۔ ایک بے صبر مغل نے تھیلی کھول کر فرش پر الٹ دی۔ اس میں دینار بھرے تھے۔ سونے کی چمک دیکھ کر مغل نے جلدی سے دینار سمیٹ کر پھر تھیلی میں بھر لیے۔

بیک جک کی حیرانی بڑھتی جا رہی تھی۔ مغلوں میں تھیلیاں تقسیم ہو چکیں تو بیک جک نے کن انکھیوں سے تیمور کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو: "میرا حصہ"۔

تیمور نے غلاموں کو اشارہ کیا۔ غلاموں نے چار خوان لا کے بیک جک کے سامنے رکھ دیے۔۔۔۔ بیک جک نے بے صبری سے ایک کا خوان پوش الٹ دیا۔ خوان میں پانڈی کی چھوٹی چھوٹی اینٹیں سجا کے رکھی گئی تھیں۔ اس نے دوسرا خوان پوش الٹا۔ یہ خوان سونے کی اینٹوں سے بھرا تھا۔ تیسرے میں دینار بھرے تھے اور چوتھے میں جواہرات کے چار ہار تھے۔

بیک جک کی آنکھیں اتنی دولت دیکھ کر پھٹی رہ گئیں۔ وہ تمام شہر سبز کو نہ دبا کر دینا تو بھی اسے اتنی دولت حاصل نہ ہوتی۔

تیمور، بیک جک کی حریص نظروں کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ بیک جک کی نظریں دولت کے اس ڈھیر سے نہ ہٹتی تھیں۔ شہر سبز آنے کا حوصلہ اسے اس کی امیدوں سے بھی زیادہ مل گیا تھا۔

آخر بیک جک نے نظریں اٹھا کر تیمور کو دیکھا۔ اس نے کہا:

"کیا تاتاری، حملہ آوروں کی اسی طرح آؤ بھگت کیا کرتے ہیں۔"

تیمور مسکرا کر بولا:

"سردار محترم! کوئی حاکم اپنی ریاست میں حملہ آور نہیں ہوا کرتا۔ ہمارے باپ داداؤں نے آپ کے باپ داداؤں سے معاہدہ کیا تھا کہ بادشاہ جنتہ مغل ہوں گے اور تاتاری سرداری کریں گے۔ سمرقند کی حکومت خانِ اعظم کرتا ہے۔ ہم تو ان کی طرف سے اس کے امیر اور سردار ہیں۔ پھر آپ حملہ آور کیسے ہوئے۔ آپ کی خاطر کرنا ہمارا فرض ہے۔"

بیک جک کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے بولا:

"اس کا فیصلہ تو خانِ اعظم کرے گا کہ بادشاہ کون ہے اور سردار کون؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تیمور سمجھ گیا کہ مغل سردار کے موٹے دماغ میں اس کی بات نہیں آئی۔ تیمور نے کھانا لانے کا اشارہ کیا۔ بھاپ اٹھتے ہوئے بھنے گوشت کے تھال آنا شروع ہو گئے۔ پرندوں کا گوشت، بکروں اور بھیڑوں کا گوشت، گھوڑوں کے گوشت کے کباب، جَو کی موٹی موٹی شہد میں ڈوبی ہوئی روٹیاں۔ مغل بھوک اور تھکن سے نڈھال ہو رہے تھے۔ انہوں نے خوب ڈٹ کر کھانا کھایا اور تھیلیاں خورجیوں میں رکھ کر وہیں قالینوں پر سو گئے۔

تیمور بیک جک کے پاس آ بیٹھا اور بولا:

"آپ ہراول دستوں کے سردار ہیں لیکن مجھے آپ کا نام ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا؟"

"بیک جک!"

اس نے جماہی لیتے ہوئے کہا:

"مغل مقدمۃ الجیش کے ہراول دستوں کے تین سردار ہیں۔ دو سردار میرے پیچھے آ رہے ہیں۔"

تیمور نے کہا:

"میں نے آپ کے آرام کے لیے اندر انتظام کرا دیا ہے۔ پلنگ ہیں تو وہاں تشریف لے چلیے۔"

بیک جک سنی اَن سنی کرتے ہوئے بولا:

"تیمور۔ کیا تم خانِ اعظم کو بادشاہ سمجھتے ہو؟"

"کیوں نہیں"

تیمور نے فوراً جواب دیا:

"یہ بات تو ہمارے اور آپ کے باپ داداؤں میں صدیوں پہلے طے ہو چکی ہے۔ ہم نے تو وہ ہے اس پر قائم ہیں۔"

بیک جک صرف "ہوں" کر کے رہ گیا۔

تیمور بولا:

"میں آپ لوگوں کی آمد کی خوشی میں ایک جشن کر رہا ہوں۔"

"کیا کہا۔ جشن؟"

بیک جک چونک پڑا:

"اے تاتاری سردار۔ کہیں تک ہمیں فریب تو نہیں دے رہا ہے۔ تُو نے ہمارا استقبال کیا۔ حالانکہ ہمیں شہر سبز میں زبردست مقابلے کی امید تھی۔ تم نے ہمارے جانبازوں کو بغیر کسے دولت دی۔ ہمیں اتنا کچھ دیا کہ جتنا ہم مانگنے کا خیال بھی نہ کر سکتے تھے۔ تم ہمارے ساتھ ایسا سلوک کیوں کر رہے ہو۔ کیا ہمارے سپاہیوں نے لوٹ مار نہیں کی۔ کیا تمہاری کھیتیاں برباد نہیں ہوئیں؟ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تم ہمیں دھوکا دے کر کسی جال میں پھانسنا چاہتے ہو۔"

"محترم سردار"۔

تیمور دھیمے لہجے میں بولا:

"آپ نے یا خانِ اعظم نے جو کچھ کیا یا جو قدم اٹھایا وہ سب ایک غلط فہمی کی بنا پر ہوا۔ میرا باپ طرغائی اچانک انتقال کر گیا۔ مجھے سمرقند چھوڑ کر شہرِ سبز آنا پڑا۔ اگر میں سمرقند میں موجود ہوتا تو خانِ اعظم کو اس یلغار کی ضرورت نہ پڑتی۔"

"اچھا اچھا۔ تم جشن کرو لیکن ہمیں غافل نہ سمجھنا۔ سوتے میں بھی ہمارا ہاتھ تلوار پر رہتا ہے۔" بیک جک نے تیمور کو تنبیہ کی۔

"اے مغل سردار"۔

تیمور نے وضاحت کی:

"شب خون یا غفلت میں حملہ کرنا صرف جنگ کے دنوں میں جائز ہے۔ مجھے اگر آپ سے مقابلہ کرنا ہوتا تو آپ شہرِ سبز کی حدود میں داخل نہ ہو سکتے۔ ہم نے آپ کو مہمان بنایا ہے۔ غلط فہمیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ جشن سے فارغ ہونے کے بعد میں خانِ اعظم کے پاس خود جاؤں گا۔"

"بس اب میرا دل صاف ہو گیا"۔

بیک جک نے کہا:

"تم فوراً خانِ اعظم کے پاس جا کر اپنی صفائی پیش کرو۔ تمہارا شہر ہماری حفاظت میں رہے گا۔ کسی مغل سردار نے تمہارا نکالنے کی کوشش کی تو میں اس کا خاتمہ کر دوں گا۔"

"آپ اپنے سرداروں کو ناراض نہ کریں۔"

تیمور نے اس کے چھوٹے سرداروں کی حمایت و ہمدردی حاصل کرنے کے لیے کہا:

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اگر انہیں اور دولت کی ضرورت ہو تو مجھ سے کہیں۔ میں انہیں اور دوں گا لیکن میں چاہتا ہوں میرے پاس جو کچھ باقی رہ گیا ہے وہ خانِ اعظم کی خدمت میں پیش کر دوں۔"

"تیمور۔ تم تو مغلوں کے دوست معلوم ہوتے ہو۔"

بیگ جک مسند کا سہارا لیتے ہوئے بولا:

"ہم خانِ اعظم کا حق چھیننا نہیں چاہتے۔ تم ان کا حصہ سمرقند لے جا سکتے ہو۔"

دوسرے دن سے جشن شروع ہو گیا۔

صبح سے شام تک جانور ذبح ہوتے رہتے اور کھانے پکتے رہتے۔ تاتاری ساز، نغمے اور رقص میں مغلوں ہی جیسے تھے۔ شمالی کوہستان کے قبائلی طائفے مغلوں کی محفلوں میں بھی شریک ہوتے اور جب انہیں جنوب میں بلایا جاتا تو تاتاریوں کا دل بہلانے بھی آ جاتے۔ تیمور نے مغلوں کی دل بستگی کے لیے ایسے ہی ناچ گانے کے طائفے شمال سے بلوائے تھے۔

تیمور نے کھانے کے تمام لوازمات مہیا کیے لیکن اس نے کسی دعوت میں بھی مغلوں کو شراب نہ پلوائی۔ یہ بات نہیں کہ تاتاری شراب نہ پیتے تھے لیکن یہ مسلمان ہو چکے تھے۔ اس لیے شراب کو حرام سمجھتے اور کھلے بندوں پینے سے گریز کرتے۔ مولانا زین الدین نے تیمور سے کہہ دیا تھا کہ مغلوں کو شراب نہ پیش کی جائے۔ خود بھی شراب سے پرہیز کرتا تھا لیکن مغلوں میں یہ وبا عام تھی اور وہ خاص قسم کی شراب استعمال کرتے تھے جو گھوڑی کے دودھ میں تربوز کی شراب ملا کر وہ ایک محلول بناتے۔ اس قسم کی شراب کے مٹکے ان کے ساتھ ہوتے تھے۔

اس جشن میں تیمور نے روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ تیمور کی خاطر و مدارات کو دیکھ کر مغل پانی پانی ہو گئے۔ بیگ جک تیمور کے اخلاق اور مہمان نوازی سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے حکم دے دیا کہ شہر سبز کی کوئی چیز کو ہاتھ نہ لگایا جائے۔ ہاتھ لگانے کی انہیں ہوں کوئی ضرورت نہ تھی۔ وہ جس چیز کی خواہش کرتے تیمور کے غلام فوراً لے آتے۔ شراب اور عورت کے لیے تیمور نے بیگ جک سے معذرت کر لی تھی۔ یہ دونوں کو سب سے زیادہ دولت عزیز تھی اور دولت کے تو تیمور نے انبار لگا دیے تھے۔

جشن کے بعد تیمور نے بیگ جک سے کہا:

"اے مغل سردار۔ اب مجھے خانِ اعظم کے پاس جانے کی اجازت دے دیجیے۔ مجھے افسوس ہے میں اپنے مہمانوں کی شایانِ شان خدمت نہ کر سکا۔"

بیگ جک نے قہقہہ لگایا اور بولا:

"نوجوان تاتار۔ تو کتنا دل والا ہے۔ اتنا کچھ دینے اور خاطر مدارات کے بعد بھی معذرت کر رہا ہے۔ میں نے تیرے جیسا فیاض آدمی نہیں دیکھا۔"

تیمور نے بڑبڑا کر کہا:

"مغل سردار۔ میں نے شہر سبز اور اپنے قبائل کی دولت آپ کے یہاں پہنچنے سے پہلے اکٹھا کر لی تھی۔ یہاں تک کہ مذہبی اوقاف کا بیت المال بھی میں نے یہاں منگوا لیا تھا۔ اب میرے علاقے میں آپ کو کسی کے پاس جواہر کا ایک ریزہ یا سونے کا ایک چھلا بھی نہ ملے گا۔ جو کچھ ہے وہ میرے پاس ہے۔ اس تمام دولت میں سے میں نے خانِ اعظم کا حصہ نکال کر سب کچھ آپ لوگوں میں بانٹ دیا ہے۔ اگر خانِ اعظم کی خدمت میں نذرانہ نہ دینا ہوتا تو یہ بچا کھچا مال بھی میں آپ لوگوں کے حوالے کر دیتا۔"

مغل ہر چند کہ اجڈ اور جاہل جنگجو تھے مگر عقل سے عاری نہ تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان میں سوجھ بوجھ بھی آ گئی تھی۔ بیگ جک تیمور کا مطلب فوراً سمجھ گیا۔ بولا:

"تیمور۔ تو مطمئن ہو کر خانِ اعظم کے پاس جا۔ تیری عدم موجودگی میں تیرا علاقہ ہماری حفاظت میں رہے گا۔ ہمیں نہ تو اور زیادہ دولت کی تمنا ہے اور نہ ہی ہم تیرے جیسے بہادر نوجوان کی دوستی چھوڑنا چاہتے ہیں۔ تو خانِ اعظم کا مال ساتھ لے جا۔ کوئی مغل کسی تاتاری گھر کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا۔ جب تک تو واپس نہیں آتا ہم قصرِ سفید کی حدود سے قدم نہ نکالیں گے۔"

بیگ جک کی باتوں سے ظاہر ہو گیا کہ ان کی طمع کی آگ بجھ چکی ہے اور اب وہ تیمور کے جانے کے بعد اس کے علاقہ میں کسی قسم کی گڑبڑ نہ کریں گے۔

تیمور نے ادھر سے مطمئن ہو کر خانِ اعظم تغلق تیمور کے دربار میں حاضر ہونے کا فیصلہ کیا۔ تیمور کو جس طرح اپنا وقار عزیز تھا اسی طرح وہ خانِ اعظم کا وقار بھی برقرار رکھنا چاہتا تھا اور چاہتا تھا کہ دربار میں اس شان سے حاضر ہو کر دونوں کی عظمت میں کوئی فرق نہ آئے۔

تیمور نے اپنے ساتھ جانے والے تمام لوگوں کو درباری لباس پہنایا۔ پھر باقی دولت اور بیش بہا تحائف لے کر سمرقند کی طرف چلا۔ بیگ جک نے اسے خوشی خوشی رخصت کیا اور مولانا زین الدین نے فی امان اللہ کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تیمور نے بیگ جگ سے کہا تھا کہ اس نے شہرِ سبز کی تمام دولت اکٹھا کر لی ہے۔ یہ تیمور کی
کا اظہار تھا۔ یہ ایک حقیقت تھی جس کا اس نے برملا اظہار کر دیا۔ مغلوں کی یلغار کا سن کر اس نے مولانا
سے صلاح مشورہ کیا تھا۔ اس نے مولانا سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ:

"بارہ ہزار مغلوں کا مقابلہ کرنا اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔ شہرِ سبز کو اگر بچایا جا سکتا ہے تو
حکمتِ عملی سے۔"

چنانچہ اس نے مغلوں کو دولت کی چمک سے زیر کر لیا اور اب وہ اطمینان سے سمرقند جا رہا تھا۔

تیمور نے جتنی دولت بیگ جگ اور اس کے سواروں میں تقسیم کی تھی اس سے کئی گنا زیادہ دولت
لے کر جا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ خانِ اعظم صرف چاندی کے جوتے ہی سے سیدھا ہو سکتا ہے۔ سمرقند اور اردگرد
کو اگر بچانا ہے تو دولت کے دریا بہا دو لیکن سمرقند کے راستہ میں دو اور لٹیرے اس کے پیچھے لگ گئے
خانِ اعظم نے تین ہزار دستے شہرِ سبز آگے پیچھے روانہ کیے تھے۔ ایک دستے کا سردار بیگ جگ تھا
شہرِ سبز میں آرام کر رہا تھا۔ اس کے بعد آنے والے دستوں کے سردار جانی بیگ اور ارکنت تھے۔ یہ
سردار بیگ جگ سے زیادہ لالچی نکلے۔

تیمور صرف پچاس مسلح سواروں کے ساتھ خانِ اعظم سے ملنے جا رہا تھا۔ دولت اور تحائف کئی چھکڑوں
لدے تھے۔ جانی بیگ اور ارکنت نے تیمور کو گھیر لیا۔ اتنی بہت سی دولت دیکھ کر ان کی آنکھیں چمک اٹھیں
اور منہ میں پانی آ گیا۔

تیمور نے انہیں بتایا کہ یہ تمام دولت اور مال و اسباب خانِ اعظم کی خدمت میں پیش کرنے
لیے لے جا رہا ہے لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور اپنا حصہ طلب کیا۔ تیمور کو غصہ آ گیا۔ اس نے چھکڑے ان
حوالے کر دیے اور خالی ہاتھ سمرقند جانے کا قصد کیا۔

مغل سردار ڈر گئے کہ خانِ اعظم کو معلوم ہو گا تو وہ ضرور ناراض ہو گا۔ پھر بھی انہوں نے تیمور کی
اور دھونس بیٹے سے کچھ نہ کچھ سونا چاندی اور تحائف بٹھا لیے۔ تیمور نے ان کی خواہش کے مطابق انہیں
دلا کر اپنا پیچھا چھڑایا اور آگے بڑھا۔

قاسم نے شہزوری کے چہرے سے ریشمی زلفیں ہٹاتے ہوئے کہا:

"شہزوری۔ کچھ سوچو۔ کچھ سمجھو۔ ہم آخر کب تک انتظار کرتے رہیں گے۔"

شہزوری نے نرگسی آنکھیں اٹھائیں۔ مسکرائی اور بولی:

"قاسم۔ اتنے بے صبر کیوں ہوتے ہو۔ ہم روز ملتے ہیں۔ ابا جان نے ہم پر کوئی پابندی تو نہیں لگائی۔"

"شہزوری!"

قاسم بے بسی سے بولا:

"تم سمجھتی کیوں نہیں۔ ماموں جان تمہاری شادی مجھ سے نہیں۔۔۔۔"

شہزوری نے جلدی سے اپنا سیمیں ہاتھ قاسم کے منہ پر رکھ دیا۔ شرارت سے بولی:

"بری بات منہ سے نہیں نکالا کرتے۔ ابا جان نے ماں سے قبیلے کے سامنے ہماری منگنی کا اعلان
کر دیا ہے۔ وہ تمہیں بہت چاہتے ہیں۔"

"وہ مجھے ہرگز نہیں چاہتے۔"

قاسم جھلا گیا۔

"انہیں میری ضرورت ہے۔ وہ تمہاری آڑ میں مجھے روکے ہوئے ہیں۔ اگر انہوں نے تمہاری شادی میرے
ساتھ کر دی تو میں انہیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔"

شہزوری کو اس غصے پر بڑا پیار آیا۔ اس کا دل چاہا کہ قاسم سے لپٹ کے کہے:

"پیارے قاسم۔ یوں غصہ نہ کیا کرو۔ میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔"

لیکن وہ یہ کہنے کے بجائے کھل کھلا کے ہنس پڑی جیسے بہت سے گھنگھرو ایک ساتھ کھل جائیں۔ قاسم
نے دریائے آمو کی لہروں میں تھرتھراتے سورج پر نظریں جماتے ہوئے کہا:

"سورج نکلتا ہے۔ ڈوبتا ہے۔ دن ہوتا ہے۔ گزر جاتا ہے۔ ماموں جان وقت کے ساتھ اسی طرح ہمیں
چلے جا رہے ہیں۔ تمہاری محبت کی زنجیریں میرے پیر پکڑے ہوئے ہیں ورنہ میں اب تک یہاں سے
چلا گیا ہوتا۔"

"مجھے چھوڑ کے؟"

شہزوری کی شوخی میں ذرا بھی کمی نہ آئی۔ چودہ سال کی شہزوری سنجیدہ ہونا جانتی ہی نہ تھی۔ وہ تو اڑتی تتلی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ جنگلی ہرنی۔ قلانچیں بھرتی ہوئی۔ انہی اداؤں نے قاسم کو اس کا گرویدہ کر رکھا تھا۔

قاسم نے کہا:

"تم حالات کی سنگینی پر غور نہیں کرتیں شہزوری کبھی سنجیدہ ہو کر بھی سوچو۔"

شہزوری نے اس کے دھڑکتے سینہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ بولی:

"مردوں کا دل بڑا ہوتا ہے۔ میں عورت ہو کر ٹسوے نہیں بہاتی۔ تم تو مرد ہو۔ میرے لیے اس سے بڑا اور کیا سکون ہو سکتا ہے تم میرے سامنے ہو۔ دریائے آمو کا کنارہ ہے۔ اس کی سبک لہریں مجھے ترانے گاتی ہیں۔ ٹھنڈی ہوائیں نغمے بکھیرتی ہیں۔ ہم ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے، سیر کرتے، شکار کھیلتے ہیں۔ مجھے کیا چاہیے؟"

"یہ ایک پُرفریب خواب ہے شہزوری۔" قاسم نے اٹھتے ہوئے کہا:

شہزوری فوراً بولی:

"اگر یہ خواب ہے تو بھی مجھے پسند ہے۔ میں اس خواب میں ڈوب جانا چاہتی ہوں۔" شہزوری نے قاسم کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اسے بٹھا لیا۔

"میں جا رہا ہوں شہزوری!" قاسم نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"کہاں؟" شہزوری پر پہلی بار گھبراہٹ طاری ہوئی۔

"سردار تیمور کے پاس۔"

قاسم نے انکشاف کیا۔

"تمام تاتاری سردار مغلوں کے ڈر سے اپنے اپنے قلعوں میں منہ چھپائے بیٹھے ہیں۔ تیمور ہی ایک مرد ہے جس نے شہر سبز نہیں چھوڑا۔ تمہارے ابا جان صرف حاجی برلاس ہیں وہ تاتاری نہیں۔"

شہزوری آگ بگولہ ہو گئی۔ تڑپ کے کھڑی ہوئی۔ بولی:

"قاسم۔ تمہیں ابا جان کے دشمن کا نام لیتے شرم آنی چاہیے۔ ابا جان بزرگ ہیں۔ تیمور کے چچا ہیں کے ہوتے ہوئے تیمور نے قبیلہ کی سرداری کا دعوا کیوں کیا۔ وہ تاتاریوں کا باغی ہے۔"

قاسم نرم پڑتے ہوئے بولا:

"شہزوری! میں اپنی محبت کے درمیان ان باتوں کو نہیں لانا چاہتا تھا لیکن ماموں جان کی حیات

مجھے زبان کھولنے پر مجبور کر دیا۔ میں جانتا ہوں تم اپنے باپ کے خلاف ایک لفظ سننا پسند نہیں کرو گی لیکن میں تمہاری محبت کی قسم کھا کر کہتا ہوں شہزوری۔ سردار تیمور بہت عظیم ہے۔ وہ تاتاریوں کی ناک ہے۔ ان کی عظمت کا نشان ہے۔ تمہیں حالات کا علم نہیں۔ تم نہیں جانتیں کہ مغلوں نے ہم پر یلغار کیوں کی ہے۔ اس تباہی کا ذمے دار کون ہے؟"

قاسم بہت جذباتی ہو گیا اور اس کا جسم کانپنے لگا۔

شہزوری کو قاسم سے بے انتہا محبت تھی۔ قاسم اس کا پھوپھی زاد تھا۔ دونوں بچپن سے ایک ساتھ کھیلتے ہوئے جوان ہوئے تھے۔ ہمہ وقت قربت، انسیت اور محبت میں تبدیل ہو ہی جاتی ہے۔ پھر دو سال پہلے ان کی منگنی کا باقاعدہ اعلان بھی ہو چکا تھا لیکن شہزوری کا باپ شادی کے لیے ٹال مٹول کر رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حاجی برلاس کو قاسم پسند نہ تھا۔ قاسم کی وجاہت اور شجاعت کا حاجی گرویدہ تھا۔ تیمور کے بعد اگر تاتاریوں میں حاجی کو کوئی جوان نظر آتا تھا تو وہ قاسم ہی تھا۔ شہزوری اور قاسم کی شادی میں رکاوٹ کی اصل وجہ یہ تھی کہ قاسم کا جھکاؤ تیمور کی طرف تھا۔ بہادر ہمیشہ بہادر کو پسند کرتا ہے۔ تیمور اور قاسم کئی سال تک ایک ساتھ رہے تھے۔ قاسم نے اپنی جوان اور ناتجربہ کار آنکھوں سے تیمور میں وہ جوہر قابل دیکھ لیا تھا جو برلاس کی تجربہ کار باراں دیدہ نظریں نہ دیکھ سکی تھیں۔ حاجی برلاس کو یقین تھا کہ شادی ہوتے ہی قاسم شہزوری کو لے کر تیمور کے پاس چلا جائے گا اور یہ بات اسے کسی طرح گوارا نہ تھی۔

شہزوری نے ہاتھ بڑھا کر قاسم کی کمر سے خنجر کھینچ لیا۔ بگڑ کر بولی:

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میرے باپ نے مغلوں کو بلایا ہے؟"

"شہزوری!"

قاسم نے پیار سے کہا:

"تم میری زبان پکڑ سکتی ہو۔ چاہو تو کاٹ بھی سکتی ہو لیکن دنیا کو کیا کہو گی۔ تمام بوڑھے تاتاری یہی کہہ رہے ہیں کہ اگر حاجی برلاس اور بایزید جلاٹر ہمت کر کے دوسرے سرداروں کو ملا کر مقابلے پر آ جاتے تو یہ مغلوں کے قدم سمرقند تک نہ آتے۔ کیا یہ بزدلی نہیں کہ ماموں جان مغلوں کے ڈر سے ہرات بھاگ آ رہے ہیں۔"

شہزوری بہت تیز طرار تھی لیکن قاسم کی باتوں میں اتنا وزن تھا کہ وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شہزوری نے کہا:

"قاسم۔ کیا ابا جان مغلوں سے ڈر کر بھاگ رہے ہیں۔ وہ تو کہتے ہیں کہ اگر دشمن طاقت

کے سامنے سے ہٹ جانا چاہیے۔"

"نہیں شہزوری۔ حملہ آور ہمیشہ زبردست ہی ہوا کرتا ہے۔"

قاسم نے اسے سمجھایا:

"لیکن تاتاری ان سے کم نہیں۔ مقابلہ کیا جاتا تو کامیابی کی زیادہ امید تھی۔"

"پھر سب تاتاری اکٹھا کیوں نہیں ہوتے۔" شہزوری نے پوچھا۔

"اکٹھا کیسے ہوتے؟"

قاسم بے دلی سے بولا:

"متحد ہونے کے لیے ایک مردار کو حاکم سمجھنا پڑتا ہے۔ وہ حاکم صرف تیمور ہو سکتا ہے اور

تاتاریوں کی سرداری کا اہل ہے۔"

"کیا تیمور بہت بہادر ہے۔" شہزوری نے بے خیالی میں سوال کیا۔

قاسم نے کہا:

"صرف بہادر نہیں۔ وہ عقلمند بھی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کس وقت کیا کام کرنا چاہیے۔" پھر وہ

ہو گئے اور دیر تک اپنے اپنے خیالوں میں گم رہے۔

سورج غروب ہو گیا لیکن رات کی سیاہی پھیلنے سے پہلے ہی دور پیڑوں کی شاخوں سے چا

نکالا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چلنے لگے۔ اور فضا میں کیف رچ گیا۔ ایسی فضا محبت بھرے دل

بڑی بگاڑ ہوتی ہے۔

شہزوری نے سر جھٹکتے ہوئے کہا:

"قاسم تم نے جو کچھ کہا وہ ٹھیک ہے لیکن میں بھی تو مجبور ہوں۔ مجھے ابا جان کا حکم

"ٹھیک ہے شہزوری۔ تم اپنے باپ کا حکم مانتی رہو اور میں یونہی جل جل کر مر جاؤں؟"

چا گئی۔

شہزوری نے دریا میں پیر لٹکا دیے اور پانی اچھالتے ہوئے بولی:

"ہم کتنے بے بس ہیں قاسم۔ لہروں میں بہتے ہوئے تنکوں کی طرح۔ لیکن مجھے امید ہے کہ ایک نہ

ایک دن ہم اپنی منزل پر ضرور پہنچیں گے۔"

شہزوری نے آج قاسم کی باتیں غور سے سنی تھیں اور ان سے اتفاق بھی کیا تھا۔ وہ واقعی مجبور تھی۔

اس کا احساس قاسم کو بھی تھا۔

قاسم دریا کے کنارے سبزے پر لیٹ گیا۔ شہزوری نے اس کے سینے پر سر رکھ دیا۔ . . . جیسے

قاسم کے دل کی دھڑکن سن رہی ہو۔ قاسم کو شہزوری کے اس طرح سینے پر سر رکھنے سے ایک خاص قسم کا کیف

محسوس ہونے لگا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

شہزوری نے جلدی سے اپنا سر ہٹا لیا۔ بولی:

"تمہارا دل زور زور سے کیوں دھڑک رہا ہے قاسم؟"

قاسم کو شہزوری کی معصومیت بڑی بھلی معلوم ہوئی۔ آہ بھرتے ہوئے کہا:

"شہزوری! میرا دل اس خوف سے دھڑک رہا ہے کہ کہیں تم مجھ سے جدا نہ کر دی جاؤ۔"

شہزوری تن کر بولی:

"واہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں تمہاری ہوں۔ عورت ایک بار کسی کی ہو جائے تو پھر وہ کسی اور کی بیوی

نہیں ہو سکتی۔"

شہزوری کا سر پھر قاسم کے سینے پر آ گیا۔

قاسم اس کی زلفوں کو چھیڑتے ہوئے بولا:

"وہ دن میری زندگی کا سب سے حسین دن ہو گا جب حاجی برلاس تمہیں ہمیشہ کے لیے میرے حوالے

دیں گے۔"

شہزوری نے اپنا چہرہ چاند کی طرف کیا۔ چاند اب بلند ہو چکا تھا اور چاندنی ہر طرف بکھر گئی تھی۔ قاسم

کر بیٹھ گیا۔ اس نے بھی چاند کو دیکھنا شروع کر دیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں اور چاند کے دلکش

سے شہزوری کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ وہ قاسم کے سہارے بیٹھ گئی۔

قاسم نے محبت بھرے لہجے میں کہا:

"شہزوری۔ کیا واپس نہیں چلو گی۔ تمہارے ابا جان پریشان ہو رہے ہوں گے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شہزوری نے جیسے سنا ہی نہیں۔ بولی:

"قاسم۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم یہاں بیٹھ کے تمام رات چاندنی کا لطف اٹھاتے رہیں؟"

"ممکن ہے"۔

قاسم مسکرایا:

"بشرطیکہ تمہارے ابا جان چاہیں۔ پھر دن بھی ہمارے ہوں گے اور راتیں بھی"۔

محبت کے متوالے بڑی رات تک دریا کے کنارے بیٹھے چاند اور چاندنی اور جھلملاتی لہروں کا لطف اٹھاتے رہے۔ شہزوری کا سر کبھی قاسم کے شانے سے لگ جاتا تو کبھی لڑھک کر سینے پر آجاتا۔

معاً گھوڑوں کے بھاگنے کی آواز آئی۔ رات بھی زیادہ ہو چکی تھی۔ قاسم اور شہزوری چلتے ہوئے خیموں کے پاس آگئے۔

یہ حاجی برلاس کی خیمہ گاہ تھی۔

حاجی برلاس نے پہلے بڑے زور شور سے اپنے قبیلہ کی سرداری کا اعلان کیا۔ پھر سمرقند کی بھی دعویدار بن گیا لیکن تاتاریوں کی یلغار ہوتے ہی ایسا خوفزدہ ہوا کہ ماوراالنہر سے نکل بھاگا آمو پار کر کے خیمہ زن ہوا۔

یہاں آکر اسے کچھ سکون ملا تو اس نے قبیلہ کے باقی لوگوں کو پیغامات بھیج کر اپنے پاس بلایا۔ بہت سے پاس آگئے اور باقی نے انکار کر دیا۔ حاجی برلاس، تیمور کے سخت خلاف تھا لیکن دل ہی دل میں اس کی شجاعت کا بھی قائل تھا۔ اب سے کچھ سال پہلے اس نے ارادہ کیا تھا کہ اپنی بیٹی شہزوری کی شادی تیمور سے کر دے گا..... وہ دراصل ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا تھا۔ اگر تیمور اس کا داماد ہو جاتا تو اس کے بعد اس کی سرداری کی مخالفت کرنے والا کوئی نہ ہوتا۔ پھر تیمور کی صورت میں اسے ایک بہادر مل جاتا لیکن جب تیمور، امیر قزغن کے دربار میں پہنچ کر ایک ہزار سواروں کا سردار ہو گیا تو اس کو اس سے خطرہ محسوس ہوا۔ اور اس نے تیمور کی کھلے عام مخالفت شروع کر دی۔

اس مخالفت کے باوجود حاجی برلاس نے جب ہرات جانے کا فیصلہ کیا تو اس نے تیمور کو خط لکھ کر تیمور کو بلوانے کا مقصد یہ تھا کہ تیمور نے والیِ ہرات ملک معزالدین پر بڑے احسانات کیے تھے۔ تیمور کے ساتھ ہرات جاتا تو حاجی برلاس کو وہاں پناہ بھی مل جاتی اور تیمور کا چچا ہونے کی حیثیت سے اس کی

جگہ ہوتی لیکن تیمور نے چچا کو سخت جواب دیا اور ہرات جانے کے بجائے اس نے خانِ اعظم کے پاس نے کو ترجیح دی۔

حاجی برلاس کو تیمور کا جواب ملا تو وہ پڑھ کر بڑا متعجب ہوا۔ سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ تیمور ڈینگ ماری ہے اور رعب ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ بھلا مغل بھی کسی کے دوست ہوتے ہیں۔ اگر تیمور خانِ اعظم کے پاس گیا تو وہ اس کا سر اڑا دے گا۔ شاید حاجی برلاس کے دل کی بھی یہی آرزو تھی۔ اسے تیمور حماقت پر ہنسی آگئی۔

حاجی برلاس نے دریائے آمو پار تو کر لیا لیکن دوسری طرف جا کے خیمے لگوا دیے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ تک وہ تیمور کی تباہی نہ دیکھ لے گا اس وقت تک یہیں ٹھہرا رہے گا۔ اس کی نظر میں تیمور کی تباہی یقینی تھی۔ صرف چند دنوں کی بات تھی۔ مغل شہر سبز کا رخ کر چکے تھے۔ حاجی برلاس نے اپنے آدمی شہر سبز میں مقرر کیے تھے جو اسے دم دم کی خبریں پہنچا رہے تھے۔

حاجی برلاس کو پہلے خبر ملی کہ مغل شہر سبز میں داخل ہو گئے ہیں۔ تیمور نے ان کا استقبال کیا اور دعوت دی ہے۔ اس خبر پر اسے تعجب بھی ہوا اور غصہ بھی آیا لیکن ابھی ابھی اسے ایک سوار نے آکر خبر دی کہ تیمور نے سردار سے دوستی کر لی ہے اور انہیں دولت دے کر شہر سبز کو بچا لیا ہے۔ سوار نے یہ بھی خبر دی کہ تیمور جلد خانِ اعظم سے ملاقات کرنے شمال کی طرف جانے والا ہے۔

حاجی برلاس کے لیے یہ خبر بڑی مایوس کن تھی۔ وہ تو ہر لحظہ تیمور کی بربادی کی خبر سننا چاہتا تھا۔ مغلوں نے نہ تو تیمور سے جنگ کی اور نہ شہرِ سبز کو برباد کیا۔

حاجی برلاس کو اپنے بھتیجے کی عقل و فراست کی داد دینی چاہیے تھی جس نے اپنی عقلمندی سے اس سرسبز اور شہر کو بچا لیا تھا جس کا حاجی برلاس خود بھی دعوے دار تھا لیکن وہ اس خبر کو سن کر اور زیادہ جل گیا۔

حاجی برلاس تاؤ کھایا ہوا اور جلا بھنا بیٹھا تھا کہ قاسم اور شہزوری سیر کر کے واپس آگئے۔ قاسم کو دیکھتے ہی حاجی برلاس نے برا سا منہ بنا کر کہا:

"قاسم! تم نے کچھ اور سنا۔ طرغائی کے بیٹے نے زردجواہر سے شہر سبز کا سودا کیا ہے"۔

بات کچھ الجھی ہوئی تھی۔ قاسم فوراً نہ سمجھ سکا۔ اس نے پوچھا:

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ماموں جان۔ میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا۔"

"تمہارے دوست تیمور نے شہرِ سبز کی تمام دولت اکٹھا کر کے مغلوں کے حوالے کر دی ہے۔"

لہجے میں بڑی نفرت اور گہرا طنز تھا۔

قاسم کی سمجھ میں بات آ گئی۔ وہ حاجی برلاس سے پہلے ہی جلا ہوا تھا۔ بولا:

"ماموں جان۔ اگر تیمور نے زر و جواہر دے کر مغلوں کے ہاتھوں شہرِ سبز کو برباد ہونے سے بچا لیا تو میں اس کی عقل کی داد دیتا ہوں۔ دولت تو پھر اکٹھا ہو سکتی ہے۔ اگر شہرِ سبز کا حسن لٹ جاتا تو اسے بہار آنا ناممکن تھا۔"

حاجی برلاس کو قاسم کی بات ناگوار گزری۔ اس نے ناگواری کا اظہار کیا:

"تم نے تو تیمور کی حمایت پر کمر باندھ رکھی ہے۔ نہ جانے اس نے تمہیں کیا گھول کر پلا دیا ہے۔"

"معاف کیجیے ماموں جان۔"

قاسم جرأت سے بولا:

"اگر تیمور دولت دے کر شہرِ سبز کو بچا سکتا ہے تو آپ بھی مال و دولت دے کر پورے شہر کو بچا سکتے تھے۔ اب شہر شہر جو لوٹ مار ہو رہی ہے اس سے تو کہیں بہتر تھا کہ ان طمع کے بندوں کا پیٹ سونے سے بھر دیا جاتا۔"

"چپ ہو جاؤ قاسم۔"

حاجی برلاس بگڑ گیا:

"تم سیاست کے داؤ پیچ نہیں جانتے۔"

قاسم بھرا ہوا تھا اس نے کڑک کر کہا:

"ماموں جان۔ اسی داؤ پیچ کے نتیجہ میں آج برلاس قبیلہ کے لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر اس کنارے خیمے لگائے پڑے ہیں۔ خوش قسمت ہیں شہرِ سبز کے لوگ جو اپنے گھروں میں آرام سے بیٹھے ہیں۔ تیمور نے انہیں بچا لیا ہے۔"

"تم سخت گستاخ ہو گئے ہو قاسم۔" حاجی برلاس تلملا کر بولا:

"تمہیں تیمور پسند ہے تو اس کے پاس چلے جاؤ۔"

قاسم بھی آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا۔ بولا:

"ماموں جان۔ تیمور مجھے آج نہیں بچپن سے پسند ہے۔ وہ سرداری کے قابل ہے۔ آج نہیں تو کل وہ تاتاریوں کا سردار اعظم بنے گا۔"

"جاؤ۔ جاؤ چلے جاؤ اسی کے پاس۔" حاجی برلاس غصہ سے بے قابو ہوتے ہوئے بولا۔

قاسم اور شہزوری کے گھوڑے جن پر سوار ہو کر وہ واپس آئے تھے، قریب ہی کھڑے تھے۔ قاسم نے ایک للچائی نظر شہزوری پر ڈالی اور پھر نظریں جھکا کر آہستہ آہستہ اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا۔

قاسم اپنے گھوڑے کے پاس پہنچ گیا۔ شہزوری سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ زور سے چیخی:

"قاسم۔ قاسم مت جاؤ۔"

قاسم پر شہزوری کی آواز کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ رکاب میں پیر رکھ کر سوار ہو گیا۔ شہزوری تیزی سے اس کی طرف بھاگی۔ قاسم نے گھوڑے کو ایڑ دی۔ گھوڑا اسے لے اڑا۔

شہزوری قریب پہنچ چکی تھی۔ اس نے لگام پر ہاتھ ڈالا لیکن اس کے ہاتھ لگام کے بجائے گھوڑے کے ایال سے الجھ گئے۔ وہ ایال مضبوطی سے پکڑ کر لٹک گئی۔ قاسم نے گھبرا کر گھوڑا روکا مگر رکتے رکتے شہزوری کچھ دور تک گھوڑے کے ساتھ گھسٹتی چلی گئی۔ اس کے پیر اور پنڈلیاں زخمی ہو گئیں۔

گھوڑا رک گیا۔ قاسم نے جلدی سے اتر کر شہزوری کو ایال سے الگ کیا۔ شہزوری، قاسم کے ہاتھوں میں جھول گئی۔ جیسے پھول، گود میں آ گرے۔

حاجی برلاس اور اس کے سردار دوڑ کر وہاں پہنچ گئے۔

قاسم افسردگی سے بولا:

"معاف کیجیے ماموں جان۔"

اور حاجی برلاس جواب دینے کے بجائے شہزوری کے پیروں سے رستے ہوئے خون کو دیکھنے لگا۔

○

تیمور اپنے ساتھیوں کو لے کر بڑی تیزی سے معزِ خانِ اعظم سے ملنے شمال کی طرف جا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خانِ اعظم کو تحائف پیش کر کے اپنی اطاعت کا یقین دلائے تاکہ تاتاری علاقوں میں مزید لوٹ مار نہ ہو۔ سمرقند کے راستے میں اسے مغل ہراول دستوں کے دو اور سرداروں نے گھیر لیا۔ ان میں ایک کا نام جانی بیگ اور دوسرے کا التمش تیمور کریت تھا۔

تیمور نے محسوس کیا کہ یہ دونوں سردار شہرِ سبز میں پڑے ہوئے مغل سردار بیک جک سے برہم ہیں۔ بیک جک میں انسانیت، سمجھ بوجھ اور دوستی کا مادہ تھا لیکن ارکنت اور التمش ان جذبوں سے عاری تھے۔ ان کی خونخوار اور حریص نظریں ان کی سیاہ قلبی کی آئینہ دار تھیں۔ تیمور نے انہیں ان کے حسبِ منشا مال و زر دے کر اپنا پیچھا تو چھڑا لیا لیکن اسے خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں یہ دونوں شہرِ سبز پہنچ کر لوٹ مار نہ شروع کر دیں لیکن یہ باتیں سوچنے کا نہ تو وقت تھا اور نہ تیمور اس کا متحمل ہو سکتا تھا۔

تیمور نے اپنا سفر جاری رکھا۔

سمرقند کے شمالی نشیب میں اسے مغل خانِ اعظم کا اردوئے معلّٰی (لشکر) نظر آیا۔ پوری وادی میں قطاروں، گھوڑوں کے دستوں اور سفید بندے کے خیموں سے پٹی پڑی تھی۔ شاہی لشکر کی فردگاہ معلوم ہوتا تھا جیسے خیموں کا پورا شہر آباد ہے۔ جگہ جگہ آگ روشن تھی۔ زرق برق لباس میں ملبوس غلام بھاگتے پھر رہے تھے۔ مغل سوار لمبے نیزے اور صحرائی کمانیں لیے گھومتے نظر آتے تھے۔ ان نیزوں اور کمانوں کو مغلوں کو بڑا ناز تھا۔ ان کمانوں کا چلّہ کھینچنے میں بڑی طاقت استعمال کرنا پڑتی تھی۔ تاتاریوں کی بہ نسبت مغل کمانیں وزنی اور مضبوط تھیں لیکن وہ تیزی سے حرکت میں نہ آ سکتی تھیں۔ تاتاری اپنی ہلکی کمانوں کو اتنی تیز حرکت دیتے تھے کہ ان کے تیر بندوق کی گولیوں کی طرح کمانوں سے نکلتے تھے۔

چغتائی خاندان کا بانی، شمال کا خانِ اعظم تغلق تیمور خان، اپنے سرداروں کے ساتھ سفید بندے پر بڑی شان سے بیٹھا تھا۔

اس کے سردار نصف دائرے کی شکل میں اس کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ تغلق کا وہی چوڑا چکلا چہرہ۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بے قرار پتلیاں۔ چہرے پر مچھلی بکھری داڑھی۔

تیمور کا گھوڑا آہستہ آہستہ خانِ اعظم کے فرشی دربار کے سامنے پہنچا۔ تغلق تیمور کی پتلیاں تیمور پر گردش کر رہی تھیں۔ تیمور کی نظر بھی تغلق تیمور پر تھی۔

تیمور نے پہلی نظر میں یوں محسوس کیا جیسے تغلق تیمور کی شکل میں اس کا باپ طرغائی بیٹھا ہے۔

شکلوں میں اس قدر مشابہت پر تیمور کو تعجب سا ہوا۔ تیمور کے سردار درباری لباس پہنے اس کے عقب میں تھے۔

تیمور پوری تاتاری تمکنت سے فرش کے سرے پر پہنچ کر گھوڑے سے اترا۔ اس نے ایک سرسری نظر دربار پر ڈالی اور بڑے ادب سے تعظیم بجا لایا۔

تغلق تیمور، تیمور کی فولادی کڑیوں کی زرہ کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی زرہ پر سونے کا خوبصورت کام کیا ہوا تھا۔

کورنش پیش کرنے کے بعد تیمور نے بڑے وقار سے کہا:

"اے عالی نسب خانِ اعظم! اے اردوئے معلّٰی کے امیر! میں قبیلہ برلاس اور شہرِ سبز کا سردار تیمور ہوں۔"

تیمور کی بے باکی اور باوقار گفتگو سے خانِ اعظم بڑا متاثر ہوا۔ تیمور کو دیکھ کر اسے یقین کرنا پڑا کہ بیس سال سے کم عمر کا جوان بھی ایک سرکش تاتاری قبیلے کا سردار ہو سکتا ہے۔

تیمور نے پورے قبیلہ برلاس کے سردار ہونے کا اعلان کیا تھا حالانکہ برلاس قبیلہ کے زیادہ لوگ اس وقت اس کے چچا حاجی برلاس کے ساتھ دریائے آمو کے جنوب میں خیمے ڈالے پڑے تھے۔ تیمور نے ان کا ذکر جان بوجھ کر نہ کیا۔

تیمور نے اپنے سرداروں کو جو اس کے ساتھ ہی کورنش پیش کر چکے تھے، چھکڑوں سے تحائف لانے کا حکم دیا۔ چاندی اور سونے کی اینٹیں، جواہرات کے ہار، انگوٹھیاں، نگینے، آویزے، بڑے بڑے سچے موتی، چھوٹے چھوٹے ہیرے ٹکے ہوئے تاج۔

ہیروں کی چمک دمک سے آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔ فرش پر دولت کا اتنا اونچا ڈھیر لگ گیا کہ تیمور کو اڑیوں پر کھڑے ہو کر تغلق تیمور کو دیکھنا پڑ رہا تھا۔

تغلق تیمور خان نے تیمور کو بلا کر اپنے قریب ہی بٹھا لیا۔

اب تحائف اسامہ شروع ہوئے۔ چاندی کی چوکیاں۔ جواہر ریزوں کے جڑاؤ آئینے۔ سونے چاندی کے ظروف۔ زربفت۔ کمخواب کے تھان۔ حریری پردے۔

تغلق تیمور خان اور اس کے درباریوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ شاید وہ سوچ رہے تھے کہ اس قدر دولت تو وہ عمر بھر لوٹ مار کرنے کے بعد بھی اکٹھی نہ کر سکتے تھے۔ تیمور نے ایک شاہی خزانے کے برابر مال و دولت ان کے سامنے ڈھیر کر دی تھی۔ تیمور کو یہ تمام تحائف اور دولت، چھوٹی چھوٹی لڑائیوں میں حاصل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئی تھیں یا پھر امیر قزغن کے خزانے سے ملی تھی۔

تمام چھکڑے خالی ہو گئے۔ تمانچ اور دولت کا دربار میں پہاڑ سا بن گیا۔

تیمور نے مسکرا کر تغلق تیمور کو دیکھا اور اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر اس طرح جھاڑے جیسے کہہ رہا ہو

"میرے پاس جو کچھ تھا وہ سب کا سب آپ کی نذر کر دیا۔ میں تو اب خالی ہاتھ ہوں"۔

تغلق تیمور نرا جنگجو ہی نہ تھا۔ تجربے نے اسے عقل بھی عطا کر دی تھی۔ وہ تیمور کے اشارے کو سمجھ کر خود بھی مسکرانے لگا۔

خانِ اعظم تغلق تیمور خان کو جواں عمر تیمور کی تین ادائیں بہت بھائیں:

تیمور کی بے باکی

تیمور کی فقرہ بازی

اور تیمور کا ہاتھ جھاڑنے کا انداز۔

تیمور کا حوصلہ بڑھا۔ اس نے بے باک لہجہ میں کہا:

"خانِ اعظم! میں نے تمام سمرقند کی دولت آپ کے نذرانے کے لیے اکٹھا کر لی تھی۔ میں نے اس دولت میں سے کچھ آپ کو نذر کیا وہ اس دولت کا ایک حصہ ہے جو میں آپ کو پیش کرنا چاہتا تھا لیکن افسوس کہ تین کتوں نے خود کو آپ کا امیر ظاہر کرتے ہیں اس دولت کے حصے بخرے کر لیے اور میں آپ کو پورا نذرانہ پیش نہ کر سکا"۔

خان تغلق تیمور کا خیال فوراً اپنے ہراول دستوں کے تینوں سرداروں کی طرف گیا۔ اسے ان پر بہت غصہ آیا اس نے سوچا جب تیمور نے اتنی دولت مجھے پیش کی ہے تو پتہ نہیں اس کے سرداروں نے کیا کچھ مال کر لیا ہوگا لیکن چالاک خانِ اعظم نے اس خدشہ کا اظہار دربار میں نہ کیا۔ تغلق تیمور کو یہ بھی ناگوار گزرا کہ تیمور اس کے سرداروں کو کتوں سے تشبیہ دی ہے۔

تغلق تیمور پُر رعب آواز میں بولا:

"شہر سبز کے سردار تیمور۔ اگرچہ تمہاری بے باکی گستاخی کی حد تک پہنچتی ہے لیکن ہم خوش ہیں کہ تم ہمارے امیروں کے خوف سے لاپروا ہو کر ان کی حرص و طمع کا ہمارے سامنے صحیح نقشہ کھینچا ہے۔ تاہم خیال کرو کہ وہ امیر اسی دربار کے کتے ہیں۔ یہ ہمارا اور ان کا معاملہ ہے۔ اس کا تدارک ہم خود کریں گے"۔

خانِ اعظم نے ایک لحظہ بھی ضائع نہ کیا اس نے سوچا کہ اگر امیروں کو موقع اور وقت مل گیا تو وہ

تیا پانچہ کر دیں گے۔ دولت کے حصول کے سلسلے میں مغل اپنے بھائی سے بھی رعایت نہ کرتے تھے۔

خانِ اعظم نے ایک سردار سے کہا:

"طراشو خان۔ فوراً شہر سبز پہنچو اور ہمارے تینوں سرداروں کو پیغام دو کہ انہوں نے جتنی دولت سردار تیمور سے حاصل کی ہے وہ سب براس قبیلہ کے سردار حاجی براس کو واپس کر دیں اور دیکھو۔ اگر وہ انکار کریں تو ہمیں فوراً خبر کرو۔ ہم ان کے جبڑوں میں ہاتھ ڈال کر تمام دولت نکال لیں گے"۔

طراشو خان اسی وقت گھوڑے پر بیٹھ کر شہر سبز روانہ ہو گیا۔

تیمور کو خانِ اعظم کے اس حکم نامے پر کچھ تعجب سا ہوا۔ خانِ اعظم نے اس کی دولت حاجی براس کو واپس کرنے کا حکم دیا تھا حالانکہ حاجی براس، خانِ اعظم کے خوف سے دریائے آمو عبور کر گیا تھا۔

دراصل جب حاجی براس کو علم ہوا کہ خجستہ کے مرداد بایزید جلائر نے خانِ اعظم کی اطاعت قبول کر لی ہے تو حاجی براس نے بھی اپنا ایک آدمی خانِ اعظم کے پاس بھیجا اور اسے اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ خانِ اعظم نے حاجی براس کو اطاعت کے اظہار کے لیے اپنے پاس بلوایا۔ حاجی براس ڈر گیا اور اپنے قبیلہ کے آدمیوں کے ساتھ دریا دار الخر سے نکل بھاگا۔ اس کا علم خانِ اعظم کو نہ تھا۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ حاجی براس اس کے پاس آنے والا ہے۔

خانِ اعظم کا حاجی براس کو دولت واپس کرنے کا حکم بھی مصلحت سے خالی نہ تھا۔ خانِ اعظم جانتا تھا کہ تیمور اب خالی ہاتھ ہو گیا ہے۔ اگر دولت اس کو واپس کی گئی تو یہ کچھ نہ کچھ اپنے لیے بھی رکھے گا۔ اس لیے اس نے تیمور کے بجائے حاجی براس کو دولت واپس کرنے کا حکم دیا۔ حاجی براس سے خانِ اعظم بغیر کسی پریشانی کے تمام دولت طلب کر سکتا تھا۔

تیمور کو یہ نہ معلوم تھا کہ اس کے چچا نے بھی خانِ اعظم کی اطاعت کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس لیے وہ خانِ اعظم کے حکم پر حیران سا ہو گیا۔

خانِ اعظم نے کہا:

"تیمور۔ ہمارے امیروں نے تم سے دولت چھین کر اچھا نہ کیا۔ اس کا ہمیں بھی افسوس ہوا۔ لیکن ہمارے افسوس کی مقدار صرف اس قدر ہے جیسے ہمارے جسم میں پھانس چبھ جائے یا آنکھ میں پلک ٹوٹ کر گر پڑے"۔

تیمور کو دولت چھن جانے کا تو کوئی افسوس نہ تھا لیکن تغلق تیمور کی یہ بات سن کر ضرور افسوس ہوا۔ تیمور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے خانِ اعظم کے امیروں پر بھرپور طنز کیا تھا تاکہ اس کے اور امیروں کے درمیان اختلاف پیدا ہو جائے لیکن تغلق نے پھانس کے چبھنے اور پک ٹوٹ کر گرنے کی مثال دے کر اس واقعہ کی اہمیت کو بالکل ہی کم کر دیا۔

تیمور کو یہ خیال کر کے اور زیادہ افسوس ہوا کہ اس نے خواہ مخواہ تین مغل سرداروں کی مخالفت مول لی۔ تیمور کی اس حکمتِ عملی کا آگے چل کر تاتاریوں اور خود تیمور کو فائدہ پہنچا۔

○

خانِ اعظم تغلق تیمور نے قاصد سردار کو تاکید کی تھی کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے شہرِ سبز پہنچ کر ہراول دستوں کے سرداروں کو اس کا پیغام پہنچائے اور اپنے سامنے ان سے تمام دولت حاجی برلاس کو دلائے۔ قاصد سردار گھوڑا بھگاتا۔ رات دن ایک کرتا شہرِ سبز پہنچ گیا۔ مغل سردار بیک جک پہلے سے وہاں موجود تھا۔ باقی دونوں سردار خان ارکنت اور خان کریت بھی دو دن پہلے وہاں پہنچ چکے تھے۔

قاصد نے گھوڑے سے اترتے ہی خانِ اعظم کا حکم سنایا:

"خانِ اعظم تغلق تیمور خان نے ہراول دستوں کے سرداروں خان بیک جک، خان ارکنت اور خان کریت کو حکم دیا ہے کہ انہوں نے شہرِ سبز کے سردار تیمور سے جس قدر دولت اور تحائف حاصل کیے ہیں وہ سب ماوراء النہر کے سردار حاجی برلاس کو واپس کر دیے جائیں۔ دولت کی واپسی کی نگرانی خانِ اعظم نے میرے سپرد کی ہے۔"

خانِ اعظم کے اس حکم سے مغل سرداروں میں کھلبلی مچ گئی۔ وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ ہاتھ آئی ہوئی دولت کی واپسی کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ دولت ہی کے لیے تو وہ یہ ساری جنگ و جدل کر رہے تھے۔ اپنا خون بہاتے تھے، جانیں قربان کرتے تھے۔

بیک جک ان تینوں سے عقلمند تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ خانِ اعظم نے جو حکم دے دیا ہے اس سے کسی طرح ممکن نہیں، حکم عدولی کرنا جان سے ہاتھ دھونا ہے۔

بیک جک نے کہا:

"اے خانِ اعظم کے قاصد! خانِ اعظم کا حکم بجا ہے۔ سر آنکھوں پر۔ میں ابھی حاجی برلاس کو تلاش کر کے تمام دولت اور تحائف اس کے سپرد کیے دیتا ہوں۔ تو اس بات کا گواہ رہنا کہ میں نے خانِ اعظم کا حکم ماننے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں کی۔"

خان ارکنت، خانِ اعظم کا حکم سن کر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ وہ غرا کر بولا:

"سمرقند کی دولت میں ہمارا بھی حق ہے۔ ہم نے تیمور سے اپنا حصہ وصول کیا ہے۔ ہمارا حصہ واپس لینے کا خانِ اعظم کو کوئی حق نہیں۔"

خان کریت نے اس کی ہمنوائی کی۔ بولا:

"ہاتھ آئی ہوئی دولت کو ہم سے کوئی واپس نہیں لے سکتا۔ ہم خانِ اعظم کو ایک درہم بھی واپس نہ کریں گے۔"

بیک جک نے سمجھایا:

"ایسی نادانی نہ کرو مغل سردارو۔ خانِ اعظم ہمارا بادشاہ ہے۔ غلط یا صحیح جو بھی حکم دے ہمارا فرض ہے کہ ہم اسے بخوشی بجا لائیں۔"

"ہرگز نہیں۔" خان ارکنت چیخ کر بولا۔

بیک جک کی آنکھیں غصہ سے لال ہو گئیں اس نے کہا:

"تم خانِ اعظم سے بغاوت کر رہے ہو۔ اس کا انجام تمہارے حق میں اچھا نہ ہوگا۔"

"ہم خانِ اعظم کا یہ حکم نہیں مانیں گے۔" خان ارکنت نے صاف انکار کر دیا۔

بیک جک نے دیکھا کہ دونوں سردار بغاوت پر آمادہ ہیں۔ اس کے پاس صرف ساڑھے چار ہزار ہوا تھے۔ ان دونوں کے زیرِ کمان دس ہزار کا لشکر تھا۔ بیک جک کے لیے ان پر قابو پانا ناممکن تھا۔ بیک جک نے مصالحت ہی میں اپنی بہتری دیکھی۔

بیک جک نے کہا:

"تم لوگ اپنی مرضی کے مالک ہو۔ جو چاہو کرو۔ مجھے تم سے کوئی مطلب نہیں۔ میں خانِ اعظم کے حکم کے تحت دولت واپس کرنے پر آمادہ ہوں۔"

خان کریت کھڑا ہو گیا اور قاصد کو گھورتے ہوئے بولا:

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"جا۔ اور اپنے خان سے کہہ دے ہم اس کا حکم نہیں مانتے اور اسے بیک جک تو خانِ اعظم کا ہے تو مقابلہ پر آ اور ہم سے دولت چھین سکتا ہو تو چھین لے۔"

بیک جک جھگڑا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کہا:

"مجھے خانِ اعظم نے تمہارے مقابلہ کا حکم نہیں دیا ہے۔ میں تم سے لڑنا نہیں چاہتا لیکن میں شہرِ سبز کا محافظ ہوں۔ اگر تم نے شہرِ سبز میں لوٹ مار شروع کی تو میں خاموش تماشائی نہیں رہوں گا۔"

خان ارکنت اور خان کریت نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ دونوں قریب قریب کھڑے پہلے دونوں میں کچھ اشارے ہوئے پھر خان ارکنت نے خان کریت کے کان میں کہا:

"ٹھیک ہے۔ ہم اس سے لڑ کر اپنی طاقت کیوں ضائع کریں۔ شہرِ سبز سے باہر نکل کر اور لوٹ مار کریں گے۔"

خان کریت نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔

خان ارکنت نے بیک جک سے کہا:

"خان بیک جک۔ ہمارا تمہارا کوئی جھگڑا نہیں۔ ہم تمہارے شہر کو ہاتھ نہ لگائیں گے لیکن شہر سے باہر نکل کر شہروں اور دیہاتوں کا وہ حشر کریں گے کہ تمہارا خان بھی یاد رکھے گا۔"

یہ کہہ کر دونوں باغی سردار اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ انہوں نے اپنے لشکر کو فوراً تیار ہونے کا حکم دیا اور پھر تمام مال و اسباب گاڑیوں اور چھکڑوں پر لاد کر چل پڑے۔ بیک جک نے بھی اپنے لشکر کو تیار کر لیا تھا۔ وہ اپنا لشکر لے کر ان کے پیچھے پیچھے چلا تاکہ اگر وہ شہرِ سبز میں کوئی گڑبڑ کریں تو اس کا تدارک کیا جا سکے۔

باغی سرداروں نے اپنے پیچھے بیک جک کو آتے دیکھا تو اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ وہ بیک جک سے اس وقت الجھنا نہیں چاہتے تھے۔ بیک جک نے شہرِ سبز کی سرحدوں تک ان کا تعاقب کیا۔ جب وہ شہر سے نکل گئے تو اس نے اپنے سواروں کو رکنے کا حکم دیا۔

بیک جک نے قاصد سردار سے کہا:

"اے خانِ اعظم کے قاصد۔ بتا اب میں کیا کروں۔ وہ دونوں باغی ہو چکے ہیں۔ ان کے ارادے

نہیں معلوم ہوتے۔ ان کا رخ اردو دے معلّٰی کی طرف نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ شمال میں جائیں گے اور وہاں خانِ اعظم کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر علمِ بغاوت بلند کریں گے۔"

قاصد سردار بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے کہا:

"عقل مند سردار۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ تم جو بہتر خیال کرو وہ کرو۔ لیکن اس حکم عدولی اور بغاوت کی خبر خانِ اعظم کو فوراً پہنچنا چاہیے۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔"

بیک جک نے کہا:

"اس وقت خانِ اعظم سے دور رہنا کسی طرح مناسب نہیں۔ ہمیں خانِ اعظم کے پاس فوراً چلنا چاہیے۔"

بات طے ہو گئی۔

بیک جک نے اپنا گھوڑا سمرقند کی سڑک پر ڈال دیا۔ اس نے اپنے حصہ کی دولت ساتھ لینے کی بھی پروا نہ کی۔ بیک جک نے دونوں باغیوں کے رویّہ سے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ ضرور طوفان برپا کریں گے۔ ان کے پاس لشکر بھی کافی تھا اور اس وقت شمال خالی تھا۔

○

بیک جک اپنا لشکر لیے ہوئے سمرقند پہنچا مگر وہاں بغیر قیام کیے شمال کی طرف چل پڑا۔ مغلوں کا اردو دے معلّٰی سمرقند سے کچھ زیادہ دور نہ تھا۔

بیک جک اردو دے معلّٰی میں پہنچا تو خانِ اعظم بدستور نمدے کے فرش پر بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ بیک جک کے اس طرح اچانک آ جانے سے وہ بڑا حیران ہوا۔ اس کی پستلیاں تیزی سے گھومنے لگیں۔ تیمور بھی دربار میں موجود تھا۔ اس نے اس وقت تک مغل دربار میں بہت سے دوست بنا لیے تھے۔ بیک جک کو اکیلا دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔

بیک جک نے گھوڑے سے اتر کر خانِ اعظم کے دونوں ہاتھ چومے۔ پھر ادب و احترام سے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خانِ اعظم نے دل گھبراہٹ چھپاتے ہوئے کہا:

"خوش آمدید بیگ جگ۔ لیکن تم اکیلے کیوں آئے ہو۔ خان ارکنت اور خان کربت کہاں ہیں؟"

"وہ بدبخت باغی ہو گئے ہیں خانِ اعظم"۔ بیگ جگ نے لگی لپٹی کے بجائے صاف صاف بات بتا دی۔

خانِ اعظم کے جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا۔ وہ تڑپ کر اٹھا اور شیر کی طرح گرجا:

"کہاں ہیں، وہ کتے؟"

"شمال کی طرف گئے ہیں"۔ بیگ جگ نے جواب دیا۔

"ہوں!"

یہ کہہ کر خانِ اعظم تیز تیز قدموں سے فرش پر ٹہلنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور وہ ناگ کی طرح پھنکار رہا تھا۔ تمام دربار میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔

تیمور دل ہی دل میں خوب ہنس رہا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ خانِ اعظم سے کہے کہ جسے آپ چالاک اور ہوشیار سمجھ رہے تھے وہ آپ کا بال کہتے تھے وہ آپ کے لیے وبالِ جان بن گئے ہیں۔

خانِ اعظم ٹہلتے ٹہلتے رکا۔ اس نے درباریوں پر نظر ڈالی۔ پھر سب کو رخصت کر دیا۔ بیگ جگ کو اس نے روک لیا۔

تنہائی ہوئی تو خانِ اعظم نے بیگ جگ سے پوچھا:

"بیگ جگ۔ کیا تجھے یقین ہے وہ دونوں باغی ہو گئے ہیں؟"

بیگ جگ نے جواب دیا:

"خانِ اعظم۔ انہوں نے آپ کی شان میں جو گستاخ الفاظ استعمال کیے ہیں وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ وہ تو شہرِ سبز بھی لوٹنے پر آمادہ تھے۔ میں بڑی مشکل سے اس شہر کو بچا سکا ہوں۔"

"ہوں!" اس بار خانِ اعظم کی ہوں کافی طویل تھی۔

تیمور نے آہستہ سے کہا:

"خانِ اعظم۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ عرض کروں!"

خانِ اعظم کو جیسے سہارا مل گیا۔ بولا:

"ہاں جوان سردار۔ ہم تیرا مشورہ ضرور سنیں گے۔"

تیمور بولا:

"خانِ اعظم۔ مجھے باغی سرداروں اور ان کے اثر و رسوخ کا پورا اندازہ ہے اس لیے میرا مشورہ ہے کہ آپ ان کے خلاف بہت سوچ سمجھ کے قدم اٹھائیں۔"

"تاتاری جوان!"

خانِ اعظم نے تجسس آمیز نظروں سے تیمور کو دیکھتے ہوئے کہا:

"تو واقعی عقلمند ہے۔ کتنی عجیب بات ہے جو مشورہ تو نے اس وقت مجھے دیا وہی بات میں خود بھی سوچ رہا تھا۔ باغی سرداروں کے پاس اس وقت کچھ زیادہ فوج نہیں البتہ شمال میں ان کے ہمدرد موجود ہیں۔ وہاں وہ زیادہ لشکر اکٹھا کر سکتے ہیں۔ اب تیرا کیا مشورہ ہے۔ مجھے اس وقت کیا قدم اٹھانا چاہیے۔"

تیمور نے کمال جرأت اور بے باکی سے کہا:

"خانِ اعظم۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ فوراً شمال میں واپس چلے جائیے۔ اگر آپ یہاں رہیں گے تو آپ کو دشمنوں کا سامنا رہے گا۔ آپ کے سامنے تاتاری ہوں گے جو اپنے لشکر کے ساتھ قلعہ بند ہو کر بیٹھے ہیں۔ پشت پر آپ کے اپنے باغی سردار ہوں گے۔ اگر آپ شمال میں چلے گئے تو وہاں آپ کو صرف ایک خطرے کا سامنا ہوگا۔"

"تیمور۔ میں تیرے مشورے کی داد دیتا ہوں۔"

خانِ اعظم خوش ہو کر بولا:

"تو نے میری پریشانیاں آدھی کر دیں۔ میں تجھے توغان باشی (دس ہزار سواروں کا کمانڈر) کا درجہ دیتا ہوں۔ تو میری طرف سے سمرقند کا حاکم ہوگا۔"

خانِ اعظم نے تیمور کو توغان باشی کا عہدہ دے کر سمرقند کا حاکم بنا دیا اور خود خیمے ڈیرے اکھاڑ کر اسی شمال کی طرف کوچ کر گیا۔

خیموں کا شہر اجڑ گیا۔ وادی ویران ہو گئی اور تیمور کے حاکمِ سمرقند ہونے کی خبر ملک تاتار کے ایک سرے سے دوسرے کونے تک پہنچ گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حاجی برلاس کو تیمور کا خط دریائے آمو کے جنوب میں ملا۔ وہ اب تک وہیں تھا۔ اس نے مطلع کیا:

"بلادِ شمال کا خانِ اعظم واپس جا چکا ہے۔ بزرگ تاتاریوں اور میری کوشش سے تاتاری علاقے تباہی اور بربادی سے محفوظ ہو گئے۔ خانِ اعظم نے مجھے سمرقند کا حاکم مقرر کیا ہے۔ اس کی مُہر میرے پاس ہے۔ آپ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے اور میری طرف تعاون کا ہاتھ بڑھانا چاہیے۔ خانگی جھگڑے اور قبائلی رنجش ختم کر کے میرے ساتھ مل کر تاتاری حکومت کو مضبوط کیجیے۔"

یہ ایک قسم کا اطلاعی فرمان تھا۔ جو تیمور نے حکومتِ سمرقند سنبھالنے کے بعد بدخشاں، سرپول اور خجند کے قبائلی سرداروں کے نام بھیجا۔ بلخ میں بھی تیمور کا شاگرد اور ملکوتی کا شوہر علاء اس نے سب سے پہلے تیمور کی اطاعت کا اعلان کیا۔ دوسرے سرداروں کی طرف سے بھی رسمی تیمور کو تحائف بھیجے گئے۔ بایزید جلائر، خجند میں تھا۔ اسے سمرقند کا تخت ہاتھ سے نکل جانے ہوا۔ سب سے زیادہ صدمہ حاجی برلاس کو ہوا۔ وہ خود کو برلاس قبیلہ کا سربراہ اور سردار سمجھتا تھا برداشت کر سکتا تھا کہ اس کا بھتیجا سمرقند کا حاکم بن جائے اور اسے ایک نوجوان لڑکے کے ماتحت پڑے لیکن مصلحتاً خاموش ہو رہا۔ اس نے تیمور کو کوئی جواب نہ دیا۔

تیمور حالات کا بغور مطالعہ کر رہا تھا اور چپکے چپکے فوجی تیاریاں بھی کر رہا تھا۔ اسے بایزید جلائر حاجی برلاس کی طرف سے خطرہ تھا۔ حاجی برلاس دریا پار کر کے پھر شمال میں آ گیا تھا اور شہرِ سبز کے قریب پاس خیمے لگا دیے تھے۔ تیمور کو حاجی برلاس کے شہرِ سبز کے قریب خیمہ زن ہونے کی اطلاع ملی تو خود شہرِ سبز پہنچ گیا۔

تیمور حاکم تھا اور حاجی برلاس سے شہرِ سبز کے قریب خیمے لگانے کی وجہ پوچھ سکتا تھا اور حاجی برلاس کی طرف سے دوسرا قدم اٹھانے کا انتظار کرنے لگا۔

حاجی برلاس کو تیمور کے شہرِ سبز واپس آنے کی خبر مل چکی تھی۔ اس کا دامادی تیزی سے کام تیمور کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ اس نے بایزید جلائر کو پیغام بھیجا کہ فوراً اس کے پاس پہنچ جائے کا دعویدار تھا۔ اس نے تیمور کی اطاعت کا اعلان تو کر دیا تھا لیکن حاجی برلاس کے بلانے پر

پاس پہنچ گیا۔

سمرقند کے دونوں دعوے دار ایک دوسرے سے بڑے جوش و خروش سے ملے۔ دونوں کئی دن تک تنہائی میں گھنٹوں باتیں کرتے رہے۔ پتہ نہیں ان میں اندرونِ خانہ کیا معاملہ ہوا لیکن وہ کسی نتیجہ پر

مفرد پہنچ گئے۔

حاجی برلاس نے ایک غلام کے ذریعے قاسم کو بلوایا۔

قاسم، شہزوری کے ساتھ دریائے آمو کی سیر کر رہا تھا۔ آجکل وہ دونوں بہت خوش تھے۔ مغلوں کا خطرہ ٹل گیا تھا۔ اور انہیں امید تھی کہ حاجی برلاس ان دونوں کی جدی شان کر دے گا۔ حاجی برلاس نے امن و امان بحال ہونے تک ان کی شادی ملتوی کر رکھی تھی۔ اب نہ صرف امن بحال ہو گیا تھا بلکہ حکومتِ سمرقند پھر تاتاریوں کو واپس مل گئی تھی۔

قاسم اس لیے بھی خوش تھا کہ سمرقند کا حاکم تیمور کو بنایا گیا تھا۔ اس کی نظر میں اس منصب کے لیے تیمور سے زیادہ کوئی اور موزوں تاتاری نہ تھا۔

غلام، قاسم کو ڈھونڈتا ہوا دریائے آمو تک پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا کہ عاشق و معشوق دریائے آمو کے پانی میں پیر ڈالے بیٹھے ہیں۔ شہزوری اپنی سریلی آواز میں ایک کوہستانی گیت گا رہی ہے۔ قاسم دنیا سے بے خبر شہزوری کے گیت میں کھویا ہوا ہے۔ شہزوری گیت کی تان اٹھاتی تو قاسم بے چین ہو کر اس کی زلفوں سے کھیلنے لگتا۔ اور شہزوری جب جذبات سے مغلوب ہوتی تو اپنا سر قاسم کے دھڑکتے دل کے قریب کر دیتی۔

غلام دور کھڑا یہ نمائش دیکھتا رہا۔ غلام کی ابھی شادی نہ ہوئی تھی۔ وہ بھی کسی کنیز کی محبت میں گرفتار تھا۔ قاسم اور شہزوری کو اس عالم میں دیکھ کر اسے اپنی محبوبہ یاد آ گئی۔ وہ بھی اسے اس طرح ناز و غمزے دکھاتی اور مسکراتی تھی۔

گیت ختم ہوا تو غلام کو اپنا فرض یاد آیا۔ اس نے قاسم کی طرف قدم بڑھائے لیکن اسی وقت شہزوری نے دوسرا گیت شروع کر دیا۔ غلام کے قدم جہاں تک پہنچے تھے وہیں رک گئے۔

شہزوری کا یہ گیت پہلے سے بھی زیادہ پُرسوز تھا۔ اس گیت کا مرکزی خیال فرقت اور جدائی تھا۔ ایک تو دوسرا گیت اس پر شہزوری کی تانیں۔ اس کی آواز دل میں اترتی چلی جاتی تھی۔ جتنی دیر شہزوری گاتی رہی، قاسم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مستی کے عالم میں اس کے زلف و رخسار سے اٹھکیلیاں کرتا رہا اور غلام دور کھڑا ٹھنڈی آہیں بھرتا
جیسے ہی ختم ہوا غلام تیزی سے قاسم کی طرف چلا۔ اسے خطرہ تھا کہ اگر شہزوری نے تیسرا گیت شروع
اسے مزید انتظار کرنا پڑے گا۔

پیروں کی چاپ سے پہلے قاسم ہوشیار ہوا۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ غلام اس کے قریب پہ
شہزوری گیت ختم کرنے کے بعد قاسم کے شانے کے سہارے آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ قاسم نے
سے بلایا۔ شہزوری نے آنکھیں کھول دیں۔

مسکراتے ہوئے بولی:

"قاسم۔ تم نے مجھے ناحق جگایا۔ میں بڑا سہانا خواب دیکھ رہی تھی۔"

قاسم نے ہنس کر پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔ شہزوری نے اُدھر نظر کی تو شرم سے پانی پانی
جلدی اپنی بکھری زلفیں سنوارنے لگی۔

قاسم نے ہنس کر غلام سے پوچھا:

"کیا بات ہے خان۔ ماموں جان نے بلایا ہے؟"

"جی ہاں۔" کہہ کر غلام نے نظریں نیچی کر لیں۔

شہزوری اب تک خود کو نہ سنبھال سکی تھی۔ اس کے بکھرے بال درست ہونے کو دل
سے بیٹھے بیٹھے اس کے کپڑے بھی بے ترتیب ہو گئے تھے۔

قاسم نے پوچھا:

"کچھ علم ہے ماموں جان نے کیوں بلایا ہے؟"

"ابا جان مسکرا رہے تھے یا غصے میں تھے؟" شہزوری نے ایک اور سوال کر دیا۔

غلام نے سوچتے ہوئے کہا:

"میرا خیال ہے وہ غصہ میں نہیں تھے۔"

"پھر کوئی بات نہیں۔" قاسم کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

شہزوری نے کہا:

"قاسم میرا دل کہہ رہا ہے کہ آج ابا جان کوئی خوشخبری سنائیں گے!"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" قاسم نے شہزوری کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دونوں آہستہ آہستہ چلے
غلام ان کے عقب میں چل رہا تھا۔

حاجی برلاس کی شاہی خیمہ گاہ دریا سے کچھ زیادہ دور نہیں تھی۔ حاجی نے صرف دریا عبور کیا تھا۔ تھوڑ
میں یہ لوگ حاجی برلاس کے پاس پہنچ گئے۔

حاجی نے مسکرا کر ان کو دیکھا۔ قاسم اور شہزوری کے دل میں اگر کوئی وسوسہ تھا تو وہ بھی دور ہو گیا
جی کے پاس اس وقت جند کا سردار بایزید جلائر بھی بیٹھا تھا۔

حاجی برلاس نے جلائر سے کہا:

"یہ میری بیٹی شہزوری ہے اور یہ قاسم ہے۔ میرا ہونے والا داماد۔"

"ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔"

جلائر مسکرا کر بولا:

"بڑی خوبصورت جوڑی ہے۔ کب شادی ہو گی ان کی؟"

"بس بہت جلد۔"

حاجی نے کہا:

"میری یہی اولاد ہے۔ میں اس کی شادی دھوم دھام سے کرنا چاہتا ہوں۔ ذرا سکون ہو جائے
اس کام سے بھی فارغ ہو جاؤں۔ شہزوری کی رخصتی کے بعد میں گوشہ نشین ہو جاؤں گا یا پھر
بیت کعبہ کو جاؤں گا۔"

"بہت نیک خیال ہے۔ اللہ مبارک کرے۔" جلائر نے ٹکڑا لگایا۔

حاجی برلاس نے قاسم کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ قاسم کے ساتھ شہزوری بھی بیٹھ گئی۔

حاجی برلاس بولا:

"قاسم۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ ملک میں سکون ہوتے ہی میں شہزوری کو رخصت کر دوں
گا۔ سو اب اس کا وقت آ گیا ہے۔ غالم مغل واپس جا چکے ہیں اور اپنا عزیز بھتیجا تیمور سمرقند کا حاکم
نامزد کر گیا ہے۔ تیمور نے تمام تاتاری سرداروں کو فرمان روانہ کیا ہے کہ اس کی اطاعت قبول کر کے ملک کے
مستحکم کریں۔ تمام سرداروں نے تیمور کر سمرقند کا حاکم مان لیا ہے۔۔۔۔۔ بہت غور کرنے کے بعد میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان حالات میں میں بھی تیمور کی بادشاہت کو تسلیم کر لوں۔ میرے نہ ماننے سے بلوا پیدا ہوگا۔"

قاسم اور شہزادی بڑی حیرت سے حاجی برلاس کی باتیں سن رہے تھے۔ انہیں اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ قاسم کو یہ تو معلوم تھا کہ حاجی برلاس میں قوتِ فیصلہ کی کمی ہے اور وہ جلد جلد اپنی رائے تبدیل کرتا رہتا ہے لیکن اس وقت تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے حاجی برلاس نے تیمور کی دیرینہ خواہش کے لیے دفن کر دی ہے۔

قاسم نے کہا:

"قابلِ احترام ماموں جان۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ آخر کار تیمور کی صلاحیتوں کے قائل ہو گئے۔ آپ نے مجھے کس سلسلہ میں طلب کیا ہے؟"

"تم میرے قریب ترین عزیز ہو قاسم۔"

حاجی برلاس نے اپنی شفقت کا اظہار کیا:

"پھر اب تو وہ موقع بھی آ گیا ہے کہ تم میرے جسم کا ایک حصہ بننے والے ہو۔ اگر میں اس اہم سے مشورہ نہ لوں تو شاید تمہیں ناگوار گزرے۔"

قاسم کا دماغ پیچ در پیچ باتوں کو سننے اور سمجھنے سے قاصر تھا۔ الجھتے ہوئے بولا:

"ماموں جان یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا لیکن آپ جانتے ہیں کہ سیاسی باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔ ہاں اگر کوئی خدمت ہو تو مرحمت فرمائیے۔ میں بخوشی بجا لاؤں گا۔"

"میرے بیٹے قاسم!"

حاجی برلاس نے اور زیادہ محبت کا اظہار کیا:

"اس وقت میری اور خجند کے سردار بایزید جلائر کی مشکل تم ہی آسان کر سکتے ہو۔ تم تیمور کے ہو اور تیمور تم پر اعتماد کرتا ہے۔"

"ماموں جان! خدا کے لیے کچھ فرمائیے تو۔" قاسم نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

"تم جانتے ہو۔ ہمارے اور تیمور کے درمیان اختلاف کی گہری خلیج موجود ہے۔" حاجی برلاس نے قاسم سے کہا۔

قاسم نے جواب دیا:

"اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟ اس سے تو ہمارا زمانہ واقف ہے۔"

"خدا تمہیں خوش رکھے بیٹے!"

حاجی برلاس نے قاسم کو خواہ مخواہ دعا دی:

"ہم دونوں سوچتے سوچتے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تیمور اور ہمارے درمیان صلح و صفائی صرف تم ہی کرا سکتے ہو۔ اس کے دل میں ہماری طرف سے میل ہے۔ اگر تم چاہو تو میل دور ہو سکتا ہے۔ تیمور بھی آخر میرا بھتیجا ہے۔ ذرا کوشش کرو تو معاملہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو سکتا ہے۔"

قاسم جلدی سے بولا:

"ماموں جان۔ اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہوگی۔ اگر میری کوشش سے آپ دونوں کی باہمی دوری ہو سکتی ہے تو میری خدمات حاضر ہیں۔ آپ فرمائیے۔ مجھے کیا کرنا ہے۔"

"قاسم!"

حاجی برلاس نے پھر بات کو گھمایا:

"جو کام میں تمہارے سپرد کرنا چاہتا ہوں، میں اور بایزید بھی کر سکتے ہیں لیکن بیٹے! جان کس کو عزیز نہیں ہوتی۔ پہلے ہمارا ارادہ تھا کہ ہم دونوں خود اس کے پاس جا کر اپنی وفاداری اور اطاعت کا اظہار کریں لیکن اس سے سخت ناراض ہے۔ اگر اس نے غصہ میں آ کر ہمیں قتل کر دیا تو اس کا ہاتھ کون پکڑے گا؟"

"ماموں جان یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

قاسم، تیمور کی طرف داری میں بولا:

"اگر آپ اس کے پاس خود چل کر جائیں تو مجھے یقین ہے وہ آپ کو سر آنکھوں پر بٹھائے گا۔ وہ ایک مہمان نواز ہے۔ اپنے عزیزوں کی عزت کرنا جانتا ہے۔"

حاجی برلاس نے قاسم کو سمجھایا:

"ممکن ہے تیمور ایسا ہی ہو جیسا تم کہہ رہے ہو لیکن عقلمندی کا تقاضہ یہ ہے کہ جب تک اس کا دل ہماری طرف بالکل صاف نہ ہو جائے اس کے سامنے جانا کسی طرح خطرہ سے خالی نہیں۔"

قاسم نے پوچھا:

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"پھر یہ مسئلہ کس طرح حل ہوگا ماموں جان!"

حاجی برلاس نے مدعا بیان کیا:

"قاسم۔ ہم اپنی طرف سے تمہیں تیمور کے پاس بھیجنا چاہتے ہیں۔"

قاسم جلدی سے بولا:

"میں ابھی جاتا ہوں اس کے پاس۔"

"اس طرح نہیں قاسم۔"

حاجی برلاس نے اس کو روکا:

"وہ حاکم سمرقند ہے۔ ہمیں اس کے وقار کا بھی خیال ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تیمور کے اعزاز میں ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کریں۔ اس بہانے تیمور کی حاکمیت کا جشن بھی ہو جائے گا اور ہمارے شبہات بھی دور ہو جائیں گے۔"

"بڑا نیک خیال ہے ماموں جان۔"

قاسم خوش ہو کر بولا:

"اس طرح ایک تیر سے دو شکار ہو جائیں گے۔ جشن کا جشن اور میل کا میل۔ بڑی اچھی تدبیر ہے آپ نے۔"

"ہاں بیٹا۔"

حاجی برلاس نے آخری تیر پھینکا:

"میں عمر کے اس حصہ میں ہوں کہ پتہ نہیں کل کیا ہو جائے۔ چاہتا ہوں آنکھ بند ہونے سے پہلے فرض سے بھی فارغ ہو جاؤں اور خاندانی رنجشیں بھی دور ہو جائیں۔"

شہزوری کے نام پر قاسم کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ وہ شہزوری کو دزدیدہ نظر سے دیکھنے لگا۔

حاجی برلاس نے پوچھا:

"پھر کب ضیافت کر رہے ہیں آپ تیمور کی؟"

قاسم کے انداز میں التجا تھی۔

"جب تم کہو گے ضیافت کا انتظام ہو جائے گا۔" حاجی برلاس نے ہنس کر کہا۔ "کیا

بات سے انکار کر دے۔"

"واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

قاسم نے تردید کی:

"آپ محبت سے بلائیں گے تو تیمور کیوں نہ آئے گا؟"

حاجی برلاس نے قاسم کو ٹٹولا:

"ممکن ہے جس طرح ہم اس کے پاس جانے سے ڈرتے ہیں تیمور بھی ہماری ضیافت میں آنے سے گریز کرے۔ اس لیے ضروری ہے کہ پہلے تم اس کا عندیہ معلوم کر لو۔"

اس تمام گفتگو کا لب لباب اور مقصد، حاجی برلاس کا آخری جملہ تھا جس کے لیے اُس نے قاسم کے سامنے لمبی چوڑی تمہید باندھی تھی۔ حاجی برلاس، قاسم سے کہہ سکتا تھا کہ تیمور کو دعوت میں مدعو کرو لیکن اس نے قاسم کے دماغ سے شک و شبہ کے تمام سائے دور کرنے کے لیے بات کو اتنا طول دیا تھا۔ قاسم سیدھا سادہ تھا۔ اس کی سمجھ میں سوائے اس کے اور کچھ نہ آیا کہ حاجی برلاس سچے دل سے تیمور کی وفاداری اور اطاعت کا اظہار کرنے کے لیے اس کی شاندار ضیافت کرنا چاہتا ہے۔

قاسم نے حاجی برلاس کی رائے سے پوری طرح اتفاق کیا اور تیمور کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے شہر سبز روانہ ہو گیا۔

○

حاجی برلاس نے شہر سبز سے آدھی منزل دور پڑاؤ ڈالا ہوا تھا۔ قاسم کا دل خوشی سے جھوم رہا تھا۔ منزل اس کے سامنے تھی۔ حاجی برلاس اور تیمور کا میل اس کی منزل تھی۔ پھر شہزوری اس کی ہو گی، ہمیشہ کے لیے اسکی۔ اس کے گھوڑے کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ قاسم چھ گھنٹے کا فاصلہ تین گھنٹے میں طے کر کے شہر سبز میں داخل ہوا۔

قاسم، حاجی برلاس کا فوجی تھا لیکن سرحدی محافظ جانتے تھے کہ قاسم اور تیمور میں دوستی ہے۔ انہوں نے اس کا احترام کیا اور دو محافظ قاسم کو ساتھ لے کر قصرِ سفید پہنچ گئے۔

تیمور اس سے بڑی خندہ پیشانی سے ملا۔ بچپن کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ بڑی دیر تک پچھلی باتیں دہراتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گئیں اور خوب قہقہے لگے۔

پھر تیمور نے مسکرا کر پوچھا:

"قاسم۔ تمہارا چچا تک آنا کسی علت سے خالی نہیں۔ ہمارے چچا جان خیریت سے تو ہیں؟ شہر سبز کے قریب کیوں ڈیرے ڈال رکھے ہیں؟"

قاسم نے بتایا:

"سردارِ محترم۔ ماموں جان اپنے کیے پر نادم ہیں مگر بزرگانہ وضعداری ان کا دامن پکڑے ہوئے

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

تیمور نے سوال کیا:

"انہیں غلطی کا احساس ہوا ہے تو اب تک اپنی وفاداری کا اظہار کیوں نہیں کیا؟"

"وہ آپ سے ڈرتے ہیں سردارِ محترم!"

قاسم نے ہنس کر کہا:

"کہتے ہیں کہ اگر میں تیمور کے سامنے گیا تو کہیں آپ انہیں قتل نہ کرا دیں۔"

تیمور مسکرایا۔ بولا:

"کیا احمقانہ خیال ہے۔ حاجی برلاس میرے باپ کی جگہ ہیں۔ میں ان کے ساتھ کیسے گستاخی

یہ ان کا گھر ہے۔ جب جی چاہے چلے آئیں۔ میں کھلے دل سے ان کا استقبال کروں گا۔"

قاسم نے کہا:

"وہ آپ سے ملنا تو چاہتے ہیں لیکن کہتے ہیں کہ جب تک تیمور کا دل صاف نہ ہو جائے ملنے

نہیں ہو گا۔"

"قاسم یقین کرو میرے دل میں ان کی طرف سے کوئی کدورت نہیں۔" تیمور نے بات پر زور

تیمور کے پاس اس وقت دو تین اور سردار موجود تھے۔ قاسم نے ان کی طرف دیکھا۔ تیمور سمجھ

گیا۔ اس نے سرداروں کو رخصت کر دیا۔

قاسم نے رازدارانہ لہجے میں کہا:

"ماموں جان آپ سے سخت شرمندہ ہیں۔ جغتہ کے سردار بایزید بھی ان کے پاس آئے

دن نے آپ کی سرداری دل سے قبول کر لی ہے۔ انہوں نے طے کیا ہے کہ وہ آپ کی ایک شاندار ضیافت کریں۔ پکھ نایانِ شان استقبال کیا جائے۔ پھر وہ اپنے پورے لشکر کے سامنے اپنی اطاعت کا اعلان کریں۔ میں پ کی رضامندی حاصل کرنے بھیجا گیا ہوں۔"

تیمور سوچ میں پڑ گیا۔

بات ہی سوچنے والی تھی۔ دشمنوں کے لشکر میں جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ قاسم نے اسے سوچ میں گم یکھا تو اسے خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں تیمور انکار نہ کر دے۔ اور اس کی شادی کا مسئلہ پھر دور جا پڑے۔ اس نے را القوی دیا:

"انہوں نے یہ بھی کہلا ہے کہ اگر تیمور کو کوئی خطرہ ہو تو یہ ملاقات سرحد پر بھی ہو سکتی ہے۔ سرحد پر دنوں کی ملاقات ہو گی تو نہ آپ کو خطرہ ہو گا نہ ان کو۔"

یہ بات قاسم نے اپنی طرف سے کہی اور یہی بات تیمور جیسے صاحبِ عقل کو فریب دے گئی۔

تیمور نے بڑے وقار سے جواب دیا:

"قاسم۔ ہمارے بزرگوں کا قول ہے کہ عنانِ حکومت وہی ہاتھ سنبھال سکتے ہیں جو تلوار پکڑنا جانتے ہوں۔ حکومت کرنے کے لیے خطرات سے کھیلنے کا حوصلہ ہونا چاہیے۔ میں ان کے لشکر میں جانے سے نہیں ڈرتا۔ اگر خطرہ ہو بھی تو میں ایسے خطروں سے نپٹنا جانتا ہوں۔ مجھے دعوت منظور ہے۔ قبیلہ برلاس کو انتشار سے بچانے کے لیے میں ہر خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہوں۔"

قاسم نے بڑھ کر تیمور کے دونوں ہاتھ چوم لیے۔ بولا:

"سردارِ محترم۔ آپ نے میری بڑی مشکل آسان کر دی۔"

تیمور چونک پڑا۔ پوچھا:

"تمہیں کیا مشکل آپڑی تھی قاسم؟"

قاسم نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا:

"سردارِ محترم۔ آپ شہزوری کو تو جانتے ہیں؟"

"شہزوری؟" تیمور نے سوچتے ہوئے کہا:

"چچا جان کی وہ شریر اور شوخ لڑکی۔ وہ تو تمہاری منگیتر تھی۔ کیا اب تک شادی نہیں ہوئی؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نہیں سردارِ محترم!"

قاسم نے منہ لٹکاتے ہوئے کہا،

"جھگڑے۔ لڑائیاں۔ ملک میں سکون نہیں۔ شادی کیسے ہو۔ اب حالات پُرسکون ہونے پر ہی ہم نے وعدہ کیا ہے کہ تیمور سے تعلقات استوار ہوتے ہی شہزوری کو رخصت کر دیں گے۔"

"ہوں۔ تو اب تک تم ہجر و فراق کے لمحات میں مبتلا ہو۔"

تیمور مسکرایا اور قاسم جھینپ گیا۔

تیمور نے کہا:

"قاسم۔ اگر تمہاری شادی ہمارے تعلقات پر مبنی ہے تو پھر فکر نہ کرو۔ میں چچا جان کی دعوت پر آؤں گا اور اس دعوت میں تمہاری شادی کی تاریخ بھی مقرر کرا دوں گا۔"

"مجھے آپ سے ایسی ہی امید ہے سردارِ محترم۔" قاسم نے اظہارِ تشکر کیا۔

تیمور نے دریافت کیا:

"چچا جان کب دعوت کرنا چاہتے ہیں؟"

قاسم نے بتایا:

"بس آپ کی رضامندی کا انتظار ہے۔ وہ تو بالکل تیار ہیں۔ میں ابھی جا کر انہیں آگاہ کر دوں گا۔"

تیمور نے اسے روکا:

"اتنی جلدی بھی کیا ہے جانے کی۔ دو چار دن میرے ساتھ رہو۔"

"مجھے نہ روکیے سردارِ محترم۔" قاسم نے التجا کی۔

"بڑے بے چین ہو شہزوری کے لیے۔"

قاسم کیا جواب دیتا۔ وہ انکار تو کر نہ سکتا تھا۔

حاجی برلاس نے شہرِ سبز کی سرحد پر تیمور کا شاندار استقبال کیا۔ برلاس خاندان کے پندرہ سردار حاجی برلاس کے ساتھ تھے۔ تیمور بھی خلوصِ دل سے ملا۔ وہ چچا سے بغل گیر ہوا۔ تیمور کے ساتھ پچاس مسلح سوار تھے۔ حاجی برلاس صرف اپنے پندرہ سرداروں کے ساتھ تیمور کو لینے سرحد پر آیا تھا۔ چند کا سردار بایزید جلائر بھی تیمور کو خوش آمدید کہنے حاجی برلاس کے ساتھ آ گیا تھا۔ نوجوان قاسم دونوں کے درمیان رابطے کا کام کر رہا تھا۔

تیمور کو اپنے خاندان کے بچھڑے ہوئے لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ حکومت کی طمع نے برلاس قبیلہ کو دو حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ اب دونوں حصے پھر اکٹھے ہو رہے تھے۔

شہرِ سبز کی سرحد سے یہ مختصر قافلہ ہنستا، باتیں کرتا حاجی برلاس کی خیمہ گاہ کی طرف چلا۔ رفتار کم تھی۔ خیمہ گاہ پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ حاجی برلاس کی خیمہ گاہ میں چراغ روشن ہو گئے۔ ہزاروں شمعیں جگمگا رہی تھیں۔ کہکشاں جیسا منظر تھا۔ تیمور کا اتنا شاندار استقبال ہوا کہ وہ اپنے دل میں شرمندہ ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا، ایسے مہربان چچا سے جھگڑا کر کے اس نے اچھا نہ کیا۔

حاجی برلاس کا بڑا خیمہ شمعوں کی روشنی میں جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ خیمہ پر پہنچ کر سب گھوڑوں سے اتر گئے۔ تیمور نے اپنے سواروں کو باہر چھوڑا اور چچا کے ساتھ خیمہ میں داخل ہوا۔ حاجی برلاس اس کے آگے آگے تھا۔

حاجی برلاس کے خیمہ میں پہلا قدم رکھتے ہی تیمور کے کانوں میں جیسے خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اس کی چھٹی حس تیزی سے کام کر رہی تھی۔ شاید اس نے خیمہ میں چھپے ہوئے مسلح آدمیوں کو دیکھ لیا تھا۔ خیمہ خوب سجایا گیا تھا۔ قیمتی قالینوں کا فرش تھا۔ تیمور کو خطرے کا احساس ہو جانے کے باوجود دوسرا قدم اٹھا پڑا۔ اس کا ہر اگلا قدم اسے خطرے کے اور قریب کر رہا تھا۔ تیمور کے لیے خیمے کے بیچ مسند لگائی گئی تھی۔ تیمور قدم بڑھا رہا تھا اور خطرے کی گھنٹیاں تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔

تیمور اس مسند کے قریب پہنچ گیا جو اس کے لیے بچھائی گئی تھی۔ تیمور بیٹھنے کے لیے جھکا کہ اسے زور کی چھینک آئی۔ تیمور نے اپنا دامن ناک پر رکھ کر زور سے دبایا۔ خون کی ایک پچکاری سی اس کی ناک سے نکل پڑی۔ تیمور بیٹھنے کے بجائے سیدھا کھڑا ہو گیا اور "نکسیر نکسیر" کہتا خیمہ کے دروازے کی طرف بھاگا۔ پھر پلک جھپکتے میں وہ خیمہ سے باہر تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ سب کچھ اس تیزی سے ہوا کہ لوگ کچھ سمجھ ہی نہ سکے اور سمجھے تو اس وقت جب خیمے کے باہر کے بھاگنے کی آواز آئی۔ تیمور سازش کا جال توڑ کر صاف نکل گیا۔ حاجی برلاس منہ تکتا رہ گیا۔ قتل پر مامور مسلح دستہ کمین گاہ سے نکل کر باہر کی طرف دوڑا لیکن وہاں اب کچھ نہ تھا۔

تیمور اپنے پچاس سواروں کے ساتھ شہرِ سبز کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا۔

تیمور کے جانے کے بعد حاجی برلاس کے طویل و عریض خیمے میں ادھم مچ گیا۔ بایزید جلائر پر بڑا غصہ تھا۔ اس نے چیخ چیخ کر خیمہ سر پر اٹھا لیا:

"حاجی برلاس۔ تم ذلیل ہو۔ کمینے ہو۔ تم نے میرے منہ پر کالک لگوا دی۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ میں نے تمہاری سازش میں شریک ہو کر اپنا بیڑہ غرق کر لیا۔ تیمور مجھے معاف نہ کرے گا۔ وہ اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ اب میں کیا کروں۔ کدھر جاؤں۔"

قاسم کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ اس نے حاجی کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا:

"ماموں۔ میں نہ جانتا تھا تم اس قدر سازشی ہو۔ تیمور کیا سوچتا ہو گا۔ تم نے اس کے پاس میرا اعتبار اٹھ گیا۔ میں زندگی بھر اس کے سامنے نظریں نہ اٹھا سکوں گا۔ میں ذلیل ہو گیا۔"

حاجی برلاس بہرہ بنا بیٹھا تھا۔ اس میں جواب دینے کی ہمت نہ تھی۔ اس نے سوچا کیا تھا پانسہ بالکل ہی پلٹ گیا۔

بایزید جلائر نے بڑھ کر حاجی برلاس کا گریبان پکڑ لیا:

"تم نے میری عزت خاک میں ملا دی۔ میں تمہیں زندہ نہ چھوڑوں گا۔"

حاجی کے آدمیوں نے بڑی مشکل سے حاجی کا گریبان چھڑایا۔ وہ بڑبڑا رہا تھا:

"سمرقند کی حکومت چاہتے ہیں۔ سازش کرنا بھی نہیں آتی۔ تم تیمور کے پاسنگ بھی نہیں ہو۔ چالاک ہے۔ عقل مند ہے۔ وہی حکومت کا اہل ہے۔"

بایزید جلائر اور قاسم، حاجی برلاس پر پلے پڑ رہے تھے۔ حاجی کے سپاہی بار بار دخل دیتے۔ حاجی اب تک خاموش تھا۔ چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ جھگڑا بڑھتا جا رہا تھا۔ حاجی برلاس اور سپاہیوں کی کوشش تھی کہ قاسم اور بایزید کو دھکیل کر باہر نکال دیں مگر وہ نکلنے پر آمادہ نہ تھے۔ دنگا فساد اور ہاتھا پائی ہوتی رہی۔

یکایک حاجی برلاس نے زبان کھولی:

"بایزید! تم مجھے آنکھیں کیوں دکھا رہے ہو۔ تم میرے ساتھ برابر کے شریک تھے۔ اگر حکومت پر قبضہ ہو جاتا تو آدھی سلطنت کے تم مالک بن جاتے۔ فائدے میں شریک تھے تو نقصان میں بھی شریک ہو جاؤ۔ پیچ کر نہیں جا سکتا۔ سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکلا تو اب میں ٹیڑھی انگلیوں سے گھی نکالوں گا۔ میں تیمور کے خلاف لڑوں گا۔ شہرِ سبز میں آگ لگا دوں گا۔"

پھر حاجی برلاس نے تلوار نکالی۔ تلوار کو ہوا میں گردش دی اور چیخا:

"خبردار جو کسی نے مجھے الزام دیا۔ میں ایک ایک کی گردن اڑا دوں گا۔"

بایزید جلائر ڈر گیا۔ وہ اپنے ساتھ صرف پانچ سو سوار لایا تھا۔ حاجی برلاس کے پاس برلاس قبیلہ کے سے زیادہ سواروں کے علاوہ کوہستانی سوار بھی تھے۔ اس نے خاموشی اختیار کر لی اور وہاں سے نکلنے کی فکر کرنے لگا۔

حاجی برلاس نے خود اسے موقع فراہم کر دیا۔ بولا:

"جہنم میں میرا ساتھ نہیں دینا ہے وہ یہاں سے چلے جائیں۔"

بایزید جلائر جھٹ سے خیمہ سے نکل گیا۔

قاسم نے کہا:

"میں بھی آپ کا ساتھ نہ دوں گا ماموں جان۔"

یہ کہتے وقت اس کا ہاتھ شمشیر کے قبضے پر تھا۔ اسے حاجی برلاس پر ذرا بھی اعتبار نہ رہا تھا۔ اس سے کسی حرکت ممکن تھی۔ قاسم اب مزید کوئی فریب نہ کھانا چاہتا تھا۔

حاجی برلاس گرج کر بولا:

"جا۔ تو بھی چلا جا اس طرغائی کے بیٹے کے پاس لیکن یہ سوچ لے کہ تیمور تجھے دیکھتے ہی قتل کرا دے گا۔ تو اسے دھوکہ دے کر یہاں لایا تھا۔"

قاسم ایک لمحہ کے لیے تو پریشان ہو گیا۔ لیکن جلد ہی سنبھل گیا۔ بولا:

"میں تیمور کا مجرم ہوں۔ میں نے اسے دھوکہ دیا ہے۔ اگر وہ قتل کر دے گا تو میرا گناہ دھل جائے گا۔ میرے لیے وہ موت، آپ کے ساتھ زندگی گزارنے سے کہیں بہتر ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قاسم خیمہ کے دروازے کی طرف بڑھا۔ حاجی گرجا:

"تجھے شہزوری سے بھی ہاتھ دھونا ہوں گے۔ تیمور کے پاس جائے گا تو میرا دشمن ہوگا۔ ساتھ بیٹی کو رخصت نہ کروں گا۔"

شہزوری کے نام پر قاسم کا پورا وجود ہل گیا۔ شہزوری کا سراپا اس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔ برلاس سے اسے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ اپنا ارادہ نہ بدل سکا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا خیمہ سے نکل گیا۔ تلوار اس کے ہاتھ میں جھول گئی۔ اسے اپنا جسم گرتا ہوا محسوس ہوا۔ تھکا تھکا۔ جیسے اس نے کیا ہو اور اب جسم ٹوٹ رہا ہو۔ قاسم اس کا بازو تھا۔ بازو ٹوٹ جائے تو اذیت ہونا لازمی ہے۔

قاسم باہر آیا تو دیکھا بایزید جلائر اپنے سواروں کے ساتھ کوچ کے لیے تیار تھا۔

قاسم نے پوچھا:

"اے حاکم مجند۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

بایزید جلائر بھنا گیا۔ ناگواری سے بولا:

"تو کیوں پوچھ رہا ہے جدھر چاہوں جاؤں۔ میری مرضی!"

قاسم نے نرمی سے کہا:

"اے سردار! میں اس لیے پوچھتا ہوں کہ میں بھی حاجی برلاس کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ آیا ہوں۔ دغاباز کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ خواہ وہ میرا باپ ہی کیوں نہ ہو۔"

بایزید نرم پڑ گیا۔ بولا:

"قاسم۔ میں نے ایک گناہ کیا ہے اس کی سزا بھگتنے جا رہا ہوں۔"

"مجرم تو میں بھی ہوں سردار۔"

قاسم دل گرفتگی سے بولا:

"میں کدھر جاؤں؟"

"تو کس کا مجرم ہے؟" بایزید نے پوچھا۔

"امیر تیمور۔ حاکم سمرقند کا۔" قاسم نے کہا۔

"حاجی برلاس نے میرے ذریعے تیمور کو بلوایا تھا۔ مجھے معلوم ہوتا کہ یہ سازش ہے تو تیمور

بایزید نے مشورہ دیا:

"تو تیمور کا مجرم ہے پھر تیمور ہی کے پاس جا۔ اگر وہ قتل کر دے تو جرم ختم ہو جائے گا۔ اگر بخش دے تو تیری خوش نصیبی۔"

"ٹھیک ہے سردار۔ میں آپ کے مشورہ پر عمل کروں گا۔"

قاسم نے کہا۔

"مگر آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"جہاں تو جا رہا ہے قاسم۔" بایزید نے بتایا۔

"تیمور کے پاس۔"

قاسم نے حیرانی سے پوچھا:

"مگر وہ آپ کو....."

بایزید نے قاسم کی بات کاٹ دی۔ بولا:

"قاسم جس کشتی میں تو سوار ہے اس میں میں بھی سوار ہوں۔ ہم دونوں کا تقریباً ایک سا جرم ہے پھر سزا بھی ایک ساتھ ہی کیوں نہ بھگتیں۔ تو میرے ساتھ ہی چل۔"

قاسم اس پیش کش پر بہت خوش ہوا۔ وہ دوڑ کر اپنا گھوڑا لینے چلا گیا اور بایزید سے کہتا گیا کہ وہ جب تک واپس نہ آ جائے کوچ ملتوی رکھا جائے۔ بایزید نے وعدہ کر لیا۔

قاسم نے اپنا گھوڑا حاجی برلاس کے بڑے خیمے سے کچھ دور چھوڑا تھا لیکن اب گھوڑے کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ اندھیرے میں ادھر ادھر بھٹکنے لگا۔ حاجی برلاس نے روشنیاں گل کرا دی تھیں۔ اسے تیمور کے شب خون مارنے کا خطرہ تھا۔

قاسم پریشانی کے عالم میں گھوڑا تلاش کر رہا تھا کہ کسی نے اسے پیچھے سے آواز دی:

"قاسم!"

قاسم کے قدم رک گئے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اندھیرے میں ایک سایہ سا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"شہزوری نے تمہیں بلایا ہے۔" سایہ نے کہا۔

"کہاں ہے شہزوری؟" قاسم کا دل بے چین ہو گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اپنے خیمے میں۔ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔"

سایہ آگے ہو گیا۔ اور قاسم چپ چاپ اس کے پیچھے ہو لیا۔ تمام خیموں میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ ایک خیمے کے سامنے رک گیا اور بولا:

"اندر چلے جاؤ۔"

قاسم ہچکچایا۔ اسے خطرہ محسوس ہوا۔

خیمہ کے اندر سے آواز آئی:

"جلدی اندر آجاؤ قاسم۔"

یہ قاسم کی جانِ آفریں شہزوری کی آواز تھی۔ قاسم کے قدم بیدم اٹھ گئے۔ خیمہ کا پردہ اٹھا ہوا تھا۔ اندر داخل ہونے لگا تو ایک مرمریں ہاتھ اس کے ہاتھ سے ٹکرایا۔

"شہزوری!"

"قاسم!"

دونوں کی آوازیں گھٹی گھٹی تھیں مگر سانسیں جلد جلد چل رہی تھیں۔ شہزوری کی زلفوں کی مہک مدہوش کرنے لگی۔ اس کا سر قاسم کے سینے سے لگ گیا اور وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

قاسم نے شہزوری کے دونوں ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیے۔ شہزوری کی سسکیاں گرم سانسوں میں بدلنے لگیں۔ قاسم کچھ کہنے والا تھا کہ اسے خیمہ سے کچھ دور کئی مشعلیں جھلملاتی دکھائی دیں۔ وہ سنبھل کر بولا:

"شہزوری۔ میں جا رہا ہوں۔"

شہزوری اس سے چمٹی ہوئی تھی۔ اس نے قاسم کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ شاید وہ نہیں چاہتی اسے چھوڑ کر جائے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔ وہ قاسم کی گرفت سے تڑپ کر نکلی اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی:

"قاسم بھاگ جاؤ۔ خدا کے لیے اپنی جان بچاؤ۔ ہم گھیرے میں آ گئے ہیں۔"

قاسم نے بھی خطرہ محسوس کر لیا تھا لیکن اس نے اطمینان سے کہا:

"شہزوری۔ بھاگنے کا وقت نکل چکا ہے۔ میں حاجی برلاس کا قیدی نہیں بننا چاہتا۔"

قاسم تلوار کھینچ کر خیمہ کے باہر آ گیا۔ شہزوری کا خیمہ چاروں طرف سے شمع بردار شمشیر زنوں میں گھرا ہوا تھا۔ حاجی برلاس گھوڑے پر سوار سامنے موجود تھا۔

حاجی برلاس نے کہا:

"قاسم۔ پھر نہ کہنا کہ حاجی برلاس بزدل تھا جس نے اکیلے پر ہاتھ اٹھایا۔ ہم تمہاری جان بخشتے ہیں لیکن اتنی دیر کے لیے جب تک تم ہماری نظروں سے اوجھل نہ ہو جاؤ۔ ہم دوبارہ تمہیں یہاں دیکھیں گے قتل کر دیں گے۔ خواہ تیمور کا خیمہ ہو یا ہمارا خیمہ۔ جاؤ دور ہو جاؤ ہماری نظروں سے۔"

شہزوری دوڑ کر خیمہ سے نکل آئی۔ وہ سمجھی حاجی برلاس نے قاسم کے قتل یا گرفتاری کا حکم دیا ہے۔ وہ روتے ہوئے بولی:

"ابا جان! خدا کے لیے قاسم کو معاف کر دیجیے۔ خطاوار میں ہوں۔ میں نے قاسم کو بلوایا تھا۔"

"شہزوری۔ ہم نے تمہارے صدقے میں اسے بخش دیا ہے۔"

حاجی برلاس نے بڑی تمکنت سے کہا:

"قاسم ہمارا دشمن ہے۔ اسے بھولنے کی کوشش کرو۔"

قاسم کو ایک گھوڑا دیا گیا۔ ننگی تلوار اب تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ قاسم جست لگا کر گھوڑے پر آ گیا اور اس تیزی سے گھوڑے کو گھمایا کہ اس کے گھوڑے کی کنوتیاں حاجی برلاس کے گھوڑے کی کنوتیوں سے ٹکرائیں۔

اب قاسم کی تلوار کی نوک حاجی برلاس کے دل کو چھو رہی تھی۔ حاجی برلاس کے جسم میں تھرتھری پیدا ہو گئی۔ قاسم نے چیخ کر کہا:

"حاجی برلاس۔ خبردار جسم کو ذرا بھی حرکت نہ ہو۔ ورنہ.....؟"

حاجی برلاس کے چار پانچ سواروں نے قاسم کی طرف قدم بڑھائے۔ قاسم نے انہیں ڈانٹ دیا:

"رک جاؤ۔ ہمارے درمیان آنے کی کوشش کی تو میری تلوار حاجی برلاس کے دل میں اتر جائے گی۔"

سواروں نے گھوڑے روک لیے۔ قاسم نے تلوار کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ حاجی برلاس کی ہلکی سی دو کڑیاں ٹوٹ گئیں۔ تلوار کی نوک دل کی دھڑکن کے اور قریب ہو گئی۔ ہر شخص دم بخود تھا۔

قاسم نے پوچھا:

"اب بتاؤ حاجی برلاس۔ کس کی جان کس کے نشانے پر ہے۔"

شہزوری سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ چیخ پڑی:

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"خدا کے لیے قاسم۔"

"گھبراؤ مت شہزوری۔"

قاسم نے شہزوری کو روک دیا۔

"حاجی برلاس نے بہت بڑی سازش کی تھی۔ اس کا جرم ناقابلِ معافی ہے لیکن یہ تیمور کا مجرم ہے اسے سزا دے گا۔"

پھر وہ حاجی برلاس سے مخاطب ہوا:

"حاجی برلاس۔ تم نے شہزوری کے صدقے یہ مجھے بخشا تھا۔ اب میں بھی شہزوری کے صدقے تمہاری جان بخش رہا ہوں۔ تم نے شہزوری کو خوشی سے رخصت نہیں کیا لیکن میں اسے رخصت کرانے آؤں گا۔ میدانِ جنگ میں ہوگی۔ حاجی برلاس! میں تیمور کے پاس جا رہا ہوں۔ اگر اس نے مجھے معاف کر دیا تو تم سے تیمور کے پہلو بہ پہلو لڑتے ہوئے پاؤ گے۔"

قاسم نے گھوڑے کو ایڑ دی اور ہوا کی طرح ان کے درمیان سے نکل گیا۔ شہزوری چکرا کر رہ گیا۔ بایزید جلائر، قاسم کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا تو اس نے اپنے دستوں کو کوچ کا حکم دیا۔ دیر میں کافی دور نکل چکا تھا لیکن قاسم گھوڑا اڑاتا ہوا بہت جلد اس سے جا ملا۔

دستِ قضا

میاں بیوی میں اس وقت بڑا ہنگامہ خیز جھگڑا شروع ہوا جب حاجی برلاس نے شہزوری کی ماں سے:

"سنتی ہو نیک بخت۔ تم سے ایک مشورہ کرنا ہے۔"

حاجی برلاس کی بیوی خالص گھر گرہست اور قدامت پرست ناری عورت تھی۔ سادگی سے بولی:

"حاجی! تم مالک اور مختار ہو۔ جو چاہے کرو مجھے باہر کی دنیا سے کوئی مطلب نہیں۔"

"لیکن بات باہر کی نہیں۔ گھر کی ہے۔" حاجی نے وضاحت کی۔

بیوی نے حیرت سے شوہر کو دیکھا۔ پوچھا:

"گھر کی کون سی بات مجھ سے ڈھکی چھپی ہے۔ گھر کی بات ہے تو مجھ پر چھوڑ دو۔ میں خود ہی نپٹ لوں گی۔"

"یہ معاملہ تم اکیلے نہیں نپٹا سکتیں شہزوری کی ماں۔"

حاجی برلاس نے ذرا سخت لہجہ اختیار کیا:

"اسے ہم تم مل کر ہی سلجھائیں گے۔"

شہزوری کی ماں کو میاں کا سخت لہجہ ناگوار گزرا۔ وہ بھی برلاس قبیلے کے ایک بڑے سردار کی بیٹی تھی۔ چمک کر بولی:

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کان کھول کر سن لو حاجی۔ یہ گھر میرا ہے۔ یہاں میرا حکم چلے گا۔ تم اپنا زور باہر دکھایا کرو۔"

حاجی برلاس جز بز تو بہت ہوا لیکن معاملہ ایسا تھا جو بیوی کی مدد کے بغیر حل نہ ہو سکتا تھا۔ نرم پڑ گیا۔ بولا:

"تم خواہ مخواہ ناراض ہو رہی ہو۔ میں گھر کے معاملہ میں کب دخل دیتا ہوں۔ ہو گا وہی جو تم چاہو گی پہلے میری بات تو سن لو۔"

"کہو"۔ شہزوری کی ماں کا منہ پھول گیا لیکن دل میں اپنی فتح پر خوش ہوئی۔

"شہزوری کا رشتہ آیا ہے"۔ حاجی نے بات چھیڑی۔

شہزوری کی ماں چونک پڑی۔ اس نے تیز نظروں سے حاجی برلاس کو یوں گھورا جیسے اسے دھمکی دی ہو لیکن بولی کچھ نہیں۔

حاجی نے جواب کا انتظار کیا۔ بیوی خاموش رہی۔ اس کا حوصلہ بڑھا۔ جھجکتے ہوئے بولا:

"امیر خطر نے اپنے بیٹے کے لیے شہزوری کا رشتہ مانگا ہے"۔

شہزوری کی ماں کی تیز نظروں میں اور سختی آ گئی۔ بولی پھر بھی نہیں۔ گھورتی رہ گئی۔

حاجی برلاس نے اگلا قدم اٹھایا۔ تفصیل بتائی:

"امیر خطر کا قاصد آیا ہوا ہے میں نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی ہے"۔

شہزوری کی ماں جوالا مکھی بن کر پھٹ پڑی:

"کہاں کا رشتہ، کس کا رشتہ۔ شہزوری کی شادی تو ہو چکی ہے۔ اس کی شادی دو بار نہیں ہو سکتا ہے"۔

وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ دو بدو مقابلہ کے لیے بالکل تیار تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید بیوی کی اس تلخ کلامی کا ترکی بہ ترکی جواب دیتا لیکن یہ موقع نازک تھا۔ حاجی کو تیمور کے مقابلے کے لیے زیادہ سے زیادہ لوگوں کے تعاون کی ضرورت تھی۔ پھر وہ بیوی کو ناراض کیسے کرتا؟ بیوی کے گیارہ بھائی تھے ان بھائیوں کے عزیز و اقارب۔ اتنی بڑی فوجی طاقت کو وہ کیسے نظر انداز کر دیتا۔

حاجی برلاس نرم پڑ گیا۔ بولا:

"شہزوری کی ماں، تم میرا مطلب نہیں سمجھیں۔ شادی تو تمہارے ہی ہاتھوں سے ہو گی میں تو تم سے

مشورہ کر رہا تھا۔ دیکھو نا۔ تیمور ہمارا دشمن ہو رہا ہے۔ اس سے آج کل میں لڑائی تو ہونا ہی ہے۔ میں چاہتا تھا اگر امیر خطر اس بات پر ہماری مدد پر آمادہ ہو جائے تو ایک پنتھ دو کاج ہو جائیں گے۔ شہزوری بھی اپنے گھر کی ہو جائے گا اور تیمور کے مقابلے کے لیے ایک مضبوط حلیف مل جائے گا۔"

"شرم کرو شرم حاجی برلاس"۔

شہزوری کی ماں شیرنی کی طرح گرجی:

"اپنی طاقت بڑھانے کے لیے بیٹی کا نیلام کرنا چاہتے ہو۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے حاجی۔ غیر قبیلہ میں شادی کرنے کا تمہیں خیال کیسے آ گیا؟"

حاجی نے اپنے بچاؤ میں کہا:

"امیر خطر کا یسوری خاندان ہمارے قبیلہ سے کمتر تو نہیں۔ ہماری عزت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔"

شہزوری کی ماں بولی:

"حاجی۔ تمہارا حافظہ بھی اب بہت کمزور ہو گیا ہے۔ تین سال پہلے اسی یسوری قبیلہ کا رشتہ شہزوری کے لیے آیا تھا۔ لڑکے کی ماں میری بہن بنی ہوئی تھی۔ میں نے کتنے جتن کیے۔ کتنی خوشامد کی تھی تمہاری مگر تم ٹس سے مس نہ ہوئے۔ تم قبیلہ کی ناک لے کر بیٹھ گئے۔ دوسرے قبیلے میں لڑکی دینے سے تمہاری اور تمہارے قبیلہ والوں کی ناک کٹ رہی تھی۔ اب تمہیں کیا ہوا۔ کہاں گئی تمہاری ناک۔ میں یہ ہرگز نہ ہونے دوں گی۔ لڑکی کا رشتہ ایک ہی بار کیا جاتا ہے۔ شہزوری جس کی ہو چکی اسی کے گھر جائے گی۔"

شہزوری کی ماں آپے سے باہر ہو گئی۔ وہ خاموش طبیعت تھی لیکن ایسے لوگوں کا غصہ بڑا قیامت کا اور خوفناک ہوتا ہے۔

حاجی برلاس نے دیکھا گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکل رہا تو خود بھی اکڑ گیا۔ اس نے دھونس دی۔

"شہزوری کی ماں! تم بھی گرہ میں باندھ لو۔ چاہے شہزوری زندگی بھر کنواری بیٹھی رہے میں اسے قاسم کے ساتھ رخصت نہیں کروں گا۔ نہ نکاح نہ رخصتی۔ شہزوری پر ابھی ہمارا زور ہے۔"

"ایسا ہے تو پھر ایسا ہی سہی"۔

شہزوری کی ماں بھلا کب دبنے والی تھی:

"میں بھی دیکھتی ہوں شہزوری کسی اور کے گھر بیاہ کے کیسے جاتی ہے۔ غضب خدا کا رشتہ کا اعلان خود کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمام قبیلہ والوں میں بات پھیل گئی۔ میں تاتاری عورتوں میں نکوّ نہیں بن سکتی۔ قاسم کے ساتھ نکاح نہ ہوا تو ہماری زبان نکاح سے کچھ کم ہے۔ اسی زبان کی خاطر تو تاتاری گلا کٹا دیتے ہیں۔"

حاجی برلاس پیر پٹخ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"آج میں آپا جانی سے بات کروں۔ وہ مان گئیں تو میں دیکھوں گا تم مجھے کیسے روکتی ہو۔"

شہزوری کی ماں نے فوراً کہہ دیا:

"ہاں ہاں کر و بات۔ میں تمہاری آپا جانی سے ڈرتی ہوں؟"

کہنے کو تو شہزوری کی ماں کہہ گئی لیکن آپا جانی کا نام سنتے ہی وہ کانپ گئی تھی۔ آپا جانی سے وہ ہی نہیں قبیلہ برلاس کا کون بستر تھا جو نہ ڈرتا ہو۔ وہ حاجی برلاس کی پھوپھی تھی۔ عمر سو سے بھی اوپر۔ نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ بوڑھی کھوسٹ قبر میں پیر لٹکائے بیٹھی تھی مگر رعب داب کا یہ عالم کہ کوئی اس کے سامنے چوں بھی نہ کر سکے۔ چونڈا سفید، بھویں سفید۔ کمر جھکی ہوئی مگر بڑھیا لکڑی ٹیکتی میلوں پیدل چلی جاتی۔ اس کی آنکھوں کانوں پر تو جیسے بڑھاپا آیا ہی نہ تھا۔ آواز ایسی کراری کہ پردے کے پیچھے سے بولے تو سولہ سال کی لڑکی معلوم

آپا جانی برلاس قبیلہ کی معمر ترین خاتون تھیں۔ اس وقت کے تمام بزرگ تاتاری سردار ان کی گود میں کھیلے حاجی برلاس کو تو آپا جانی نے بیٹے کی طرح پالا تھا۔ جس دن حاجی برلاس کی ماں اسے جنم دے کر اللہ کو پیا ہوئی اسی دن آپا جانی بیوہ ہوئی۔ آپا جانی نے حاجی برلاس کو گود لیا تھا۔ دراصل آپا جانی کے زور پر ہی حاجی گورتا تھا۔

جب تیمور اور حاجی برلاس کا جھگڑا چلا تو قبیلہ کے سب ہی سردار تیمور کو اپنا حاکم بنانا چاہتے تھے لیکن دیوار بن کر تیمور کے سامنے آ گئی۔ اس نے اعلان کرا دیا کہ چچا کے ہوتے ہوئے بھتیجے کا سرداری پر کوئی حق نہیں نتیجہ یہ ہوا کہ عمر رسیدہ تمام سردار حاجی برلاس کی طرف دار ہو گئے اور جوان سردار وں نے تیمور کے جھنڈے تلے دم لیا۔ اس کھینچا تانی میں کئی باپ بیٹے ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔ بھائی بھائی کا دشمن بن گیا۔

رات کو آپا جانی کے دربار میں مقدمہ پیش ہوا۔ حاجی برلاس مدعی اور اس کی بیوی مدعا علیہ تھی۔

آپا جانی کا خیمہ بڑی خوبصورتی سے آراستہ کیا گیا تھا۔ دو ہرے قالینوں کا فرش اور ریشمی پردے لگا بڑی بی کی مسند پر زرنگار جھالریں لگی تھیں۔

آپا جانی مسند کے سہارے کمر جھکائے اس طرح بیٹھی تھیں جیسے کوئی شہنشاہ بیٹھتا ہے۔ قبیلہ کی

دو شیزائیں اس کے پیر اور شانے داب رہی تھیں۔ ان میں ایک شہزوری تھی۔

شہزوری کو پتہ چل گیا تھا کہ آج اس کا مقدمہ آپا جانی کے سامنے پیش ہوگا۔ وہ شام ہی سے آپا جانی کے خیمہ میں پہنچ گئی۔

حاجی برلاس نے تیمور کے خلاف قتل کی جو سازش کی تھی اس کی خبر آپا جانی کو نہ ہونے دی تھی۔ شہزوری نے پیر دبانے کے دوران بھانڈا پھوڑ دیا۔ اور بڑی بی کو الف سے ی تک ساری بات بتا دی۔

حاجی برلاس اور اس کی بیوی آپا جانی کے سامنے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ قبیلہ کے کچھ اور بزرگ بھی خیمہ میں موجود تھے۔ آپا جانی کے خیمہ میں کسی کو اس وقت تک زبان کھولنے کی اجازت نہ تھی جب تک وہ خود کسی کو بولنے کا حکم نہ دے۔

آپا جانی نے حاجی برلاس اور اس کی بیوی کے ایک ساتھ اس کے پاس آنے سے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ میاں بیوی میں کسی بات پر جھگڑا ہوا ہے اور وہ جھگڑا اس قدر بڑھ گیا ہے کہ فیصلے کے لیے وہ اس کے پاس آئے ہیں۔

بڑی دیر خاموشی کے بعد بڑی بی بولیں:

"حاجی برلاس۔ بیوی سے نہ لڑا کرو۔ شہزوری کی ماں بڑی نیک بچی ہے۔"

حاجی برلاس گھبرا گیا۔ آپا جانی نے پہلے ہی جملہ میں شہزوری کی ماں کی طرف داری کر دی تھی۔ اس نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا:

"آپا جانی۔ جھگڑا وگڑا کچھ نہیں۔ میں آجکل پریشان ہوں۔ تیمور نافرمانی پر کمر بستہ ہے۔ اس نے ایک بڑی فوج اکٹھا کر لی ہے۔ آپ کے حکم کے خلاف وہ میری سرداری سے اب تک انکار کر رہا ہے۔ اسے سزا دینے کے لیے میں دوسرے قبیلوں کا تعاون حاصل کرنا چاہتا ہوں۔۔۔۔"

"حاجی برلاس۔ بات مختصر کرو۔"

آپا جانی بڑے کرارے لہجے میں بولیں:

"مجھے رام کہانی سنانے کی ضرورت نہیں۔"

حاجی برلاس کو پسینہ آ گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا:

"بات میرے گھر کی ہے اگر تنہائی میں عرض کرنے کی اجازت ہو تو زیادہ بہتر ہوگا۔"

آپا جانی نے خیمے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف کچھ اس انداز سے دیکھا کہ وہ ایک ایک کر کے خاموشی سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خیمہ کے باہر چلے گئے۔

شہزوری بھی باہر نکل گئی۔

"کہو۔" آپا جانی نے حاجی برلاس کو سختی سے حکم دیا۔

حاجی نے کہنا شروع کیا:

"یسوری قبیلہ کا سردار امیر خظر میرا دوست ہے۔ بہادر سواروں کا ایک مضبوط جتھا اس کے ساتھ ہے۔ امیر خظر کی فوجی طاقت تاتاری قبیلوں میں۔۔۔۔"

"مطلب کی بات کرو حاجی۔" آپا جانی نے اسے پھر ٹوکا۔

حاجی برلاس پہلے ہی گھبرایا ہوا تھا۔ اب اور زیادہ گھبرا گیا۔ جلدی جلدی خود کو سنبھالا۔ بولا۔

"امیر خظر نے شہزوری کا رشتہ اپنے لڑکے کے لیے مانگا ہے۔"

"تم نے کیا جواب دیا؟" آپا جانی نے تیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

حاجی نے ڈرتے ڈرتے کہا:

"میں نے منظور کر لیا ہے آپا جانی۔"

آپا جانی نے تیزی سے پہلو بدلا اور کڑک کر بولیں:

"پھر میرے پاس کیا لینے آئے ہو؟ حاجی برلاس تم عقل سے بڑھ گئے ہو۔ میں نے تمہیں پال پوس کر کیا۔ تیمور کے مقابلے میں تمہاری حمایت کی۔ حالانکہ تیمور میں ایک سردار کی حیثیت سے تم سے کہیں زیادہ موجود ہیں لیکن تم نے میری محبت کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔ تم نے تیمور کو اپنی دعوت میں بلا کر قتل کرنے کی کوشش کی۔ اگر تیمور ہلاک ہو جاتا تو برلاس قبیلہ ہمیشہ کے لیے بدنام ہو جاتا۔"

حاجی برلاس پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اس کے پاس جواب ہی کیا تھا۔ بھیگی بلی بنا بیٹھا رہا۔

آپا جانی بولتے بولتے تھک گئی تھیں۔ انہوں نے دو تین لمبی سانسیں لے کر خود کو سنبھالا۔ ایک دو دانہ کھانسیں۔ پہلو بدلنے میں ایک بار مسند سے لڑھک بھی گئیں مگر تھیں بڑی جی دار۔ خود ہی سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

"کیا تم نے شہزوری اور قاسم کے رشتے کا اعلان نہیں کیا؟" آپا جانی نے جرح شروع کی۔

"جی ہاں اعلان کیا تھا لیکن۔۔۔۔"

حاجی برلاس نے وضاحت کرنا چاہی مگر آپا جانی نے ڈانٹ دیا:

"صرف اس بات کا جواب دو جو میں پوچھ رہی ہوں۔"

حاجی برلاس میں ہمت نہ تھی کہ آپا جانی کو ٹوکتا یا ان کی مخالفت کرتا۔ اس کی طاقت آپا جانی کی وجہ سے تھی۔ قبیلہ کے تمام سرداروں کو انہوں نے حاجی کا طرفدار بنایا تھا۔

"حاجی برلاس۔"

آپا جانی نے اسے مخاطب کیا۔

"رشتہ کا اعلان تم نے کیا۔ پھر غضب یہ کہ اس کی تصدیق مجھ سے کرائی۔"

"وہ میری غلطی تھی آپا جانی۔"

حاجی برلاس لجاتے ہوئے بولا:

"قاسم باغی ہو گیا۔ وہ قبیلہ کا دشمن ہے۔"

آپا جانی نے فوراً گرفت کی:

"قاسم دشمن تھا تو اسے بچ کے تیمور کے پاس کیوں جانے دیا۔ قتل کر دیا ہوتا۔"

"یہ بھی میری غلطی تھی آپا جانی۔" برلاس کا سر مجرم کی طرح جھک گیا۔

"اور میری غلطی یہ ہے کہ میں نے تمہیں تیمور پر فوقیت دی۔"

آپا جانی بڑے غصے سے بولیں:

"حاجی۔ یہ رشتہ اس وقت تک نہیں ٹوٹ سکتا جب تک دونوں میں سے ایک مر نہیں جاتا یا ان میں سے ایک انکار نہیں کر دیتا۔ قبیلہ کا یہی دستور ہے اور یہی رہے گا۔"

مقدمہ کا فیصلہ ہو گیا۔

حاجی برلاس کی بیوی کو ایک لفظ بولنے کی ضرورت نہ پڑی۔ اس کا مقدمہ تو خود آپا جانی لڑ رہی تھیں۔ حاجی نے شکست کے باوجود ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ اسے امید کی ہلکی سی کرن دکھائی دی۔ بولا:

"آپا جانی۔ آپ نے فرمایا ہے کہ دو میں سے ایک انکار کر دے تو رشتہ ختم ہو سکتا ہے۔"

آپا جانی نے حیرت سے حاجی برلاس کو دیکھا۔ ان کے خیال میں اب اس بارے میں کسی مزید گفتگو کی ضرورت نہ تھی لیکن حاجی نے پھر بات چھیڑ دی۔ آپا جانی نے کہا:

"ہاں کہا تھا۔ اگر لڑکی یا لڑکا کسی خاص وجہ سے رشتہ سے انکار کر دیں تو یہ ممکن ہے لیکن انکار کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوئی دلیل اور ثبوت ہونا بھی ضروری ہے۔"

حاجی برلاس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وہ آپا جانی کی بات بھی پوری طرح نہ سن سکا۔ وہ اپنی ہی فکر میں گم تھا کہ آپا جانی خاموش بھی ہو گئیں اور اسے خبر نہ ہوئی۔

آپا جانی خود ہی بولیں:

"حاجی برلاس! تم سوچ رہے ہو قاسم اس رشتہ سے انکار کر دے گا۔ یہ غلط ہے۔ قاسم کو شہزوری کہیں بہتر دلہن نہیں مل سکتی۔ وہ کبھی انکار نہیں کرے گا۔"

حاجی برلاس ہوش میں آ گیا اور بولا۔

"میں قاسم پر لعنت بھیجتا ہوں۔ میرا خیال۔۔۔۔"

حاجی نے چپ ہو کر کن انکھیوں سے بیوی کی طرف دیکھا۔ شہزوری کی ماں اب تک خاموش تھی۔ اس نے اب بھی خاموشی ہی اختیار کیے رکھی۔

حاجی برلاس کو جواب آپا جانی نے دیا۔

"تمہارا اشارہ شہزوری کی طرف ہے۔ اس سے بھی پوچھ دیکھو۔۔۔۔ لیکن ٹھہرو، اس سے میں خود پوچھ لوں گی۔ تمہارے پھسلانے اور ورغلانے سے وہ غلط فیصلہ بھی کر سکتی ہے۔"

آپا جانی نے حاجی برلاس اور اس کی بیوی کو خیمہ سے باہر بھیج دیا۔ شہزوری کو بلوایا گیا۔ شہزوری ڈری آئی۔ وہ بہت پریشان تھی۔ اس کے خیال میں فیصلہ آپا جانی کو کرنا تھا۔ اسے کیوں بلایا گیا۔ یہی سوچ سوچ کر اس کا دل ہولا ہو رہا تھا۔

شہزوری سر جھکائے آپا جانی کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ آپا جانی نے اپنا لرزتا ہاتھ شہزوری کے سر پر رکھا۔ ان کے چہرے کی جھریاں سمٹتی اور پھیلتی محسوس ہو رہی تھیں۔ شاید وہ مسکرا رہی تھیں۔

آپا جانی نے محبت سے پوچھا:

"شہزوری۔ تیرے باپ نے قاسم اور تیرے رشتے کا اعلان کیا۔ میں نے بھی اسے پسند کیا۔ اس لیے میں نے تیری مرضی معلوم نہیں کی تھی لیکن اب اس کی ضرورت آن پڑی ہے۔ نہ تو میری ناراضگی کا خیال کر اور نہ برلاس سے خوف کھا۔ مجھے صاف صاف بتا اگر تجھے یہ رشتہ پسند نہیں تو میں اسے ختم کرا دوں گی۔ تیرے اوپر کوئی انگلی نہ اٹھائے گا۔"

شہزوری کو اس بات کا تو خیال ہی نہ تھا۔ وہ عجیب کشمکش میں پڑ گئی۔ قاسم سے رشتہ توڑنے کا وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی لیکن باپ کی مخالفت ایک بھیانک دیو بنی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اگر وہ اپنی پسند کے مطابق رشتہ برقرار رکھتی ہے تو حاجی برلاس اس کا جینا حرام کر دے گا اور اگر رشتہ توڑتی ہے تو اس کی امیدوں اور آرزوؤں کا محل ریزہ ریزہ ہوتا ہے۔

آپا جانی بولتے بولتے تھک گئی تھیں۔ آج انہیں بے تکان بولنا پڑا تھا۔ شہزوری سے باتیں کرتے وقت ان پر کچھ زیادہ ہی تھکن غالب آ گئی تھی۔ انہوں نے اٹک اٹک اور ٹھہر ٹھہر کر اپنا مقصد بیان کیا تھا۔ شہزوری کو اس سے سوچنے کا موقع مل گیا۔

وہ ابھی سوچ رہی تھی۔ اپنے متعلق، قاسم کے متعلق اور حاجی برلاس کی اس نئی ضد کے لیے۔ آخر اس کی سوچ ایک نکتہ پر آ کر جم گئی۔

شہزوری کو یہ یقین تھا کہ آپا جانی ایک بار جس بات کا اعلان کر دیں اس کو کسی صورت میں بدل نہیں سکتی تھیں۔ یہ ان کی آن اور انا کا مسئلہ بن جاتا تھا۔ انہوں نے تیمور کے مقابلے میں حاجی برلاس کی حمایت کا اعلان کیا۔ انہیں اس اعلان پر افسوس تھا۔ اس کا اظہار بھی وہ برملا کرتی تھیں لیکن وہ اپنی کہی ہوئی بات سے منہ نہیں موڑتی تھیں۔ جو کہہ دیا وہ پتھر کی لکیر ہو گیا۔ اسی نکتہ میں شہزوری کو اپنی کامیابی دکھائی دی۔

شہزوری نے ادب سے کہا:

"آپا جانی۔ شادی بیاہ کے معاملات میں تاتاری لڑکیاں اپنے بزرگوں کے فیصلے کو تسلیم کرتی ہیں۔ تاہم میرے لیے میرے باپ نے اعلان کر دیا۔ آپ نے اس کی منظوری دیدی۔ یہ اعلان اور منظوری میرے لیے آسمانی حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ میں باپ کی مخالفت اور آپ کے حکم سے مرتابی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ ہاں اگر آپ اور میرے ابا جان کسی مصلحت کی بنا پر چاہتے ہیں کہ میں اس رشتہ سے انکار کر دوں تو بھی مجھے آپ لوگوں کے حکم سے انکار نہ ہو گا۔ میں اسے بھی چپ چاپ تسلیم کر کے انکار کر دوں گی لیکن میرا یہ انکار زبان سے نہیں خنجر سے ہو گا۔ میں اپنا خنجر اپنے دل میں اتار کر ہمیشہ کے لیے اپنی زبان بند کر لوں گی تاکہ نہ میں اپنی ہم جولیوں میں شرمندہ ہوں اور نہ دوسرے تاتاری قبائل ہمارے برلاس قبیلہ کو یہ طعنہ دے سکیں کہ برلاس زبان کے جھوٹے اور قول کے پھر جانے والے ہیں۔"

شہزوری کی باتوں کا ایک ایک لفظ تیر بن کر آپا جانی کے دل میں اتر گیا۔ انہیں شہزوری کا دل دکھانے کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بڑا غم ہوا۔

انہوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے شہزوری کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولیں:

"شہزوری۔ مجھے معاف کر دے۔ میں نے ناحق تیرا دل دکھایا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ برلاس میں ایسی [illegible] بھی موجود ہیں جو بزرگوں کی بات پہ اپنی جان تک گنوا سکتی ہیں۔ . . . . تو اطمینان رکھ۔ قاسم کے سوا کوئی [illegible] تیرا دولہا نہیں بن سکتا۔"

شہزوری کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو جگمگا اٹھے۔

آپا جانی نے حاجی برلاس کو بلا کر اپنا آخری فیصلہ سنا دیا:

"حاجی۔ تیری بیٹی کا حقدار قاسم ہے۔ تجھے یہ رشتہ توڑنا ہے تو جا کر میدان جنگ میں قاسم کو قتل کر دے۔"

حاجی برلاس کو یہی خدشہ تھا۔ اگر اسے شہزوری کو سمجھانے کا موقع مل جاتا تو شاید وہ مان جاتی لیکن آپا جانی نے اسے یہ موقع ہی نہ دیا۔ حاجی شکست خوردہ سپاہی کی طرح منہ لٹکائے خیمہ سے نکلنے لگا تو اس کے کانوں میں آپا جانی کی آواز آئی۔

"بدبخت اور بے غیرت ہے وہ باپ جو اپنی سرداری کے لیے بیٹی کا سودا کرے۔"

حاجی برلاس خون کے گھونٹ پیتا ہوا خیمہ سے باہر نکل گیا۔

○

بایزید جلائر جس وقت قاسم اور اپنے پانچسو سواروں کے ساتھ شہر سبز کی سرحد پر پہنچا تو اس نے تیموری سرحدی دستوں کو مقابلہ کے لیے تیار پایا۔ تیمور کے سواروں نے ترکش سے تیر نکالے اور کمانیں سیدھی کر لیں۔ قاسم نے فوراً سفید کپڑا تلوار پر باندھ کر فضا میں بلند کر دیا۔ بایزید نے بھی یہی عمل کیا۔ تیمور کے سواروں کی کمانیں نیچی ہو گئیں۔ تیر، ترکش میں واپس چلے گئے۔

بایزید جلائر نے اپنے سواروں کو وہیں چھوڑا اور قاسم کے ساتھ سرحد پر پہنچا۔ قاسم کو تیموری سوار جانتے تھے۔ قاسم اور بایزید نے اپنی تلواریں محافظوں کے حوالے کر دیں اور تیمور سے ملنے کی خواہش کی۔ محافظ

اپنی حفاظت میں لے کر قصر سفید کی طرف چلے۔ قصر سفید کے ایک حصہ میں تیمور نے اپنی رہائش کے لیے ایک خوبصورت حویلی تعمیر کرائی تھی۔

تیمور اپنی حویلی میں بیٹھا سرداروں سے صلاح و مشورہ میں مصروف تھا۔ اسی وقت اسے اطلاع دی گئی کہ قاسم اور خجند کا سردار بایزید جلائر ملاقات کے لیے آئے ہیں۔

تیمور ایک فریب کھا چکا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ قاسم کا آنا تو اس کی سمجھ میں آتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ قاسم ایک بھولا بھالا جوان ہے۔ اس کا اس سازش سے کوئی تعلق نہیں۔ اسے دھوکے سے بلانے کو بھیجا گیا تھا لیکن بایزید جلائر کا آنا اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ تیمور کو یقین تھا کہ بایزید جلائر اس سازش میں برابر کا شریک ہے۔ پھر وہ شہر سبز کیوں آیا۔ اس کے ارادے کیا ہیں؟

انسان میں مہمان نوازی کا جذبہ ہو تو وہ دروازے پر آئے ہوئے دشمن کو بھی خوش آمدید کہنے کے لیے مجبور ہوتا ہے۔ تیمور بڑا مہمان نواز تھا۔ اس کے دل نے گوارا نہ کیا کہ بایزید جلائر سے ملنے سے انکار کر دے۔ تیمور نے اطلاع دینے والے کو حکم دیا کہ مہمانوں کو عزت سے اندر لایا جائے۔

بایزید جلائر اور قاسم لائے گئے۔ دونوں کی نظریں ندامت سے جھکی ہوئی تھیں۔ ان کے جسم پر کوئی اسلحہ نہ تھا۔ تیمور نے ان کے چہروں سے دلوں کی کیفیت معلوم کرنے کی کوشش کی۔ پھر مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔

"معزز سردار۔ نظریں اٹھائیے۔" تیمور نے بایزید کو مخاطب کیا۔

بایزید جلائر نے سر اوپر اٹھایا اور تیمور سے نظریں ملائیں۔ تیمور نے اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔ بایزید بھی ہاتھ پھیلا کر آگے بڑھا۔ دونوں گلے مل گئے۔

قاسم اب تک سر جھکائے کھڑا تھا۔ تیمور بولا:

"قاسم۔ تم قابلِ رحم ہو۔ میں بغیر کچھ پوچھے تمہیں معاف کرتا ہوں۔"

قاسم نے حیران حیران نظروں سے تیمور کو دیکھا۔ تیمور اب بھی مسکرا رہا تھا۔

"سردار تیمور۔ آپ کتنے عظیم ہیں۔" قاسم کے جسم میں مسرت کی بجلیاں سی دوڑ گئیں۔

تیمور نے اسے کوئی جواب نہ دیا صرف ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ قاسم ساتھ ہو لیا۔ تیمور بایزید جلائر کا ہاتھ پکڑے ہوئے اپنی مسند کے پاس پہنچا اور اسے اپنے برابر بٹھا لیا۔ قاسم اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ تیمور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا:

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اے حاکمِ خجند۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ بھی اس سازش میں شریک تھے۔"

بایزید جلائر کی آنکھیں شرم سے اوپر نہ اٹھتی تھیں۔ وہ بڑے کرب سے بولا:

"سردارِ تیمور۔ یہ تمہاری اطلاع غلط ہے کہ تم اپنے دشمن کی غلطی پر پردہ ڈال رہے ہو۔ تاتاریوں میں کبھی نہیں ہوا کہ کسی کو مہمان بنا کر قتل کیا جائے۔ میں حاجی برلاس کی نفرت انگیز سازش میں برابر کا شریک ہوں۔ میرا ضمیر مجھے کچوکے دے رہا ہے۔ میں اقبالِ جرم کر کے سزا کا منتظر ہوں۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو رہی ہے۔"

تیمور نے بایزید کے کاندھے پر ہاتھ رکھا:

"معزز سردار۔ اعترافِ گناہ کے بعد آدمی بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر آپ کو معاف کرتا ہوں۔ آپ میرے مہمان ہیں۔ آپ کی افسردگی میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔"

بایزید جلائر جذبات سے بے قابو ہو گیا۔ وہ دوبارہ تیمور کے گلے لگ کر بولا:

"قاسم نے سچ کہا۔ تم بہت عظیم ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں تمہارے اور حاجی کے جھگڑے میں آئندہ نہ پڑوں گا۔ میں نے تمہارے جھگڑے میں پڑ کر سخت غلطی کی۔ مجھے ذلت اٹھانا پڑی۔"

"ایسی باتیں نہ کیجیے سردار۔" تیمور نے اسے تسلی دی۔

بایزید جلائر، تیمور سے عمر میں کافی بڑا تھا۔ تیمور کو اس کی بزرگی کا احترام تھا۔ وہ بڑی تہذیب سے گفتگو کر رہا تھا۔ تیمور نے غلام کو مشروب لانے کا حکم دیا۔

تیمور نے پوچھا:

"سردار۔ آپ کے سوار کہاں ہیں؟"

بایزید جلائر کی ندامت اور شرمندگی تیمور کے حسنِ سلوک کی وجہ سے دور ہو گئی۔ اس نے کہا:

"جرم میں نے کیا تھا۔ میں اکیلا ہی معافی مانگنے تمہارے پاس چلا آیا۔ میرے سوار شہرِ سبز کے باہر موجود ہیں۔ میں ان سے کہہ آیا ہوں کہ میرے مرنے کی خبر ملے تو خوشی خوشی خجند واپس چلے جائیں اور وہاں اعلان کر دیں کہ بایزید نے جو گناہ کیا تھا اس کی اسے سزا مل گئی۔"

تیمور بہت متاثر ہوا۔ اس نے حکم دیا:

"بایزید جلائر کے سواروں کو شہر میں بلا لیا جائے۔ وہ ہمارے مہمان ہیں۔"

بایزید جلائر کو بڑی عزت سے حویلی میں ٹھہرایا گیا۔ شام کو شاندار ضیافت ہوئی۔ تاتاریوں کا خاص کھانا گھوڑوں کے بچوں کے کباب اور شہد چپڑی جو کی روٹی تھی۔ اسی سے مہمانوں کی تواضع کی گئی۔

قصرِ سفید کی اس حویلی میں رات بھر جشن جیسا سماں رہا۔ صبح دم تیمور نے بایزید جلائر کو رخصت کیا۔ دونوں کے دل صاف ہو گئے۔ آئندہ کے لیے تعاون کے عہد و پیمان ہوئے۔ بایزید نے وعدہ کیا کہ وہ نہ تو خود حاجی برلاس کے جھگڑے میں دخل دے گا اور نہ دوسرے تاتاری سرداروں کو اس میں شریک ہونے دے گا۔

حاکمِ خجند کے جانے کے بعد تیمور نے قاسم کی خوب خبر لی لیکن ہنس ہنس کر۔ اسے قاسم کی سادہ لوحی پر ہنسی آتی تھی۔ تیمور نے کہا:

"قاسم! محبت نے تمہاری عقل پر پردہ ڈال دیا ہے۔ تمہیں دوست دشمن کی بھی تمیز نہیں رہی۔"

قاسم نے آہ بھری۔ بولا:

"سردار۔ میری محبت کا تو جنازہ نکل گیا ہے۔ حاجی نے شہزوری کو رخصت کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے:

"پھر صبر کرو۔ کوئی اور شہزوری ڈھونڈ لو۔" تیمور نے ہنس کر کہا۔

تیمور کے متعلق مورخوں کا بیان ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کبھی کسی مسخرے کی بات پر نہیں ہنسا اور نہ کبھی کھلکھلا کر مسکرایا۔ قاسم شاید وہ پہلا شخص تھا جسے تیمور چھیڑتا تھا۔ دراصل اسے قاسم سے محبت تھی۔ اس کی محبت کی وجہ ایک تو قاسم کی سادہ لوحی اور دوسرے اس کی شجاعت تھی۔ قاسم میدانِ جنگ میں صرف جوش سے کام لیتا۔ عقل کو وہ بالائے طاق رکھ دیتا تھا۔ تیمور کو اس کی یہ ادا بھی پسند تھی۔

قاسم نے ایک اور ٹھنڈی سانس لی۔ بولا:

"شہزوری کو تو خیر میں نہیں چھوڑ سکتا۔ میں نے اعلان کر دیا ہے کہ شہزوری کو میدانِ جنگ میں قتل کر کے حاصل کروں گا۔"

"یہ اعلان کس کے سامنے کیا تھا قاسم؟" تیمور نے دلچسپی سے پوچھا۔

"حاجی برلاس اور اس کے لشکریوں کے سامنے۔" قاسم نے سینہ تان کر جواب دیا۔

تیمور سنجیدہ ہو گیا۔ بولا:

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"قاسم۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ دل سے نکلی ہوئی بات خدا ضرور پوری کرتا ہے۔ میدانِ جنگ اور وقت بھی لڑائی چھڑ سکتی ہے۔ لیکن ایک بات کا خطرہ ضرور ہے۔"

"کس بات کا خطرہ؟" قاسم پریشان ہو گیا۔

"یہی کہ اگر حاجی نے شہزوری کی کہیں اور شادی کر دی تو تم کیا کرو گے؟" تیمور نے پوچھا۔

"یہ ہرگز نہیں ہو سکتا سردار.....!"

"کیوں۔ کوئی خاص وجہ؟"

"آپا جانی میری طرف ہیں۔"

قاسم نے بتانا شروع کیا:

"انہوں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ شہزوری تیری ہے۔ تجھی کو ملے گی۔"

آپا جانی کے نام پر تیمور کے چہرے پر ناگواری کے آثار پیدا ہو گئے۔ بے دلی سے بولا:

"قاسم۔ آپا جانی کی میں بھی بہت عزت کرتا تھا لیکن انہوں نے میرے ساتھ ناانصافی کی۔"

"آپ ٹھیک فرما رہے ہیں سردار۔"

قاسم کو آپا جانی کا ذکر چھیڑ کر افسوس ہوا۔ اس نے وضاحت کی:

"آپا جانی نے آپ کے ساتھ ناانصافی کی ہے اس کا احساس انہیں خود بھی ہے۔ وہ اعلانیہ کہ انہوں نے تیمور کا حق مار کر حاجی براس کو دیا ہے۔"

"اس سے کیا فائدہ؟"

تیمور چڑ سا گیا۔ بولا:

"آپا جانی، حاجی کی طرف داری سے ہاتھ کیوں نہیں اٹھا لیتیں۔"

"یہی تو ان میں سب سے بڑا عیب ہے۔"

قاسم نے یوں کہا جیسے اسے خود بھی آپا جانی پر غصہ ہو:

"ان کے منہ سے نکلی ہوئی بات پتھر کی لکیر بن جاتی ہے۔ وہ کہتی ہیں جس کی میں نے طرف ہاتھ نہیں اٹھاؤں گی۔"

تیمور کو جوش آ گیا۔ اس نے کہا:

"قاسم۔ میں اس پتھر ہی کو توڑ کر چکنا چور کر دوں گا جس پر آپا جانی کی باتوں کی لکیریں پڑتی ہیں۔" تیمور نے غصہ سے اپنی دونوں مٹھیاں بند کر لیں۔

○

قاسم کے آنے سے شہر کی دو شہزادیوں میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ شہزوری اور قاسم کی داستانِ محبت شہرِ سبز کی حسیناؤں کا موضوع بن گیا۔ انہیں معلوم تھا کہ تیمور اور حاجی براس کے جھگڑے نے دو محبت بھرے دلوں کو جدا کر دیا ہے۔ ایک شہرِ سبز میں اور دوسرا خیمہ گاہ میں آتشِ فراق میں جل رہا ہے۔ کنواری لڑکیوں میں تجسس کا مادہ کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ ہر لڑکی اس فکر میں رہتی تھی کہ قاسم سے ملے اور دیکھے کہ ایک عاشق اپنے محبوب سے جدا ہونے کے بعد اپنے دن رات کیسے بسر کرتا ہے۔ اس کا دن کن مشاغل میں گزرتا ہے اور رات کا کرب ناک سناٹا اس پر کیا قیامت ڈھاتا ہے؟

قاسم، تیمور کی حویلی کے باہر قصرِ سفید کے ایک شکستہ کمرے میں مقیم تھا۔ قصرِ سفید ایرانیوں کا ایک مشہور قلعہ تھا اور امتدادِ زمانہ سے بہت شکستہ ہو گیا تھا۔ پھر بھی اس کے وسیع و عریض کمروں اور راہداریوں سے پرانی شاہانہ شوکت کا شکوہ ٹپکتا تھا۔

تیمور کی حویلی میں جانے والی خواتین اس کمرے کے سامنے سے گزرتی تھیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کوئی دوشیزہ کمرے کے باہر جان بوجھ کر قاسم کے کمرے میں داخل ہو جاتی اور پھر معذرت کر کے واپس چلی جاتی۔ قاسم پہلے تو اسے محض ایک اتفاق ہی سمجھتا رہا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ یہ اتفاق نہیں ہے۔ لڑکیاں قصداً اس کے کمرے میں آتی ہیں۔ اس نے بعض لڑکیوں کے لبوں پر ابھرتے ہوئے سوال بھی دیکھے تھے جیسے وہ اس سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔ ایک لڑکی تو دن میں ایک بار ضرور اس کے کمرے میں داخل ہوتی۔ کچھ دیر اسے خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہتی اور پھر بغیر معذرت کیے واپس چلی جاتی۔

ان لڑکیوں کے اس طرح آنے جانے اور اس کے آرام میں خلل انداز ہونے کا وہ برا تو نہ مناتا لیکن انہیں دیکھ کر اسے فوراً اپنی شہزوری یاد آ جاتی اور اسے اپنی محرومی کا بری طرح احساس ہوتا۔

قاسم کو شہرِ سبز میں رہتے ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ اسے شہزوری کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کی خیریت معلوم کرنے کے لیے قاسم کا دل ہر وقت بے چین رہتا۔ حاجی برلاس کے کچھ آدمی تیمور کے پاس آتے تھے لیکن قاسم نے ان سے کوئی گفتگو نہ کی۔ وہ ان سے گفتگو کرکے اس کے بارے میں تو وہ ان سے پوچھ نہ سکتا تھا۔

قاسم کا دل ایک دن بہت بے چین ہوا۔ اس نے اپنی خدمت پر مامور ملازم سے پوچھا:

"تمہارا کوئی عزیز حاجی برلاس کی خیمہ گاہ میں بھی رہتا ہے؟"

"کیوں نہیں صاحب۔"

ملازم نے خوش اخلاقی سے جواب دیا:

"میرا سگا بھائی حاجی برلاس کے باورچی خانے میں کام کرتا ہے۔"

قاسم نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن بات زبان پر آتے آتے رہ گئی۔ اسے اپنی عزت کا خیال تھا۔ اپنی عزت سے زیادہ اسے شہزوری کا خیال تھا۔

ملازم نے قاسم کو خاموش دیکھ کر کہا:

"صاحب جی۔ کسی کو پیغام بھیجنا ہو تو مجھے بتا دیجیے۔ ہمارے آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں۔"

"پیغام تو ضرور بھیجنا ہے لیکن . . . ." قاسم کہتے کہتے رک گیا۔

ملازم جلدی سے بولا:

"صاحب۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ آپ کا پیغام لے کر میں خود جاؤں گا اور جواب بھی لاؤں گا۔ خدمت کا موقع دیں۔"

قاسم نے افسردگی سے کہا:

"تمہارا شکریہ۔ میں جسے پیغام بھیجنا چاہتا ہوں وہاں تک تم پہنچ نہیں سکتے۔"

قاسم ملازم کو کوئی تفصیل نہ بتا سکا۔ پھر دروازہ پر آہٹ سی ہوئی۔ وہ بولا:

"دیکھنا دروازے پر کون ہے؟"

ملازم دروازے تک گیا۔ واپس آکر منہ بناتے ہوئے کہا:

"ان لڑکیوں کو اتنی بڑی حویلی نہیں دکھائی دیتی۔ روز ایک نہ ایک آپ کے کمرے میں گھس آتی ہے۔ اس وقت بھی کوئی لڑکی بھولنے سے ادھر آ گئی تھی۔"

قاسم بہت افسردہ تھا لیکن اسے ملازم کے بھولے پن پر ہنسی آ گئی۔ اس کا دل چاہا کہ ملازم کو بتائے لڑکیاں بھول کر نہیں قصداً ادھر آتی ہیں۔

قاسم بانکا خوبصورت جوان تھا۔ اسے اپنی وجاہت کا خود بھی اندازہ تھا۔ ملازم اسے ذرا دیر گھورتا رہا پھر کمرے سے نکل گیا۔

قاسم آنکھیں بند کرکے لیٹ گیا اور تصور میں شہزوری سے باتیں کرنے لگا۔ قاسم کا تصور جلد ہی ٹوٹ گیا۔ دروازہ کے باہر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ قاسم نے آنکھیں کھول دیں۔ ملازم جا چکا تھا۔ کوئی اٹھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ ایک لڑکی لجاتی مگر احتیاط سے قدم اٹھاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ قاسم کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔

لڑکی گھبرا گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو حیرت اور تجسس سے دیکھا۔ لڑکی بڑی جرأتمند تھی۔ بے بولی:

"قاسم! مجھ پر اعتبار کر سکو تو میں تمہارا پیغام شہزوری تک لے جا سکتی ہوں۔"

قاسم کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں:

کون ہے یہ؟

شہزوری کو کیسے جانتی ہے؟

پیغام کیوں لے جانے کو کہتی ہے؟

سوالات کا قاسم کے دماغ میں ایک دم ہجوم ہو گیا۔

"تم کون ہو؟" قاسم نے ہمت کرکے پوچھا۔

"میں اسی شہر میں رہتی ہوں۔ سردار تیمور کی ادنیٰ کنیز ہوں۔" لڑکی نے اتنی تیزی سے جواب دیا جیسے یہ جواب رٹ رکھا تھا۔

قاسم کی دلچسپی بڑھی۔ پوچھا:

"کیا نام ہے؟"

"پروشیا!" لڑکی بے جھجک بولی۔

"شہزوری کو کیسے جانتی ہو۔ کبھی دیکھا ہے اسے؟" قاسم نے سوال کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پروشیا مسکرائی۔ جواب دیا:

"حاجی برلاس کی بیٹی کو کون نہیں جانتا۔ آجکل تمہارے اور شہزوری کے قصے ہر لڑکی کی زبان پر ہیں۔ وہ تمہاری منگیتر ہے نا؟"

قاسم کی حیرت میں اضافہ ہو گیا۔ پروشیا کو ہر بات کی خبر تھی۔ قاسم نے کریدا:

"تمہارا لباس اور گفتگو کنیزوں جیسی نہیں۔ پھر تم خود کو کنیز کیوں کہتی ہو؟"

پروشیا کے چہرے پر جوانی اور حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ وہ بڑے دلفریب انداز میں مسکرا دلفریب انداز کہ اگر قاسم نے شہزوری کو نہ دیکھا ہوتا تو اس مسکراہٹ پر بھی لوٹ ہو جاتا۔

پروشیا میں بلا کی محبوبیت تھی۔ لانبا گندمی سڈول سراپا، گہری چمکتی آنکھیں، جوانی کی ابھار پروشیا اگر حسن کی مکمل پیکر نہ تھی تب بھی اس میں اتنی جاذبیت ضرور موجود تھی کہ وہ اپنے خالق سحر زدہ کر دے۔

پروشیا سحر انگیز لہجہ میں بولی:

"قاسم۔ عقلمند آدمی آم کھاتے ہیں۔ پیڑ نہیں گنا کرتے۔ اگر شہزوری کو پیغام بھیجنا ہوں۔ مجھے فخر ہوگا کہ میں آپ کے کسی کام آسکی۔"

قاسم ذرا دیر کے لیے تو پروشیا کے سحر سے واقعی متاثر ہو گیا۔ پروشیا کی شخصیت

قاسم نے ایک اور سوال کیا:

"ٹھیک ہے۔ میں نہیں پوچھتا کہ تم کون ہو لیکن مجھے یہ ضرور معلوم ہونا چاہیے کہ تم مجھ کرنا چاہتی ہو جبکہ تمہیں معلوم ہے کہ میں شہزوری کے سوا۔۔۔۔"

"قاسم!"

پروشیا سخت لہجہ میں بولی:

"آپ مجھے غلط سمجھنے کی کوشش نہ کریں۔ میں کیا، سب ہی جانتے ہیں آپ شہزوری آپ کی شادی اسی کے ساتھ ہوگی۔ پھر آپ مجھ پر شبہ کیوں کر رہے ہیں۔"

قاسم گھبرا گیا۔ شرمندہ ہو گیا۔ لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں بولا:

"پروشیا۔ مجھے معاف کرنا۔ میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ تم جو احسان کر رہی ہو!

گا: کیا اس کے بدلہ میں، میں تمہاری کوئی خدمت کر سکوں گا۔"

پروشیا کا موڈ ٹھیک ہو گیا۔ بولی:

"میں نہ احسان کر رہی ہوں نہ اس کا معاوضہ چاہتی ہوں۔ بعض کام بغیر معاوضے کے بھی کیے جاتے ہیں وئی کام خود کرنے کو دل چاہے تو اسے احسان کیسے کہہ سکتے ہیں۔ بس یہ بھی ایک ویسا ہی کام ہوگا۔"

قاسم کو بری طرح زچ کر دیا۔

قاسم بے بسی سے بولا:

"پروشیا تم اس قدر عقلمند ہو کہ میرے پاس تمہاری باتوں کا کوئی جواب نہیں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ خدا ایسی قدردان گھر میں پہنچائے۔"

پروشیا کی شوخی، سنجیدگی میں بدل گئی۔ اس کی آنکھیں چمک آئیں لیکن اس نے کمالِ ضبط سے کام پر بولی:

"آپ میری فکر نہ کریں۔ گھر کوئی برا نہیں ہوتا۔ یہ تو رہنے والے پر منحصر ہے چاہے جنت بنائے یا جہنم۔"

پروشیا نے اپنے دل سے اٹھتی ہوئی ہوک کو بڑے بوڑھوں کی عام گفتگو میں ڈھال دیا۔

قاسم کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ بات کس طرح آگے بڑھائے۔ شہزوری کا خیال اس پر یوں مسلط رہتا تھا اور اب بھی اسی کا ہو رہا تھا اور ایک بے غرض ہستی اس کی مدد پر آمادہ تھی۔

پروشیا خود ہی بولی:

"میرا زیادہ ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔ اگر مجھ پر اعتبار کر سکتے ہو تو شہزوری کو پیغام دو۔ میں رازداری کی قسم کھاؤں۔"

قاسم نے اٹکتے ہوئے کہا:

"تم جانتی ہو پروشیا۔ مجھے ایک ہفتہ سے زیادہ ہو گیا شہزوری کی کوئی خبر نہیں ملی۔ میں جس حال میں چھوڑ کر چلا تھا ممکن ہے حاجی برلاس نے اس پر سختی کی ہو۔ یہی باتیں معلوم کرنا تھیں۔ میں جس حال میں ہوں آپ دیکھ رہی ہو۔ میں نے شہزوری کو حاصل کرنے کا مردوں کی طرح اعلان کیا ہے۔ زندگی ہے تو اسے ضرور حاصل کروں گا۔ میری زندگی صرف اس کے لیے ہے۔ میرا دل اسی کے گیت گاتا ہے۔"

قاسم ایک بار شروع ہوا تو پھر اس نے داستانِ محبت کے دفتر کھول دیے۔ دل میں لگی ہوئی آگ کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

الفاظ کا روپ دینے لگا۔ اسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ وہ یہ باتیں ایک حسین دوشیزہ کے سامنے کہہ رہا ہے حسینہ کے سامنے جو نہ معلوم کب سے اس کی خاموش پرستش کر رہی ہے۔

قاسم جب پہلے یہاں آیا تھا تو اس وقت بھی پروشیا اس کے گرد پروانے کی طرح منڈلائی تھی لیکن نہ اس نے کبھی قاسم سے اپنے دل کی بات کی اور نہ قاسم کو اس کا احساس ہی ہونے دیا۔ اس کی محبت آہستہ آہستہ پروان چڑھنے لگی۔

پروشیا کو معلوم تھا کہ قاسم اور شہزوری ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ ان کی منگنی ہو چکی ہے۔ قاسم صرف شہزوری کا ہے۔ اس کے باوجود وہ قاسم سے محبت کرتی تھی۔ بے لوث اور بے غرض محبت۔ محبت آج اسے قاسم کے کمرے تک کھینچ لائی تھی۔

پروشیا نے قاسم کی تمام باتیں بڑے صبر و تحمل سے سنیں۔ قاسم اپنی رو میں کتنی ہی بے کہہ گیا تھا اور ایسی باتیں بھی اس کی زبان سے نکل گئی تھیں کہ اگر اسے ذرا بھی شبہ ہو جاتا کہ پروشیا طرف مائل ہے تو ہرگز نہ کہتا۔

قاسم نے داستان محبت ختم کی تو پروشیا بولی:

"پیغام دو باتوں پر مشتمل ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ تمہارے آنے کے بعد شہزوری پر کیا گزری یہ کہ تم شہزوری کو یقین دلانا چاہتے ہو کہ تمہارے دل میں صرف اسی کی محبت ہے۔"

قاسم پروشیا کی بے باکی پر ششدر رہ گیا۔ اس نے بے خودی کے عالم میں بھی احتیاط چھوڑا تھا لیکن پروشیا نے بڑی بے باکی اور صفائی سے اس کی تمام بُرد کو دو جملوں میں بیان کر دیا۔

قاسم نے کہا:

"بالکل ٹھیک ہے پروشیا۔ میرا یہی پیغام ہے۔"

"قاسم!"

پروشیا نے اسے مخاطب کیا:

"خیمہ گاہ سے بچ کے نکل آنے کے بعد شہزوری کی ماں اور حاجی برلاس میں بڑی زبردست حاجی برلاس کو اس وقت فوجی مدد کی سخت ضرورت ہے۔ اس نے سوری قبیلے کی مدد حاصل کرنے کے بیٹے سے شہزوری کا رشتہ کرنے کا فیصلہ کیا لیکن شہزوری کی ماں نے صاف انکار کر دیا۔

معاملہ آپا جانی کے حضور پیش ہوا۔ آپا جانی نے پورا معاملہ سنا۔ پھر شہزوری کو بلا کر اس سے تنہائی میں گفتگو کی اور فیصلہ تمہارے حق میں کر دیا۔"

قاسم پھٹی پھٹی نظروں سے پروشیا کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ قاسم کو حیرانی ہوئی کہ اگر پروشیا کی باتیں صحیح ہیں تو اسے ان باتوں کا علم کیسے ہوا۔ وہ تو اپنے آپ کو شہر سبز کی رہنے والی بتاتی ہے مگر یہ باتیں برلاس خاندان کی عزت سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی خبر پروشیا کو کیسے ہوئی؟

قاسم نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں پوچھا:

"پروشیا۔ تم نے جو باتیں بتائیں وہ یقیناً درست ہوں گی لیکن خدا کے لیے مجھے بتاؤ کہ تم کون ہو؟ میں میرے اور شہزوری کے معاملات سے اس قدر دلچسپی کیوں ہے؟"

پروشیا نے ہنسی کے پھول بکھیرتے ہوئے کہا:

"اس کا جواب بھی وہی ہے۔ آم کھاؤ پیڑ مت گنو۔ اگر مجھ پر اعتبار نہیں تو میں جاتی ہوں۔" پروشیا نے کے لیے تیار ہو گئی۔

"ٹھہرو پروشیا۔"

قاسم نے اسے روکا:

"مجھے تم سے بہتر پیغامبر نہیں مل سکتا۔ تم میرے اور شہزوری کے حالات سے پوری طرح واقف ہو اور کوئی شہزوری سے وہ کچھ نہ کہہ سکوں گا جو تم بیان کر دو گی۔ پروشیا! ایک بات کا ضرور خیال رکھنا راستے میں ملاقات میں کوئی دقت ہو تو خود کو خطرہ میں ہرگز نہ ڈالنا۔"

بے فکر رہو قاسم۔ اتنی سمجھ مجھ میں ہے۔"

پروشیا ایک بھرپور نظر قاسم پر ڈالتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"اب کب ملاقات ہو گی پروشیا۔"

قاسم کہتے کہتے رکا۔ اسے خیال ہوا کہ شاید اس نے غلط جملہ استعمال کیا ہے:

"میرا مطلب ہے تم کب جا رہی ہو اور کب تک واپسی ہو گی؟"

پروشیا کو قاسم کی بوکھلاہٹ کا احساس تو ضرور ہوا لیکن اس نے اس کا اظہار نہ کیا، دروازہ کے پاس رکی اور بولی:

"کچھ عورتیں آج خیمہ گاہ جا رہی ہیں۔ میں ان کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ اور انشاء اللہ واپسی پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جلد ملاقات ہوگی۔"

○

پروشیا برلاس قبیلہ ہی کی دوشیزہ تھی۔ اس کا قیام بھی قصرِ سفید کے اندر تھا۔ برلاس قبیلہ برلاس اور تیمور کے اختلاف کی وجہ سے دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ جو لوگ تیمور کے طرف دار تھے شہرِ سبز سے باہر رہتے تھے وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ شہرِ سبز میں آ گئے تھے۔ ان سب کا سردار تیمور پر تھا۔

پروشیا کی قاسم اور تیمور سے دور کی عزیز داری تھی۔ یہی عزیز داری اس کی حاجی برلاس سے بڑی سمجھ دار تھی۔ تاتاری دوشیزاؤں کی طرح اس نے بھی تیر اندازی اور شمشیر زنی میں مہارت حاصل کی تھی ابھی تک اسے ان فنون کے جوہر دکھانے کا موقع نہ ملا تھا۔

خیمہ گاہ میں صرف شہزوری کے خیمہ پر پہرہ تھا۔ حاجی برلاس کو قاسم کی طرف سے خطرہ تھا۔ قاسم جوان تھا۔ جب اسے غصہ آتا تو پچاس پچاس جوانوں کے مقابلے پر اکیلا نکل کھڑا ہوتا۔ دو چار جوان تو اس کے مقابل آنے سے کتراتے تھے۔ حاجی برلاس نے اسی خطرہ کے پیشِ نظر شہزوری کے خیمے کے گرد پہرہ تھا۔ پہرہ صرف قاسم کے لیے تھا ورنہ شہزوری خیمہ گاہ میں ایک خیمہ سے دوسرے خیمہ میں آزادی سے عورتیں اس سے ملنے جلنے بھی آیا کرتی تھیں۔

پروشیا کو شہزوری سے ملنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ وہ شہزوری کے خیمے میں داخل ہوئی سر جھکائے کسی خیال میں غرق تھی۔

پروشیا، شہزوری کی طرف بڑھتے ہوئے بولی:

"مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے پاس بے وقت آئی ہوں۔"

شہزوری کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ایک اجنبی لڑکی کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ کچھ پریشان

پروشیا، شہزوری کے قریب پہنچ کر بولی:

"مجھے اس بات کا اور زیادہ افسوس ہے کہ میرے آنے سے آپ کے سہرے خواب کا تانا بانا

شہزوری نے اخلاق کا مظاہرہ کیا:

"تشریف رکھیے۔ آپ کے آنے کی مجھے خوشی ہوئی۔ ہم اس سے پہلے شاید نہیں ملے لیکن آپ کی بے تکلفی دونوں کو جلد ہی قریب لا سکتی ہے۔"

پروشیا بیٹھ گئی۔ اسی شوخی سے بولی:

"اس وقت تو میں بہت دور سے آ رہی ہوں لیکن میں جہاں سے آ رہی ہوں وہ مقام آپ کے تصور سے زیادہ دور نہیں۔"

شہزوری کو یہ لڑکی بہت اچھی لگی لیکن وہ پروشیا کے لطیف اشارے کو نہ سمجھ سکی۔ بولی:

"اپنا نام بتائیے اور یہ بھی بتائیے کہ آپ کہاں سے آئی ہیں؟"

پروشیا نے ادھر اُدھر دیکھا۔ خیمہ بالکل خالی تھا پھر بھی آہستہ سے بولی:

"اچھا ہوا آپ نے نام اور مقام ہی پوچھا۔ اگر آپ اس کے ساتھ کام بھی پوچھ بیٹھتیں تو ضرور پریشانی ہو جاتی۔"

"آپ کی باتیں بہت دلچسپ ہیں۔" شہزوری کو کوئی جواب نہ سوجھا تو بس یونہی کہہ بیٹھی۔

"میرا نام پروشیا ہے۔"

اس نے بتایا:

"اس وقت اس مقام سے آ رہی ہوں جس کا خواب آپ کھلی آنکھوں سے میرے آنے سے پہلے دیکھ رہی تھیں۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی!" شہزوری نے حیران نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ شہزوری ہیں نا؟" پروشیا نے ہنس کر پوچھا۔

"اس میں کیا شک ہے؟"

شہزوری نے اقرار کیا: "حاجی برلاس میرے والد ہیں۔"

پروشیا نے کہا:

"شہزوری۔ آپ نہ حیران ہوں نہ پریشان۔ میں اسی شہرِ سبز اور قصرِ سفید سے آ رہی ہوں جس کا تصور آپ میرے آنے کے وقت اپنی آنکھوں میں لیے بیٹھی تھیں۔ قصرِ سفید میں بھی آپ جیسی ایک بے چین روح ہے جو دن کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خواب دیکھتی ہے اور رات کو تارے گنتی ہے۔ اس کا ایک اہم پیغام تیرے پاس ہے جو آپ سے کہے بغیر آپ سننا گوارا کریں۔"

پروشیا نے ایک ہی دفعہ پوری داستان بیان کر دی۔

شہزوری اتنی نادان نہ تھی کہ پروشیا کی باتیں نہ سمجھتی۔ کچھ سوچتے ہوئے بولی:

"پروشیا۔ میں نہیں جانتی تم کون ہو لیکن یہ ظاہر ہے کہ تم قاسم کی ہمدرد ہو۔ قاسم نے تم پر اعتماد کیا ہے۔ میرا فرض ہے کہ میں بھی تم پر اعتماد کروں۔ اب ہمیں غیریت کا پردہ درمیان سے اٹھا کے دوستوں کی طرح گفتگو کرنا چاہیے۔ میں نے آپ کو تم میں بدل دیا ہے۔ اس تکلف کو تم بھی ختم کر دو۔"

"ٹھیک ہے شہزوری۔"

پروشیا نے کہا:

"ہمیں اپنی باتیں جلد ختم کرنا چاہییں۔ ابھی خیمہ خالی ہے ممکن ہے کہ کوئی آ جائے اور ہمیں گفتگو کا موقع نہ مل سکے۔ قاسم تمہارے لیے بہت بے چین ہے۔ اسے پتہ نہیں کہ اس کے خیمہ گاہ سے جانے کے بعد کیا گزری۔ یہ بات تو میں نے اسے بتا دی ہے۔ اب قاسم کا یہ پیغام ہے کہ وہ تمہارا ہے اور ہمیشہ تمہارا ہی رہے گا۔ ظاہر ہے کہ وہ تمہارا جواب چاہتا ہے۔ اگر تم بھی ثابت قدم رہو تو مشکل خود بخود آسان ہو سکتی ہے۔"

شہزوری نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا:

"عورت، عورت کے دل سے واقف ہوتی ہے۔ پس اس کے سوال کا جواب تم جو مناسب سمجھتا وہ دے۔ میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ وہ جہاں رہے خوش رہے۔ محبت ایک جگہ رہنے ہی کا تو نام نہیں۔ ہم دور رہ کر بھی محبت کر سکتے ہیں۔ جب آپا جانی میری طرف دار ہیں تو میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

پروشیا کو جس بات کا خطرہ تھا وہی ہوا۔ شہزوری کی دو بے تکلف سہیلیاں ہڑبڑا کے لگائی خیمہ میں آ گئیں۔ پروشیا کا اب وہاں بیٹھنا بے کار تھا۔ اس نے شہزوری سے اجازت لی اور خاموشی سے خیمہ سے باہر آ گئی۔

○

پروشیا دوسرے دن شام کو قصرِ سفید پہنچ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ قاسم بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ موقع پاتے ہی قاسم کے کمرے میں پہنچ گئی لیکن قاسم سے ملاقات نہ ہو سکی۔ تیمور نے اپنے تمام سرداروں کو حویلی میں صلاح و مشورے کے لیے بلایا تھا۔ قاسم وہیں گیا تھا۔

تیسرے دن قاسم کی ملاقات ہوئی۔ قاسم نے پروشیا کو دیکھا تو کچھ پوچھنے کے بجائے مجسم سوال بن گیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ پروشیا نے اس کی بے چینی محسوس کر لی، بولی:

"خوش قسمت ہے وہ مرد جس سے کوئی عورت اتنی ہی محبت کرے جتنی مرد کو اس سے ہو۔ شہزوری جہاں رہے گا، میں اسی حال میں ہے جس حال میں تم یہاں ہو۔ اس کی زبان پر تمہارے نام کے سوا کسی اور کا نام نہ آیا ہے اور نہ آئے گا۔ تمہارے پیغام کا یہی جواب ہے۔"

قاسم نے اطمینان کا سانس لیا۔ بولا:

"پروشیا، تم کس قدر نیکدل ہو۔ میں تمہارا احسان عمر بھر نہ بھول سکوں گا۔"

کاش، قاسم، پروشیا کے دل کا حال جان سکتا۔ پروشیا نے اپنے جذبات دباتے ہوئے کہا:

"قاسم! بار بار احسان کا نام لے کر مجھے شرمندہ نہ کرو۔ میں نے جو کچھ کیا وہ میرا فرض تھا۔"

پروشیا تھوڑی دیر قاسم کے پاس بیٹھنے کے بعد واپس چلی گئی۔ اگلے تین دن پروشیا بالکل غائب رہی۔ قاسم نے پہلے تو اس کا انتظار کیا پھر یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ پروشیا کسی کام سے شہرِ سبز سے باہر گئی ہوگی۔

قاسم کا یہ خیال درست ہی نکلا۔ پروشیا، حاجی برلاس کی خیمہ گاہ میں گئی تھی۔ واپس آئی تو اپنے ساتھ ایسی اہم خبر لائی جسے سن کر قاسم گھبرا گیا۔

"آپا جانی، تیمور سے لڑنے شہرِ سبز تشریف لا رہی ہیں۔"

اس خبر سے قاسم کو تو گھبراہٹ ہونی ہی تھی۔ اس نے جب یہ خبر تیمور کو پہنچائی تو اس کو بھی ذرا دیر کے لیے پسینہ آ گیا۔

تاتاریوں اور خصوصیت سے برلاس قبیلہ پر آپا جانی کا جو اثر تھا اس سے تیمور پوری طرح واقف تھا۔ آپا جانی لڑنے کا مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ وہ تیمور کو حاجی برلاس کے ساتھ صلح صفائی پر آمادہ کریں اور اگر تیمور انکار کرے تو شہرِ سبز کے لوگوں کو تیمور کے خلاف بھڑکا دیں۔

تیمور نہ تو آپا جانی کو داخلہ شہرِ سبز میں بند کر سکتا تھا اور نہ ان کی زبان پر پہرہ بٹھا سکتا تھا۔ تیمور کو اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نئی مصیبت نے سخت الجھن میں مبتلا کر دیا۔

کہتے ہیں کہ تیمور کو شطرنج کھیلنے کا شوق تھا۔ جنگ بھی اس کی نظر میں شطرنج ہی کا ایک کھیل تھا۔ وہ فوجی حکمتِ عملی کی بنیاد شطرنج کے مہروں پر رکھتا۔ دفاع اور پیش قدمی پر غور کرتا اور حسبِ ضرورت فوج کو ترتیب دیتا۔ آپا جانی کی آمد نے اسے مات سے دوچار کر دیا۔

اس نے اپنے بچاؤ کی تدبیروں پر غور کیا۔ تیمور کے مشیرِ خاص امیر مبشر دمولانا زین الدین شہرسبز میں موجود تھے۔ تیمور ہر اہم موقع پر ان سے مشورہ کیا کرتا۔ آپا جانی کا توڑ کرنے کے لیے بھی وہ ان کے پاس گیا۔ تمام رات ان سے گفتگو ہوتی رہی۔

مولانا دین دار آدمی تھے لیکن دنیاداری سے اتنے دور بھی نہ تھے کہ اچھے بُرے کی تمیز نہ کر سکتے۔ تاتاریوں پر آپا جانی کے اثر و رسوخ سے وہ بھی واقف تھے۔

تیمور نے وہ رات مولانا کے پاس گزاری۔ صبح نمازِ فجر کے بعد جب حویلی واپس آیا تو بہت مطمئن تھا۔ دے رہا تھا رات کو جو حکمتِ عملی ترتیب دی گئی اس سے تیمور کو پچاس فیصد کامیابی کی امید تھی۔ اس نے شاندار خیمہ شہرِ سبز کی سرحد پر بھجوا دیا اور شام ہوتے ہوتے خود بھی حویلی چھوڑ کر مع سرداروں کے سرحد پہنچ گیا۔

تیمور کا بھیجا ہوا شاندار خیمہ سرحد سے کچھ اور آگے ایک بلند مقام پر نصب کیا گیا۔ اسے بڑے سے سجایا گیا۔ یہ خیمہ اس نے آپا جانی کے لیے لگایا تھا۔ آپا جانی کی آمد کو وہ روک تو نہ سکتا تھا لیکن اس نے اپنی حکمتِ عملی سے ان کو شہرِ سبز میں داخل ہونے سے روک دیا تھا۔ اس نے آپا جانی کے شاندار استقبال کی تیاری کی۔ وہ آپا جانی کی آمد سے ان کے ساتھ آنے والوں پر یہ ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا کہ وہ آپا جانی کی خائف ہے یا اُسے ان کی آمد ناگوار گزری ہے۔ اور وہ اس مقصد میں کامیاب بھی ہوا۔

آپا جانی شہرِ سبز آئیں اور بڑی شان سے آئیں۔

حاجی برلاس کے علاوہ اس کے گروہ کے تمام سردار آپا جانی کے ساتھ تھے۔ حاجی برلاس کی خیمہ

شہرِ سبز تک آپا جانی کے عقیدتمندوں کا ہجوم رہا۔ کوئی ان کے ہاتھ پیر چومتا۔ کوئی زر و جواہر نچھاور کرتا۔ آپا جانی ایک کالی گھوڑا گاڑی میں سفر کر رہی تھیں۔ دھوپ سے بچاؤ کے لیے ان کے سر پر زرنگار چھتر لگا تھا۔ گاڑی کے چاروں طرف تاتاری سوار چل رہے تھے۔ آپا جانی ہاتھ کے اشارے سے عقیدتمندوں کے نعروں کا جواب دے رہی تھیں۔ یہ شاہانہ سواری آہستہ آہستہ شہرِ سبز کی طرف بڑھتی رہی۔

تیمور نے شہرِ سبز سے حاجی برلاس کی خیمہ گاہ تک جاسوس سواروں کا جال بچھا دیا تھا۔ اسے لمحہ لمحہ کی رپورٹ مل رہی تھیں۔

جب آپا جانی کا جلوس سرحد سے دو فرسنگ کے فاصلہ پر رہ گیا تو تیمور نے اپنے گھوڑے کو ایڑ دی۔ اہم اور اس کے تمام سردار تیمور کے جلو میں چلے آئے۔ ایک فرسنگ آگے پہنچ کر تیمور نے آپا جانی کا استقبال کیا۔ ہوا میں تیر چھوڑے گئے۔

تیمور گھوڑے سے اترا۔ آپا جانی کی گاڑی کے پاس پہنچا اور بڑی عقیدت سے ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ آپا جانی نے مسکرا کر تیمور کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی۔ تیمور گھوڑے پر سوار ہو کر جلوس کے آگے آگے چلنے لگا۔ وہ ایک رہبر کے فرائض ادا کر رہا تھا۔

اس نے سواری کا رخ اس طرف موڑ دیا جہاں آپا جانی کے لیے شاندار خیمہ نصب کیا گیا تھا۔ ان کے ساتھ آنے والوں کے لیے چھوٹے خیمے قریب ہی لگائے گئے تھے۔

خیمے کے سامنے بڑے احترام سے آپا جانی کو اتارا گیا۔ بڑی بی کمر جھکائے لکڑی ٹیکتی گاڑی سے اتریں۔ ان کے ہاتھ میں لکڑی تھی لیکن اس پر چاندی کا پترا چڑھا تھا اور گنگا جمنی کام کیا ہوا تھا۔ خیمہ کی شان و شوکت دیکھ کر آپا جانی بہت خوش ہوئیں۔ شہرِ سبز کی ایک درجن سے زیادہ معزز تاتاری خواتین نے ان کا استقبال کیا۔ اس استقبال کا انتظام پروشیا کے ہاتھ میں تھا۔

تیمور آپا جانی کو خیمہ کے دروازے تک پہنچا کر واپس ہو گیا۔ نمانوں کو ان کے خیموں میں پہنچا دیا گیا۔ آپا جانی کے ساتھ آنے والے تاتاری سردار دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ شہرِ سبز میں اپنے دوستوں اور عزیزوں سے مل سکیں گے اور انہیں اپنا طرف دار بنانے کی کوشش کریں گے۔ حاجی برلاس نے اسی لیے اپنے تمام سرداروں کو آپا جانی کے ہمراہ بھیج دیا تھا لیکن تیمور نے انہیں بڑی چالاکی سے شہرِ سبز کی سرحد پر ہی روک لیا تھا۔ حاجی برلاس کے سرداروں کو غصہ تو بہت آیا لیکن انہیں تیمور کی ذہانت اور عظمندی کی داد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دینی پڑی۔

مہمانوں کے لیے کھانا پہنے ہی تیار تھا۔ تیمور، آپا جانی کے خیمے میں کئی بار آیا لیکن کھانا ختم ہونے سے پہلے اس نے ان سے گفتگو نہ کی۔

جب کھانا ختم ہوا اور آپا جانی کے ساتھ آنے والے تمام سردار ان کے خیمہ میں جمع ہو گئے تو تیمور سرداروں کے ساتھ وہاں پہنچا۔

یہ بڑی اہم محفل تھی۔ اس میں تیمور کی قسمت کا فیصلہ ہونا تھا۔ تیمور کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر اس وقت ذرا بھی غلطی ہو گئی تو پورا قبیلہ اس کے خلاف ہو جائے گا۔ حاجی برلاس کے آدمیوں کو امید آپا جانی کے سامنے زبان نہ کھول سکے گا لیکن ان کی امیدوں کے برعکس تیمور نے گفتگو میں خود پہل تیمور آپا جانی کے برابر بیٹھا تھا۔ اس نے آپا جانی کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور بولا:

"محترم آپا جانی! آپ نے مجھے مہمانی کا شرف بخشا۔ اس کے لیے میں جتنا بھی فخر کروں کم ہے۔ مجھے خیمہ گاہ میں طلب کرتیں تو بھی میں سر کے بل چل کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ چچا برلاس کی جگہ ہیں۔ میں ان کی بڑی عزت کرتا ہوں لیکن انہوں نے مجھے دعوت میں بلا کر قتل کرنے کی کوشش

تیمور نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ آپا جانی کے چہرے پر نظر پڑیں جامیں اور متانت سے بولا:

"آپا جانی۔ ذرا غور کیجیے۔ آپ کے ساتھ آنے والے تمام سردار میرے مخالف ہیں لیکن انہوں نے انہیں قتل کرا دوں تو کیا آپ مجھے معاف کر دیں گی؟"

"ہرگز نہیں بیٹے!"

آپا جانی کو بولنا پڑا:

"یہ مہمان نوازی کے اصولوں کے خلاف ہے۔"

تیمور نے آغاز ہی میں آپا جانی کو متاثر کر لیا۔ اس نے فوراً ہی دوسرا حملہ کر دیا۔ بولا:

"آپا جانی۔ آپ کو علم ہو گا کہ مغلوں نے ہم پر حملہ کیا۔ تمام تاتاری سردار اپنے قلعوں میں چھپ کے بعض سردار مغلوں کے دوست بن گئے۔ ہمارے چچا حاجی برلاس بھی جنوب میں بھاگ گئے۔ آپ ان سر پوچھیے۔ یہ آپ کو بتائیں گے کہ صرف میں ہی وہ واحد سردار ہوں جس نے اپنا ملک چھوڑنے سے انکار کر مغل شہر سبز تک پہنچ گئے تھے لیکن میں نے شہر سبز سے قدم نہ نکالا اور اپنی تمام دولت مغلوں کے حوالے

پوری سرزمین کو بچا لیا..... آپا جانی! کیا میرے اس کارنامے سے میری قوم کو میرا احسانمند نہ ہونا چاہیے؟"

"بے شک بے شک۔" آپا جانی اس کے سوا اور کیا جواب دے سکتی تھیں۔

تیمور نے خود کو الفاظ کے تیروں سے مسلح کر لیا تھا۔ اس نے کہا:

"آپا جانی۔ میں نے شہر سبز کو بچایا۔ میں نے تاتاری مملکت کو بچایا۔ میں اس وقت تن تنہا مغلوں کے خان اعظم سے ملنے گیا جب تمام سردار قلعوں میں منہ چھپائے بیٹھے تھے۔ میں نے خان اعظم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی اور اپنے واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ آپا جانی۔ کیا میں نے مغلوں سے تاتاری مملکت بچا کر کچھ برا کیا؟"

"شاباش تیمور۔ تو نے بہت بڑا کام کیا۔" آپا جانی اس کی باتوں سے پگھل گئیں۔

تیمور نے مہمان سرداروں کو باری باری دیکھا پھر آپا جانی سے کہا:

"آپا جانی۔ اگر میں نے ملک اور قوم کی اتنی خدمت کی ہے تو کیا میرا یہ حق نہیں کہ میں ان سرداروں سے اپنی خدمت کا صلہ مانگوں؟"

آپا جانی کرسیدھی کرتے ہوئے بولیں:

"تو صلہ کا حق دار ہے تیمور۔"

تیمور نے جھٹ سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہ مہر حکومت نکال کر آپا جانی کے قدموں میں رکھ دی جو سے بلاد شمال کا خان اعظم سمرقند سے واپس جاتے وقت دے گیا تھا۔

تیمور نے بڑے کرب ناک لہجے میں کہا:

"آپا جانی۔ میں نے اپنی تمام دولت، زر و جواہر، قیمتی اشیاء مغلوں کے حوالے کر کے مملکت تاتار کو بچایا۔ تاتاریوں کی عزت کو محفوظ رکھا۔ میں نے اس کا کوئی صلہ نہ مانگا۔ میں نے اپنی دولت کے جانے کا غم نہ کیا۔ انہوں نے ان سے کوئی علاقہ بھی طلب نہ کیا۔ یہ مہر حکومت سمرقند کی سرداری، مجھے خان اعظم نے دی ہے۔ اس خان اعظم نے جسے ہمارے باپ دادا اپنا بادشاہ تسلیم کرتے آئے ہیں۔ اس مہر حکومت پر میرا حق ہے۔ سمرقند کی سرداری پر میرا حق ہے۔ آپا جانی۔ کیا آپ یہ مہر حکومت مجھے اپنے قدموں سے اٹھانے کی اجازت نہ دیں گی۔"

آپا جانی فوراً بول پڑیں:

"کیوں نہیں۔ تیمور یہ مہر حکومت تجھے خان اعظم نے دی ہے۔ اس پر تیرا حق ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تیمور نے فوراً ہاتھ بڑھا کر مہرِ حکومت اٹھالی اور بولا:

"بس آپا جانی۔ مجھے آپ کی رضامندی حاصل ہوگئی ہے۔ اب میں اس مہرِ حکومت اور سمرقند کی حفاظت کروں گا۔ مجھ سے یہ کوئی نہیں چھین سکتا۔ جو بھی میرے مقابلے پر آئے گا میں اس سے لڑوں گا وہ میرا چچا ہو یا قبیلے کا کوئی اور سردار۔"

حاجی برلاس کے تمام سردار دم بخود رہ گئے۔ آپا جانی کی جیسے زبان بند ہوگئی۔ وہ کیا سوچ کر کیا ہوگیا؟ تیمور نے اپنی باتوں سے سب کو قائل کر لیا۔ آپا جانی کچھ بھی نہ کہہ سکیں۔ انہوں نے یوں محسوس کیا وہ تیمور سے شرمندہ ہوں۔

تیمور نے آپا جانی کے بولنے کا آخری گھر بھی بند کر دیا۔ اس نے کہا:

"آپا جانی۔ آپ واپس جا کر چچا برلاس سے کہہ دیں کہ انہوں نے میرے قتل کرنے کی جو دلیل اُسے میں معاف کرتا ہوں۔ میرا دل ان کی طرف سے صاف ہے اور یہ بھی کہہ دیں کہ وہ تاتاری روایات کا انہوں نے قاسم اور شہزوری کے رشتے کا عام اعلان کر دیا تھا۔ وہ شہزوری کو رسم کے مطابق رخصت کرے شہزوری کو بزورِ شمشیر رخصت کرالوں گا۔"

آپا جانی یا برلاس سرداروں کے پاس اس کا بھی کوئی جواب نہ تھا۔

تیمور نے اٹھتے ہوئے قاسم کو حکم دیا:

"قاسم۔ مہمانوں کی ہر ضرورت کو پورا کیا جائے۔ آپا جانی پورے قبیلے کی ماں ہیں۔ ان کی خاطر خبردار، کوئی کوتاہی نہ ہونے پائے۔"

تیمور فوراً آپا جانی کے خیمے سے نکل آیا۔ اس نے ان کو بات کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ آپا جانی جو لیے آئی تھیں اس کا خاتمہ تیمور نے خود اُن کے ہاتھوں کرا دیا۔ انہوں نے وہاں زیادہ دن ٹھہرنا مناسب دوسرے دن ہی واپسی کا فیصلہ کر لیا۔

○

حاجی برلاس کو اس محاذ پر زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ آپا جانی واپس چلی گئیں۔ وہ جا

اس قدر ناراض ہوگئیں کہ انہوں نے اس سے بات تک نہ کی۔ حاجی برلاس اس ناکامی پر دانت پیس کر رہ گیا۔

آپا جانی نے ایک اور غضب ڈھایا۔

خیمہ گاہ پہنچتے ہی انہوں نے شہزوری اور اس کی ماں کو اپنے حضور طلب کر لیا۔ ماں بیٹی کو آپا جانی اور تیمور کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ابھی پتہ نہ تھا۔ آپا جانی کے بلاوے سے وہ بہت پریشان ہوئیں۔

آپا جانی جب شہرِ سبز جا رہی تھیں تو انہیں یہ خیال نہ تھا کہ حاجی برلاس نے آپا جانی کو قاسم کے پاس بھیجا ہے۔ ماں کو قاسم خود اس رشتے سے دستبردار ہو جائے۔ حالانکہ آپا جانی کے جانے سے شہزوری کا کوئی تعلق نہ تھا۔ ان کو تو حاجی برلاس نے اس لیے بھیجا تھا کہ وہ تیمور کو جنگ سے باز رکھیں۔ حاجی برلاس نے پیش کش کی تھی کہ تیمور کو برلاس قبیلے کا سردار تسلیم کر لیا جائے گا بشرطیکہ سمرقند کی سرداری حاجی برلاس کو دیدے۔

حاجی برلاس نے صلح کی دوسری صورت یہ بتائی تھی کہ سمرقند پر ایک ساتھ حاجی برلاس اور تیمور حکومت کریں۔ حاجی کو معلوم تھا کہ تیمور ان میں سے کوئی شرط بھی تسلیم نہ کرے گا۔ اس صورت میں آپا جانی ناراض ہو کر واپس آئیں گی اور حاجی کو اُس کے خلاف باتیں کرنے کا موقع مل جائے گا۔

ماں بیٹی، آپا جانی کو سلام کر کے سہمی سہمی سی سامنے بیٹھ گئیں۔

آپا جانی نے شہزوری کو اشارہ کر کے اپنے پاس بلا کر بٹھا لیا اور بولیں:

"بیٹی، تاتاری قبیلوں میں سرداری کے لیے لڑائیاں ہوتی رہی ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن تیرے چچا نے تیمور کی مخالفت میں تیری شادی بھی روک دی ہے۔ تیمور اور حاجی برلاس میں لڑائی ہو کے رہے گی۔ میں جانتی ہوں اس لڑائی میں تیرا نام نہ آئے گا۔ خاندانی بات خاندان ہی میں طے ہونا چاہیے۔"

آپا جانی کی بات شہزوری کی سمجھ میں نہ آئی۔ وہ ان کا منہ دیکھنے لگی۔ شہزوری کی سمجھ میں نہ آیا تو اس کی ماں کیا خاک سمجھتی۔ وہ یوں بیٹھی تھی جیسے اُس کا اس معاملے سے کوئی تعلق ہی نہیں۔

آپا جانی نے دونوں کو خاموش دیکھا تو خود ہی بولیں۔ مگر اب اُن کا رخ شہزوری کی ماں کی طرف تھا:

"بیٹی پر سب سے زیادہ حق باپ اور ماں کا ہوتا ہے۔ میرا مطلب ہے اگر تم دونوں کو حاجی کا فیصلہ پسند ہے تو بیچ میں سے ہٹ جاتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی، بعد میں کہا جائے کہ آپا جانی نے باپ بیٹی یا میاں بیوی کے بیچ میں جھگڑا کرا دیا۔"

شہزوری نے سوچا کہیں اس کی سادہ لوح ماں کوئی غلط بات نہ کہہ دے اس لیے خود ہی بول پڑی:

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"آپا جانی۔ ماں باپ کا فیصلہ سر آنکھوں پر۔ لیکن قبیلہ کی آپ بڑی بوڑھی ہیں۔ قبیلہ کی عزت
آپ جو فیصلہ کریں گی وہی بہتر ہوگا کیونکہ آپ کی عقل میرے ماں باپ سے کہیں زیادہ ہے۔" شہزوری
کرماں کو امداد طلب نظروں سے دیکھا۔

شہزوری کی ماں نے فوراً کہا:

"ور کیا آپا جانی۔ خاندانی باتیں آجتک آپ طے کرتی آئی ہیں۔ میں ماں ضرور ہوں لیکن آپ
تھوڑی رکھتی ہوں۔"

آپا جانی، شہزوری اور قاسم کے حق میں تو پہلے ہی فیصلہ کر چکی تھیں۔ اب نئے حالات
کی تائید حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ تیمور نے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ وہ شمشیر کی نوک پر شہزوری
گا۔ اس کی ذمہ داری بڑی بی اپنے سر نہیں لینا چاہتی تھیں۔ انہیں ان دونوں کی حمایت حاصل ہو
اطمینان کا سانس لیا۔

آپا جانی نے کہا:

"مجھے خوشی ہے کہ تم لوگ بزرگوں کی اب بھی عزت کرتی ہو۔ میرا فیصلہ وہی ہے جو میں
اگر حاجی نے شہزوری کو زبردستی رخصت کرنے کا ارادہ کیا تو اسے میری لاش پر سے گزرنا ہوگا۔"

شہزوری اور اس کی ماں کے تمام خدشات دور ہو گئے۔ شہزوری نے خود کو اپنی تمناؤں
محسوس کیا۔

وہ دونوں دیر تک آپا جانی کے پیر اور شانے دباتی رہیں۔

پروشیا نے گھوڑا روک کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ وہی مقام، وہی پیڑ، وہی سبزہ
ٹیلہ جس کے قریب شہزوری کا خیمہ تھا لیکن اب وہاں ویرانی برس رہی تھی۔ نہ خیمہ گاہ تھی نہ حاجی
پروشیا سخت حیران تھی۔ یہ لوگ کہاں چلے گئے۔ کب چلے گئے اور کیوں چلے گئے؟ اس کی
تھا۔ چار روز پہلے تک تو سب یہاں موجود تھے۔

پروشیا سوچتی رہی اور اپنا گھوڑا آگے بڑھاتی رہی۔

قاسم اور شہزوری کا رابطہ پروشیا کے ذریعے قائم تھا۔ وہ ہر دوسرے روز شہر سبز سے حاجی برلاس
گاہ میں آتی اور ایک کو دوسرے کا پیغام پہنچاتی تھی۔ پروشیا کی بے لوث خدمت نے قاسم اور شہزوری
کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔

آپا جانی اور تیمور کی گفتگو کے بعد دونوں طرف بظاہر خاموشی تھی لیکن دونوں اپنی جگہ خائف تھے تیمور
دونوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ تیمور کو جنگ پر اکساتے اور حاجی برلاس پر حملہ کرنے کی درخواست کرتے۔
چاہتا تھا کہ ایک بھرپور حملہ کر کے حاجی کا جھگڑا ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے لیکن اسے برلاس قبیلہ
سرداروں کا تعاون حاصل نہ تھا۔ اسی لیے وہ حاجی برلاس کے مقابلہ پر نکلنے سے گریز کرتا تھا۔

پروشیا خیالات میں گم آگے بڑھتی رہی۔ یہ شاہراہ سمرقند تھی۔ اس سڑک پر مملکت تمار کے بڑے
مرو اور قصبے آباد تھے۔ تجارتی راستہ بھی یہی تھا۔ دن کے وقت اس شاہراہ پر تجارتی قافلے شمال سے
اور جنوب سے شمال کی طرف آتے جاتے دکھائی دیتے۔

پروشیا کو ایک قافلہ سمرقند کی طرف سے آتا دکھائی دیا۔ اسے اس سڑک پر چلتے ہوئے کئی گھنٹے ہو
اس نے گھوڑا روک لیا۔ قافلے کے ساتھ کچھ سوار تھے۔ پروشیا نے آگے بڑھ کر ایک سوار سے

"مہربان بھائی! کوئی لشکر سمرقند جاتے تو نہیں دیکھا؟"

سوار نے خوبصورت پروشیا کو سر سے پیر تک دیکھا۔ وہ پروشیا کے حسن سے کچھ زیادہ مرعوب ہو گیا۔ اس
دینے کی کوشش کی لیکن الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔ اس کے ایک ساتھی نے اس کی
اندازہ لگا لیا۔ وہ گھوڑا بڑھا کر پروشیا کے قریب آ کر بولا:

"بچی بیٹی۔ میرا ساتھی چلتے چلتے تھک گیا ہے۔ اس کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔ تمہیں جو پوچھنا ہے
مجھ سے۔"

پروشیا مسکرا دی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ بھلا سوار اس کی صورت دیکھ کر گھبرا گیا ہے اور اس کا
ساتھی اس کے اڑے آیا ہے۔ وہ مسکرا کر بولی:

"دن پہلے یہاں حاجی برلاس کا لشکر موجود تھا۔ اب وہ کسی اور طرف چلا گیا ہے۔ میں اس کے بارے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں پوچھ رہی تھی۔"

ادھیڑ عمر سوار نے بتایا:

"یہاں سے کچھ دور شمال میں جہاں یہ سڑک دائیں جانب گھومتی ہے بہت سے خیمے لگے ہیں، وہی لشکر ہو جس کی تمہیں تلاش ہے۔"

پروشیا نے "شکریہ" کہا اور گھوڑا شمال کی طرف موڑا۔

سوار نے اسے روکا اور بولا:

"میری اچھی بیٹی۔ لڑکیوں کو کسی لشکر میں تنہا نہ جانا چاہیے۔ لشکریوں کا کیا اعتبار۔ تاتاری بڑے اجڈ ہوتے ہیں۔"

"بزرگ محترم۔ آپ کا ایک بار اور شکریہ۔"

پروشیا نے ہنس کر کہا:

"میں بھی تاتاری لڑکی ہوں اور اپنی حفاظت کرنا بھی جانتی ہوں۔"

پروشیا نے گھوڑے کو ایڑ دی اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ قافلہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

پروشیا کے جانے کے بعد جوان سوار کو بھی ہوش آ گیا۔ اس نے اپنے ادھیڑ عمر ساتھی سے پوچھا:

"چلی گئی۔ کون تھی یہ لڑکی؟"

ادھیڑ عمر کو غصہ آ گیا۔ بولا:

"عجیب گدھا ہے تو۔ لڑکی کو دیکھا تو اس ہی کھو بیٹھا۔"

جوان کھسیانہ ہو گیا۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔ قافلہ پھر جنوب کی طرف چل پڑا۔

○

پروشیا سوچتی ہوئی گھوڑا بھگاتی چلی جا رہی تھی۔ وہ موڑ پر پہنچی لیکن جیسے ہی اس نے موڑ کاٹا۔ چار سواروں نے اس کا راستہ روک لیا۔

"کون ہو تم؟" ایک سوار نے اکڑ کر سوال کیا۔

"پروشیا" اس نے بے باکی سے جواب دیا۔ سامنے تراتی میں حاجی برلاس کے خیمے نظر آ رہے تھے۔

"کہاں سے آئی ہو؟" سوال ہوا۔

"شہر ہیز سے۔" جواب ملا۔

سوار چونک پڑا۔ پوچھا:

"تیمور کو جانتی ہو؟"

پروشیا جھلا گئی:

"ہر تاتاری کو تیمور کا نام معلوم ہونا چاہیے۔ ہٹ جاؤ میرے سامنے سے۔" پروشیا نے سوار کو ڈانٹ پلائی۔

سوار بڑا ڈھیٹ تھا۔ اس نے پوچھا:

"کہاں جا رہی ہے؟" اور اس نے اپنا گھوڑا پروشیا کے گھوڑے سے بھڑا دیا۔

پروشیا کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ چیخ کر بولی:

"سامنے حاجی برلاس کی خیمہ گاہ میں جانا ہے۔"

ساتھ ہی پروشیا نے بڑی تیزی سے تلوار بھی میان سے نکالی۔

سوار نے جلدی سے گھوڑا پیچھے کر لیا۔ اکڑ کر بولا:

"تلوار کیوں نکالی؟"

"اس لیے کہ بدتمیز کی زبان صرف تلوار سے بند کی جا سکتی ہے۔" پروشیا نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا اور ہوا میں لہرائی۔

"سامنے سے ہٹ جاؤ۔ ورنہ مجھے اپنا راستہ خود بنانا پڑے گا۔"

سوار نے پروشیا کو لڑنے مرنے پر آمادہ دیکھا تو زم پڑ گیا۔ اس نے پلٹ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ایک ساتھی بولا:

"جھگڑے سے کیا فائدہ۔ یہ ہمارے سردار کے پاس جا رہی ہے۔ ہم ساتھ چلتے ہیں۔ سردار خود فیصلہ کر لے گا۔"

چاروں سوار پروشیا کے آگے اور دو پیچھے ہو گئے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ لوگ ترائی میں اترے تو حاجی برلاس سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ حاجی خیمہ گاہ سے ادھر ہی آ رہا تھا۔ پاس پہنچ کر انہوں نے گھوڑے روک لیے۔ پروشیا نے ادب سے سلام کیا۔

حاجی نے حیرت سے پروشیا کو دیکھا:

"کون ہو تم؟"

"پروشیا۔" اس نے ٹالمٹول کا جواب دیا۔

"کہاں سے آئی ہو؟"

"شہر سبز سے۔"

حاجی کی حیرت شبہ میں تبدیل ہو گئی۔ اس نے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا:

"تیمور کا پیغام لائی ہو؟"

"نہیں۔ میں شہزوری سے ملنے آئی ہوں۔" پروشیا نے جرأت سے جواب دیا۔

حاجی کا غصہ بڑھ گیا۔ بولا:

"کیوں ملنا ہے شہزوری سے؟"

پروشیا نے اطمینان سے جواب دیا:

"ایک سہیلی دوسری سہیلی سے کیوں ملا کرتی ہے سردارِ محترم۔"

"واپس جاؤ۔" حاجی برلاس چیخ کر بولا:

"میں شہر سبز کے کسی آدمی کو اپنے لشکریوں کے قریب نہیں دیکھنا چاہتا۔"

پروشیا کو شوخی سوجھی۔ اس نے کہا:

"میں مرد نہیں عورت ہوں سردار۔"

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ شہزوری گھوڑا بھگاتے چلی آ رہی ہے۔ شہزوری کا خیمہ اونچی جگہ تھا۔ پروشیا کو دیکھ لیا تھا۔ شہزوری قریب پہنچی۔ گھوڑا روکا۔ باپ سے کہا:

"ابا جان۔ یہ میری سہیلی پروشیا ہے۔"

"معلوم ہے۔" حاجی نے کڑک کر جواب دیا۔

"شہر سبز والے ہمارے دشمن ہیں۔ تم کسی سے نہیں مل سکتیں۔"

شہزوری تاؤ کھا کر رہ گئی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا کہ پروشیا نے اپنا گھوڑا موڑ لیا اور ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی:

"خدا حافظ شہزوری۔ پھر ملیں گے۔"

پروشیا کا گھوڑا گرد میں دب گیا۔ شہزوری کا منہ اتر گیا۔ وہ اپنے خیمے کی طرف واپس چلی گئی۔ اس کا جی چاہا تھا۔ قاسم کا خیال اسے بار بار پریشان کر رہا تھا۔ کیا پتہ قاسم نے کوئی اہم پیغام بھیجا ہو؟ یہ سوال اس کے دماغ میں گردش کر رہا تھا۔

پروشیا شہر سبز پہنچی۔ تمام شہر میں خبر پھیل گئی کہ حاجی برلاس اپنا لشکر لے کر بھاگ گیا لیکن تیمور بے چین تھا۔ برلاس کیوں پیچھے ہٹ گیا؟ وہ مقابلہ نہیں کرنا چاہتا یا اس میں کوئی فوجی چال پوشیدہ ہے۔ تمام دن شہر میں باتیں ہوتی رہیں۔ نافہموں نے خوشیاں منائیں۔ عقلمند سوچ میں ڈوبے رہے۔ رات کو تیمور نے مجلسِ مشاورت بلائی۔ زین الدین بھی تشریف لائے۔ اس وقت تک پروشیا کی باتوں کی تصدیق دوسرے ذرائع سے بھی ہو چکی تھی۔

مسئلہ پیش ہوا۔

ہر ایک نے اپنی اپنی رائے دی۔ بڑی تفصیلی بحث ہوئی۔ رات کا کھانا وہیں کھایا گیا۔ کھانے کے بعد پھر گفتگو شروع ہوئی۔ سوائے تیمور اور مولانا زین الدین کے ہر ایک کا یہی خیال تھا کہ حاجی برلاس خوف کھا کر پیچھے ہٹ گیا ہے۔ گفتگو طول کھینچتی گئی۔ رات کا پچھلا پہر ہو گیا لیکن کسی بات پر اتفاق نہ ہو سکا۔ پھر اس وقت سب ہی ایک دم چونک اٹھے جب سرحد سے ایک سوار گھوڑا سرپٹ دوڑاتا آیا اور اس نے اعلان کیا:

"حاجی برلاس کا لشکر آہستہ آہستہ شہر سبز کی طرف بڑھ رہا ہے۔"

دوسرے ہی لمحے تیمور مسلح ہو کر سرحد کی طرف جا رہا تھا۔ تیمور نے اپنے تمام سوار سرحد پر پہلے ہی بھیج دیے تھے۔ اس کے ساتھ ہو گئے۔

قاسم عجب شان سے گھوڑے پر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں عشق کے نشہ سے مخمور ہو رہی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے جگمگاتے ہوئے وہ اپنی محبوبہ سے ملنے جا رہا ہے۔ جس طرح شہزوری اس کی محبوبہ تھی اسی طرح وہ بھی محبوب تھا۔ اور وہ تھی پروشیا!

پروشیا جسم پر پورا اسلحہ سجائے اس کے پہلو میں چل رہی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تیمور اور اس کے ساتھیوں کے گھوڑے پوری رفتار سے سرحد کی طرف بڑھ رہے تھے لیکن
پر پہنچے تو میدانِ کارزار گرم تھا۔ دن کا اجالا پھیل چکا تھا۔ تاتاری تاتاری سے ٹکرا رہا تھا۔ اور ایک ہی قبیلہ
اپنے ہی بھائیوں کے گلے کاٹنے پر تُلے ہوئے تھے۔ حاجی برلاس نے سخت حملہ کیا تھا۔ اس کے سوار
زیادہ تھی۔ تیمور کے جوانوں نے حملہ روکنے کی پوری کوشش کی لیکن انہیں پیچھے ہٹنا پڑا۔

تیمور کے پہنچتے ہی لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا۔

اسے دیکھتے ہی اس کے سواروں میں جیسے جان پڑ گئی۔ انہوں نے حملہ روک لیا۔ پھر جوابی حملہ
برلاس کو شہر سبز کی سرحدوں سے پیچھے دھکیل دیا۔ برلاس اپنے حملے میں تقریباً ایک فرسنگ
کے اندر گھس آیا تھا۔ قاسم مست ہاتھی کی طرح بڑھ بڑھ کر حملے کر رہا تھا۔ حاجی برلاس کے کئی
ہاتھوں مارے گئے۔ تیمور نے حاجی کے لشکر پر اتنا دباؤ ڈالا کہ اس کے قدم اکھڑ گئے اور اس نے
شروع کر دیا۔

تیمور کا حوصلہ بڑھا اس نے حملہ میں مزید شدت پیدا کر دی۔ حاجی برلاس اس صورتِ حال
پریشان ہوا۔ اب تک وہ دور کھڑا سواروں کو لڑا رہا تھا۔ وہ گھوڑا بڑھا کر لشکر کے درمیان آ گیا اور
کے حوصلے بڑھانے لگا۔

میدان میں ایک بار فوج کے قدم اکھڑ جائیں تو جمنا مشکل ہوتا ہے۔ حاجی برلاس کے آ
ہوا کہ لشکر کے پسپا ہونے کی رفتار سست ہو گئی۔ حاجی کا لشکر بار بار جم کر لڑنے کی کوشش کرتا
جواں سال سوار پھر اس کے قدم اکھیڑ دیتے۔

دوپہر، شام پھر رات ہونے لگی۔ بھوکے پیاسے سوار دن بھر جنگ کرتے رہے۔ ۰۰
کے خون سے بھگا رہے تھے۔ تیمور کا لشکر شاہراہِ سمرقند پر حاجی برلاس کے لشکر کو بہت دور تک
گیا تھا لیکن حاجی کو شکست نہ ہوئی تھی۔ وہ کسی نہ کسی طرح مقابلہ کرتا رہا۔ پھر اندھیرا ہو گیا کہ دوست
مشکل ہو گئی۔ لڑائی بند کرنا پڑی۔

تیمور کا پلہ بھاری رہا لیکن اس کی فتح پیچیدہ حالات ہو گئی۔ کاش رات نہ ہوتی کیونکہ اس را
ساتھ بڑی دشمنی کی۔ اس رات نے تیمور کی فتح کو شکست اور ایک زبردست شکست میں تبدیل
دونوں لشکر الگ ہو گئے۔

حاجی برلاس پسپا ہوتا ہوا اپنی لشکر گاہ کے قریب پہنچ گیا تھا۔ وہ اپنے سواروں کے ساتھ لشکر گاہ
ہی چلا گیا۔

تیمور نے الاؤ روشن کرا کر میدان میں پڑاؤ ڈالا۔ قرب و جوار کی آبادیوں میں سوار دوڑائے گئے جو کچھ
کھانا وہ کھانے پینے کے لیے لایا گیا۔ کھا پی کر لشکر آرام کرنے لگا۔ پتھریلی زمین کے بستر پر یا پیڑوں کے
سہارے سوار بیٹھ گئے۔

تیمور ایک بڑے پتھر کے سہارے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ پتہ نہیں وہ سو رہا تھا یا آج کی کامیابی پر
غور کر کے صبح کی لڑائی کے لیے نئے انداز سے حملہ کرنے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا کہ اس کے خادمِ خاص نے اسے جھنجھوڑ
جگا دیا۔

"مالک، غضب ہو گیا۔" خادم نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

تیمور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ الاؤ کے بھڑکتے شعلوں میں خادم کے چہرے پر نظر ڈالی۔ خوف سے اس کے
ہونٹ کانپ رہے تھے۔

"ڈرو مت۔ بتاؤ کیا ہوا۔" تیمور نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

تیمور اسے دیکھ کر خود بھی پریشان ہو گیا تھا لیکن اس نے اپنا خوف خادم پر ظاہر نہ ہونے دیا۔

"مالک!"

خادم نے لرزتے لہجے میں کہا:

"تمام سردار آپ کو دھوکا دے گئے۔ وہ آپ کا ساتھ چھوڑ کر حاجی برلاس کی خیمہ گاہ میں چلے گئے۔"

تیمور کو شاید زندگی میں پہلی بار خطرہ اپنے بالکل قریب محسوس ہوا۔

"ایسا کیوں ہوا؟"

اس کی نظریں چاروں طرف تیزی سے گھوم رہی تھیں۔ الاؤ جگہ جگہ روشن تھے لیکن ان کے گرد صرف ایک ایک
سنتری اونگھتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ جس وقت الاؤ جلائے گئے تھے تو ہر الاؤ کے پاس سو سو دو
سو آدمی اکٹھا ہو گئے تھے۔ اب الاؤ کے پاس سناٹا تھا۔

خادم نے بتانا شروع کیا:

"ہمنے تو بس یہ سنا کہ آپا جانی کا کوئی آدمی ہمارے لشکر میں آیا تھا۔ اس آدمی نے آپا جانی کا یہ حکم سنایا ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ جو سردار تیمور کی طرف سے لڑے گا وہ تاتاری جہنم میں جائے گا۔ آپا جانی اس کے لیے بد دعا کریں گی۔ اپنا
یہ بھی حکم دیا کہ تیمور کا لشکر چھوڑ کر حاجی کی خیمہ گاہ میں آجاؤ۔۔۔۔۔ مالک! سب سردار آپ کو چھوڑ گئے
چالیس پچاس سوار رہ گئے ہیں۔"

تیمور کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ پچاس سواروں کے ساتھ
سے مقابلہ خودکشی کے برابر تھا۔

تیمور نے فوراً اپنے سواروں کو اکٹھا کیا اور گھوڑوں کی باگیں شہر سبز کی طرف موڑ دیں۔ ایک گرد
ہوا اور ہر طرف دھند پھیل گئی۔

یکایک تیمور نے گھوڑا روک کر اپنے سواروں کو دیکھا۔ سوار ٹولیاں بناتے آگے پیچھے چل رہے
تیمور کے پاس پہنچ کر رک گئے۔

"قاسم!"

تیمور نے بڑے کرب سے کہا:

"آخر تم بھی مجھے دھوکا دے گئے۔"

تیمور کے سوار بھی حیران رہ گئے۔ جب یہ لوگ چلے تھے تو قاسم اور پروشیا سب کے ساتھ
کی طرف چلے تھے لیکن تھوڑی دور چلنے کے بعد قاسم نے اپنے گھوڑے کی رفتار کم کر دی۔ پروشیا کو
کم کرنا پڑی۔ ان کے گھوڑوں کی رفتار ہی نہ رہی۔ گھوڑے رک گئے۔ اندھیری رات میں تیمور کے سوار
ہی نہ ہو سکا کہ ان کے دو ساتھی پیچھے رہ گئے ہیں۔

گھوڑے رکے تو پروشیا نے کہا:

"قاسم! تم نے سردار تیمور کا ساتھ کیوں چھوڑ دیا۔ یہ تو غداری ہے۔"

قاسم نے جواب دیا:

"پروشیا۔ اگر یہ غداری ہے تو تم نے سردار کو کیوں چھوڑا۔ تم میرے ساتھ کیوں رک گئیں!"

پروشیا کے پاس کوئی معقول جواب نہ تھا۔ کچھ سوچنے کے بعد بولی:

"قاسم۔ میں نے تیمور کو تمہاری وجہ سے چھوڑا ہے۔"

قاسم اندھیرے کی وجہ سے پروشیا کا چہرہ صاف طور سے نہ دیکھ سکا اور نہ اسے معلوم ہو سکا کہ

نت پروشیا کے دل کی دھڑکن الفاظ میں تبدیل ہو گئی تھی۔

قاسم نے کہا:

"پروشیا۔ تم نے میرے لیے تیمور کو چھوڑا۔ اسی طرح میں نے شہزوری کے لیے سردار سے منہ موڑا
ہے شہزوری مجھے صرف آج مل سکتی ہے۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے اگر میں اسے حاصل نہ کر سکا تو پھر مجھے
زوری کبھی نہ مل سکے گی۔"

پروشیا کانپ اٹھی۔ گھبرا کے بولی:

"تو کیا تم شہزوری کو لینے جاؤ گے۔۔۔۔ اکیلے۔۔۔۔ خیمہ گاہ میں۔۔۔۔ ہزاروں سواروں کے
یان۔۔۔۔"

"اس کے سوا کوئی چارہ نہیں پروشیا۔" قاسم کی آواز میں درد پیدا ہو گیا۔

پروشیا نے تیزی سے اپنا گھوڑا قاسم کے گھوڑے کے سامنے کر دیا۔ بولی۔

"خدا کے لیے نہ جاؤ قاسم۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔"

"پروشیا!"

قاسم افسردہ لہجے میں بولا:

"تمہارے بہت احسانات ہیں مجھ پر۔ لیکن پہلا حق شہزوری کا ہے۔ راستہ نہ روکو۔ میں شہزوری
ی آواز سن رہا ہوں۔ مجھے بلا رہی ہے وہ۔"

پروشیا کے آنسو نکل آئے۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی:

"میرا کوئی حق نہیں۔ میں کچھ نہیں مانگتی قاسم۔ مجھے تمہاری زندگی چاہیے۔"

قاسم کا گھوڑا آگے بڑھ گیا۔

پروشیا نے روکنا تو نہ سکی لیکن اس نے اپنا گھوڑا بھی اس کے پیچھے لگا دیا۔ قاسم اور پروشیا
ہے کے دھندلکے میں حاجی برلاس کی خیمہ گاہ پر پہنچ گئے۔ سامنے خیمے ہی خیمے نظر آ رہے تھے۔ خیمہ گاہ کے
محافظ سرخ دو سواروں کو اندر آتے دیکھا تو ان کی طرف بڑھے۔ نیم تاریکی کی وجہ سے چہرے صاف نظر نہ آ
رہے تھے۔

قاسم کو شہزوری کا خیمہ معلوم نہ تھا لیکن اس کا جذبۂ صادق یا ٹوٹے دوست اس کی رہنمائی کر رہی تھی۔ اس کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گھوڑے کا رُخ سیدھا شہزوری کے خیمہ کی طرف تھا اور حاجی برلاس کے محافظ سوار لمحہ بہ لمحہ قاسم اور پرد
کے قریب ہوتے جا رہے تھے۔

یکایک قاسم نے نعرہ لگایا:

"شہزوری۔ میں آ گیا۔ تمہارا قاسم"

اس کے ساتھ ہی محافظوں کی کمانوں نے تیر اگلنا شروع کر دیے۔ قاسم اور پردیسٹیا کے کئی تیر گ
ان کی رفتار میں کمی نہ آئی۔

محبت کی ماری شہزوری خواب دیکھ رہی تھی۔ قاسم سامنے کھڑا تھا۔ مسکرا رہا تھا۔ اسی وقت قاسم کی
اس کے کانوں میں گونجی۔ شہزوری تڑپ کر اٹھی اور ننگے سر ننگے پیر خیمہ سے نکل گئی۔ قاسم کی آواز اسے
سے بلا رہی تھی۔ وہ بے تحاشا آواز کی سمت بھاگ اٹھی۔

قاسم کا جسم تیروں سے چھلنی ہو گیا لیکن گھوڑا شہزوری کے خیمے کی طرف بڑھتا رہا۔ شہزوری اس کی آوا
بھاگتی چلی آ رہی تھی۔ قاسم کا گھوڑا شہزوری کے پاس پہنچ گیا۔ قاسم نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے شہزوری کی طرف
بڑھائے لیکن اس کے ہاتھ جھول گئے۔ پھر پورا جسم زین سے لٹک گیا۔

تیروں کی بارش اور تیز ہو گئی۔

شہزوری نے زمین سے لٹکتی ہوئی قاسم کی گردن کو اپنے ساتھ لگا لیا لیکن ایک ساتھ کئی تیر اس کی پشت
داخل ہو گئے۔ شہزوری کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے اور وہ زمین پر گر گئی۔

حاجی برلاس دوڑتا ہوا وہاں پہنچا۔ محافظوں نے دونوں کی لاشیں برابر زمین پر رکھ دیں۔ قاسم اور
شہزوری کو حاجی نے زندگی میں نہ ملنے دیا لیکن اب ان کی روحیں ایک ساتھ عالمِ بالا کی طرف پرواز کر رہی تھیں

دخترِ تاتار

مولانا نے تیزی سے آگے بڑھ کر تیمور کا گریبان پکڑ لیا۔

تیمور کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ دل سے مولانا زین الدین کی عزت کرتا تھا۔ وہ کہی گیا، شہر سبز سے قند
تاتاری ان کا مرید تھا لیکن تیمور کو مولانا کی یہ حرکت ناگوار گزری۔ اب وہ سمرقند کا حاکم نہ تھا بلکہ اس ک
سمرقند کے محض ایک مقامی ناظم جیسی تھی پھر بھی اس نے ماضی میں تاتاریوں کی جو درگت انجام دی تھیں
پیشِ نظر مولانا کا یہ تحقیر آمیز رویہ کچھ مناسب نہ تھا۔

تیمور نے بہت ضبط کیا پھر بھی غصہ سے اس کی تیوریاں چڑھ گئیں اور اس نے مولانا کی دونوں کلائیاں
سے پکڑ لیں۔

"یہ کیا حرکت ہے مولانا؟"

سے جھٹکا دے کر اپنا گریبان چھڑا لیا۔

مولانا بڑے طیش میں تھے۔ چیخ کر بولے:

"تیرا ہاتھ تیرے گریبان تک گیا تو تُو بھڑک اٹھا لیکن تیرے شمالی مغل آقاؤں کے ہاتھ تاتاری عورتوں
تک پہنچ رہے ہیں۔ اس پر تیری رگِ حمیت نہیں پھڑکتی۔ تیرے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔"

تیمور کچھ سمجھا۔ کچھ نہ سمجھا۔ بولا:

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"آپ کا میں نے ہمیشہ احترام کیا ہے مولانا۔ مجھ سے کوئی شکایت ہے تو سلیقے سے بیٹھ کر
میں تاتاریوں کی خدمت کے لیے ہمیشہ تیار ہوں لیکن مجھے ہم چشموں میں اس طرح ذلیل کرنے کی اجازت نہ
شریعت دیتی ہے اور نہ میں خود اسے برداشت کر سکتا ہوں۔"

"اچھا تو بیٹھ جاؤ۔" مولانا شریعت کے نام پر نرم پڑ گئے۔

"پہلے آپ تشریف رکھیے۔" تیمور نے بھی غصے پر قابو پایا۔

مولانا زین الدین بیٹھ گئے۔ مولانا کے ساتھ چار آدمی آئے تھے۔ مولانا کا اشارہ پاکر وہ بھی بیٹھ گئے۔
تیمور مولانا کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے دل میں اب بھی مولانا کا پہلے
احترام تھا۔

"فرمائیے مولانا۔"

تیمور ادب سے بولا:

"آپ کو میری کس گستاخی نے اس قدر چراغ پا کر دیا ہے؟"

"حاکم اور رعیت کا کیا رشتہ ہے تیمور؟" مولانا نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

مولانا کی دینی بصیرت اور سیاسی شعور کا تیمور کو پوری طرح اندازہ تھا۔ جب تک وہ شہر سبز میں رہا
معاملے میں مولانا سے مشورہ کرتا تھا۔

ذرا دیر غور کرنے کے بعد الفاظ تولتے ہوئے بولا:

"مولانا۔ جب تک رعیت اطاعت و فرمانبرداری کرتی رہے حاکم وقت کا فرض ہے کہ وہ رعیت
مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرے۔"

"اگر تجھے یہ بات تسلیم ہے تو پھر بتا کہ تاتاریوں کی جان، مال اور عزت و آبرو کی تو حفاظت کیوں
مولانا ویسے ہی غصے سے بولے۔ وہ تیمور کو دلیلوں سے قائل کرنا چاہتے تھے۔

"لیکن میں نہ اب سمرقند کا حاکم ہوں نہ تاتاریوں کا سردار۔"

تیمور نے فوراً جواب دیا:

"پچھلے نو سال میں میرے چچا حاجی برلاس اور دوسرے تاتاری سرداروں نے میرے حا
کیا اس سے آپ واقف ہیں۔ مجھے انہوں نے اس قابل کب چھوڑا ہے کہ میں تاتاریوں کی کوئی مدد کر

تیمور سمرقند کا حاکم تھا لیکن اس کے چچا نے اس کی مخالفت کی۔ تاتاری سردار بھی اس کے چچا کے ساتھ
ہو گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تیمور کو بھاگ کر اپنے سالے امیر حسین کے پاس کابل میں پناہ لینی پڑی۔ تیمور نے افغان
وجیوں کی مدد سے پھر سمرقند پر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر چار سال کی طویل خانہ جنگی کے باوجود کامیاب نہ ہو
سکا پھر بلاد شمال کا خانِ اعظم تغلق تیمور دوبارہ تاتاری علاقے میں گھس آیا۔ اب کے اس نے تمام بڑے بڑے
تاتاری سرداروں کو قتل کر دیا۔ حاجی برلاس نے راہِ فرار اختیار کی لیکن ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارا گیا۔ تیمور نے خانِ اعظم
سے رشتہ کرنے کی کوشش کی۔ خانِ اعظم نے خوش ہو کر تیمور کو سمرقند کا ایک مقامی افسر مقرر کر دیا لیکن سمرقند کی حکومت
کی باگ ڈور اپنے بیٹے شہزادہ الیاس خواجہ اور چغتہ سردار بیک جک کے حوالے کر کے واپس چلا گیا۔

مولانا زین الدین کو ان واقعات کا علم تھا۔ انہوں نے کوشش بھی کی کہ تمام تاتاری تیمور کے جھنڈے تلے
اکٹھا ہیں لیکن خود غرض اور لالچی حاجی برلاس نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔

مولانا تیمور کے جواب سے لاجواب ہو گئے۔ بڑی افسردگی سے بولے:

"تیمور۔ تو کیا تاتاریوں کے گھر بار یونہی لٹتے رہیں گے۔ ان کی عزت و آبرو سے شامی مغل یونہی کھیلتے
رہیں گے!"

تیمور کا غصہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ وہ بھی نرمی سے بولا:

"مولانا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ الیاس خواجہ اور بیک جک کے دستوں نے ایک دو جگہ لوٹ مار کی تھی۔ میں
نے اسی وقت ایک شکایتی خط خانِ اعظم کو بھیجا تھا۔ میں نے الیاس خواجہ اور بیک جک کے پاس بھی قاصد بھیجے تھے
کہ وہ اپنے دستوں کو جنوب میں نہ آنے دیں۔"

"اس کا نتیجہ کیا نکلا تیمور؟" مولانا زین الدین کی آواز پھر سخت ہو گئی جیسے انہیں غصہ آ گیا ہو۔

"میری اطلاع اور خط کا خاطر خواہ نتیجہ نکلے گا مولانا۔" تیمور نے تسلی آمیز لہجے میں کہا تاکہ مولانا کے بھڑکے
ہوئے جذبات ٹھنڈے پڑ جائیں۔

مولانا کے جذبات ٹھنڈے ہونے کے بجائے اور بھڑک اٹھے۔ وہ تقریباً چیختے ہوئے بولے:

"خاطر خواہ نتیجہ نکلا ہے اور خوب نکلا ہے۔ ناطانِ تیمور تو مغلوں کو ایمان دار سمجھے بیٹھا ہے۔ الیاس خواجہ اور
بیک جک سرحد پر ڈیرے ڈالے پڑے ہیں۔ ان لٹیروں کے حکم پر یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ بستیوں کی بستیاں
جلا کر راکھ کر دیں۔ سادات گھرانے کے معزز افراد گرفتار ہو رہے ہیں۔ تاتاری لڑکیاں کنیز بنا کر شمال کو بھیجی جا رہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں اور تیرے شہر سمرقند . . . . ."

مولانا نے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اپنے ساتھ آئے ہوئے ایک فرد کو مخاطب کیا:

"ظفریاب! ادھر آؤ۔"

ظفر کچھ دور بیٹھا تھا۔ وہ سر جھکائے مولانا کے پاس آ گیا۔

"ذرا نکالو تو وہ جیب سے۔"

مولانا کے کہنے پر ظفریاب نے جیب سے مڑا تڑا پھولوں کا ایک ہار نکالا جس کے پھول مرجھا کر پیرا

ظفریاب نے ہار مولانا کی طرف بڑھا دیا۔

"لو دیکھو۔"

مولانا نے ظفریاب کے ہاتھ سے ہار لے کر تیمور کے ہاتھ میں زبردستی تھما دیا۔

"یہ ہار ہے اور یہ مرجھائے ہوئے پھول ہیں اس سہرے کے جو ظفریاب کے سر پر باندھا گیا۔ پھر جلا

کیا ہوا؟"

مولانا تیمور کو تیز نظروں سے گھورتے ہوئے بولے . . . . مگر آواز ڈوبی ڈوبی تھی:

"اور پھر تاتاریوں کی عزت، ظفریاب کی دلہن، جس کا ابھی اس نے منہ بھی نہ دیکھا تھا، مغل لٹیرے ا

اٹھا کر لے گئے۔"

"مولانا . . . . !" تیمور دھاڑ جیسے کوئی سوتے سے شیر کو جگا دے۔

"قسم ہے خالقِ کائنات کی!"

تیمور نے دیوار سے کمان اور ترکش اتارا، ڈھال کو بائیں بازو پر چڑھایا، کمان تاننے سے پہلے

تلوار کو بے نیام کرتے ہوئے بولا:

"انتقام . . . . انتقام . . . . انتقام . . . . میں جا رہا ہوں مولانا۔"

مولانا اور دوسرے لوگ بھی گھبرا کے تیمور کے ساتھ ہی کھڑے ہو گئے تھے۔ مولانا نے تیمور کو ایسے

جلال میں اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ دل میں خوش تھے کہ شیر جاگ پڑا ہے۔ تاتاری غیرت بیدار ہو گئی

مولانا نرمی سے بولے:

"کہاں جا رہے ہو تیمور؟"

"شمال میں مولانا۔ جہاں میری تاتاری بہنیں قید ہیں۔"

پھر تیمور نے ظفریاب کی طرف رخ کر کے کہا:

"جہاں ایک بے کس و بے بس دلہن اپنے دولہا کا انتظار کر رہی ہے۔"

"خدا ساتھ ہو تیمور۔"

مولانا نے اس کی حوصلہ افزائی کی:

"نہیں شمال میں ضرور جانا ہے۔ تمہیں اپنی بہنوں کو آزاد کرانا ہے۔ بچھڑی دلہن کو دولہا سے ملانا ہے مگر

نہیں اور اس حال میں بھی نہیں۔"

"مولانا!"

تیمور گھبرا گیا، پھر پڑا:

"فرض یاد دلا کر آپ مجھے فرض سے روک رہے ہیں یا آپ مجھے بزدل سمجھتے ہیں۔"

"فرض شناس ہو اور شجاع بھی۔"

مولانا نے تیمور کے بازو پر چڑھی ڈھال پر ہاتھ رکھا:

"پہلے تمہیں تاتاریوں کو اکٹھا کرنا ہوگا۔ ان میں جوش و خروش پیدا کرنا ہوگا۔ پھر سوچ سمجھ کر شیدہ طریقے سے لشکر

بنا کر تم بڑھو گے۔ بلادِ شمال کے خانِ اعظم سے ٹکراؤ گے۔ فتح تمہارے قدم چومے گی۔"

کچھ دیر تک مولانا زین الدین کو گھورتا رہا۔ اس نے تلوار بھی نیام میں کر لی۔ پھر پُرسکون ہوتے ہوئے بولا:

"نہیں مولانا۔ میں نے اب تک آپ کی کوئی بات رد نہیں کی لیکن یہ مسئلہ نہ تو شرعی ہے اور نہ سیاسی۔ یہ تو

ذاتی مسئلہ ہے۔ وہ قوم جو غلامی قبول کر لیتی ہے اس کے اعضا شل ہو جاتے ہیں۔ حوصلے پست پڑ جاتے

ہیں، ذہن مفلوج ہو جاتے ہیں۔ اس میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ تاتاری غلام ہو چکے ہیں

ان کے خلاف تلوار اٹھانے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔ وہ یکجا نہیں ہو سکتے۔ میں لشکر تیار نہیں کر

سکتا۔ تاتاریوں کو مغلوں کے خلاف لڑنے پر آمادہ کر سکتا ہے۔ مگر میں پھر بھی جاؤں گا اور مغلوں کے پہاڑ

سے ٹکرا کر ایک فرض ادا بھی تو ہے اور وہ فرض اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔" مولانا نے تیمور کو اس کے اس

فیصلے سے روکنے کے لیے اپنی کوشش کو ایک اور رُخ دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تیمور تو اس وقت بالکل باغی ہو چکا تھا۔ سختی سے بولا:

"اس سے بڑا اور کوئی فرض نہیں ہے مولانا۔ آپ نے مجھے غفلت سے بیدار کیا ہے اب میرے آگے کی کوشش نہ کیجیے۔ مجھے گستاخی کا موقع نہ دیجیے۔"

"مجھے گستاخی کی پروا نہیں۔" مولانا استقلال سے بولے۔

"لیکن میں تمہیں فرض یاد دلانے سے باز نہیں رہ سکتا۔ تمہیں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اپنے انتظام کرنا ہوگا۔"

"میں انہیں آپ کے ساتھ شہر سبز بھیج دوں گا۔" تیمور نے جواب دیا جیسے وہ پہلے ہی اس کا فیصلہ

"یہ کس طرح ممکن ہے تیمور۔"

مولانا اسے سمجھانے لگے:

"شہر سبز کسی طرح محفوظ نہیں آئے دن مغل حملے کرتے رہتے ہیں..... خدانخواستہ کچھ ہو کمزور ہاتھ مغلوں کے پہلے ہی وار میں قلم ہو جائیں گے۔ میں تمہارے اور خدا کے سامنے شرمندہ نہیں الجائی اور جہانگیر کو کسی طرح بھی شہر سبز نہ لے جاؤں گا۔"

تیمور فکر میں پڑ گیا۔

اس نے الجائی خاتون اور جہانگیر کو شہر سبز بھیجنے کا فیصلہ فوری طور پر کیا تھا لیکن مولانا کے یکسر بدل گئی تھی۔ جہانگیر کی عمر پانچ سال کی تھی۔ وہ اس قابل نہ تھا کہ میدانِ جنگ کی صعوبتیں برداشت جب وہ چچا کے خلاف جنگ میں معروف تھا۔ الجائی خاتون اور جہانگیر اپنے ماموں امیر حسین کے پاس سے رہے تھے لیکن اب امیر حسین، مغلوں سے شکست کھا کر نہ معلوم کہاں بھٹکتا پھر رہا تھا۔ اس کی جگہ جتہ سردار حکومت کر رہا تھا۔

تیمور جس وقت زور سے چیخا تھا تو اس کی آواز مردانے سے گزر کر زنانخانے میں پہنچی تھی۔ نو چھوٹی کمان کا چلّہ کھینچے کسی چڑیا کا نشانہ لے رہا تھا۔ باپ کے چیخنے کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو گیا۔ وہ سہما سہما ماں کے پاس پہنچا۔ الجائی خاتون بھی گھبرا گئی تھی۔ وہ جہانگیر کو لیے مردانے اور زنا والی دیوار کے پاس پہنچی اور دروازے کے قریب کھڑے ہو کر کان باہر کی طرف لگا دیے۔

تیمور اور مولانا کی گفتگو اس کے کان تک صاف پہنچ رہی تھی۔ الجائی خاتون نے ایک کنیز کو بلا

تیمور اسی کش مکش میں تھا کہ الجائی خاتون کی کنیز امیر کے پاس پہنچی اور ادب سے بولی:

"آقائے محترم! خاتون آغا آپ کو یاد فرما رہی ہیں۔"

خاتون آغا، تیمور کی بیوی الجائی خاتون کا خطاب تھا۔ تیمور نے گہری سوچ سے سر اٹھا کر الجائی خاتون نیز کو دیکھا۔ پھر اچانک اس کی نظر اس جوان پر پڑ گئی جس کی دلہن کو مغل اٹھا کر لے گئے تھے۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"ظفر یاب۔" ظفر یاب کا لہجہ بڑا اداس تھا۔

"اور میری بدقسمت بہن کا کیا نام ہے؟"

"گل عذار۔"

"گل عذار۔"

تیمور زیرِ لب بولا:

"ظفر یاب۔ جاؤ اور شہر سبز میں اس خبر کا انتظار کرو کہ تیمور تمہاری گل عذار کو واپس لا رہا ہے یا مغلوں نوں مارا گیا ہے۔"

"معزز سردار۔"

ظفر یاب بھرائی ہوئی آواز میں بولا:

"آپ میری گل عذار کو ڈھونڈنے جا رہے ہیں اور میں شہر سبز میں بیٹھ کر خبروں کا انتظار کروں میرا انتظار نہیں ہے سردار۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔ مجھے تو گھر والوں نے پکڑ کر کمرے میں بند کر دیا ورنہ مغل میرے جیتے جی گل عذار کو نہیں لے جا سکتے تھے۔"

تیمور کے ہونٹ ہلکے سے ہلے۔ شاید وہ مسکرایا تھا۔ اس کی مسکراہٹ کو لوگ ترستے تھے۔ تیمور نے قہقہہ بلند نہیں کیا۔ تاریخ اس کی شاہد ہے کہ اس کی محفل یا دربار میں کبھی کسی مسخرے کو بازیابی نصیب ہوئی۔

"ہم تمہیں اپنے ساتھ لے چلیں گے ظفر یاب۔"

ظفر یاب کے چہرے پر شکر گزاری کے آثار نمایاں ہو گئے۔ تیمور مولانا سے اجازت لے کر اندر کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

الجائی خاتون دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ تیمور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ اس نے دیکھا تو ٹھٹک گیا۔ الجائی اپنے بیٹے جہانگیر کے سر پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ جہانگیر نے تیمور کو آتے دیکھا تو ماں کی اوٹ میں سر چھپا لیا۔ وہ تیمور سے بہت ڈرتا تھا۔

"الجائی خاتون آغا۔۔۔۔ تم یہاں؟"

تیمور نے ماں بیٹے کا سر سے پیر تک جائزہ لیا اور شاید پدرانہ محبت سے مجبور ہو کر اس کا ہاتھ سر پر پہنچ گیا۔ الجائی خاتون کا ہاتھ وہاں پہلے سے موجود تھا۔ تیمور کا ہاتھ اس کے ہاتھ پر پڑا تو الجائی خاتون نے تیمور کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔

"خاتون آغا۔ تمہاری آنکھوں میں آنسو۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟"

الجائی خاتون سسکی بھر کے رہ گئی۔ شاید الفاظ اس کا ساتھ نہ دے سکے۔

تیمور کی نظریں جہانگیر کے ہاتھ میں دبی کمان پر پڑیں۔

"اوہو۔ ہمارا بیٹا جہانگیر تیر اندازی کر رہا تھا۔ کتنے شکار مارے؟"

جہانگیر نے تیمور کو مہربان دیکھا تو معصومیت سے کہا:

"بابا۔ میں نے نشانہ باندھا تھا لیکن۔۔۔۔"

جہانگیر نے رک کر سر اوپر اٹھایا اور ماں کو دیکھنے لگا جیسے پوچھ رہا ہو کہ آگے کچھ کہوں یا نہ کہوں۔

"ہاں بیٹے۔ تم نے نشانہ باندھا لیکن تمہارا شکار تیر چلانے سے پہلے ہی نشانے سے ہٹ گیا۔"

اندازے کے مطابق اس کا جملہ خود پورا کر دیا۔

"نہیں بابا۔ شکار نہیں ہٹا۔" جہانگیر نے اسی معصومیت سے کہا۔

"پھر کیا ہوا بیٹے؟" تیمور کا تجسس بڑھ گیا۔

"پھر میں ڈر گیا بابا۔"

"ڈر گئے۔ تم ڈر گئے جہانگیر۔۔۔۔ کس نے ڈرایا تمہیں؟"

"آپ کی آواز نے بابا۔۔۔۔ آپ کسی کو ڈانٹ رہے تھے۔ میں تیر چلا ہی نہیں سکا۔"

تیمور کے دل پر چوٹ سی پڑی۔ جہانگیر کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا:

"ہم تو تمہارے بابا ہیں جہانگیر۔ ہم سے کیوں ڈرتے ہو؟"

"سب ہی تو آپ سے ڈرتے ہیں۔ امی بھی ڈرتی ہیں۔"

جہانگیر کا ایک ایک لفظ تیر کی طرح تیمور کے دل میں آویزاں ہوتا چلا گیا۔

"امی کہتی ہیں۔ آپ ہمیں چھوڑ کر پھر چلے جائیں گے۔"

جہانگیر کے اس جملے نے تیمور کے پورے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس کے دل میں پدرانہ شفقت اور محبت کا سمندر موجزن ہو گیا۔ الجائی خاتون کی خاموش محبت نے بھی جوش مارا۔

"خاتون آغا۔" تیمور نے بڑے پیار سے بیوی کو دیکھا۔

الجائی خاتون کی آنکھیں خشک ہو چکی تھیں۔ وہ خالی خالی نظروں سے تیمور کو دیکھنے لگی۔

"ہم تمہیں چھوڑ کر نہیں جائیں گے خاتون۔" تیمور نے کہا۔

خاتون آغا کا دل خوشی سے کھل گیا۔

"تو آپ نہیں جائیں گے بابا۔" جہانگیر نے فوراً تصدیق کرانا چاہی۔

"ہم جائیں گے جہانگیر۔۔۔۔ لیکن تم دونوں ہمارے ساتھ ہو گے۔"

الجائی خاتون کی خشک آنکھوں میں ایک دم خوشی کے آنسو تیر گئے۔ جہانگیر، باپ کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

○

شہر سبز میں ظفر یاب اور گل عذار کے مکانات ایک ہی محلے میں تھے۔ چنانچہ بارات ایک گھر سے چڑھی اور دوسرے گھر اسی رات دلہن رخصت ہو کر آ گئی۔

ظفر یاب دوستوں میں بیٹھا خوش گپیوں میں مصروف تھا کہ اس پر غلوں کی قیامت ٹوٹ پڑی۔ مغل بڑے منظم طریقے سے تاکاری آبادیوں کو لوٹتے اور لڑکیوں کو پکڑ کر لے جاتے تھے۔ انہوں نے پہلے بڑی خاموشی سے گھر کے دالان حصے کو گھیرا۔ پھر پانچ مغل تلواریں کھینچتے ہوئے زنانے حصے میں گھس گئے۔ مردوں کو اس وقت خبر ہوئی جب اندر سے عورتوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آئیں۔ وہ زنان خانے کی طرف دوڑے لیکن مغل سواروں کی چمکتی تلواروں نے انہیں آگے بڑھنے سے روک دیا۔

گھر والے ابھی حالات کا پوری طرح اندازہ بھی نہ کر پائے تھے کہ مغل سوار گھوڑے دوڑا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مغل سوار گل عذار اور اس کی پانچ سہیلیوں کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔

یہ ڈاکو آندھی کی طرح آئے اور بگولوں کی طرح نکل گئے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ ظرفا سب سے خراب تھا۔ وہ ابھی دلہن کا تصور لیے دوستوں سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا اور اب اس کی خوشی پر پڑ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو وہ تلوار کھینچ کر گھوڑے کی طرف بڑھا۔ دوستوں نے دوڑ کر اسے پکڑ لیا کتنی تعداد میں آئے تھے کسی کو اندازہ نہ تھا۔ پھر رات میں ان کا تعاقب کرنا اپنی موت کو دعوت دینا تھا۔ نتیجہ سب رو دھو کر بیٹھ گئے۔ غلامی کا دوسرا نام کم ہمتی ہے۔ تاتاریوں پر مغلوں کا اتنا رعب بیٹھا ہوا تھا کہ وہ ان سے بھی ڈرتے تھے۔

مغل ڈاکو لڑکیوں کو اپنے آگے بٹھائے گھوڑے بھگائے چلے جا رہے تھے۔ لوٹ کا قیمتی سامان خاص پر بار کر رکھا تھا۔ یہ جب لوٹ مار کرنے نکلتے اتنی ہی تعداد میں گھوڑے ساتھ رکھتے تھے تاکہ ہر ایک اپنا گھوڑا سامان پر لاد لے۔ مغلوں کو اس ڈکیتی میں کافی سامان ہاتھ لگا تھا۔ انہوں نے شادی کے گھر کو تاراج کیا تھا۔ پورا جہیز اور مہمان خواتین کے زیورات نہ اٹھا لائے تھے۔ گل عذار اور اس کے ساتھ گرفتار ہونے والی سہیلیاں تک اپنا قیمتی زیور نہ اتار سکا تھا اور وہ اسی حالت میں گرفتار ہو گئی تھیں۔

مغل سواروں کی تعداد صرف بیس تھی۔ وہ رات بھر بغیر دم لیے گھوڑے بھگاتے رہے۔ صبح کو جب نمودار ہوا تو انہوں نے گھوڑے روکے۔ انہیں اپنے تعاقب کا خدشہ تو نہ تھا۔ پھر بھی وہ کسی قسم کا خطرہ مول لینے تیار نہ تھے۔ ان کا مقصد لڑائی جھگڑا یا جنگ کرنا نہ تھا۔ وہ مال و دولت حاصل کرنے آئے تھے اور ان کا یہ مقصد حاصل ہو گیا تھا۔

اغوا ہونے والی لڑکیاں ان کے لیے دولت کا بہت بڑا ذریعہ تھیں۔ ان لڑکیوں کو پکڑ کر وہ مغل لشکر (لشکر) میں لے جاتے اور بھاری رقم کے عوض فروخت کر دیتے تھے۔

مغلوں میں یہ دستور تھا کہ جنگ یا امن کے زمانے میں وہ ایک سے دوسری جگہ جاتے تو پورے گھر اہل و عیال کے ساتھ جاتے تھے۔ بلادِ شمال کے خانِ اعظم کے ساتھ جو لشکر تاتاریوں پر حملہ آور ہوا تھا وہ بھی تاتاری علاقوں میں آیا تھا۔ خانِ اعظم تو واپس جا چکا تھا لیکن اس کا بیٹا شہزادہ الیاس اور ایک جتھہ سوار لشکر کے ساتھ سمرقند سے پندرہ میل اوپر ٹھہرا ہوا تھا۔

یہ ان کی عارضی مستقر یا خیمہ گاہ تھی۔

مغلوں کی یہ خیمہ گاہ ایک پورا شہر تھا۔ خیموں کا یہ شہر تین میل کے رقبے میں بالکل اس طرح پھیلا تھا جیسے کہ ہمارے ملک میں افغان مہاجرین کی خیمہ بستیاں ہیں۔ مغلوں کے خیمے آجکل کی طرح کے نہ ہوتے تھے۔ مغل ان خیموں کو بجائے گھر کہتے تھے۔ وہ بانس کی شاخوں کا گنبد سا بناتے، بالکل اس طرح کا جیسا قائدِ اعظم کے مزار کا گنبد ہے۔ بانس کے اس ڈھانچے پر وہ نمدہ چڑھاتے تھے۔ جب وہ کسی جگہ جاتے تو ان مکانوں کو بیس فٹ لمبی بیل گاڑیوں پر لاد دیتے تھے۔ ان گاڑیوں میں بائیس بائیس بیل جوتے جاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ مغلوں کے بائیس خاندان تھے جنہیں مغلوبہ کے چنگیز خان نے ایک بڑی حکومت قائم کی تھی۔

شہزادہ الیاس خواجہ اور سردار بیک جک اسی خیمہ گاہ میں رہتے تھے۔ ان کے خاندان والے اور فوجی دستے دوسرے سے کچھ فاصلے پر مقیم تھے۔ خیمہ گاہ میں بڑے بڑے بازار تھے جہاں خرید و فروخت کے سامان سے دکانیں سجی رہتی تھیں۔ کھیل کود اور تماشے والے بھی یہاں آ بسے تھے۔ کوہستانی گانے بجانے اور رقص کرنے والے بھی ان بازاروں میں گھومتے اور مغلوں کا دل خوش کر کے پیسے بٹورتے تھے۔ مغل فاتح تھے۔ ان کا ہاتھ کھلا ہوا تھا۔ مال و دولت کی انہیں کمی نہ تھی۔ تاتاری علاقوں میں مغلوں کو لوٹ مار کرنے کی کھلی چھٹی تھی۔

خانِ اعظم نے شمال میں جاتے وقت الیاس خواجہ اور بیک جک کو تاکید کی تھی کہ اب وہ تاتاری علاقوں کے حاکم ہیں۔ تاتاریوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت ان کا فرض ہے۔ سوائے عاید شدہ خراج کے اس سے زائد رقم وصول نہ کی جائے لیکن اس کے واپس جاتے ہی الیاس خواجہ اور بیک جک نے ہاتھ پاؤں نکالے۔ انہوں نے بڑے بڑے شہروں میں فوجی چوکیاں قائم کر دی تھیں لیکن لشکر کو خیمہ گاہ میں رکھا تھا تاکہ اگر تاتاری بغاوت کریں تو پوری طاقت سے یلغار کر دی جائے۔ تاتاریوں سے انہیں کوئی ہمدردی نہ تھی۔ انہیں تو صرف دولت چاہیے تھی اور وہ لوٹ مار سے حاصل ہو سکتی تھی۔ ہر لوٹ مار میں ان کا حصہ ہوتا تھا۔ لڑکیوں کی فروخت سے جو رقم حاصل ہوتی اس میں سے نصف الیاس خواجہ اور بیک جک کو پہنچا دی جاتی۔

دوسرے دن مغل سوار گل عذار، اس کی سہیلیوں اور لوٹے ہوئے سامان کے ساتھ خیمہ گاہ میں پہنچ گئے۔ الیاس خواجہ نے حکم دے رکھا تھا کہ جب مغل سوار اس قسم کی کوئی واردات کر کے واپس آئیں تو سمرقند میں ہرگز داخل نہ ہوں کیونکہ خانِ اعظم نے تیمور کو سمرقند کا مقامی ناظم مقرر کیا تھا اور الیاس خواجہ اور بیک جک کو تاکید کی گئی تھی کہ تیمور کی دل آزاری نہ کی جائے۔

مغلوں کو سمرقند کے اندر بھی کسی قسم کی لوٹ مار کی اجازت نہ تھی۔ اسی وجہ سے گل عذار کو لانے والے سمرقند سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کترا کر دوسرے راستے سے مغلوں کی خیمہ گاہ پہنچ گئے۔

گل عذار یا اس کی سہیلیوں کو راستے میں کوئی تکلیف نہ دی گئی۔ انہیں اچھا کھانا اور پھل مہیا کیا گیا کیونکہ یہ لڑکیاں فروخت کا مال تھیں۔ اگر وہ بیمار ہو جاتیں تو پھر ان کی اچھی قیمت نہ ملتی۔

خیمہ گاہ میں جو تاتاری تھے وہ غریب طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ دکان لگا کر یا پھیری لگا کر سودا بیچتے تھے۔ ان میں نہ تو حوصلہ تھا کہ وہ تاتاری لڑکیوں کو فروخت سے روک سکتے۔۔۔۔ اور نہ ان کے پاس اتنا مال تھا کہ وہ مظلوم لڑکیوں کو خرید کر آزاد کر سکتے۔

وہ منظر بڑا دردناک ہوتا جب کسی تاتاری دکاندار کے خاندان کی کوئی لڑکی گرفتار ہو کر آتی اور اسے بازار میں فروخت کے لیے کھڑی کر دی جاتی۔ لڑکی اور دکاندار ایک دوسرے کو پہچان لیتے۔ لڑکی حسرت بھری سے اسے دیکھتی لیکن دکاندار کا سر شرمساری سے جھک جاتا اور بے بسی کے آنسو آنکھوں سے نکل پڑتے

مغل سوار خیمہ گاہ میں پہنچے تو انہیں سب سے پہلے فوجی چوکی پر حاضری دینا پڑی۔ یہ چوکی اس لیے بنائی گئی تھی کہ خیمہ گاہ کے بازاروں میں فروخت کے لیے جو سامان آئے اس پر سرکاری ٹیکس وصول کیا جائے۔ چاروں طرف تمام راستوں پر اس طرح کی متعدد چوکیاں قائم تھیں۔ لوٹ کے مال کا آدھا حصہ، جو عام طور پر ان چوکیوں پر وصول کیا جاتا اور شام کو ایلخانی خواجہ اور بیگ جک کو آدھا آدھا پہنچا دیا جاتا تھا، اس لیے آنے والی لڑکیوں کی تعداد یہاں درج کر لی جاتی تھی تاکہ فروخت کرنے والے لڑکیوں کو بیچ کر آدھی رقم پہنچا دیں۔

شہر سبز سے آنے والے مغلوں نے بھی نصف مال چوکی والوں کے حوالے کر دیا۔ لڑکیوں کی تعداد پوری ہو گئی۔ اب مغل اپنا پتہ درج کرا رہے تھے۔ تاکہ اگر وہ لڑکیوں کی فروخت کی رقم کا مطالبہ حصہ چوکی میں نہ آئے تو انہیں تلاش کر کے گرفتار کیا جا سکے۔

گل عذار اور اس کی سہیلیاں چوکی کے سامنے ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھی تھیں۔ ان کے آنسو اتار کر ٹیکس کے کھاتے میں جمع کرا دیے گئے تھے۔ ان مظلوم اور بے کس لڑکیوں نے گھوڑوں پر آگے بیٹھے ہوئے مغلوں کے ظلم کا شکار کیا تھا لیکن انہیں بھوک پیاس کی کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ اور انہیں پکڑنے والوں نے ان کی کسی قسم کی دل آزاری نہیں کی تھی۔ اس لیے ذہنی فکر اور پریشانی کے باوجود ان کے چہرے قدرتی حسن سے شگفتہ تھے۔

یہ سب کی سب شہر سبز کی شریف زادیاں اور اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ صورت، شکل، جسم

کی بھی وہ شہر سبز کی چنی چنی لڑکیوں میں شمار ہوتی تھیں۔ ان کے نقوش مغل لڑکیوں ہی جیسے تھے کیونکہ مغل اور تاتار کے خاندانوں کی شاخیں آگے جا کر مل جاتی تھیں۔ مغل، ترک، تاتار، ترکمان سب ایک ہی قوم کی مختلف شاخیں تھیں جو مختلف زمانوں میں مختلف علاقوں میں آ کر آباد ہو گئی تھیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ تاتاری مسلمان ہو گئے تھے اور شہروں میں مہذب زندگی گزار رہے تھے اور شمال کے مغل اب تک قدیم، وحشیانہ اور خانہ بدوش زندگی کے عادی چلے آ رہے تھے۔

شہر میں رہنے کی وجہ سے تاتاری لڑکیوں کے تیکھے نقوش میں رعنائی اور جاذبیت پیدا ہو گئی جبکہ مغل لڑکیوں کے چہرے کرخت اور وحشت زدہ تھے۔ گل عذار تو شہر سبز کی حسین ترین لڑکی تھی۔ وہ سر جھکائے اپنے خیالوں میں کھوئی ایک مغل اس سے کچھ فاصلے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر تو گل عذار کو بغور اور دلچسپی سے دیکھتا رہا پھر اس کے قریب آ گیا۔

گل عذار نے گھبرا کر سر اٹھایا۔ ایک خوفناک چہرے والے کو اپنے سے اتنا قریب دیکھ کر وہ خوفزدہ ہو گئی۔ جوان تھا لیکن اس کا چہرہ بڑا وحشیانہ تھا۔ اس نے گل عذار کو اپنی طرف متوجہ دیکھا تو ہنسنے لگا۔ اس کی ترچھی آنکھیں اور ترچھی ہو گئیں۔

گل عذار اس کی آنکھوں میں خوفناک پرچھائیاں دیکھ کر لرز اٹھی۔

"کھڑی ہو۔ چل میرے ساتھ۔" مغل نے جیسے حکم دیا۔

"نہیں"۔ گل عذار کے منہ سے اک دم نکل گیا۔ پھر سر جھکا کر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔

گل عذار کی سہیلیوں کا خوف کی وجہ سے رنگ پیلا پڑ گیا۔ راستے میں انہیں کوئی تکلیف نہ ہوئی اس وجہ سے تقدیر پر صابر و شاکر بیٹھی تھیں مگر اس نئی صورتحال نے ان کے جسم میں کپکپی پیدا کر دی۔

مغل کچھ دیر انتظار کرتا رہا۔ پھر سخت لہجے میں بولا۔

"اٹھ گھوڑی کی اولاد۔ تاتاری۔۔۔۔"

گل عذار نے کوئی جواب نہ دیا تو مغل جوان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور کھینچ کر کھڑا کر دیا۔ گل عذار کی زور سے چیخ نکل گئی۔ گل عذار کو بلانے والے مرحوم کا منہ سے اپنے نام اور پتے لکھانے میں مصروف تھے۔ چیخ کی آواز پر انہوں نے چونک کر دیکھا۔ ایک لمحہ میں وہ سارا معاملہ سمجھ گئے۔ ان میں سے ایک تیزی سے اٹھا اور اپنے ساتھیوں کو پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہوا لڑکیوں کے پاس پہنچ گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بدصورت مغل جوان، گل عذار کو کھینچ کر اپنی طرف لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ گل عذار اپنی
ں۔ وہ پوری مدافعت کر رہی تھی۔ اس نے اپنی دونوں کہنیاں مغل جوان کے سینے میں اڑا دی تھیں

"چھوڑ دو اوغلو خاں۔ یہ میری قیدی ہے"۔

یہ اس مغل کی آواز تھی جو چنگی والوں کے پاس سے سب سے پہلے لڑکیوں کے پاس پہنچا تھا۔
اوغلو خان کی گرفت نرم پڑ گئی۔ گل عذار تڑپ کر دور جا کھڑی ہوئی۔ اوغلو خان کی آنکھیں نشہ
بنی تھیں۔

"تو کون ہوتا ہے مجھے حکم دینے والا۔ جانتا ہے میں کون ہوں"۔

"جانتا ہوں اوغلو خاں"۔

مغل نے ترکی بہ ترکی جواب دیا:

"تم شہزادے ہو اور شہزادے الیاس خواجہ خان کے سالے بھی ہو لیکن یہ میری قیدی ہے
میں لے جا سکتے"۔

اوغلو خان کا ہاتھ تیزی سے کمر میں لگے برچھے پر پہنچ گیا:

"تم ایک شہزادے سے بدتمیزی کر رہے ہو۔ اس کی سزا جانتے ہو"۔

"یہ کوئی بدتمیزی نہیں"۔

مغل نے بھی ہاتھ تلوار کے قبضے پر جما لیا:

"میں اور میرے ساتھی ان لڑکیوں کو پکڑ کر لائے ہیں۔ میں نے آدھا مال چنگی خانے میں جمع کرا
لڑکیاں میری ملکیت ہیں۔ ان پر کوئی قبضہ نہیں کر سکتا"۔

اس تکرار کے دوران، مغل کے باقی ساتھی اور چنگی کا منشی مع اپنے دس مسلح ساتھیوں کے
کے کہ اوغلو خان کا برچھا نکلے یا مغل تلوار بلند کرے، منشی ان کے درمیان حائل ہو گیا۔

"اوغلو خان یہ کیا کر رہے ہو؟"

منشی سختی سے بولا:

"یہ لڑکیاں مغل سرکار اور ان لوگوں کی مشترکہ ملکیت ہیں۔ انہیں فروخت کر کے آدھی رقم
دربار بیگ جک کو ادا کی جائے گی"۔

"میں بھی مغل شہزادہ ہوں"۔

اوغلو چیخ کر بولا:

"قیدیوں پر میرا بھی حق ہے۔ میں بھی تاتاریوں کا آقا ہوں"۔

"بحث مت کرو اوغلو خان"۔

منشی نے اوغلو خان کی مطلق پروا نہ کی:

"تمہارا کسی تاتار پر کوئی حق نہیں۔ تم کسی علاقے کے حاکم نہیں۔ تمہارا حق الیاس خواجہ خان پر ہے۔
اس سے اپنا حق طلب کرو۔ یہ لڑکیاں فروخت کی جائیں گی۔ جو ان کی قیمت ادا کرے گا وہ اپنے ساتھ
جائے گا"۔

اوغلو خان اتنے آدمیوں میں گھر گیا تھا۔ اس نے دوسرا رُخ اختیار کیا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں سونے
کا ٹکڑا تھا۔ وہ ہاتھ سے اتارا۔ پھر اس پر تھوک کر مغل کی طرف پھینکتے ہوئے بولا:

"لے۔ میں نے اس کی قیمت ادا کر دی۔

پھر پیٹھ گھما کر گل عذار کی طرف بڑھا۔

مغل کا ہاتھ پہلے ہی شمشیر کے قبضے پر تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے تلوار کھینچ لی اور گل عذار کے سامنے
کھڑا ہو گیا:

"اوغلو خان خبردار۔ قدم آگے نہ بڑھانا"۔

اوغلو خان رک گیا۔

"کیوں؟ میں نے قیمت ادا کر دی ہے۔ اب یہ میری ملکیت ہے"۔

"نہیں"۔

مغل بھی ضد پر اڑ گیا تھا۔ اس نے تلوار ہوا میں لہرائی اور اوغلو خان کو گھورنے لگا جیسے وہ اسے
باقاعدہ مبارزت دے رہا ہو۔

مغل کو معلوم تھا کہ اوغلو خان، حاکم سمرقند الیاس خواجہ کا سالا ہے اور اس سے جنگ کا نتیجہ اس کے حق
میں اچھا نہ ہوگا لیکن ہر مغل فطری طور پر سرکش اور ضدی ہوتا ہے۔ جب اپنے ضد چڑھ جاتے تو پھر کسی کا لحاظ نہیں
کرتا۔ اوغلو خان نے پہلے برچھے پر ہاتھ ڈالا۔ پھر کچھ سوچ کر تلوار نکال لی۔ چنگی کا منشی اس موقع پر بھی ان کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

درمیان میں آ گیا۔

اوغلوخان نے منشی سے شکایت بھرے لہجے میں کہا:

"دیکھو۔ اس کی شرارت۔ میں نے قیمت ادا کر دی پھر بھی یہ مغل شہزادے پر تلوار اٹھا رہا ہے!"

منشی نے سوالیہ نظروں سے مغل کی طرف دیکھا۔ اس کے خیال میں بھی معاملہ ختم ہو گیا تھا۔ شہزادے نے قیمت دے دی تھی۔ اب مغل کی سراسر زیادتی تھی۔

مغل نے اسی طرح تلوار لہراتے ہوئے اطمینان سے کہا:

"مجھے یہ سودا منظور نہیں۔ ممکن ہے بازار میں مجھے اس سے دوگنا قیمت ملے۔ پھر میں نقصان کیوں اٹھاؤں۔"

"مجھ سے زیادہ قیمت کون دے سکتا ہے۔"

اوغلوخان دھاڑا:

"اتنا وزنی کڑا کسی کے پاس نہیں۔"

"اس کا فیصلہ تو بازار ہی میں ہو گا۔" مغل نے صاف جواب دیدیا۔

منشی کو بولنا پڑا:

"اوغلوخان۔ تم اسے مجبور نہیں کر سکتے۔ تمہیں لڑکی کو حاصل کرنا ہے تو بازار میں بولی لگاؤ۔"

اوغلوخان پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ اس نے تلوار نیام میں کر لی۔ بولا:

"اچھا چلو بازار میں۔ دیکھتا ہوں مجھ سے زیادہ قیمت کون دیتا ہے۔"

مغل کا دماغ جیسے بالکل ہی پھر گیا تھا:

"لڑکیاں ابھی بازار نہیں جائیں گی۔"

"کیوں نہیں جائیں گی؟" اوغلوخان کے بجائے یہ سوال چنگی کے منشی نے کیا جسے اب غصہ آ رہا تھا۔

"لڑکیوں کو بازار میں لے جانا ہو گا۔ ان کی آدھی قیمت مجھے وصول کرنا ہے۔"

مغل لاپروائی سے بولا:

"میں نے کب انکار کیا ہے۔ لڑکیاں ابھی تھکی ہوئی ہیں۔ طویل سفر نے انہیں مضمحل کر دیا۔ حسن ماند پڑ گیا ہے۔ آج یہ آرام کریں گی۔ تاکہ کل جب میں انہیں بازار میں لے جاؤں تو ان کا حسن

مجھے ان کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول ہو گی۔"

مغل نے بڑا معقول جواب دیا تھا۔ چنگی کا منشی اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ پھر اس نے اوغلوخان کو مخاطب کیا:

"شہزادے! اپنے گھر جا کر آرام کرو۔ کل لڑکیوں کی بولی ہو گی۔ جو خرید سکتے ہو تو قیمت دے کر حاصل کر لینا۔"

اوغلوخان بزدل نہ تھا۔ اگر منشی موجود نہ ہوتا تو شاید وہ مغل سے لڑ پڑتا۔ لیکن منشی سے الجھنا مناسب نہ تھا۔ منشی الیاس خان کا ملازم تھا اور الیاس خان اپنے ملازموں کا بہت خیال رکھتا تھا۔ پھر منشی اس کے اعتماد کا آدمی تھا۔ اس کے ذریعے لوٹ کے مال کا پورا حصہ اس کے پاس پہنچ جاتا تھا۔

پہلے اوغلوخان نے تلوار نیام میں کی۔ پھر مغل نے بھی تلوار نیام میں ڈال لی۔ منشی کی وجہ سے بات رفع دفع ہو گئی۔

چنگیز خان اور ہلاکو خان کی سفاکی اور ہلاکت خیزی سے قطع نظر، تاریخ عالم انہیں دنیا کے عظیم فاتحوں میں شمار کرنے میں حق بجانب ہے۔ چین کا شہنشاہ قبلائی خان بھی اسی نسل سے تھا۔ یہ سب مغل تھے۔ مغلوں کی قومیت کے دور میں زیر بحث رہی ہے۔ شروع میں یہ لفظ "منگ" کو تھا جس کے معنی "بہادر لوگ" یا "سنہری لوگ" ہوتے ہیں۔ یہ قوم سائبیریا کی قدیم قوم تنگوسی اور قدیم ترک دونوں کی نسل سے تھی۔ اونچے قد اور مشقت پسند یہ لوگ خرائے گوبی اور شمال کے ہموار میدان میں رہتے تھے۔ ستھین، ہن اور ہیونگ نو بھی مغل قومیت رکھتے تھے۔

چنگیز اور ہلاکو کے بعد اس قوم پر زوال آیا۔ دو سو سال کے مختصر عرصے میں مغلوں کی حکومت پارہ پارہ ہو گئی۔ تیمور کے زمانے میں ان کی وسط ایشیا اور مغربی ایشیا میں صرف دو حکومتیں باقی رہ گئی تھیں۔ وسط ایشیا کی مغل حکومت سمرقند کے اوپر اوپر دریائے سائبیریا سے بحیرہ ارال تک پھیلی تھی۔ اس کا صدر مقام حصار الماليق تھا اور ہلاکو چنگیز خان کے منجھلے بیٹے جغتائی خان کی نسل حکمران تھی۔ بلاد شمال کا خان اعظم تغلق تیمور جس نے تیمور کو سمرقند کی نیابت سونپی تھی، اسی نسل کا حکمران تھا۔ شہزادہ الیاس خواجہ خان اسی کا بیٹا تھا جو ان دنوں سمرقند سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کچھ دور مغل خیمہ گاہ میں بیٹھا محکوم تاتاریوں کی دولت لوٹ رہا تھا۔

اس دن خیمہ گاہ کے بڑے بازار میں بڑی رونق تھی۔ کل چنگی پر شہزادہ اوغلو خان کا جو قافلہ تھا اس کا چرچا پورے لشکر میں ہو گیا تھا۔ اوغلو خان، الیاس خواجہ کی پہلی بیوی کا بھائی تھا۔ ایک تو مغل بیوی کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ اوغلو خان کا باپ بڑا دولت مند اور با اثر مغل تھا۔ اس نے اکلوتے بیٹے اوغلو خان کے لیے سونے چاندی کے علاوہ بہت سے قیمتی جواہرات بھی چھوڑے تھے۔ اوغلو دولت بڑی بے دردی سے خرچ کر رہا تھا۔ وہ بلا کا عیاش تھا۔

مغل بستیوں کے قریب باقاعدہ قحبہ خانے قائم کیے جاتے تھے جہاں طوائفیں مغل جوانوں کا دل بہلاتی تھیں۔ جب مغل لشکر کسی طرف کوچ کرتا تو طوائفیں بھی لشکر کے ساتھ چلتی تھیں۔ اوغلو خان کا بیشتر وقت طوائفوں کے خیموں میں گزرتا تھا۔ اوغلو خان کے پاس ان فضول خرچیوں کے باوجود کافی دولت تھی اور پورے لشکر میں اس سے زیادہ کوئی امیر نہ تھا۔

بازار لگا تو سب کا یہی خیال تھا کہ تاتاری لڑکی گل عذار کو اوغلو خان بڑی سے بڑی بولی دے کر خریدے گا۔ لشکریوں میں کوئی اتنا امیر نہ تھا۔ اگر ہوتا بھی تو اوغلو خان جیسے خودسر اور بدقماش شہزادے سے مقابلہ کر کے خواہ مخواہ کا جھگڑا کیوں مول لیتا۔ دوسرا کوئی شہزادہ لشکر گاہ میں موجود نہ تھا۔ خانِ اعظم کے ساتھ آئے شہزادے اس کے ساتھ ہی حصار امالیق واپس چلے گئے تھے۔ اس طرح اوغلو خان کی کامیابی یقینی تھی۔

تاتاری لڑکیوں کو خوب بناؤ سنگار کرا کے بازار میں لایا گیا۔ ان کا دل بجھا ہوا تھا لیکن گھبرایا ہوا بھی خوبصورت لگتا ہے۔ ان کے اداس چہرے قدرتی حسن کو چھپانے سے قاصر تھے۔

تاتاری لڑکیاں خوبصورت ہونے کے علاوہ صحت مند بھی ہوتی تھیں۔ جو لڑکی زیادہ صحت مند ہو قیمت زیادہ لگتی خواہ وہ خوبصورت زیادہ نہ بھی ہو۔ اس لیے کہ یہ لڑکیاں گھر کے کام کاج کے لیے خریدی جاتی تھیں۔ دل بہلاوہ ایک ثانوی چیز تھی۔ امیر سرداروں کی بیویاں اپنے شوہروں کو تاکید کرتی تھیں کہ ان کے لیے لڑکی خرید کر لائیں تاکہ وہ گھر کے کام کاج کے علاوہ مغل بیگمات کی بھی اچھی طرح خدمت کر سکیں۔ مغل عورتیں جیسی مشقت کی عادی نہ رہی تھیں۔ دولت کی فراوانی نے انہیں تساہل پسند اور آرام طلب بنا دیا تھا۔ لڑکیاں خوبصورت اور صحت مند تھیں۔ ان کی اچھی قیمت لگی۔ گل عذار کی سہیلیاں ایک ایک کر کے معمولی قیمت پر فروخت ہوئیں۔

جب کوئی لڑکی فروخت ہو کر خریدار کے حوالے کی جاتی تو وہ باقی لڑکیوں پر حسرت بھری نظر ڈالتی۔ یہ بھی اُسے حسرت سے دیکھتیں۔ دونوں طرف حسرت ہی حسرت تھی۔ یہ سب ایک ہی کشتی میں سوار تھیں اور سب کا انجام ایک سا تھا۔

گل عذار کو یہ تو معلوم تھا کہ اسے بھی فروخت کیا جائے گا لیکن وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی کہ اوغلو۔ ان کے علاوہ کوئی اور اسے خرید لے۔ اوغلو خان بڑے بھیانک چہرے والا مغل تھا۔ گل عذار یہ بھی جانتی تھی کہ کل کی وجہ سے اوغلو خان کا دوسروں سے جھگڑا ہوا تھا اور اوغلو خان کی توہین ہوئی تھی۔ اگر اوغلو خان نے اسے خرید لیا تو توہین کا بدلہ وہ گل عذار سے لے گا۔

اوغلو خان کی نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں اور وہ اسے دیکھ دیکھ کر سہمی جا رہی تھی۔ اوغلو خان نے کسی اور لڑکی کی طرف توجہ دی تھی نہ کسی کی قیمت لگائی تھی۔ وہ تو بس اُسی پر دانت لگائے ہوئے تھا اور دانت کٹکٹا بھی رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں سونے کے پانچ پانچ کڑے پڑے تھے اور ہاتھوں میں سونے کی ایک ایک اینٹ دبی ہوئی تھی۔ اس کا مقابلہ بھلا کون کر سکتا تھا۔

آخری لڑکی گل عذار تھی۔

اسے نیلام کی چوکی پر کھڑا کیا گیا تو اوغلو خان نے ایک جھرجھری لی اور جیسے کسی طویل خواب سے بیدار ہوا۔ سب کی نظریں اوغلو خان کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کا سر غرور سے تن گیا۔ لیکن اسی وقت بھرے بازار میں کچھ شور سا ہوا۔ لوگ گھبرا گئے اور ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ اسی وقت "ہٹو۔ بچو۔ راستہ دو" کی آوازیں آنے لگیں۔ لوگ مکھیوں کی طرح چھٹ گئے۔ راستہ بن گیا اور رقعہ نما ایک گاڑی آتی دکھائی دی جس کے آگے بیلوں کے بجائے دو گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ رقعہ کے پہیوں پر چاندی کے پترے چڑھے تھے۔

اوغلو خان کے علاوہ تمام مغلوں نے تعظیم سے سر جھکا دیے اور نظریں نیچی کر لیں۔ مغل، رقعہ نشین معزز ہستی کو پہچان گئے تھے۔

مغل تعظیم کہیں نہ بجا لاتے۔ وہ ہستی قابلِ احترام تھی ہی۔ اس کا نام خانی طورہ تھا لیکن وہ لشکر اور پوری حکومت میں "بڑی ماں" کے نام سے مشہور تھیں۔

خانی طورہ، ایلِ شمال کے خانِ اعظم خانِ تغلق تمور کی بڑی بہن تھیں۔ سفید براق بال جن کی دو چوٹیاں گوندھی ہوئی تھیں دونوں شانوں پر لٹک رہی تھیں۔ عمر ساٹھ سال سے اوپر لیکن بغیر سہارے کے رقعہ سے خود اتریں۔ لوگوں کے سر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کچھ اور جھک گئے۔

ان کے ہاتھ میں خالص سونے کی ایک چھڑی تھی جس پر چاندی کا کام کیا ہوا تھا۔ مٹھے کے اوپر لال جواہر جڑے ہوئے تھے۔

مغلوں کے لیے وہ اجنبی نہ تھیں لیکن گل عذار ان کی شان و شوکت اور رعب و دبدبہ دیکھ کر حیران خانی طورہ مجمع سے گزر کر اس جگہ جا کر رک گئیں جہاں گل عذار کو نیلامی کے لیے کھڑا کیا گیا تھا۔ لوگ بھاگ کر ایک آبنوسی کرسی اٹھا لائے۔ خانی طورہ بڑی شان سے کرسی پر بیٹھ کر گل عذار کو دیکھنے لگیں۔

خانی طورہ کا احترام و عزت اس وجہ سے نہ تھا کہ وہ مغل خاندان کی معمر ترین عورت تھیں بلکہ اس کا سبب انہوں نے مغل ولی عہد شہزادہ الیاس کو دودھ پلایا تھا۔ جس دن شام کو الیاس خواجہ پیدا ہوا اسی دن صبح کو چغتائی خان کے بچے کا انتقال ہوا تھا۔ خانی طورہ صدمے سے نڈھال منہ لپیٹے اپنے گھر میں پڑی تھی۔ وہ ولی عہد کو اپنے بھائی خانِ اعظم کو مبارکباد دینے بھی نہ گئی لیکن جب اگلے دن اسے پتہ چلا کہ الیاس کی ماں بچے کے بعد سخت بیمار ہو گئی ہے..... اس کا دودھ خشک ہے اور بچہ اب تک بھوک سے بلک رہا ہے تو بھاگی بھاگی بھائی کے گھر گئی اور بچے کو دودھ پلایا۔ حالانکہ بچے کی خالہ نے اپنا دودھ اسے پلانے کی تھی لیکن بچے نے منہ نہ لگایا اور روتا چیختا رہا۔

اس دوران خانی طورہ کے شوہر کا انتقال ہو گیا لیکن اس نے الیاس خواجہ کی وجہ سے دوسری جب سے اب تک وہ بیوگی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ پھر بھلا خانِ اعظم اس کا احترام کیوں نہ کرتا۔ الیاس کی عزت اپنی ماں سے بھی زیادہ کرتا تھا۔ جس ہستی کی بادشاہِ وقت اور ولی عہد سلطنت عزت کریں وہ کیوں باعثِ احترام کیوں نہ ہوتی۔

خانِ اعظم، خانی طورہ کو ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا لیکن جب الیاس خواجہ کو تاتاری حکومت سنبھالنے کے واپس نہ گئیں اور الیاس خواجہ کے ساتھ خیمہ گاہ میں رہنے لگیں۔ خانی طورہ اس عمر میں بھی سیر سپاٹے تقریب میں بھرپور حصہ لیتی تھیں۔ دن میں ایک بار بڑے بازار کا چکر لگانا تو ان کا معمول تھا۔ اس روز شاندار اور خوبصورت رتھ میں بازار سے گذر رہی تھیں کہ ایک جگہ زیادہ مجمع دیکھ کر ٹھہر گئیں۔ لوگوں سے کہ تاتاری کنیزوں کا نیلام ہو رہا ہے۔

اس قسم کا نیلام تو تقریباً روز ہی ہوا کرتا تھا۔ خانی طورہ کو اطمینان نہ ہوا تو انہوں نے اپنے

کہنے اونلوخان کا چنگی والا واقعہ حرف بہ حرف دہرا دیا۔

اونلوخان کچھ بدسرشت تھا۔ وہ خانی طورہ کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ حالانکہ خانی طورہ تو وہ شخصیت تھیں کہ سب سے محبت کرتیں اور سب انہیں چاہتے۔ اونلوخان کا قصہ سننے کے بعد وہ ذرا دیر کچھ سوچتی رہیں پھر رتھ کا رخ مجمع کی طرف کر دیا۔

خانی طورہ اور نیلام کی چوکی میں چار فٹ سے زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ گل عذار نے خانی طورہ کو اپنی طرف مخاطب دیکھا تو جھٹ سے سر جھکا کر سلام کر دیا۔

"میرے ساتھ چلے گی؟" خانی طورہ نے آہستہ سے پوچھا۔

گل عذار نے اثبات میں سر ہلا کر نظریں نیچی کر لیں اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

خانی طورہ کو پتہ نہیں گل عذار کا سلام کرنا یا اس طرح آنسو بہانا، کون سی ادا پسند آ گئی کہ نیلام کرنے والے کو حکم دیا:

"اتارا سے چوکی سے۔"

نیلام کرنے والا گھبرا کے پہلے خود چوکی سے کودا۔ پھر ہاتھ کے سہارے سے گل عذار کو اتارا۔ وہ مغل جو کل اونلوخان کے سامنے تلوار کھینچے کے کھڑا ہو گیا تھا، خانی طورہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر بولا:

"نہ ہے نصیب کہ خانی ماں نے میری کنیز پسند کر لی۔"

مغل کا سر ادب سے اور جھک گیا۔

"قیمت گھر آ کے لے لینا۔" خانی طورہ بڑے رعب سے بولیں۔

"کیا فرما رہی ہیں خانی ماں"۔ اور مغل خانی ماں کے پیروں میں بیٹھ گیا۔ "مجھ پر آسمانی روحوں کی مار پڑے جو آپ سے قیمت لوں۔ آپ کی ہی کنیز ہے۔"

خانی طورہ کرسی سے کھڑی ہو گئیں جس کا مطلب تھا کہ خانی طورہ نے اس کا تحفہ قبول کر لیا۔ وہ کسی کا نیلام کرتیں تو دوسرے دن اسے اپنے گھر بلاتیں اور گرانقدر انعام و اکرام سے نوازتیں۔ ان کا گھر "خیمہ گھر" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

خیمہ گاہ میں بڑے گھر صرف تین تھے۔ ایک گھر الیاس خواجہ کا۔ دوسرا اس کی پہلی بیوی کا اور تیسرا خانی خانان کا۔ مغلوں میں پہلی بیوی کا درجہ بہت بلند سمجھا جاتا تھا اور اس کا گھر یا خیمہ شوہر کے خیمہ کے مغرب میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوتا تھا۔ دوسری بیویوں اور داشتاؤں کے خیمے، مشرق کی جانب لگتے تھے اور ان کی اونچائی کم ہوتی قسم کے گنبد نما، متحرک گھروں کا مغلوں میں عام رواج تھا لیکن جب سے یہ منگولیا چھوڑ کر جنوب یا مغر جا کر آباد ہوئے، اس قسم کے متحرک گھروں کا رواج کم ہو گیا۔ پہاڑی علاقوں میں سوائے شاہی خاندان کے خیموں میں رہتے تھے۔

خانی طورہ نے واپسی کا ارادہ کیا۔ گل عذار جس کا چہرہ چاند کی طرح کھل اٹھا تھا، خانی طورہ کا اشارہ پا پاس آ گئی۔

خانی نے پہلا قدم اٹھایا تھا کہ اوغلو کی آواز آئی:

"کنیز کی بولی ہو گی"۔

مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نے خانی طورہ کی بات رد کرنے کی جرأت کی تھی پلٹ کر اوغلو خان پر حقارت بھری نظریں ڈالیں۔ ان نظروں میں حقارت سے زیادہ قہر بھرا ہوا تھا۔

"کنیز کا مالک میں اور میرے ساتھی ہیں"۔

مغل نے اوغلو خان کا وار جیسے خود پر روک لیا:

"میں جسے چاہوں کنیز بخش دوں یا تحفہ میں دیدوں۔ کسی کو دخل دینے کی ضرورت نہیں"۔

"یہ نہیں ہو سکتا"۔

اوغلو خان ایک بار پھر تلوار کھینچ کر کھڑا ہو گیا۔

"قانون سب کے لیے ایک جیسا ہے۔ میں بغیر نیلامی کے کنیز کو نہیں جانے دوں گا"۔

مغل نے بھی تلوار کھینچنا چاہی لیکن خانی طورہ نے اسے اشارے سے منع کر دیا۔ لوگ پریشان دیکھیے اب کیا ہوتا ہے۔ اوغلو خان بازار میں اکیلا نہ تھا۔ اس کے ساتھ اس کے بدقماش دوستوں پورا گروہ تھا جن کے ہاتھ تلواروں پر پہنچ چکے تھے اور وہ اوغلو کے اشارے کے منتظر تھے۔

دوسری طرف خانی طورہ کے وہ عقیدتمند آنکھیں لال پیلی کر رہے تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ اوغلو خان کے مقابلے پر آ کر ان کی توہین کی ہے۔

خانی طورہ بلاوجہ کا خون خرابہ پسند نہ کرتی تھیں۔ انہوں نے بگڑی ہوئی صورتحال کو خود ہی سنبھا واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گئیں۔

لڑکی کو نیلام کیا جائے"۔ خانی نے حکم دیا۔

نیلام کرنے والے نے بادلِ نخواستہ گل عذار کا ہاتھ پکڑ کر پھر سے چوکی کھڑا کر دیا۔ گل عذار کا رہ رہا تھا اور آنسو دوبارہ جاری ہو چکے تھے۔ لوگ بہت جز بز ہو رہے تھے لیکن خانی طورہ کے پاس سے خاموش تھے۔

نیلامی بولنے والے کی آواز آئی:

"پہلی بولی"۔

اوغلو خان اپنی جگہ سے دو قدم آگے بڑھ کر بولا:

"پہلی بولی میری ہے"۔

یہ کہتے ہوئے اس نے تلوار نیام میں کر لی اور سونے کی اینٹیں جنہیں تلوار کھینچتے وقت اس نے ایک ہاتھ میں ڈال لیا تھا۔ وہ تھیلا اس نے نیلام کی چوکی کے پاس الٹ دیا۔ تھیلے میں دو اینٹیں اور تھیں پھر اس نے ہاتھوں سے سونے کے کڑے اتارے۔ اوغلو خان شاید پہلی اور آخری بولی لگانا چاہتا تھا اس لیے اس نے اپنے ہیرے کی انگوٹھی بھی اتار کے اس ڈھیر میں شامل کر دی۔

"یہ میری پہلی بولی ہے"۔ اوغلو نے سینہ تان کر کہا۔

مجمع پریشان ہو گیا۔ ظاہر ہے خانی طورہ کے پاس اس وقت اتنا سونا موجود نہ تھا اور بولی بیچ بازار ہو رہی تھی۔ خانی طورہ کو گھر جانے یا گھر سے کچھ منگوانے کا بھی موقع نہ تھا۔ مجمع کو اوغلو خان کی کامیابی نظر آنے لگی۔ گل عذار کی روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں۔

"موت کیوں آ گئی ہے۔ آواز دے"۔

اوغلو خان نے نیلام کرنے والے کو ڈانٹا:

"کون ہے مقابلے پر بولی دینے والا"۔

نیلام کرنے والا، اوغلو خان کی ڈانٹ پی گیا۔ اس نے نظر گھما کر خانی طورہ کی طرف دیکھا۔ سب کی نظریں خانی طورہ پر جمی ہوئی تھیں۔

خانی طورہ کے لب ہلے:

"میرا اس ہونے اور انگوٹھی سے دوگنی بولی دیتی ہوں"۔

مجمع میں جان پڑ گئی۔ گل عذار کے چہرے کی رونق لوٹ آئی۔ نظریں گھما کر اوغلو خان پر ٹھہر

"بولی ادھار نہیں ہوا کرتی خانی ماں"۔

اوغلو خان نے بڑے تمسخر سے قہقہہ لگایا:

"مال نکال کر سامنے رکھیے ورنہ کنیز میری ہو گئی"۔

اوغلو خان بڑے فخر سے قدم اٹھاتا ہوا نیلامی کی چوکی کے پاس آ گیا:

"کیا بولی ادھار ہو سکتی ہے؟" اس نے بولی بولنے والے سے سوال کیا۔

وہ گھبرا گیا۔

"دیکھیے خان۔ خانی ماں کی بات۔۔۔۔"

"میرے سوال کا جواب دے"۔

اوغلو خان نے اسے ڈپٹا:

"ادھار بولی ہو سکتی ہے تو میں بھی بولوں گا"۔

"دیکھیے ناخانہ میں۔۔۔۔" نیلام کنندہ کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ بات کیسے بنائے۔ ادھار بولی کسی نے نہ دی تھی لیکن خانی طورہ کی بات اور تھی۔ ان کی بات ہی نقد رقم تھی۔

خانی طورہ نے نیلام کرنے والے کو بدحواس دیکھا تو اپنی سونے کی چھڑی چوکی کے پاس ڈال دی۔ کا وزن تو زیادہ نہ تھا لیکن اس میں جڑے ہوئے ہیرے جواہرات کی قیمت، اوغلو خان کے سونے سے زیادہ تھی۔

"یہ میرا مال ہے اور یہ میری بولی ہے"۔ خانی طورہ ذرا اونچی آواز میں بولیں۔

نیلام کرنے والے کی مشکل آسان ہوئی۔ اس نے اوغلو خان کی طرف دیکھا:

"خان۔ اب کیا کہتے ہیں آپ؟"

"میرا سونا زیادہ ہے۔ میری بولی بڑی ہے"۔ اوغلو خان اڑ گیا۔

"سونا کم ہے مگر چھڑی جڑاؤ ہے"۔

خانی طورہ کے بجائے نیلام کرنے والے نے جواب دیا:

"چھڑی کے جواہرات بہت قیمتی ہیں"۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تو نیلام کرنے والا کون ہے؟"

اوغلو خان گرجا۔ پھر اس نے بڑھ کر چھڑی اٹھائی۔ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ہتھیلی پر رکھ کر وزن کا اندازہ کیا۔

بعد بولا:

"اس میں سونا بہت کم ہے۔ صرف چار ہیرے جڑے ہیں۔ ایک ہیرا میری انگوٹھی میں بھی ہے۔ میرا مال ہے۔ میری بولی اونچی ہے۔ میرا سونا ان چار ہیروں سے زیادہ قیمت کا ہے۔ دس بارہ ہیرے ہوتے تو بھی لیتا"۔

نیلام کرنے والا عجب مخمصے میں پھنس گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اوغلو خان کو کس طرح سے رے۔ سب کا یہی خیال تھا کہ چھڑی کی قیمت اوغلو خان کے مال سے کہیں زیادہ ہے۔

خانی طورہ کو غصہ تو بہت آیا۔ ان کے اختیارات اتنے تھے کہ اگر چاہتیں تو سواروں کو بلا کر اوغلو خان کو ابھی ار دیتیں۔ وہ کئی آدمیوں کی تغلق تمور اور الیاس خواجہ سے کہہ کر جان بخشی کرا چکی تھیں لیکن انہوں نے ن کے منہ نہ لگنا چاہا۔

خانی طورہ نے قریب کھڑے ہوئے ایک آدمی کو اشارے سے بلایا۔ وہ بڑھ کے آیا اور ہاتھ باندھ کر حکم کا نے لگا۔

"میری گاڑی کے پاس جا"۔

خانی طورہ اطمینان سے بولیں:

"میری کنیز سے کہنا کہ بچوں کے کھلونے لے کے آ جائے"۔

"کھلونے؟" وہ آدمی حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔

"جاتو۔۔۔۔ میں نے کہہ تو دیا"۔ خانی طورہ کے چہرے کی جھریاں جیسے مسکرانے لگیں۔

آدمی چلا گیا تو اوغلو خان ہنس کر بولا:

"خانی ماں۔ میں کھلونوں سے نہیں بہل سکتا۔ بولی دیجیے یا ہار مان جائیے"۔

خانی طورہ نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ انہوں نے گردن گھما کر دیکھا۔ دور تک آدمیوں کے درمیان ستہ بنا ہوا تھا۔ ان کی کنیز تیز تیز قدموں سے آ رہی تھی۔ چھوٹے قد اور چپٹی ناک والی کنیز تبتی معلوم ہوتی تھی۔ زدیک آ کر ایک تھیلی خانی طورہ کے ہاتھ میں تھما دی۔ جس کے منہ پر ڈوری بندھی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خانی طورہ نے تھیلی کھولتے ہوئے کنیز سے کہا:

"لنکا، میری چھڑی اٹھالے۔"

لنکا نے جھک کر زمین سے چھڑی اٹھائی۔

خانی طورہ نے کھلی تھیلی چوکی کی طرف اچھال دی۔ تھیلی زمین پر گری تو اس میں بھرے ہوئے جواہرات دور تک بکھر گئے۔

"دیکھ لے اوغلو..... یہ شہزادوں اور شہزادیوں کے کھلونے ہیں۔"

خانی طورہ کے ہونٹ غصے سے پھڑک رہے تھے:

"جا..... باپ کی قبر پر جا۔ مانگ جا کے اس سے اس طرح کے کھلونے۔"

ہیرے زمین پر پڑے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ لوگ حیرت سے کبھی ہیروں کو اور کبھی خانی طورہ کو دیکھتے۔ اوغلو خان کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"چل لڑکی میرے ساتھ۔" خانی طورہ کھڑی ہو گئیں۔

گل عذار کو ایک بار پھر زندگی مل گئی۔ وہ چوکی سے اتر پڑی۔ خانی طورہ رتھ کی طرف جا رہی تھیں ان کے پیچھے ہولی۔

نیلام کرنے والا جلدی جلدی ہیرے بٹورنے لگا۔ اوغلو خان خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ انگوٹھی اور سونے کی اینٹیں اٹھا کے تھیلے میں بھر لیں۔ سامنے گل عذار رتھ میں بیٹھ رہی تھی۔

○

خانی طورہ کا گنبد نما گھر بھی الیاس خواجہ کے گھر کے مغرب کی جانب تھا۔ ان کی حیثیت، الیاس سے کمتر نہ تھی۔ خانی طورہ کو پانچ سو ارد اتی حفاظت کے لیے ملے ہوئے تھے لیکن وہ ان سے کوئی محافظوں کے باہر جاتیں۔ شام کو الیاس خواجہ خود ان سے ملنے آیا۔ اسے کل اور آج کے واقعے پہنچی تھی۔ اس نے اوغلو خان کو بلا کر بڑی پھٹکار لگائی تھی اور یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر وہ اپنی ذا باز نہ آیا تو اسے خیمہ گاہ سے نکال دیا جائے گا۔ الیاس خواجہ اب خانی ماں سے معذرت کرنے آیا تھا

خانی طورہ کا گنبد نما مکان اندر سے خوب سجا ہوا تھا۔ اس میں کئی کمرے تھے۔ بانس کی کھپچیوں پر کپڑا چڑھا کے کمرے کو دوسرے کمرے سے الگ کیا گیا تھا۔ زمین پر بیش قیمت قالینوں کا فرش تھا۔ دروازوں پر پردے پڑے تھے۔ مغل، چار پائیوں کے بجائے نمدوں کے بستر استعمال کرتے تھے۔ میز، کرسیوں کی بجائے چوکیاں ہوتی تھیں۔ اندر آنے کے لیے صرف ایک دروازہ ہوتا پھر گیلری جیسا راستہ جس کے دونوں طرف کمرے ہوتے۔

الیاس خواجہ سر جھکائے آیا اور ادب سے سلام کر کے خانی طورہ کے سامنے بیٹھ گیا۔ کمرے میں دونوں کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔

دو دو منٹ تک خاموشی رہی۔ الیاس خواجہ معذرت کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہا تھا اور خانی طورہ غصے میں بیٹھی تھیں۔

"میں بہت شرمندہ ہوں خانی ماں۔" آخر الیاس خواجہ نے خاموشی کا قفل توڑا۔

"ہوں!"

خانی طورہ نے نظر اٹھا کر الیاس خواجہ کو دیکھا:

"الیاس! تو شرمندہ ہو یا نہ ہو، میں اب یہاں نہیں رہ سکتی۔ تو نے اور تیری بیوی نے مانڈ چھوڑ رکھا ہے ایک کو سینگ مارنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ بڑوں کا تو ادب ہی اٹھ گیا ہے اب۔ ذلت کی سی ذلت ہے نے بھرے بازار میں جواب دیے ہیں۔"

الیاس خواجہ دم سادھے بیٹھا رہا۔ پھر خانی طورہ کے پیر پکڑ کر بولا:

"معاف کر دو خانی ماں۔ تم خانی ماں نہیں، میری ماں ہو۔ تم نے مجھے زندگی دی ہے۔ تم دودھ نہ پلاتیں تو مر جاتا۔"

الیاس خواجہ کی آنکھیں جیسے بھر آئیں۔

خانی طورہ اسے گھور رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر تڑپ اٹھیں۔ ان کی ممتا جاگ اٹھی۔ انہوں نے الیاس کو بیٹے کی طرح پالا تھا۔ بولیں:

"اچھا۔ پریشان مت ہو۔ میں نہیں جاؤں گی لیکن اسے منع کر دے میرے منہ نہ لگا کرے ورنہ اچھا نہ ہوگا کسی کے حق میں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اس کا بندوبست کر دیا ہے میں نے خانی ماں۔"

الیاس فوراً سنبھل کر بولا:

"اگر اس نے اب ایسی حرکت کی تو میں اسے خیمہ گاہ سے نکال باہر کروں گا۔"

الیاس خواجہ تو خانی طورہ کو مطمئن کر کے چلا گیا لیکن اوغلو خان کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ گل عذار بھی اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی اور وہ سینکڑوں آدمیوں کے مجمعے میں خوار بھی ہوا تھا۔

ایک دن اوغلو خان گھوڑا دوڑاتا ہوا خانی طورہ کے گھر کی طرف آ ہی گیا۔ خیمہ گاہ کے اس حصے پر آنے کی اجازت نہ تھی۔ یہاں الیاس خواجہ اور اس کی بیگمات کے خیمے تھے یا پھر خانی طورہ کا گھر۔ یہ ایک محلسرا تھی۔

خانی طورہ کے پانچوں محافظ خیمہ سے کچھ دور بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ایک سوار ادھر آتا دکھائی دیا۔ محافظ اچک کر گھوڑے پر سوار ہوا اور خانی طورہ کے گھر سے بہت پہلے ہی اسے جا کر روک لیا۔

"اوغلو خان۔ کدھر کا رُخ ہے؟"

محافظ نے اس کے گھوڑے سے اپنا گھوڑا بھڑا دیا۔

"ادھر نہ کوئی بازار ہے اور نہ قحبہ خانے۔"

محافظ کا یہ طنز اوغلو خان کی بدکرداری کا مظہر تھا۔

"میں۔ میں نانی ماں کے دیدار کو جا رہا ہوں۔" اوغلو خان نے بات بنائی۔

محافظ نے اسے گھور کر دیکھا۔ اس کے تیور کچھ اچھے نہ دکھائی دے رہے تھے۔

"خانی ماں نے تمہیں بلایا ہے؟" محافظ کا لہجہ اکھڑا اور سخت ہو گیا۔

اوغلو خان جھلا گیا۔ اکڑ کے بولا:

"تم محض محافظ ہو۔ شہزادوں سے گفتگو کرنے کا سلیقہ ہونا چاہیے۔ میں خانی ماں سے ملنے یا بلانے نہ بلانے کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔"

"اوغلو خان!"

محافظ کی تیوریوں پر بل پڑ گئے:

"اپنی شہزادگی الیاس خواجہ کو دکھاؤ۔ ہم جس کے محافظ ہیں اس کے سامنے تو تعلق تیور بھی گردن

جھکائے۔"

اوغلو خان نے دیکھا کہ محافظ تو اکڑتا ہی چلا جا رہا ہے تو وہ نرم پڑ گیا۔

"محافظ۔ دراصل تم میرا مطلب نہیں سمجھ سکے۔ خانی ماں کی جو عزت بڑے خان اور چھوٹے خان کی نظروں میں ہے اس سے تو واقف نہیں۔ کچھ دن پہلے مجھ سے ایک غلطی ہو گئی تھی۔ ایک تاتاری لڑکی کی وجہ سے میں ان سے خواہ مخواہ الجھ پڑا تھا۔ چھوٹے خان (الیاس خواجہ) نے میری صلح صفائی کرا دی ہے۔ میں اس لیے بار خود خانی ماں سے اپنی غلطی کی معافی مانگوں۔ تم جانتے ہو کہ اگر خانی ماں نے مجھے معاف نہ کیا تو آسمانی روحیں مجھے معاف نہیں کریں گی۔"

مغلوں میں اب تک توہم پرستی موجود تھی۔ جنوب میں آباد ہونے کی وجہ سے ان کی عادات و اطوار میں کچھ فرق آ گیا تھا لیکن وہ چنگیزی قوانین کے اب تک پابند تھے۔ تاتاری مسلمان ہو چکے تھے لیکن چغتائی مغل اب بھی بتوں۔ بادل کی گرج اور بجلی کی چمک سے وہ بہت ڈرتے تھے۔ سوائے میدانِ جنگ کے۔ اگر کہیں بجلی چمکنے لگے تو ڑا ہو کر خیموں میں گھس جاتے اور منہ پر کپڑا لپیٹ کر اوندھے پڑ جاتے تھے۔

"آسمانی روحوں" کے ذکر سے محافظ بھی خوفزدہ ہو گیا اور سرگوشی میں بولا:

"اوغلو خان۔ آسمانی روحوں کے عذاب سے بچنا ہے تو تم خانی ماں سے ضرور معافی مانگ لو۔ خانی ماں کے قبضے میں طاقت ہے۔ میں نے کئی بار رات کے وقت آسمانی روحوں کو ان کے گھر میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔"

"جبھی تو میں معافی مانگنا چاہتا ہوں۔"

اوغلو خان کو بات کرنے کا موقع مل گیا:

"چلو۔ مجھے خانی ماں کے سامنے پیش کر دو۔"

"نہیں نہیں اوغلو خان۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

محافظ جیسے خواب سے چونک پڑا:

"چھوٹے خان کے سوا کوئی اور ان کی اجازت کے بغیر ان کے خیمے کے قریب بھی نہیں آ سکتا۔"

"تو پھر تم کیا چاہتے ہو۔ میں اسی طرح گنہ گار پھرتا رہوں۔ معافی نہ مانگوں۔" اوغلو خان نے اس کے کمزور پہلو پر

"معافی تو تمہیں ضرور مانگنا چاہیے۔ کوئی تمہیں معافی مانگنے سے کیسے روک سکتا ہے۔" اس کے خیال میں یہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی گناہ تھا۔

"اچھا ٹھہرو۔ میں کوئی انتظام کرتا ہوں۔"

محافظ نے اوغلو خان کو تسلی دی اور پھر ہاتھ کے اشارے سے اپنے ایک ساتھی کو بلایا۔ ساتھی گھوڑوں پر سوار۔ . . . . خانی ماں کے خیمے سے کچھ دور مستعد کھڑے تھے۔

ایک سوار گھوڑا بڑھا کر آ گیا۔ پہلے محافظ نے کہا:

"یہ اوغلو خان ہیں۔ چھوٹے خان الیاس خواجہ کے . . . . "

"میں جانتا ہوں انہیں۔"

سوار مسکرایا:

"انہیں سب ہی جانتے ہیں۔ خوانف کے ہر خیمے پر ان کا ذکر ہوا کرتا ہے۔ بڑے فیاض ہیں یہ۔ ڈیرے والیاں ان پر جان دیتی ہیں۔"

اوغلو خان خفیف ہو گیا لیکن مصلحتاً خاموش رہا۔

"اوہ۔ تم نے تو کہانی بیان کرنا شروع کر دی۔"

پہلا محافظ چڑ گیا:

"شہزادے ایسا ہی کرتے ہیں۔ جس کے پاس دولت ہوتی ہے وہی ڈیروں پر جاتا۔ لوگ تو نہیں جا سکتے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ تم خانی ماں سے جا کے دریافت کرو کہ اوغلو خان حاضر ہونا چاہتے ہیں۔"

سوار نے گھوڑا موڑا۔

"ذرا جلدی جواب لانا۔" محافظ نے اسے تاکید کی۔

سوار گھوڑا بھگاتا خانی ماں کے خیمے پر پہنچ گیا۔ اس کی آواز پر تبتی کنیز باہر نکلی۔ سوار کی خواہش اس کے ذریعے خانی ماں تک پہنچا دی۔

خانی ماں سنتے ہی بھڑک اٹھی۔

"ذرا دیکھو تو اس کی جرأت۔ مجھ سے معافی مانگنے آیا ہے۔ مجھے مجمعے میں ذلیل کر کے اب چلا ہے آنسو پونچھنے۔ میں اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔"

خانی ماں کی تیز تیز آواز سن کر گل عذار دوسرے کمرے سے بھاگ کر ان کے پاس آ گئی۔

"کیا ہوا اماں؟" اس نے آتے ہی پریشانی سے پوچھا۔

وہ خانی ماں کو صرف "ماں" کہتی تھی۔ خانی ماں نے گل عذار کو بیٹی بنا لیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے جیتے جی اسے کسی مغل کے ہاتھ میں نہ پڑنے دیں گی۔

خانی ماں نے گل عذار کو ایک خنجر دیا تھا کہ اگر ان کی عدم موجودگی میں گل عذار کسی مصیبت میں پھنس جائے تو وہ اس خنجر سے اپنی اور اپنی عصمت کی حفاظت کر سکتی ہے۔ یہ خنجر گل عذار ہر وقت اپنے ساتھ رکھتی اور سوتے وقت قالین کے نیچے چھپا دیتی۔

خانی ماں نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا:

"وہ کمینہ یہاں تک آ پہنچا گل۔ مجھ سے معافی مانگنے آیا ہے۔ وہ بڑا مکار ہے۔ اس کا باپ بھی ایسا ہی مکار تھا۔ . . . . ضرور اس میں کوئی چال ہے۔ میں اسے اپنے گھر میں آنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ کبھی نہیں۔"

خانی ماں بولتے بولتے تھک گئیں۔ ان کی سانس تیز تیز چلنے لگی۔ گل عذار نے ان کے گلے میں اپنی بانہیں ڈال دیں۔

"آپ اپنا جی ہلکان نہ کریں۔"

پھر گل عذار، کنیز کی طرف دیکھ کر بولی:

"جاؤ کہہ دو کہ خانی ماں کے سر میں درد ہے۔ وہ اس وقت کسی سے نہیں مل سکتیں۔ جب ٹھیک ہوں گی تو خود بلوا لیں گی۔"

کنیز چلنے لگی تو خانی ماں نے اسے روکا۔ سانس درست کرتے ہوئے بولیں:

"محافظوں سے کہنا کہ کسی کے آنے جانے کی خبر مجھ تک پہنچانے کی ضرورت نہیں۔ خبردار جو آئندہ سے اس حکم میں کوتاہی ہوئی۔"

کنیز نے جو کچھ سنا تھا یاد کر کے اور ٹھہر ٹھہر کے سوار سے کہہ دیا۔ سوار نے وہ باتیں اور حکم محافظ تک پہنچا دیے۔

اوغلو خان نے بھی جواب اور احکامات سن لیے اور چپ چاپ گھوڑا گھما کر واپس ہوا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اوغلو خان کو شکست پر شکست ہو رہی تھی۔ ہر شکست کے بعد اس کے انتقامی جذبے میں شدت ہوتی جا رہی تھی۔

یہاں سے اوغلو خان سیدھا اپنے بہنوئی الیاس خواجہ کے پاس گیا۔ الیاس خواجہ اسے دیکھ کر متعجب ہوا۔ کچھ ہی دیر پہلے اوغلو خان اس سے مل کر گیا تھا۔

الیاس خواجہ نے منہ بنا کر پوچھا:

"اب کیوں آئے ہو اوغلو خان۔ تم نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ کیا پھر کوئی نیا جھگڑا لے کر آئے ہو؟"

"نہیں چھوٹے خان۔"

اوغلو خان نے چہرے پر مصومیت پیدا کر لی۔

"میں خانی ماں کے پاس گیا تھا۔"

"خانی ماں کے پاس۔"

الیاس خواجہ چیخ پڑا:

"تم ان کے پاس کیوں گئے تھے۔ کس نے کہا تھا وہاں جانے کے لیے۔ میں نے ان سے معذرت کر کے معاملہ رفع دفع کر دیا تھا۔ پھر تمہیں جانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"میں تو معافی مانگنے گیا تھا چھوٹے خان۔"

اوغلو خان نے صفائی پیش کی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے خانی ماں کے گھر جانے کی خبر الیاس خواجہ کو پہنچے گی۔ اس خیال کے تحت وہ پہلے ہی بتانے آ گیا تاکہ بعد میں اس پر پشیمان نہ پڑے۔

"اوغلو خان۔ تم نے میری جان مصیبت میں ڈال رکھی ہے۔"

الیاس خواجہ کو غصہ آ گیا:

"خاقان (تغلق تمور) کو معلوم ہوا کہ تم نے خانی ماں کو پریشان کیا ہے تو تمہارا جو حشر ہو گا وہ الگ میرے متعلق معلوم نہیں وہ کیا سوچیں گے؟ تم تاتار کی حکومت میرے ہاتھ سے نکلوا کر رہو گے۔"

"میں ان سے مل نہیں سکا چھوٹے خان۔"

اوغلو خان نے اپنی صفائی میں مزید کہا:

"انہوں نے ملنے سے انکار کر دیا۔"

"بہت اچھا ہوا اوغلو۔"

الیاس خواجہ کو کچھ اطمینان ہوا:

"وہ تمہیں دیکھتے ہی قتل کرا دیتیں۔ کون انہیں روک سکتا ہے۔ خانی ماں کے پانچوں محافظ بڑے خان کے ملازم ہیں۔ میرا اُن پر کوئی زور نہیں۔ تم قسمت والے تھے کہ بچ کر آ گئے۔"

"چھوٹے خان۔ خانم مجھ سے ناراض ہیں۔"

اوغلو خان نے پھر بات چھیڑی:

"جب تک وہ ناراض ہیں آسمانی روحیں بھی مجھ سے ناراض رہیں گی۔ مجھے ان سے معافی دلوا دیجیے چھوٹے خان۔۔۔۔!"

اوغلو خان نے کچھ ایسی مکارانہ اداکاری کی کہ الیاس خواجہ کو اس کی بات کا یقین آ گیا۔ اس نے بڑے نرم لہجے میں کہا:

"اچھا۔ میں کوشش کروں گا۔ کل مجھے مشورت پینا ہے۔ خانی ماں مبارک دینے آئیں گی میں ان سے تمہاری عرض کروں گا۔"

اوغلو خان خوشی خوشی اٹھ کے وہاں سے چلا آیا۔ اسے خانی ماں کی ناراضگی کی ذرا بھی پروا نہ تھی۔ وہ ان کے خون کا پیاسا ہو گیا تھا۔ اسے الیاس خواجہ کا ڈر تھا۔ وہ ڈرتا بھی صرف اسی سے تھا۔ وہ تو کسی آئندہ مرحلے کی نشاندہی کرنے آیا تھا۔ خانی ماں سے ملنے بھی وہ اسی غرض سے گیا تھا۔ ان سے معافی مانگنے کے بہانے وہ گھر کا مکمل جائزہ لینا چاہتا تھا۔

خانی ماں کا گھر اس نے اندر سے کبھی نہ دیکھا تھا۔ گل عذار اسی گھر میں تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اگر اسے اس گھر میں داخل ہونے کا کبھی موقع ملے تو گل عذار تک پہنچنے میں کوئی دقت نہ ہو گی لیکن وہ اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ خانم ماں کی ناراضگی اور بڑھ گئی۔

دوسرے دن الیاس خواجہ کی شربت کی رسم ادا ہونی تھی۔

یہ رسم مغل بادشاہ یعنی خانِ اعظم سے مخصوص تھی۔ جب خانِ اعظم کے گھر اولاد پیدا ہوتی تو وہ اس بیوی کے بچے کو جنم دیتا، بات چیت بند کر دیتا۔ خانِ اعظم کا گھر الگ ہوتا اور اس کی بیویاں الگ الگ رہتیں۔ بچے کی پیدائش کے بعد نہ تو اس بیوی کے پاس خود جاتا اور نہ اسے اپنے گھر میں طلب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرتا۔ یہ کیفیت اس وقت تک قائم رہتی جب تک بچہ ماں کا دودھ پینا چھوڑ نہ دیتا۔ اس کے بعد ایک ساتھ دو دو پیتے جو اس بات کا اعلان ہوتا کہ اب شوہر اپنی بیوی سے پھر رجوع کر رہا ہے۔

الیاس بادشاہ اب تک خود مختار بادشاہ نہ ہوا تھا لیکن وہ ولی عہد تھا اور تغلق تمور اس سے [illegible] کرتا تھا۔ تغلق تمور بوڑھا ہو چکا تھا۔ وہ اپنی زیادہ سے زیادہ ذمے داریاں الیاس خواجہ کو سونپ رہا تھا۔ اس کا اعلان تو پہلے ہی ہو چکا تھا۔ تغلق تمور نے بعض شاہانہ مراعات بھی الیاس خواجہ کو عطا کر دی تھیں۔ شربت بھی انہی مراعات اور رسومات میں سے ایک تھی جو بادشاہِ وقت سے تعلق رکھتی تھیں۔

الیاس خواجہ کی "شربت نوشی" کے لیے بڑا اہتمام کیا گیا۔ اسے سرکاری طور پر منانے کا حکم تھا۔ سارے کو چہ و بازار کو سجا کر دلہن بنا دیا گیا۔ جگہ جگہ میں جشن منانے کا حکم تھا چنانچہ جگہ جگہ کھیل تماشے والوں کے جمگھٹے تھے۔ جگہ جگہ میلہ لگ گیا۔ شراب خانوں پر بھیڑ بڑھ گئی اور طوائفوں کی قیمت چڑھ گئی۔ ہر شخص خوشی منانے میں مصروف ہو گیا۔

لیکن یہ تمام ہنگامے الیاس خواجہ کے گھر سے دُور ہی دُور رہے۔ الیاس خواجہ کی بیگمات کے [illegible] میں کسی کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ اس رسم کا تعلق صرف بادشاہ کی ذاتِ خاص سے تھا اس لیے الیاس خواجہ کسی کو مدعو نہیں کیا گیا۔ مہمانوں میں صرف الیاس خواجہ کی بیگمات اور داشتائیں تھیں۔ صرف خانی ماں کو بلاوا گیا تھا۔ وہ بھی صرف برکت اور دعا کے لیے۔

خانی ماں اس سے پہلے بھی الیاس خواجہ کے باپ تغلق تمور کی اس رسم میں کئی بار شرکت کر چکی تھی۔ خانی ماں کی زیادہ سے زیادہ ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتا تھا اس لیے اس نے سوائے پہلی بیگم کے تمام بیگمات کو خانی ماں کے گھر بھیجا تاکہ وہ انہیں مدعو کریں۔ خانی ماں کے سر میں واقعی درد شروع ہو گیا تھا نے دعوت قبول کر لی۔

الیاس خواجہ کی بڑی بیگم یعنی پہلی بیوی کو اس کے مکان میں دلہن کی طرح سجایا گیا۔ اسے دلہن الیاس خواجہ کی تمام بیگمات موجود تھیں اور الیاس خواجہ کی خوشنودی کے لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہوتے ہوتے دلہن تیار ہو گئی۔

دلہن کی جوانی ڈھل رہی تھی لیکن بناؤ سنگار نے اس کا روپ نکھار دیا تھا۔ پھر اسے جلوس کی شکل خواجہ کے گھر لے جایا گیا۔ بادشاہ اور ملکہ کے گھر کے دروازے شمال کی جانب ہوتے تھے۔ باقی تمام

دروازے جنوب کی طرف کھلتے تھے۔

خانی ماں پہلے ہی الیاس خواجہ کے گھر پہنچ گئی تھیں۔ شربت کی رسم انہی کے ہاتھوں انجام پانی تھی۔

الیاس خواجہ کے گھر کے سامنے ساز بجانے والی عورتیں، ہاتھوں میں ساز لیے ایک قطار میں کھڑی تھیں۔ دلہن اس کے گھر سے دولہا یعنی الیاس خواجہ کے گھر لایا گیا۔ دروازے پر خانی ماں نے دلہن کا استقبال کیا۔ اسے بائیں دیں اور سر پر ہاتھ پھیرا۔

دلہن مغلوں کے روایتی لباس میں تھی۔ چہرے پر نقاب تھا۔ یہ نقاب گھوڑے کے بالوں سے بنایا گیا تھا۔ الیاس خواجہ نمدے کی مسند پر بیٹھا تھا۔ مسند قالینوں کے فرش کے اوپر لگی تھی۔ یہی اس کا بستر تھا۔ مسند دروازے کے بالکل سامنے تھا۔ مغلوں میں گھر کے مالک کا بستر ہمیشہ دروازے کے سامنے لگایا جاتا تھا دروازے پر داخل ہونے پر الیاس خواجہ نے مسند پر کھڑے ہو کر دلہن کا استقبال کیا لیکن نہ اس کا نقاب اٹھایا اور نہ ان کے جسم کی تھاہ لگنے دیا۔

خانی ماں نے شربت کا پیالہ طلب کیا۔

ایک بہت بڑا پیالہ لایا گیا جسے خانی ماں کے بوڑھے ہاتھ سنبھال نہ سکتے تھے۔ کنیز نے بھرا ہوا پیالہ الیاس خواجہ کی بیگم نمبر ۲ کو دیا۔ یہ پیالہ پہاڑی بکروں کے سینگوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ پیالے میں گھوڑی کا ٹھاد دودھ بھرا تھا۔ یہ گرمی کا زمانہ تھا۔ مغل گرمیوں میں گھوڑی کا دودھ بڑے شوق سے پیتے تھے۔

الیاس خواجہ کے سرہانے، بالوں کی رسی سے بندھا ہوا نمدے کا ایک گٹھا لٹکا تھا۔ یہ گٹھا بڑا متبرک سمجھا جاتا تھا اور بادشاہ بھائی یعنی بادشاہ کا بھائی سمجھا جاتا تھا۔

خانی ماں نے دودھ میں اپنی پانچوں انگلیاں بھگوئیں۔ پھر یہ انگلیاں اس گٹھے پر چھڑک دیں۔ اب الیاس خواجہ کے ملازمِ خاص کو گھر کے دروازے پر بلایا گیا۔ یہ ملازم بادشاہ کا باڈی گارڈ ہوتا اور رات بھر ننگی تلوار لیے بادشاہ کے گھر کے چاروں طرف پہرہ دیتا۔

پیالہ اس ملازم کے حوالے کر دیا گیا۔ ملازم پیالہ لے کر دروازے سے کچھ دُور گیا۔ پھر ایک جگہ کھڑے ہو کر اس نے جنوب کا رخ کیا۔ اس نے پیالے میں دایاں ہاتھ بھگویا۔ پھر دودھ کو جنوب کی جانب چھڑک دیا۔ یہ عمل اس نے تین بار کیا۔

مغلوں کے خیال میں جنوب میں آگ کی دیوی رہتی تھی۔ یہ عمل اس کی خوشنودی کے لیے کیا جاتا تھا۔ اس کے [illegible]

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملازم نے تین بار مشرق میں دودھ چھڑکا۔ یہ ہوا کی خوشنودی کے لیے تھا۔

شمال میں ملازم نے دودھ اس لیے چھڑکا کہ وہاں مغلوں کے آباواجداد کا قبرستان تھا۔ مغل اس رسم سے محروم رکھتے تھے کیونکہ مغرب میں چنگیز خاں کے ناجائز بیٹے جوجی خاں کی اولاد حکمرانی کرتی تھی۔ کے دوسرے تمام بیٹے اس سے نفرت کرتے تھے۔

شربت کا پیالہ اندر واپس گیا۔

خانی ماں نے برکت کے لیے پیالے کو ہاتھ سے چھوا۔ پھر دوسری بیگم نے پیالہ الیاس خواجہ کو اس نے پیالے کو منہ لگایا تھا کہ باہر سازوں کے بجنے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ یہ ساز اس وقت تک بجتے رہے جب تک الیاس خواجہ اور اس کے بعد دلہن نے دودھ نہ پی لیا۔ اس وقت دلہن کا نقاب الٹ دیا گیا اور شادی کی گئیں۔

الیاس خواجہ کی تمام بیگمات نے اپنی انگلیوں سے ہیرے کی ایک ایک انگوٹھی اتار کر دلہن کی گود میں اس بات کی علامت تھی کہ وہ دلہن کی گود ہمیشہ ہری دیکھنا چاہتی ہیں۔

نذر کے دوران الیاس خواجہ نے اوغلو خان کی پھر سفارش کی اور اسے معاف کر دینے کی خواہش کی۔ خانی ماں نے اسے فوراً ڈانٹ دیا:

"الیاس۔ پاگل ہوا ہے۔ اس پاک اور روحوں کی محفل میں تو شیطان کا نام لے رہا ہے۔ کہیں روحیں ناراض نہ ہو جائیں"۔

الیاس خواجہ سہم کر خاموش ہو گیا۔ پھر تمام مہمان چلے گئے اور دولہا دلہن گھر میں اکیلے رہ گئے۔

○

اچانک خانی ماں بیمار ہو گئیں۔

سر درد کی انہیں پہلے ہی شکایت تھی۔ پھر ضعیفی خود ہی ایک بیماری ہے۔ انہیں ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا۔ ٹانگیں کمزور ہو گئیں اور انہیں چلنا پھرنا مشکل ہو گیا۔ گنٹھیا کا مرض مغل مرد اور عورتوں میں عام تھا۔ ممکن ہے یہ دودھ پینے سے ہوتا ہو۔ کئی مغل خاقان اسی موذی مرض میں مبتلا ہو کے مرے تھے۔ مغل بادشاہ اور شاہی

زندگی تو بڑی عیش و عشرت سے گزارتے تھے لیکن بیماری کا زمانہ ان پر بڑا سخت گزرتا تھا۔ کوئی بڑا ہو یا چھوٹا، مرد ہو یا عورت، بیمار پڑتے ہی اسے اچھوت سمجھ کر الگ کر دیا جاتا تھا۔ بیمار اگر غریب ہوتا تو اسے شہر سے دور کسی جگہ ایک خیمے میں ڈال دیا جاتا۔ کھانے پینے کا سامان اس کے پاس رکھا جاتا۔ پھر اسے تنہا چھوڑ دیتے۔ بیماری بڑھ جاتی تو اسی تنہائی میں تڑپ تڑپ کر مر جاتا۔ زندگی ہوتی تو لوٹ پوٹ کے خود ہی اچھا ہو جاتا۔ اسے کسی سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ نہ کوئی اس کے پاس آ سکتا تھا۔

مغلوں کا عقیدہ تھا کہ اگر بیمار کے عزیز و اقارب اس سے ملنے جائیں گے تو ان کے ساتھ بد روحیں بھی بیمار کے پاس چلی جائیں گی اور بیمار کو بار بار آئیں گی۔ یہ بات مغلوں کے جادوگر پیشواؤں نے مشہور کر رکھی تھی۔ حالانکہ حقیقت بالکل اس کے برعکس تھی۔ مغلوں میں مشہور تھا کہ جب کسی کے جسم میں بد روح حلول کر جاتی ہے تو وہ بیمار ہو جاتا ہے۔ وہ ڈرتے تھے کہ اگر کوئی بیمار کے پاس جائے گا تو بیماری کی بد روح اس پر سوار ہو جائے گی۔ اس طرح وہ ہر بیماری کو چھوت کی بیماری سمجھتے تھے۔

خاقان چین شہنشاہ قبلائی خان نے بھی اپنے طویل محل میں اسی طرح تڑپ تڑپ کر جان دی تھی۔ جب وہ مرا تو اس کے پاس کوئی موجود نہ تھا۔ اس کی لاش دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل ہو گیا تھا کہ اس کی موت کس وقت ہوئی ہے۔ مغل اپنی چھوٹی موٹی بیماریوں کو چھپاتے تھے کہ کہیں انہیں آبادی سے نکال نہ دیا جائے۔

خانی ماں کی بیماری آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ ان کے گھر میں کوئی آتا جاتا نہیں تھا۔ بیماری کا علم گل عذار بیگم اور پانچ محافظوں کے سوا کسی اور کو نہ تھا۔ پھر بھی یہ بات زیادہ عرصے تک چھپائی نہ جا سکی۔ خانی ماں کا رتبہ بہت بلند تھا۔ بازار جانا بند ہو گیا۔ کئی اہم تقریبوں میں جن میں انہوں نے شرکت سے معذوری ظاہر کر دی۔ اس سے لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ خانی ماں کی حیثیت اس قدر بلند تھی کہ کسی کو کھل کر کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ شبہ سب کو تھا لیکن کوئی یقین سے نہ کہہ سکتا تھا کہ خانی ماں کی موت کی خبر بس اب کوئی دم میں پھیلنے والی ہے۔

گل عذار سب سے زیادہ پریشان تھی۔ اس کی زندگی اور عزت تو خانی ماں کی حیات سے وابستہ تھی۔ جب وہ نہ رہیں گی تو خدانخواستہ خانی ماں اس دنیا میں نہ رہیں تو کیا ہو گا؟ وہ کہاں جائے گی؟ اوغلو خان اس سے بھرپور انتقام لے گا اور نہ معلوم کیا کیا کرے گا؟

اصل حقیقت سے وہ اور تتی کنیز ہی واقف تھیں۔ محافظ سواروں کو ابھی تک مرض شبہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ضعیفی میں اس لیے انہوں نے گھر سے نکلنا بند کر دیا ہے۔ گل عذار اور تتی کنیز کی تمام احتیاطوں کے باوجود

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آخر خانی ماں کی بیماری کا راز طشت از بام ہو گیا۔

خانی ماں کا سب سے بڑا دشمن اودلوخان تھا۔ مغل، خانی ماں کے معتقد تھے اور ان کا دیدار باعث
سمجھتے تھے۔ خانی ماں کا رتھ اب بازار میں نہیں آ رہا تھا۔ لوگوں کو فطرتاً تشویش ہوئی۔ خیمہ گاہ میں بات پہنچ
کے کانوں میں بھنک پڑ گئی۔ وہ اس خبر کو لے اڑا۔ اس نے یہ بات مختلف ذرائع سے مغل سرداروں تک
عجیب بات تھی کہ مغل موت سے نہ ڈرتے تھے لیکن بیماری سے بہت خوفزدہ رہتے تھے۔ بیمار خواہ ان کا
قریبی عزیز کیوں نہ ہو، اس سے وہ دور بھاگتے اور فوراً الگ خیمے ڈلوا لیتے۔

اودلوخان نے یہ خبر مذہبی پیشواؤں کے کانوں تک بھی پہنچا دی۔ یہ پیشوا جن کے قبضے میں مدر
سمجھی جاتی تھیں، خانی ماں کی بیماری کی خبر سن کر بہت خوش ہوئے۔ انہیں خانی ماں سے شکوہ تھا کہ انہوں
خان سے کہہ کر ان کے ایک ساتھی کو قتل کرا دیا تھا جس نے خانی ماں سے گستاخی کی تھی۔ اس بات کا بدلہ
آ گیا تھا۔

ایاس خواجہ کو ہفتوں سے خانی ماں کی خبر نہ ملی تھی۔ "شربت نوشی" کی تقریب میں خانی ماں نے
کہ ان کے سر میں اکثر درد رہنے لگا ہے۔ اس وقت ایاس خواجہ نے کوئی خاص توجہ نہ دی تھی لیکن جب
نے دلی زبان میں خانی ماں کی بیماری کا خدشہ ظاہر کیا تو اسے بھی فکر ہوئی۔ پھر ایک دن چار یا پانچ مذہبی پیشوا
پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے خانی ماں کی بیماری کی تحقیقات کا فوری مطالبہ کیا بلکہ انہوں نے صاف الفاظ
کہ اگر خانی ماں واقعی بیمار ہیں اور انہیں بستی سے دور خیمے میں نہ پہنچایا گیا تو آسمانی روحیں ناراض ہو جائیں
پر عذاب نازل ہوگا۔

اودلوخان کی لگائی ہوئی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ مذہبی پیشواؤں کی باتوں نے اس پر تیل چھڑک دیا
کے معاملے میں وہ عام مغلوں سے ذرا ہٹ کر ہی سوچتا تھا۔ اس نے فوراً خانی ماں کی بیماری کو خیز کہہ کر ہلکا پھلکا
صرف گنٹھیا کی وجہ سے مجہول ہوئے تھے۔ یوں ان کے حواس بھی درست تھے اور بخار بھی نہیں آتا تھا۔ گنٹھیا کا
ایک پیشوا ہی آیا تھا کیونکہ دوسرے لوگ بیمار کے گھر میں جاتے ڈرتے تھے۔ خانی ماں کی بیماری سے
خوفزدہ ہو گئے تھے۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ جو مغل جتنا زیادہ صاحب اقتدار ہوتا ہے اتنی ہی زبردست
اس کے پیٹ میں گھس جاتی ہے۔

خانی ماں نے پیشوا کو اپنے پاس بلا لیا۔

پیشوا اندر آیا اور خانی ماں کے بستر کے پاس پڑی ہوئی لکڑی کی چوکی پر خود ہی بیٹھ گیا۔ اس نے
ماں کو نہ تو سلام کیا اور نہ بیٹھنے کی اجازت مانگی۔ سوائے بادشاہ کے مذہبی پیشوا کسی کو سلام نہ کرتے تھے
تو بادشاہ کی بھی پروا نہ کرتے تھے۔

خانی طورہ نے ہاتھ اٹھا کر خود ہی سلام کیا اور اس کا مزاج پوچھا۔

"تم کیسی ہو خانی طورہ؟" پیشوا نے بغیر جھجک سپاٹ لہجے میں الٹا ان سے سوال کر دیا۔

"میں بالکل اچھی ہوں"۔

خانی ماں نے صحت مندوں کی طرح جواب دیا۔

"صرف پیروں میں تکلیف ہے"۔

"چلنے پھرنے سے معذور ہو تم؟" پیشوا کے لہجے میں ذرا بھی لوچ پیدا نہ ہوا۔

"اہل محترم پیشوا۔ میں مغلوں کی عام بیماری گنٹھیا میں مبتلا ہوں"۔ خانی ماں نے اعتراف کر لیا۔

"عام بیماری نہیں خانی طورہ"۔

پیشوا کا لہجہ سخت ہو گیا۔

"یہ موت کی بیماری ہے۔ تم کسی وقت بھی مر سکتی ہو۔ تمہیں بستی سے دور رکھنا ہوگا"۔

"میں جانتی ہوں پیشوائے محترم"۔

خانی ماں کی آواز میں لرزش پیدا ہو گئی۔

"میں بستی سے باہر جانے کو تیار ہوں لیکن میں چاہتی ہوں کہ میرے ساتھ میری لڑکی اور ملازمہ کو رہنے
اجازت دی جائے"۔

"بیمار کے پاس کوئی ملازم نہیں رہ سکتا خانی طورہ"۔ پیشوا نے صاف انکار کر دیا۔

"میں بیٹی کو تو ساتھ رکھ سکتی ہوں"۔ خانی ماں کے لہجے میں ہزاروں التجائیں بھر گئیں۔

"ہاں بیٹی رہ سکتی ہے۔ مگر....."

پیشوا رک کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر بولا:

"خانی طورہ۔ تمہاری تو کوئی اولاد نہیں"۔

"ہم نے ایک ناتاری لڑکی کو گود لے لیا ہے پیشوائے محترم"۔ خانی ماں کی آواز خفیف ہو گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تاتاری لڑکی"۔

پیشوا سوچنے لگا۔ پھر فیصلہ کن انداز میں بولا:

"ٹھیک ہے۔ لڑکی تاتاری ہے تو تمہارے ساتھ رہ سکتی ہے۔ وہ تمہارے ساتھ مرجائے گی تو کوئی افسوس نہیں ہوگا اور اگر زندہ بچی تو تمہارے ساتھ ہی اسے بھی دفن کر دیں گے"۔

ان میں دستور تھا کہ جب بادشاہ مرتا تو اس کے دفن کرنے کے لیے بڑا سا گڑھا کھودتے پھر چند گھوڑے ذبح کر کے ان کا خون چھڑکتے۔ کھانے پینے کا سامان رکھتے اور ساتھ ہی بادشاہ کی چند کنیزوں یا داشتاؤں کو نئے کپڑے پہنا کر لاش کے ساتھ . . . . . زندہ دفن کر دیتے۔

گل عذار پردے کے پیچھے کھڑی خانی ماں اور پیشوا کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کے جانے کے بعد وہ خانی ماں کے پاس آئی۔ خانی ماں کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو چمک رہے تھے۔

"رو کیوں رہی ہو خانی ماں"۔

گل عذار بستر کے قریب بیٹھ گئی:

"میں تمہاری خدمت کروں گی۔ میرا ایک خدا تمہارے تمام خداؤں سے بڑا ہے۔ وہ تمہیں ضرور شفا دے گا"۔

"میں مر گئی تو کیا روؤ گی گل عذار"۔ خانم ماں نے ٹھنڈی سانس لی اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

گل عذار نے ان کی آنکھوں میں پہلی بار آنسو دیکھے تھے۔ وہ بھی رونے لگی۔ ذرا دیر بعد وہ استقلال سے بولی:

"خانی ماں۔ تم نے مجھے درندوں سے بچایا۔ زندگی دی ہے۔ میں تمہارے بعد زندہ نہ رہ سکوں گی۔ میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی"۔

خانی ماں نے ہاتھ بڑھا کر گل عذار کو اپنی طرف کھینچا۔ گل عذار ان کے سینے سے لگ کر سسکیاں لینے لگی۔

شام تک خانی ماں کا خیمہ دور ایک وادی میں لگا دیا گیا۔ یہ وادی بالکل ویران تھی۔ لوگوں کا وہاں بہت کم گزر ہوتا تھا۔ خیمے پر سفید پردہ لٹکایا گیا جس پر سرخ رنگ سے اس کا نشان بنایا گیا اور پھر مرد نے کی کھوپڑی کی لکیروں سے بنا دی گئی۔ یہ امتناعی نشان تھا جس کا مطلب تھا کہ اس طرف آنا منع ہے کیونکہ بیمار اندر ہیں۔

خانی ماں یہاں پڑا ہے۔

خانی ماں کی وفادار کنیز کو ان سے جدا کر دیا گیا۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ پھر چار پیشوا خانی کی لکڑی کے ایک تختے پر ڈال کر اس خیمے میں لے آئے۔ گل عذار اُن کے پیچھے آنسو بہاتی آ رہی تھی۔ ایسے بیمار کو پیشوا ہی ہاتھ لگا سکتے تھے اور بیمار کو امتناعی خیمے تک لانا ان کا کام تھا۔

خانی ماں کی بہتی کنیز تو روتی دھوتی ان سے الگ ہو گئی لیکن ان کے محافظ سواروں نے جھگڑا ڈال دیا۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ بڑے خان نے انہیں خانی ماں کا تاحیات ملازم بنا کے ساتھ کیا ہے اس لیے وہ خانی ماں کے قریب اس وقت تک رہیں گے جب تک وہ زندہ ہیں۔ اگر ان کا انتقال ہو گیا تو لاش لے کر مغلوں کے صدر مقام الملایق جائیں گے کیونکہ شاہی خاندان کے تمام لوگ وہیں دفن ہیں۔ یہ محافظ ایلچی خواجہ کے ماتحت تھے اس لیے وہ انہیں حکم نہ دے سکتا تھا۔

آخر بڑے بحث و مباحثے کے بعد طے پایا کہ محافظ اپنا خیمہ خانی ماں کے خیمے سے دو سو گز دور لگائیں گے اور نہ تو وہ بیمار کے خیمے میں جائیں گے اور نہ اس سے کوئی رابطہ رکھیں گے۔ اس طرح محافظوں کا خیمہ اس نے میں خانی ماں کے خیمے سے دو سو گز دور نصب کر دیا گیا۔

خانی ماں کے محافظ بڑے وفادار ثابت ہوئے۔ انہیں یہ تو یقین ہو گیا تھا کہ خانی ماں کا یہ آخری وقت ہے امتناعی خیموں میں صرف ایسے مریضوں کو رکھا جاتا تھا جن کے بچنے کی کوئی امید نہ ہو۔ ہفتے دو ہفتے میں مریضوں اٹھیں ہی ان خیموں سے اٹھائی جاتی تھیں۔

خانی ماں کے محافظ دراصل بڑے خان کے سامنے سرخرو ہونا چاہتے تھے۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ نے اپنی جان کی پروا نہ کی اور مرتے دم تک خانی ماں کی حفاظت کا فرض ادا کرتے رہے۔ اس سلسلے میں محافظ کسی حصے میں خانی ماں کے خیمے سے دور دورہ کر ایک چکر لگا لیا کرتے تھے تاکہ خانی ماں اگر زندہ بچ تو ان کی وفاداری کی گواہی دیں۔

بہتر نہیں یہ اس جگہ کی آب و ہوا کا اثر تھا یا گل عذار کی دعاؤں کی تاثیر کہ یہاں آتے ہی خانی ماں کی طبیعت پہلے ان کے پیروں میں حرکت پیدا ہوئی۔ پھر وہ پیر سمیٹنے اور کھولنے کے قابل ہو گئیں۔ زندگی کی ان کے دل میں پیدا ہو گئی۔ اور پژمردہ چہرے کی رونقیں پھر لوٹ آئیں۔ گل عذار تو خوشی کے مارے رونے لگی تھی۔ وہ خانی ماں کے گلے میں باہیں ڈال کے کہتی:

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"دیکھا خانی ماں۔ میرا خدا سب سے بڑا ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ تم بہت جلد چلنے پھرنے کے قابل ہو گی"۔ اور خانی ماں اسے سینے سے چمٹا کر پیار کر لیتیں۔

خانی ماں کو دوبارہ زندگی مل گئی۔

پہلے وہ گل عذار کے سہارے چلیں۔ پھر چھڑی کا سہارا۔ آخر وہ دن بھی آ گیا کہ وہ بغیر کسی کے کمرے میں گھومنے لگیں۔ گل عذار خوشی کے مارے دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔

"ماں۔ اب ہم اپنے گھر چلیں گے۔ گنبد والے گھر۔ اب تم بیمار تھوڑی ہو"۔ گل عذار نے لڈکا۔

"نہیں گل۔ ابھی نہیں"۔

خانی ماں نے اس کے گال تھپتھپائے:

"ابھی کچھ دن اور یہاں ٹھہرنا ہو گا"۔

"کیوں ماں؟"

گل اٹھلائی:

"میرے اللہ نے تمہارے پیر اچھے کر دیے۔ اب ہم اس ویرانے میں کیوں پڑے رہیں"۔

"گل۔ تجھے یہاں کا دستور نہیں معلوم"۔

خانی ماں اسے بتانے لگیں:

"جب بیمار اچھا ہو جاتا ہے تو اپنے پیروں سے چل کر اپنے گھر جاتا ہے۔ اس وقت ہمارے بستی کے تمام خاص و عام جمع ہوتے ہیں۔ وہ مریض کو اپنی آنکھوں سے چلتے دیکھتے ہیں۔ اگر مریض رہ جائے تو اسے پھر انتہائی خیمے میں بھیج دیتے ہیں"۔

"عجیب دستور ہے معلوں کا"۔

گل نے منہ بنایا:

"تو پھر آپ کب تک گھر جانے کے قابل ہو جائیں گی"۔

خانی ماں اس کی معصومیت پر مسکرا دیں:

"کل سے میں خیمے کے باہر سیر کرنے نکلوں گی۔ مجھے اپنی طاقت کا اندازہ ہو جائے گا"۔

آخر خانی ماں سیر کے لیے باہر نکلیں۔ محافظوں کی جو اُن پر نظر پڑی تو "خانی ماں۔ خانی ماں" کے نعرے

لگاتے ان کے پاس آ گئے۔ ان کی عقیدت خانی ماں سے اور بڑھ گئی۔

صحت یاب ہونے والے مریض کے بارے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس نے بد روح سے لڑ کر اسے اپنے پیٹ سے نکال پھینکا ہے۔ اس طرح اس کی قدر و منزلت میں اضافہ ہو جاتا تھا۔

اسی دن ایاس خواجہ کو خبر دی گئی کہ خانی ماں اچھی ہو گئی ہیں۔ وہ وادی میں سیر کرتے دیکھی گئی ہیں۔ ایاس خواجہ نہیں بہت چاہتا تھا۔ اس نے فوراً اپنے خاص ملازم کے ذریعے خانی ماں سے دریافت کیا کہ وہ کب واپسی کی ہم ادا کرنے کو تیار ہیں۔ خانی ماں نے کچھ سوچ کر دو دن بعد واپسی کا اعلان کر دیا۔ خیمہ گاہ میں یہ خبر پھیلی تو ہر شخص خانی ماں کی دوسری زندگی دیکھنے کے لیے بے چین ہو گیا۔

اس رات گل عذار نے پہلی بار اپنے شک کا اظہار کیا:

"ماں! مجھے کئی راتوں سے نیچے وادی میں ایک سایہ سا گھومتا دکھائی دیتا ہے"۔

"پگلی کہیں کی!"

خانی ماں نے پیار بھرے لہجے میں کہا:

"تیرا وہم ہے۔ یہاں تو دور دور تک آبادی کا نشان نہیں"۔

"نہیں خانی ماں"۔

گل عذار اعتماد سے بولی:

"میں نے اسے آواز دے کر پوچھا بھی کہ وہ کون ہے لیکن وہ فوراً غائب ہو گیا۔ مجھے یقین ہے ماں۔ وہ ضرور ہمارا کوئی دشمن ہے۔ جبھی تو میرے پکارنے پر بھاگ جاتا ہے"۔

"تو نے کب دیکھا تھا سایہ؟" خانی ماں بھی کچھ فکرمند ہو گئیں۔

"کب کبھی مالد میں تو اسے روز دیکھتی ہوں"۔

گل عذار نے انکشاف کیا:

"ایک دفعہ تو وہ سیدھا اس خیمہ کی طرف آ رہا تھا مگر آواز دیتے ہی چٹانیں پھلانگتا بھاگ گیا"۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تو نے محافظوں سے پوچھا؟"

خانی ماں نے مزید تصدیق کرنا چاہی:

"ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی ہماری خیریت معلوم کرنا چاہتا ہو اور خود کو ظاہر بھی نہ کرنا چاہتا ہو۔"

خانی ماں کی بات کچھ معقول تھی لیکن گل عذار نے فوراً تردید کر دی:

"یہ بات نہیں ماں۔ جب سایہ بھاگ جاتا ہے تو میں تمہیں جگانے کے بہانے شمع لے کر دروازے سے باہر نکلتی ہوں اور محافظوں کے خیمہ کی طرف رُخ کر کے اسے گردش دیتی ہوں۔ اس کے جواب میں وہ بھی روشنی کر کے ہلاتے ہیں۔ کبھی تو محافظ آواز بھی لگاتے ہیں کہ ہم جاگ رہے ہیں۔"

"اچھا تُو سو جا۔"

خانی ماں نے اس کا خوف دور کرنے کی کوشش کی:

"یہ سایہ اصل میں میرے پیٹ سے نکلی ہوئی بد روح ہے۔ بد روحیں مریض کو تو چھوڑ جاتی ہیں کے آس پاس منڈلاتی رہتی ہیں۔"

گل عذار نے یہ تو بزرگوں سے سنا تھا کہ دنیا میں نیک اور بد رُوحیں ہوتی ہیں لیکن یہ بات اس کسی طرح نہ آتی تھی کہ بد روح کے پیٹ میں گھس جانے سے کوئی بیمار ہو سکتا تھا۔ بیماری تو اللہ کی طرف ہوتی ہے۔ کبھی وہ کسی کو سزا دینے کے لیے بیمار کر دیتا ہے تو کبھی بیماری کو موت کا بہانہ بنا کر بھیجتا۔ یہ باتیں وہ خانی ماں کو کیسے سمجھاتی۔ خانی ماں توہم پرست اور بے دین تھیں۔

گل عذار نے کوئی جواب نہ دیا تو خانی ماں نے سمجھا کہ لڑکی کا خوف دور ہو گیا۔

"جا گل! اب سو جا۔"

گل اٹھ کے دوسرے کمرے میں چلی گئی اور بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی لیکن نیند اس سے خفا ہو گئی تھی۔ وہ بار بار کروٹ بدلتی۔ آنکھیں بند کرتی۔ منہ پر کپڑا ڈال لیتی یا پھر چہرہ ہاتھوں میں لیتی لیکن نیند کو نہ آنا تھا نہ آئی۔

آخر وہ جھلا کے اٹھ بیٹھی۔ آج وہ دل میں خانی ماں سے بھی خفا تھی۔ انہوں نے اس کی بات کا اعتبار اور گل کو یقین تھا کہ وہ سایہ کتنا ہی پُراسرار کیوں نہ ہو، بد رُوح نہیں ہو سکتی۔ روح تو ہوا کے جھونکے کی طرح ہے۔ اِدھر سے آیا اُدھر سے نکل گیا۔ یہ نہیں کہ جب اسے پکارا جائے یا ٹوکا جائے تو وہ نیچے اترنے

جاگتا ہوا کسی چٹان کے پیچھے چھپ جائے۔

گل عذار نے سر پر ایک سیاہ کپڑا ڈالا اور خنجر لیے ہوئے خیمے کے دروازے پر آ گئی۔ خانی ماں اپنے کمرے میں محوِ خواب تھیں۔ ان کے کمرے میں ایک شمع ٹمٹما رہی تھی۔ گل عذار نے اپنے کمرے کی شمع روشن کر لی تھی۔ خانی ماں اور اس کے کمرے کے درمیان جو پردہ پڑا تھا وہ اس قدر باریک تھا کہ خانی ماں کے ہلتے ڈولتے سائے کی صورت بھی اس کے کمرے میں جیسے در آتی تھی۔ وہ اپنے بستر پر لیٹے لیٹے ان کو سوتے ہوئے دیکھا کرتی تھی۔

تاریک رات تھی اور ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گل عذار کا اس سائے کے لیے تجسس بہت بڑھ گیا تھا۔ خانی ماں کی باتوں سے وہ کچھ اور چڑ گئی تھی۔ اس نے سوچا کیوں نہ خود سائے کے متعلق کچھ اور معلومات حاصل کرے۔ وہ تاتاری لڑکی تھی۔ مسلمان ہونے کی وجہ سے وہ بھوت پریت سے نہ ڈرتی تھی۔ بھوت پریت تو صرف "کالی" کے سائے سے بھاگ جاتے تھے۔ وہ جی کڑا کر کے خیمے سے کچھ آگے بڑھی۔ قریب ہی ایک چھوٹی چٹان تھی۔ گل عذار دبے پیروں چٹان کے پاس پہنچ گئی۔ چٹان کے قریب کھڑے ہو کر اس نے ادھر دیکھنا شروع کیا جہاں اس نے دربار سائے کو دیکھا تھا۔

اندھیرا اتنا تھا کہ اسے کچھ نظر نہ آیا۔ دس گز دور خیمہ مشکل سے نظر آ رہا تھا پھر بھلا سو گز دور وہ جگہ یا وہاں پر سایہ کیا نظر آتا۔

گل عذار خود کو کوستی ہوئی واپس ہوئی۔ ناحق وہ رات کے وقت خیمے سے نکلی۔ خانم ماں کی آنکھ کھل گئی تو اسے خیمے میں نہ پا کر کیا سوچیں گی۔ اس نے واپسی کے لیے پہلا قدم اٹھایا ہی تھا کہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ خوف کے مارے اس کے جسم کے تمام رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے جلدی جلدی درود شریف پڑھا۔ آنکھیں ملیں۔ پھر خیمے کی طرف دیکھا۔

وہی۔ ہاں وہی سایہ دبے قدموں خیمے کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایک ہی لمحے کے دوران اس کے دماغ میں سیکڑوں خیالات بجلی کی سی سرعت سے گھوم گئے۔

کون ہے یہ؟

کہیں خانی ماں کا دشمن نہ ہو؟

خانی ماں کو مارنے نہ آیا ہو؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر..... پھر..... اس کا سر چکرانے لگا لیکن اس نے خود کو سنبھالا۔ خطرہ سر پر منڈلا مدافعت کی قوت خود کر آتی ہے۔ اسے اپنے سے زیادہ خانی ماں کی فکر تھی۔ پھر ایک دم اس کے

"خانی ماں، ہوشیار۔ خانی ماں ہوشیار۔"

اور وہ اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے تیزی سے خیمے کی طرف دوڑ پڑی۔

گل عذار کی آواز اس قدر تیز اور بھیانک تھی کہ پوری وادی گونج اٹھی۔ رات کے سناٹے آواز تیز معلوم ہوتی ہے۔ گل تو گلا پھاڑ کے چلائی تھی۔

سایہ خیمے کے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ گل عذار کی بھیانک آواز یا چیخ سے وہ گھبرا گیا۔ پلٹ کر آواز کی سمت دیکھنے کی بھی کوشش نہ کی اور بے تحاشا خیمے کی دوسری طرف بھاگ نکلا۔ گل عذا خیمے کے دروازے پر پہنچ گئی۔ اس کی آواز سے خانی ماں جاگ اٹھی تھیں۔ وہ دروازے کی طرف آ رہی دروازے پر دونوں باہم ٹکراتے ٹکراتے بچیں۔

گل عذار خانی ماں سے لپٹ گئی:

"ماں۔ ماں۔ خانی ماں۔ وہ۔ وہی۔"

"ہوش میں آ بیٹی۔ وہ کون ہے۔ کہاں ہے؟" خانی ماں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔

"خانی ماں۔ وہی سایہ۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اسے۔" گل کی سانس ابھی تک پھول

"گل۔ تجھے کیا ہو گیا ہے۔ سایہ تجھے....."

"سایہ نہیں خانی ماں۔ وہ ایک آدمی تھا۔"

"آدمی۔ کہاں تھا آدمی؟"

"خیمے کے دروازے پر۔"

گل سنبھل کر کھڑی ہو گئی:

"وہ خیمے کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں آپ کو آواز نہ دیتی تو وہ خیمے میں داخل ہو جاتا۔"

"میری بچی۔ تجھے کیا ہو گیا ہے۔"

خانی ماں کو قطعی یقین نہ آیا:

"کہاں تھا وہ۔ کدھر گیا۔" اور خانی ماں جھٹ سے خیمے سے باہر نکل گئیں۔

"اں باہر نہ جا۔ وہ خیمے کے پیچھے ہو گا۔" گل عذار بھی ان کے پیچھے باہر آ گئی۔ خنجر اس کے ہاتھ میں

تھا۔

خانی ماں نے خیمے کا پورا چکر لگا لیا۔ دو چار قدم ادھر ادھر بڑھ کر جب دیکھا تو انہیں کچھ نظر نہ آیا۔

"گل عذار یہ وہم دل سے نکال دے ورنہ میں تو اچھی ہو جاؤں گی اور تو بیمار پڑ جائے گی۔"

گل عذار شرمندہ ہو گئی۔

وہ ایک حقیقت سے آشنا تھی لیکن اس کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ وہ کس طرح خانی ماں کو یقین

کہ اس کا خیمہ خطرے میں ہے۔

گل عذار کی آواز دو سو گز دور معافظوں کے خیمے تک بھی پہنچ گئی تھی۔ دو شمعیں پکڑے، نیزے

لیے وہ ان کے پاس پہنچ گئے۔

"خانی ماں۔ ان سے کچھ نہ کہیے گا۔" گل نے ... سرگوشی کی۔

اسی وقت ایک محافظ بولا:

"خانی ماں۔ آپ باہر کھڑی ہیں۔ یہ چیخ کی آواز کس کی تھی؟"

"فکر کی کوئی بات نہیں۔"

خانی ماں نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے کہا:

"بچی کو شبہ ہوا تھا کہ کوئی خیمے کے باہر آیا ہے۔ بس چیخ پڑی۔"

"ہاں خانی ماں۔"

ایک محافظ نے کہا:

"جوان لڑکیاں نہ جانے کیا کیا خواب دیکھتی ہیں اور سوتے میں کبھی ہنستی ہیں تو کبھی چیخیں مارنے

لگتی ہیں۔"

"ہاں ہاں۔ یہ خواب ہی سے ڈری ہے۔"

خانی ماں نے بات مختصر کی:

"مگر دیکھو خیمے سے دور دور تک ایک چکر لگا لو۔ ہو سکتا ہے کوئی جنگلی جانور ادھر آ نکلا ہو۔"

"بہتر ہے خانی ماں۔ آپ آرام کریں۔ ہم ابھی جا کے دیکھتے ہیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محافظ سلام کر کے مشعلیں لیے چلے گئے۔ خانی ماں گل عذار کو اپنے کمرے میں لے آئیں۔ اس کے سینے پر ہاتھ رکھا تو گل کا دل دھڑ دھڑ ہو رہا تھا۔

"تو بڑی ڈرپوک ہے گل"۔ خانی ماں مسکرائیں۔

گل عذار بھنّا اٹھی:

"میں تاتاری لڑکی ہوں ماں۔ میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ مجھے اپنی فکر نہیں۔ میں تو۔ میں تو.....

"کہہ ڈالو جو منہ میں آیا ہے"۔

خانی ماں نے اس کے رخسار پر آئے بال ہٹا دیے:

"تجھے اپنی فکر نہیں ہے تو پھر کس بات کا ڈر ہے۔ مجھ سے کیوں چھپا رہی ہے۔ بیٹیاں ماں سے نہیں چھپایا کرتیں۔ لڑکی بڑی ہو جائے تو ماں اس کی سہیلی بن جاتی ہے۔ اب مجھے صاف صاف بتا دے کہ ڈرتی ہے۔ کیوں ڈرتی ہے؟"

خانی ماں کسی اور ہی راستے پر چل پڑیں۔ گل نے انہیں حیرت سے دیکھا:

"مجھے غلط نہ سمجھو ماں۔ میں بتاتی ہوں لیکن تم اس بات کا بھی یقین نہ کرو گی"۔

"تو بہت بتا۔ مجھے بڑا اعتبار ہے"۔

"وہ تمہارا کوئی دشمن تھا خانی ماں"۔

"میرا دشمن۔ میرا کوئی دشمن نہیں"۔

خانی ماں بڑے وثوق سے بولیں:

"میری مخالفت کی جا سکتی ہے لیکن کوئی دشمنی کی حماقت نہیں کر سکتا۔ میری دشمنی موت کو آواز دینا ہے کسی نے مارنے کی کوشش کی تو خانِ اعظم قتغنی تمور اُس کے گھر بار، خاندان بلکہ محلہ اور شہر والوں کو بھی خاکستر کر دے گا۔ میری دشمنی تو ایاس خواجہ بھی مول نہیں لے سکتا۔ اس کی حکومت میرے ایک اشارے پر الٹ سکتی ہے"۔

خانی ماں تھک کر زور زور سے سانس لینے لگیں۔ گل عذار کو یقین کرنا پڑا کہ واقعی کوئی ان کا دشمن نہیں ہو سکتا۔ لیکن پھر وہ کون تھا۔ کس لیے خیمے کے پاس گیا تھا۔ مجھ سے کسی کو کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟

ایک دم سے اسے اوغلو خان کا خیال آیا مگر اس خیال کو اسے خود ہی رد کرنا پڑا۔ اوغلو خان تو

پرندہ ہے۔ اس دن وہ معافی مانگنے آیا تھا۔

گل ان خیالات میں الجھتی ہی چلی گئی۔ اب تو اسے اپنے اوپر بھی شبہ ہونے لگا۔ کہیں وہ وہم کا شکار تو نہیں ہو گئی۔ ممکن ہے کہ وہ سایہ نہ ہو بلکہ اس کے وہم نے اسے ہیولا بنا دیا ہو۔ کہتے ہیں وہم کے مریض کو ہر چیز اپنے تصور کے مطابق نظر آتی ہے۔

"ہاں خانی ماں۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ یہ سب میرا وہم ہے"۔ گل نے خیالات کی یورش سے تنگ آ کر اپنی شکست تسلیم کر لی۔

"بس جاؤ اور اچھی لڑکیوں کی طرح آنکھیں بند کر کے سو جاؤ"۔

خانی ماں نے اس کے اعتراف سے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ پھر خود ہی بات پلٹ دی:

"نہیں گل۔ میرے ہی کمرے میں سو جا اور آئندہ بھی میرے پاس سویا کر"۔

"نہیں خانی ماں"۔

گل سمجھی کہ خانی ماں اسے بزدل اور ڈرپوک سمجھ رہی ہیں:

"میں اپنے کمرے میں سوؤں گی اور ہمیشہ الگ ہی سویا کروں گی۔ مجھے کسی کا خوف نہیں"۔

گل اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

بستر پر لیٹ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں مگر اس کا وہم پھر مختلف شکلوں میں نمودار ہو گیا۔ وہ سایہ تھا ضرور کسی کا۔ اس کے دل نے کہا۔ پہلے دو دروازے دکھائی دیا اور آتشخیمے کے دروازے پر۔ اس نے گھبرا کے آنکھیں کھول دیں۔ شمع کی مدھم روشنی پردے سے چھن چھن کر اس کے کمرے میں آ رہی تھی۔ اس نے آیت الکرسی پڑھی تو دل کچھ ٹھہرا۔ اس نے کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔

رات کا نہ معلوم کون سا پہر تھا کہ گل عذار کی آنکھ پھر کھل گئی۔ وہ سوئی نہیں تھی۔ نیند کے غلبے سے اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ اسی حالت میں ذرا سی آہٹ یا کھٹکے سے آنکھ کا کھل جانا کچھ تعجب خیز نہ تھا۔ پھر یہ آہٹ یا کھٹکا کیا تھا۔ یہ تو کسی کے قدموں کی آواز تھی۔ اندھیرے میں اس کی آنکھیں تو دھوکا دے سکتی تھیں لیکن وہ بہری نہ تھا کہ اتنی صاف آواز بھی اسے سنائی نہ دیتی۔

اس نے آنکھیں ملیں۔ کانوں میں انگلیاں ڈال کر جیسے انہیں صاف کیا لیکن آواز تو قریب سے قریب تر آ رہی تھی۔ جیسے کوئی آہستہ آہستہ دبے قدموں، احتیاط کے ساتھ خیمے کی طرف بڑھ رہا ہو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گل عذار بڑی کشمکش میں مبتلا ہو گئی۔ کیا وہ واقعی اتنے بڑے وہم میں مبتلا ہو گئی ہے کہ اس کی آواز بعد اب اس کے کان بھی اسے دھوکا دینے لگے۔ یہ وہم یا دھوکا نہیں ہو سکتا۔ اس کے دل میں یقین ہو گیا۔

گل عذار نے سوچا کہ خطرے سے یوں آنکھیں بند کر لینا بزدلی ہی نہیں بے وقوفی ہے۔ اسے وقت سے پہلے خطرے کی مدافعت کا انتظام کرنا چاہیے۔

گل فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سرہانے سے خنجر نکال کر ہاتھوں میں لے لیا۔

وہ خنجر لے کر پردے کے پاس پہنچی۔ خانی ماں بڑے آرام سے سو رہی تھیں۔ گل نے انہیں جگانے کی کوشش نہ کی۔ کیونکہ کچھ گھنٹے قبل وہ گل کو وہی کہہ چکی تھیں جس نے خود اس کے اپنے اعتماد کو ڈگمگا دیا تھا۔ اور فیصلہ کیا کہ آنے والا جیسے ہی خانی ماں کے کمرے میں داخل ہو گا وہ اس پر حملہ کر دے گی۔ وہ خانی ماں کو دشمن سے بچائے گی خواہ اس کی اپنی جان ہی کیوں نہ جاتی رہے۔

قدموں کی آواز دروازے تک پہنچ گئی۔

گل کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا لیکن وہ خنجر مضبوطی سے پکڑے حملہ کرنے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ امیروں کے اس خیمے میں دروازے کے بجائے موٹا پردہ پڑا ہوا تھا۔ عام بیماروں کو جو امتیازی خیمہ دیا جاتا تھا اس میں پردہ بھی نہ ہوتا تھا۔ یہ تو خانی ماں کا خاص لحاظ تھا کہ ان کے لیے خیمے پر پردہ لٹکایا گیا تھا۔ گل نے اندازہ لگایا کہ آنے والا دروازے (پردے) پر آ کر رک گیا۔

"خانی ماں!" باہر سے ایک ڈوبی ڈوبی آواز آئی جیسے کوئی خواب میں بول رہا ہو۔

گل کا کلیجہ اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے خانی ماں کو دیکھا۔ وہ بے خبر سو رہی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے لیکن اب یہ اطمینان ضرور تھا کہ آنے والا دشمن نہیں۔ دشمن ہوتا اور کسی بری نیت سے آتا تو اسے آواز دینے کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن آخر یہ ہے کون اور اتنی رات گئے آیا کیوں ہے؟

"خانی ماں!"

اب کے آواز صاف تھی۔

"ہم سب نے دور دور تک دیکھ لیا۔ کوئی خطرے کی بات نہیں۔"

گل بے ساختہ مسکرا پڑی۔ یہ تو ان محافظوں میں سے ایک تھا جسے خانی ماں نے چاروں طرف دیکھ بھال کے لیے بھیجا تھا۔ محافظ پھر بولا۔ گل کا انتظار کرتا رہا۔ جواب کون دیتا۔ خانی ماں تو کسی اور دنیا میں پہنچی ہوئی تھیں۔

محافظ نے جواب نہ پا کر سمجھا۔

جانے والا واپس چلا۔ اس کے قدموں کے فاصلے کے ساتھ ساتھ آواز کم ہوتی گئی۔ گل واپس آئی۔ اب اس کا دل مطمئن تھا۔ لیٹتے ہی اسے نیند آ گئی۔

○

گل رات بھر جاگتی رہی تھی۔ صبح دیر تک سوئی۔ خانی ماں اسے دیکھ کر کئی بار واپس ہو گئی تھیں۔ گل بیدار ہوئی تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔ وہ جلدی سے خانی ماں کے پاس گئی اور رات کا قصہ ہنس ہنس کے انہیں بتایا۔ وہ بھی خوب ہنسیں۔ دیر تک سونے سے اس کی ساری کسلمندی دور ہو گئی تھی۔ وہ خوش بھی بہت تھی۔ آج اس خیمے میں اس کا آخری دن تھا۔ کل صبح کا سورج طلوع ہوتے ہی وہ اپنے محل نما گھر میں پہنچ جائے گی جہاں نوکر چاکر ہوں گے۔ خانی ماں کی خدمت ہو گی۔ نہ کسی کے قدموں کی آواز ہو گی اور نہ کوئی "سایہ" دکھائی دے گا۔

دن اسی ہنسی خوشی میں گزر گیا۔

شام ہوئی تو گل عذار کو دور خیمہ گاہ میں چراغ جگمگ کرتے دکھائی دیے۔ وہ خانی ماں کو باہر لے آئی۔ پوری خیمہ گاہ کی رونق ہی کچھ اور ہوتی تھی۔ خانی ماں کا دل خوشی سے لبریز ہو گیا۔ یہ اہتمام ان کی واپسی کی خوشی میں کیا گیا تھا۔ ان دکانوں سے کوئی خوش قسمت ہی زندہ واپس آتا تھا۔ جو بچ جاتا اس کا استقبال بڑے پُروقار طریقے سے ہوتا۔ خانی ماں تو شاہی خاندان سے تھیں اور سب کے لیے قابلِ احترام۔ انہیں واپس تو صبح کو جانا تھا لیکن ان کے استقبال کی تیاریاں ابھی سے شروع ہو گئی تھیں۔

وہ دونوں اس پُرلطف نظارے سے لطف اندوز ہو رہی تھیں کہ ایلچی خواجہ کی طرف سے خانی ماں اور گل کے لیے نیا لباس بھیجا گیا۔ لباس لانے والے ملازموں کے ساتھ دو جادوگر بھی تھے۔ ان میں ایک وہ بھی تھا جس نے گل سے سخت کھانی کی تھی۔ خانی ماں نے اسے فوراً پہچان لیا مگر ایسی بن گئیں جیسے اسے پہلی بار دیکھا ہے۔ وہ بڑا گھمنڈی شخص تھا۔

لباس لانے والے جادوگروں کو خانی ماں کے کمرے میں بٹھایا گیا۔ خانی ماں اور گل عذار نے نئے کپڑے پہنے اور پرانے کپڑوں کی پوٹلی بنا کر جادوگروں کے حوالے کر دی۔ جادوگران کپڑوں پر دیر تک کچھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پڑھ پڑھ کر پھونکتے رہے۔ پھر باہر لے جا کر کپڑوں میں آگ لگا دی۔ جب تک کپڑے جلتے رہے منہ ہی منہ میں پڑھتے اور پھونکتے رہے۔

جو ملازم ساتھ آئے تھے وہ اس تمام عرصے میں آنکھیں بند کیے صحن سے خیمے کے اندر ہی بیٹھے رہے جب کرداکھ ہو گئے تو دونوں جادوگر مسکراتے ہوئے واپس آئے اور خانی ماں کو مبارک باد دی۔

"مبارک ہو خانی ماں۔ بد روح شمال میں بھاگ گئی ہے۔ ہم نے حد بندی کر دی ہے اب وہ واپس آ سکتی۔"

"تم لوگ چاہو تو وہ کبھی واپس نہ آئے۔"

خانی ماں بڑی عقیدت سے بولیں:

"میں نے اس بیماری میں بڑی تکلیف اٹھائی ہے۔ اس بیماری نے ہمارے کتنے بڑے بڑے کی جان لی ہے۔"

"ہاں خانی ماں۔ گنتھیا دیوی آسمانی دیوتاؤں کی خدمت گزار ہے۔ ایک بار بڑے دیوتا نے اس سے پوچھا تھا کہ تجھے کیا انعام دیا جائے تو دیوی نے دنیا کا سب سے اچھا خون پینے کی خواہش کی تھی۔ ہم مغلوں سے زیادہ پاک صاف اور اچھا ہے۔ دیوتا نے اسے ہمارا خون بخش دیا۔ تب سے یہ مغلوں کا خون پیتی ہے چاہتا ہے کسی بد روح کو بھیج دیتی ہے جو کسی مغل کے پیٹ میں گھس کر سارا خون کھینچ لیتی ہے۔"

جادوگر نے مغلوں میں پائی جانے والی گنتھیا کی عام بیماری کی تفصیل اس طرح بیان کی جیسے یہ باتیں سامنے ہوتی تھیں۔ خانی ماں سر ہلا ہلا کر اس کی تصدیق کرتی رہیں۔

گل عذار چونکہ مسلمان تھی اسے جادوگر کی ان فضول باتوں پر غصہ آتا رہا۔

اب جادوگر نے خانی ماں سے واپسی کی تفصیلات پر گفتگو شروع کی۔ دراصل اس وقت الیاس نمائندگی کر رہے تھے۔ خانی ماں سوچ سوچ کر جواب دیتی رہیں۔

طے یہ ہوا کہ خانی ماں کو واپس لے جانے کے لیے صبح کو ایک بھی سجائی گاڑی آئے گی جس میں چھ گھوڑے جتے ہوں گے۔ جس وقت گاڑی روانہ ہو گی تو الیاس خواجہ کا غلام خاص، گھوڑے پر سوار ہو کر گاڑی کے آگے چلے گا۔ وہ الیاس خواجہ کا نمائندہ ہو گا۔

یہ گاڑی خانی ماں کو لے کر وادی میں اس جگہ تک جائے گی جہاں الیاس خواجہ مع اپنے تمام مردوں

ان کے استقبال کے لیے موجود ہو گا۔ وہاں گاڑی چھوڑ دی جائے گی اور خانی ماں ایک جلوس کی شکل میں پالکی میں اپنے گھر جائیں گی۔ اس طرح یہ شاہانہ جلوس خانی ماں کے گھر پر اختتام پذیر ہو گا۔ وہی گھر جس سے انہیں دودھ کی مکھی کی طرح کچھ دن پہلے نکالا گیا تھا۔

خانی ماں چاہتی تھیں کہ آج رات وہ پوری نیند سو لیں تاکہ کل تر و تازہ اٹھیں۔ انہیں زندگی کے امتحان سے گزرنا تھا۔ جو راستہ انہیں پیدل طے کرنا تھا وہ ایک میل سے کم نہ تھا۔ راستہ بھی اونچا نیچا اور پتھریلا تھا۔ اس قدر اتنا فاصلہ بغیر رکے طے کرنا تھا۔ اگر پیر مڑ گئے اور وہ اپنے گھر پہنچنے سے پہلے گر گئیں تو یہی مغل جو اس وقت ان پر نثار ہونے کو تیار ہیں۔ جو ان کے استقبال میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہتے ہیں، یہی لوگ آنکھیں پھیر لیں گے اور چیخ چیخ کر کہیں گے کہ:

"بڑھیا کو واپس لے جاؤ۔ اسے خیمے میں مرنے دو۔"

خانی ماں نے بہت چاہا کہ وہ لیٹ جائیں لیکن وہاں تو آنے جانے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ جادوگر رخصت ہوئے تو الیاس خواجہ کا نائب آ گیا۔ خانی ماں، بیماری کے کپڑے تبدیل کر چکی تھیں۔ کپڑے خاکستر بھی کیے جا چکے تھے اس لیے ان کے کوئی بھی مل سکتا تھا۔ ان کے خیمے سے امتناعی نشان مٹایا جا چکا تھا۔

الیاس خواجہ کا نائب السلطنت ایک گھنٹے تک خانی ماں کا دماغ چاٹتا رہا۔ اس کے آنے کی کوئی خاص وجہ نہ تھی ملاقات کے لیے آیا تھا اور خانی ماں پر یہ تاثر چھوڑنا چاہتا تھا کہ وہ ان کی بیماری کی خبر سے سخت پریشان ہوا تھا اسے جب سے ان کے صحت یاب ہونے کی خبر ملی ہے وہ بے حد خوش ہے اور اسی کا اظہار کرنے کے لیے وہ آیا ہے۔

خانی ماں نے اس بیماری کے دوران ایک ایک کو پرکھ لیا تھا۔ ان کی محبت اور منافقت دونوں ہی ان کے سامنے تھی۔

نائب السلطنت کو گئے ہوئے ایک گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ الیاس خواجہ کا خاص خادم آ گیا۔ خانی ماں سونے کے بستر پر لیٹ چکی تھیں۔ گل عذار ان کا سر دبا رہی تھی۔ اسے خانی ماں کے ساتھ خلوص دل سے محبت تھی۔ ایک کے بعد ایک آنے سے خانی ماں سے بھی زیادہ تھکاوٹ گزر رہا تھا۔ وہ بھی یہ چاہتی تھی کہ یہ رات خانی ماں پورے سکون سے گزارے تاکہ کل پیدل چلنے میں انہیں کوئی تھکن محسوس نہ ہو۔

الیاس خواجہ کے خادم خاص کا مرتبہ نائب السلطنت سے کسی طرح کم نہ تھا بلکہ خادم خاص تو خود کو نائب السلطنت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے بھی بڑا مردار سمجھتا تھا۔ نائب السلطنت کی بات رد کی جا سکتی تھی لیکن الیاس خواجہ نے آج تک خانی ماں کی کوئی بات رد نہ کی تھی۔ الیاس خواجہ کے گھر کی تمام محافظ عورتیں اور مرد اس کے ماتحت تھے۔ اس کی "داروغہ محلات" جیسی تھی۔

خانی ماں کو تکلفاً بستر پر بیٹھ کر اسے خوش آمدید کہنا پڑا۔ الیاس خواجہ نے خانی ماں کے لیے گھوڑی کا دودھ بھیجا تھا۔ گھوڑی کا دودھ مغل نہ صرف شوق سے پیتے بلکہ اسے متبرک سمجھتے تھے۔ یہ چنگیز خان کو بہت مرغوب تھا اور جو چیز چنگیز خان کو پسند تھی اسے پسند نہ کرنا بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ خادمِ خاص نے بڑی مشکل سے خانی ماں کی جان چھوڑی۔ گل عذار اپنے کمرے میں بیٹھی خانم کی جا

مکارانہ باتوں پر پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ جیسے ہی وہ باہر نکلا، گل عذار دندناتی ہوئی خانی ماں کے پاس آ گئی۔

"ماں! بس اب تم آرام کرو۔ کوئی اور آئے گا تو میں اسے تم سے نہ ملنے دوں گی۔ کہہ دوں گی خانی ماں سو رہی ہیں۔ گل..... گل کا خان آپ کے لیے بہت سخت ہے..... یونہی رات بھر لوگوں سے ملتی رہیں"

گل:

خانی ماں مسکرائیں:

"کوئی محبت سے ملنے آئے تو اسے دروازے سے نہیں ٹوکا کرتے بیٹی!"

"محبت!"

گل نے زہر خند کیا:

"میں خوب جانتی ہوں اس محبت کو۔ جب تم گھر سے نکالی جا رہی تھیں اور تینتی کنیز تمہارے ہم رو رہی تھی تو یہی ظالم اس غریب کے بال پکڑ کر تمہارے پاس سے گھسیٹتا ہوا لے گیا تھا۔ میں نے دیکھی ہے محبت۔ یہ سب دکھاوا ہے۔ منافقت ہے خانی ماں۔ یہ لوگ اعتبار کے قابل نہیں۔"

گل عذار نے ایک سانس میں دل کی بھڑاس نکال لی۔ پھر نہ جانے کیوں خانی ماں کے پیروں پر آنسو ملنے لگی۔

خانی ماں اس کی صورت غور سے دیکھتی رہیں۔ پھر محبت سے بولیں:

"گل! تم مغلوں کی محبت کو دکھاوا کہتی ہو۔ کیا تجھے یقین ہے کہ مغل کسی سے محبت نہیں کرتے؟"

"نہیں! مغل کے دل میں محبت نام کی کوئی چیز نہیں۔" وہ آنسو پونچھنے لگی۔

"میں ہوں تو مغل ہوں گل۔ کیا تجھے میری محبت پر....."

گل نے جلدی سے خانی ماں کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا:

"ایسا نہ کہو خانی ماں!..... میں تو تمہاری محبت کے سہارے زندہ ہوں۔"

گل عذار کی آنکھوں میں پھر آنسو چمک اٹھے:

"ہاں۔ میں اکثر سوچتی ہوں تم مغل نہیں تاتاری ہو۔"

"گل!"

خانی ماں کا لہجہ کھردرا ہو گیا:

"ایسا پھر کبھی نہ کہنا۔ تاتاری مغلوں کے ہی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یاد رکھو مغل، تاتاریوں سے بہتر ہیں۔ مجھے اپنے مغل ہونے پر فخر ہے۔ میں تاتاریوں کے بارے میں صحیح طور پر نہیں کہہ سکتی لیکن یہ پتے کی بات ہے کہ مغلوں کے مزاج میں "شدت" ہوتی ہے۔ وہ محبت کرتے ہیں تو ٹوٹ کے اور نفرت کرنے پر آئیں تو خون بہا کے بھی قہقہے لگاتے ہیں۔"

گل عذار کو افسوس ہوا کہ اس نے مغلوں کی توہین کر کے خانی ماں کا دل دکھایا:

"معاف کر دو ماں۔ میں جذبات میں نہ جانے کیا کیا کہہ گئی۔ مجھے تم نے جو محبت دی ہے وہ تو مجھے اپنے سگے اور بھائی بہنوں سے بھی نہ مل سکی۔ یہ محبت اور محبت کی یہ شدت تو شاید ظہیر باب میں بھی موجود....."

گل عذار کہتے کہتے اچانک خاموش ہو گئی۔

"ظہیر باب تمہارا شوہر تھا جس سے تم چھینی گئی تھیں؟" خانی ماں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ہاں ماں۔ ہم ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ پھر ہماری شادی ہو گئی لیکن ہم میاں بیوی نہ ہو سکے۔" شرمیلے سے گردن جھکا لی۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو گل؟"

خانی ماں شاید اس کی بات نہ سمجھ سکیں۔

"شادی کے بعد تو میاں بیوی مرد و عورت ہو جاتے ہیں۔"

"ہاں ماں۔ لیکن مجھے اس وقت اغوا کیا گیا جب میں دل میں ظہیر باب کا تصور اور آنکھوں میں اس کی بھرپور مردی لیے بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خانی ماں کو اس کا بہت دکھ ہوا لیکن وہ مغلوں کی برائی نہ سن سکتی تھیں اور نہ اپنی زبان سے ظالم کہہ سکتی تھیں۔

"جا۔ سو جا گل۔ تُو بہت تھکی ہوئی ہے۔"

خانی ماں نے مزید گفتگو کا دروازہ بند کر دیا۔

گل عذار بستر پر لیٹ گئی لیکن یہ بستر آج اسے کانٹوں کی طرح چبھ رہا تھا۔ ظہیر یاب کا نام ایک بار زبان سے نکل گیا تھا۔ وہ خانی ماں سے اس سلسلے میں کوئی گفتگو نہ کرنا چاہتی تھی لیکن جب ذکر آ ہی گیا تو دل کی چھپا بھی نہ سکی۔

تھکن سے اس کا جسم چُور چُور ہو رہا تھا اور ظہیر یاب کی یاد نے بھی اسے بے چین کر دیا تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے پڑی تھی لیکن نیند تو جیسے اس سے روٹھ گئی تھی۔ اس عالم میں نہ معلوم رات کا کتنا حصہ بیت گیا کہ اسے خیمے کے باہر کسی کے پیروں کی چاپ محسوس ہوئی۔ وہ گھبرا کے اٹھ بیٹھی۔

"کون ہے؟" اس کے منہ سے آہستہ سے نکل گیا۔

پیروں کی آواز ایک دم بند ہو گئی۔ گل عذار کی چھٹی حس زور سے پھڑکی۔ اسے خطرے کا احساس ہوا۔ نظر گھما کر خانی ماں کے کمرے کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے سکون سے سو رہی تھیں۔ اس کے دماغ میں کشمکش ہونے لگی۔ وہ کیا کرے؟ خانی ماں کو جگائے۔ خود باہر نکل کر دیکھے لیکن خانی ماں تو اسے پہلے ہی دم کے لئے اگر انہیں جگایا اور باہر کوئی نہ ہوا تو وہ خانی ماں کی نظروں میں کس قدر ذلیل ہو گی۔ لیکن یہ چاپ۔ یہ آواز ہو سکتا ہے یہ؟ کوئی جانور؟

جانور کے خیال سے اسے اطمینان ہوا۔

خیمہ ویران جگہ پر ہے..... ضرور کوئی جانور ہو گا۔ وہ دل کو تسلی دے کر لیٹ گئی۔

اسے یہ تو اطمینان تھا کہ اس علاقے میں کوئی جنگلی درندہ موجود نہیں۔ بیس ہزار سواروں کی فوج کے قریب کسی درندے کی موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو بستی کے قائم ہونے سے پہلے ہی کوس کا علاقہ خالی کر کے بھاگ گئے تھے۔ ہاں کتا، بلی یا جنگلی چوہے کا امکان ہو سکتا تھا۔

پھر ظہیر یاب کا خیال اسے اچانک آیا تھا۔ وہ اس کے خیالوں میں کھو گئی۔ بچپن سے جوانی تک لمحات ایک ایک کر کے اس کے تصور کے کینوس پر پھیلنے لگے۔ پیروں کی چاپ اور خطرے کا احساس

ہوا ہے محو ہو گیا۔

"کون ہے؟" معاً اس کی زبان سے نکلا۔

وہ گھبرا کے اٹھی۔ دروازے پر نظر پڑی تو اس کا پردہ ہلتا ہوا معلوم ہوا جیسے کوئی جلدی سے نکل کے باہر گیا ہے۔

خانی ماں بدستور آرام سے سو رہی تھیں۔ گل عذار نے ہاتھ بڑھا کر سرہانے سے خنجر نکال لیا۔ اس نے کوئی چاپ نہیں سنی تھی لیکن دروازے کے پردے کا اس طرح ہلنا، گل کو کسی نامعلوم خطرے کی شدت سے محسوس ہوا تھا۔

وہ دبے پاؤں خانی ماں کے کمرے سے گزر کر دروازے پر پہنچی۔ پردہ اپنی جگہ پر قائم ہو چکا تھا۔ بالکل ساکت..... گل عذار نے آہستہ سے پردہ ایک طرف سرکایا۔ کمرے میں جلتی ہوئی شمع کی روشنی ایک پتلی لکیر کے اندھیرے میں جذب ہو گئی۔

گل نے جھانک کر دیکھا۔ ہر طرف سناٹا، گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا اور اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس نے باہر نکلنے کی غلطی کر دی۔ یہ غلطی وہ پہلے کر چکی تھی اور اس کی وجہ سے خانی ماں کی نظروں میں خفیف ہو چکی تھی۔ باہر ہوا بالکل ساکن تھی۔ اس وقت دور پار کہیں بلی کے بولنے اور کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ گل عذار مطمئن ہو کر واپس آ گئی اور اس نے دل میں کہا کہ اب وہ کسی وہم میں مبتلا نہ ہو گی۔ وہم تو بزدلی کی پہلی سیڑھی ہے۔ یہ بڑھ جائے تو انسان بزدل ہو جاتا ہے۔ اس کی حسیات مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں۔ گل عذار نے خنجر سرہانے رکھ دیا اور زبردستی آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔

کہتے ہیں کہ نیند تو سُولی پر بھی آ جاتی ہے۔ گل عذار کو صرف دم ہوا تھا اور وہ کسی حد تک دُور بھی ہو گیا تھا۔ کہ نیند آ ہی گئی۔ شاید ظہیر یاب کے تصور نے اسے لوریاں دے کر سُلا دیا۔ لیکن وہ زیادہ دیر نہ سو سکی۔ سینے پر بوجھ سا محسوس ہوا۔ اور اس کی آنکھ کھل گئی۔

آنکھ کھلتے ہی اس کا سارا جسم خوف سے کانپ اٹھا۔ کوئی بھاری بھرکم آدمی اس سے الجھا ہوا تھا۔ وہ بوجھ بن گئی تھی۔ اسے دبوچنے والا ایک ہاتھ سے اس کے دونوں ہاتھ پکڑے ہوئے تھا اور اس کا دوسرا ہاتھ گلے کے گرد تھا۔

اس بستر میں خطرے کا پورا احساس ہو گیا۔ وہ بھی تاتاری لڑکی تھی۔ جوان تھی۔ طاقتور تھی۔ آسانی سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شکست تسلیم نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو چھڑانے کی کوشش شروع کر دی۔ اس کے سر پر
ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ وہ چیخ بھی نہیں مار سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے پاس صرف چند لمحات ہیں۔ اگر اس نے
وہ اپنا بچاؤ نہ کر سکی تو وہ اس دباؤ سے بے ہوش ہو جائے گی اور یا پھر اپنا سب کچھ کھو دے گی۔

گل عذار نے نیچے دبے ہوئے اپنے پورے بدن کو ایک ساتھ حرکت دی۔ سر کو جھٹکا اور کہنی کا وار
اس کشمکش میں اس کا ایک ہاتھ آزاد ہو گیا۔

وہ ہاتھ بجلی کی طرح خنجر پر گیا۔ دوسرے ہی لمحے گل عذار کے خنجر کی نوک اس پراسرار حملہ آور کے
دل میں اتر گئی۔

گل عذار نے جھٹکا دے کر خنجر کھینچا۔

پھر دوسرا، تیسرا وار..... وہ وحشیانہ انداز میں تواتر کے ساتھ خنجر کے وار کرتی رہی اور سینہ
فاہر تا رہا۔

گرم گرم خون، اچھل اچھل کے اور ٹپک ٹپک کر گل عذار پہ گر رہا تھا لیکن اس کا ہاتھ رکنا ہی نہ تھا۔
یہاں تک کہ اس کے منہ پر رکھے ہوئے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور اس پر سوار ہونے والا لڑھک کر اس کے
بستر کے ساتھ آ لگا۔

گل کے دونوں ہاتھ آزاد ہو چکے تھے۔ اس نے پوری قوت لگا کے اس بوجھ کو اپنے اوپر سے دھکیلا۔
پھر لڑھک کر گل عذار کے بستر کے ایک طرف ہو گیا۔

گل عذار خنجر لیے کھڑی ہو گئی۔

اس وقت وہ کسی شیرنی کی طرح بپھری ہوئی تھی لیکن جب اس کی نظر لڑھکے ہوئے وزنی چیز کے چہرے پر
پڑی تو اس کی آنکھیں پتھرا سی گئیں۔

وہ بوجھ، وہ لاش ــــ اونلو خان کی تھی۔

اونلو خان۔ الیاس خواجہ کا سالا، اس کی بیوی کا بھائی!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گل عذار اپنے انجام کا سوچ کر کانپ اٹھی۔

اس نے خون کیا ہے۔ خون بھی ایک مغل شہزادے کا۔

ایلچی خواجہ اسے تڑپا تڑپا کے مارے گا۔ مغل اسے گھوڑے سے باندھ کے گھسیٹیں گے۔ اس کا جسم کو عریاں کر کے سنگینوں سے چھید دیا جائے گا۔ اور پھر نہ جانے کب ملک تاتار پر کیا قیامت آجائے۔ شہر کا کیا حشر ہو۔ اس کے عزیز و اقارب کی کیا درگت بنے۔ ظفر یاب کی تو یہ لوگ تکا بوٹی کر ڈالیں گے۔

لیکن وہ بھی تو مجبور تھی۔

اس نے ظفر یاب کی امانت کی حفاظت کی تھی۔ اس نے تاتاری عصمت کے پرچم کو سرنگوں نہیں ہونے دیا تھا۔ پھر بیت جائے جو بیتنا ہے تاتار پر۔ ظفر یاب پر۔

گل عذار کے مضمحل ہوتے اعضا میں پھر طاقت آگئی۔ اس کے ضمیر نے اسے سہارا دیا۔ گل عذار نے حقارت بھری نظروں سے لاش کو دیکھا۔

پردے سے چھن کے آنے والی مدھم روشنی میں لاش کا چہرہ بڑا بھیانک دکھائی دے رہا تھا لیکن اب گل کے تمام وہم دور ہو گئے تھے۔ ڈر اور خوف اس سے دور بھاگ گیا تھا۔ پھر وہ خوفزدہ کیوں ہوتی۔ اس نے کیا کہ وہ خانی ماں سے صاف صاف کہہ دے گی کہ یہ خون اس نے کیا ہے اور اس کی سزا وہ بھگتنے کے لیے وقت تیار ہے۔

گل عذار، خانی ماں کے کمرے میں جانے کے لیے پلٹی لیکن گھومتے ہی وہ کسی چیز سے ٹکرائی۔

"خانی ماں۔ تم؟"

گل عذار، خانی ماں سے ٹکرائی تھی جو اس کی پشت پر کھڑی تھیں۔ گل عذار حیرت سے ان کا منہ تک رہی تھی اور ان کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی بھی کوشش کر رہی تھی۔

"کہاں جا رہی تھیں گل؟" خانی ماں کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔

"تمہارے پاس خانی ماں۔"

"کس لیے؟"

"اقبالِ جرم کرنے۔"

گل عذار نے خون آلود خنجر خانی ماں کے قدموں میں رکھ دیا۔

"جرم میں نے کیا ہے۔ سزا بھی میں بھگتوں گی۔ میں چاہتی ہوں کہ مجھے ایک وار میں ختم کیا جائے۔ میرے جسم پر بار بار وار کیا جائے یا نیزہ اتارا جائے لیکن میری لاش کی بے حرمتی نہ کی جائے۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں گل۔"

خانی ماں کا لہجہ کسی بھی تاثر سے خالی تھا:

"اٹھ۔ سامنے کھڑی ہو اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے جواب دے۔"

"تم نے وعدہ کیا ہے خانی ماں۔ تم اس پر قائم رہ سکو گی؟"

گل نے کھڑے ہو کر آنکھیں چار کیں۔

"ہاں۔ میں نے وعدہ کیا ہے اور مغل عورت اپنا وعدہ پورا کر کے رہتی ہے۔"

"مجھے ایک وار میں مارا جائے گا؟"

"تیری خواہش پوری ہو گی۔"

"میری بے عزتی بھی نہیں ہو گی۔"

"تو چاہے گی تو ایسا ہی ہو گا۔"

"لاش کو گھوڑے کے پیر میں باندھ کر گھسیٹا بھی نہ جائے گا۔"

"ایسا کبھی نہ ہو گا گل۔"

خانی ماں نے اپنا ایک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا:

"لیکن پہلے یہ بتا کہ تو نے اسے کیوں قتل کیا؟"

"میں مجبور تھی ماں۔"

گل بے خود ہو کے بولی:

"میرے لیے دو ہی صورتیں تھیں۔ یا تو عورت کی عزت اور شوہر کی امانت کو چپ چاپ اس شیطان کے حوالے کر دیتی یا اس کی حفاظت میں خود قربان ہو جاتی۔ میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور جد و جہد کے دوران مارا گئی۔ مجھے اپنے مرنے کا کوئی غم نہیں۔"

"لیکن گل۔ تو نے اس کے علاوہ ایک جرم اور بھی کیا ہے۔" خانی ماں کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لہرائی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں نے صرف اپنی حفاظت کی ہے اور کوئی جرم نہیں کیا"۔ گل کے ذہن میں اور کسی جرم کا تصور ہی نہ تھا۔

"سن گل"۔

خانی ماں نے اپنا دوسرا ہاتھ بھی گل کے دوسرے شانے پر رکھ دیا:

"تیرا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ تو نے مجھے اپنے جرم میں شریک ہونے کی دعوت نہ دی"۔

"جی۔ کیا کہا آپ نے۔ میں سمجھی نہیں"۔ گل نے حیران ہو کر پوچھا۔

خانی ماں نے جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ اپنی رو میں بولیں:

"تجھے اوغلو خان کا قاتل کوئی نہیں ثابت کر سکتا"۔

"جی خانی ماں"۔

گل بوکھلا گئی۔

"اوغلو خان کو میں نے مارا ہے۔ وہ میرے خنجر سے قتل ہوا ہے۔ میں اس قتل سے انکار نہیں کر سکتی۔ کیا آپ یہ الزام اپنے سر لینا چاہتی ہیں۔ میں ایسا ہرگز نہ ہونے دوں گی"۔

"لیکن گل۔ قتل کا الزام تجھ پر کون لگا سکتا ہے۔ تو نے اوغلو خان کو قتل نہیں کیا۔ تیرے خنجر نے شیطان مارا گیا ہے جس نے تجھ سے وہ ہیرا چھیننا چاہا جو عورت کو آسمانی دیوتا عطا کرتے ہیں۔ وہ ہیرا جو دیوتا عورت سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ اس کی قیمت دو کوڑی کی رہ جاتی ہے اور پھر وہ سسک سسک کر مرتی ہے۔ اگر تو اس شیطان کی ہوس پوری کر دیتی تو یقین جان کہ میرا خنجر تیرے سینے کے پار ہوتا، بدروح سمجھ کر تجھے قتل کر دیتی"۔

"خانی ماں۔ تم کس قدر عظیم ہو"۔ گل بڑھ کر خانی ماں سے لپٹ گئی۔

"لیکن میں تجھے معاف نہیں کر سکتی گل"۔ خانی ماں اسے سینے سے لگائے بولیں۔

"جی۔ خانی ماں"۔

گل گھبرا کر ان سے الگ ہو گئی۔ پھر سنبھل کے بولی:

"خانی ماں۔ میں اپنی زندگی کی بھیک نہیں مانگتی لیکن آپ سے یہ امید ضرور رکھتی ہوں کہ آپ میرا بے رحمی نہیں ہونے دیں گی۔ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ مغل عورت اپنا وعدہ پورا کرتی

"اس ہوزی کا خون میں نے تجھے معاف کیا"۔

خانی ماں نے اوغلو کی لاش کی طرف اشارہ کیا:

"یہ خون میرے خیمے میں ہوا ہے اور اس کا ذکر بھی میرے ہی خیمے میں دفن ہو جائے گا لیکن تیرا دوسرا جرم اس سے زیادہ سنگین ہے"۔

"دوسرا جرم کونسا خانی ماں"۔ گل نے پریشان ہوتے ہوئے خانی ماں کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ خانی ماں کے چہرے پر مسکراہٹ کی کلیاں کھلی تھیں۔ وہ گل عذار کو پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"گل تو نے اب تک مغلوں کے مقام اور سفا کی سنی اور دیکھی ہے"۔

خانی ماں کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا:

"یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے آبا و اجداد نے مقتولوں کے سروں کے مینار بنائے۔ انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکایا اور قتل کیا لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہر حملہ آور اور فاتح ایسا ہی کرتا ہے۔ میدانِ جنگ میں بربریت اور سفاکی ہی بہادری اور شجاعت ہے۔ ایسے وقت میں جو لوگ رحم سے کام لیتے ہیں وہ بزدل ہوتے ہیں۔ تو تاتاری ہے گل۔ یاد رکھ اگر تاتاری کبھی فاتح ہو کر ہمارے علاقے میں داخل ہوئے تو کچھ عجب نہیں کہ تاتاری بھی مغلوں کے سروں کے مینار بنائیں لیکن ہم مغل دل کے خراب نہیں ہوتے۔ رحم کے وقت رحم کرتے ہیں۔ احسان کا بدلہ احسان سے دیتے ہیں۔ اگر تو نے مجھے اپنی مدد کے لیے پکارا ہوتا تو آسمانی دیوتاؤں کی قسم، خانی طورہ کا خنجر اوغلو خان کے دل میں اسی طرح داخل ہوتا جیسے تو نے داخل کیا ہے۔ مجھے اسی بات کا افسوس رہا۔ مجھے یہ لکھانے کا موقع ہی نہیں ملا کہ مغل عورت کسی کے احسان کا بدلہ کس طرح دیتی ہے۔ تو نے بیماری میں جس خلوص سے میری خدمت کی ہے وہ میرے دل پر نقش ہے"۔

گل آنکھیں پھاڑے اور منہ کھولے خانی ماں کی باتیں سن رہی تھی۔

خانی ماں ذرا ٹھہر کے بولیں:

"اب جا اور میرے محافظوں کو بلا کے لے آ"۔

"محافظوں کو۔ یہاں بلا کے لاؤں؟" گل نے انہیں حیرانی سے دیکھا۔

"جلدی کر گل"۔ خانی ماں نے سختی سے کہا۔

"پتہ نہیں رات کتنی باقی رہ گئی ہے۔ اس لاش کو صبح سے پہلے ٹھکانے لگانا ہے"۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گل عذار دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"ٹھہر گل۔ اس طرح نہیں"۔

خانی ماں نے اسے روکا:

"اپنے کپڑے تبدیل کر لے"۔

گل کو اس بات کا خیال ہی نہ تھا۔ اس کے کپڑوں پر جگہ جگہ خون کے چھینٹے اور دھبے پڑے تھے ماں نے ایاس خواجہ کا بھیجا ہوا اپنا دوسرا جوڑا اسے دیا۔ جسے پہن کر وہ محافظوں کو بلانے چلی گئی۔

خانی ماں کے چاروں محافظ اکٹھے بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ انہیں دور سے کوئی آتا دکھائی دیا۔ ایک محافظ نے ڈپٹ کر پوچھا:

"کون ہے؟" اور نیزہ سنبھالتا ہوا آگے بڑھا۔ باقی محافظ بھی چوکنا ہو کر اس کے پیچھے ہو لیے۔

"میں ہوں گل عذار۔ خانی ماں کی خادمہ"۔ محافظوں کو اپنے قریب آتا دیکھ کر گل نے کہا۔

محافظ قریب آ کر رک گئے۔ ایک بولا:

"گل بانو۔ آپ خادمہ نہیں خانی ماں کی بیٹی ہیں۔ ہماری بہن ہیں۔ خانی ماں کی طبیعت تو ٹھیک ہے نے کیوں تکلیف کی۔ ہمیں آواز دے کر بلا لیا ہوتا"۔

"خانی ماں نے تمہیں ذرا بلایا ہے"۔ گل نے آنے کا مدعا بیان کیا۔

"ہم غلام ہیں ان کے۔ وہ خیریت سے تو ہیں"۔ ایک نے پوچھا۔

"فکر کی ضرورت نہیں۔ بالکل خیریت سے ہیں"۔

محافظ تیز تیز قدموں سے خانی ماں کے خیمے کی طرف بڑھے۔ یہ سب آگے پیچھے خیمے میں داخل ہوئے انہوں نے خانی ماں کو عجیب حال میں دیکھا۔ ان کے کپڑے بے ترتیب اور بال بکھرے ہوئے تھے اور خون آلود خنجر تھا۔

"خانی ماں، کیا ہوا؟" ایک محافظ نے حیرت سے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے"۔ خانی ماں نے اطمینان سے کہا۔

"حملہ۔ کس نے جرأت کی حملہ کرنے کی"۔ دوسرے محافظ کے منہ سے غصے کے مارے الفاظ نہیں پا رہے تھے۔

"حملہ آور کا نام سن کر گھبرا تو نہ جاؤ گے؟" خانی ماں نے محافظوں کے چہروں پر نظریں دوڑائیں۔

ایک محافظ کچھ زیادہ ہی پرجوش تھا۔ بولا:

"خانی ماں۔ آپ پر حملہ آسمانی روح پر حملہ ہے۔ اگر حملہ آور شہزادہ الیاس خواجہ ہے تب بھی ہم اسے زندہ نہ چھوڑیں گے"۔

"شاباش محافظ۔ مجھے تمہاری وفاداری سے ایسی ہی امید تھی"۔

خانی ماں نے خنجر فرش پر پھینک دیا۔

"بزدل اوغلو خان مجھے مارنے آیا تھا لیکن خود میرے ہاتھوں مارا گیا"۔

"اوغلو خان!" سب محافظوں کی زبان سے ایک ساتھ نکلا۔

پھر ان میں سے ہر ایک نے اوغلو خان کو موٹی موٹی گالیاں دینا شروع کر دیں۔ ایک محافظ نے تو اوغلو خان کے کپڑوں کا بچا چٹھا کھول کے رکھ دیا۔

"ہمارے لیے کیا حکم ہے خانی ماں؟" محافظوں کے جذبات ٹھنڈے ہوئے تو ایک نے دریافت کیا۔

"اوغلو خان کی لاش دوسرے کمرے میں پڑی ہے۔ اسے اٹھا کر لے جاؤ اور ایسی جگہ دبا دو کہ ڈھونڈنے والے تلاش نہ کر سکیں"۔

"ایسا ہی ہوگا"۔ کہتے ہوئے چاروں محافظ دوسرے کمرے میں گھس گئے۔

اوغلو خان کی لاش بھاری تھی۔ گناہ گار کی لاش یوں بھی بھاری ہوتی ہے۔ محافظ بھی کافی تنومند تھے۔ وہ سٹریچر خیمے سے باہر لے گئے۔ پھر اس کے ہاتھ پیر پکڑ کر لٹکاتے ہوئے نیچے وادی میں اتر گئے۔

گل عذار کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا مگر خانی ماں یوں مسکرا رہی تھیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

"دیکھا تو نے گل۔ مغل سفاک تو ہوتے ہیں لیکن احسان فراموش نہیں ہوتے"۔

"خانی ماں"۔ گل دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔

خانی ماں نے اسے اپنے کمرے میں روک لیا۔ قالین پر گرا ہوا اوغلو خان کا خون اب تک پوری طرح سوکھا تھا۔ گل کو خیال آیا۔ بولی:

"خانی ماں۔ میں گیلے کپڑے سے خون صاف کر دوں"۔

"کوئی ضرورت نہیں"۔ خانی ماں نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گل عذار کے دل و دماغ میں الجھنیں پیدا ہو رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد پھر بولی:

"صبح کو کسی کی قالین پر نگاہ پڑ گئی تو دھبے ضرور نظر آ جائیں گے۔"

خانی ماں مسکرائیں:

"تجھے علم نہیں گل۔ اس خیمے کے قریب آنے کی کوئی ہمت نہیں کرے گا۔ صبح کو جب ہم روانہ ہوں خیمہ اور اس کا تمام سامان جلا کر راکھ کر دیا جائے گا۔ جس گھر میں ایک بار "بد روح" آ جائے وہ گندا ہو جاتا ہے۔ اسے کوئی استعمال نہیں کر سکتا۔"

گل کے دل کی دھڑکنیں تھم گئیں۔ اس نے خانی ماں کے سینے سے اپنا سر لگا دیا۔ اب آرام نہ رہ گیا تھا۔ صبح ہونے والی تھی۔

خانی ماں کو محافظوں کی واپسی کا بے چینی سے انتظار تھا۔ انہیں محافظوں پر پورا اعتماد تھا۔ پھر موقعوں پر دل بے چین سا رہتا ہے۔ وقت گزارنے کے لیے خانی ماں اور گل باتیں بھی کرتی رہیں۔ کام انہیں کوئی خاص نہ تھا۔ صبح کو انہوں نے اپنے گھر واپس جانا تھا۔ گل نے خانی ماں کی توجہ ادھر کے دشمنوں کی طرف دلائی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اس خدشے کو بھی مٹانے کے لیے گل عذار کے کو پیٹ دیا۔ یہ کام گل عذار نے کیا۔ خانی ماں بس یونہی اس کا ہاتھ بٹاتی رہیں۔ گل عذار کے جو کپڑے خانی ماں نے دیے تھے ان کی ایک پوٹلی سی بنا کر خانی ماں نے قالین کے اندر گھسیڑ دی۔ احتیاط کے طور پر خانی ماں نے کا قالین بھی لپیٹ دیا۔

صبح کاذب کے وقت محافظوں کے آنے کی آواز آئی۔ خانی ماں ان سے ملنے باہر چلی گئیں۔ تھیں کہ محافظ لپٹے ہوئے قالین دیکھیں اور کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوں۔

محافظ بڑے مسرور نظر آ رہے تھے۔ ایک نے سینہ تان کر کہا:

"خانی ماں۔ آپ کی دعاؤں سے ہم نے اوغلو خان کی لاش کو ایک گہرے کنوئیں میں ڈال کر پتھر اس طرح جمع کر دیے ہیں کہ کھڈ کا منہ بالکل بند ہو گیا ہے۔ اب پورا مغل لشکر بھی اسے ڈھونڈ نہیں کر سکتا۔"

"شاباش۔" خانی ماں نے ان کی تعریف کی:

"ہم حسب المعمول پہنچ کر تمہیں منہ مانگا انعام دیں گے۔ تم نے ایک شیطان کا نام و نشان

مٹا دیا ہے۔ آسمانی روحیں تم سے بہت خوش ہوں گی۔"

"آپ کی خوشی سب سے بڑا انعام ہے خانی ماں۔"

دوسرے محافظ نے کہا:

"آپ نے ہمارے بال بچوں کو اتنا کچھ دے رکھا ہے کہ ہمیں اب کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ آپ کی خدمت ہماری زندگی کا مقصد ہے۔"

محافظ خوشی خوشی چلے گئے۔ گل اور خانی ماں کا ذہن کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ ذرا دیر بعد صبح ہو گئی اور دور پرے اونٹ چلتے پھرتے نظر آئے۔

خانی ماں نے ایلچی خواجہ کا بھیجا ہوا لباس خود بھی پہنا اور گل کو بھی پہنا دیا۔ گل عذار نے اپنا خنجر صاف کر کے کپڑوں میں چھپا لیا۔ اس خنجر نے اس کی زندگی کو صرف گھنائے سے ہی نہیں بچایا تھا بلکہ اس سے ایک شیطان صفت شخص کا خاتمہ بھی ہوا تھا۔ کپڑے پہن کر اور تیار ہو کر دونوں خیمے سے باہر آ گئیں۔ خانی ماں آنے والوں کا استقبال خیمے سے باہر کرنا چاہتی تھیں۔

ذرا دن چڑھے، آدمیوں کا ایک غول خیمہ کی طرف آتا دکھائی دیا۔ یہ تمام کے تمام خیمہ گاہ کے ساحر (جادوگر) تھے۔ خانی ماں کو اس خیمے تک لانے والے چار ساحر تھے لیکن اس وقت اسے واپس لے جانے والے ساحروں کی تعداد اس سے بھی اوپر تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ خیمہ گاہ کے تمام ساحر خانی ماں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے آئے ہیں۔ خانی ماں نے ان ساحروں کا استقبال خیمے سے باہر ہی کیا۔

ساحروں کے علاوہ ان کے ساتھ کوئی اور مغل نہ تھا۔ یہاں تک کہ چاندی کی جو چوکی خانی ماں کے بیٹھنے کے لیے ایلچی خواجہ نے بھیجی تھی اسے بھی دو ساحر اٹھا کے لائے تھے۔ چاندی کی چوکی خیمے سے دور رکھ دی گئی اور خانی ماں سے اس پر بیٹھنے کی درخواست کی گئی۔ خانی ماں مسکراتے ہوئے چوکی پر بیٹھ گئیں۔ گل عذار ان کی پشت کی طرف کھڑی ہو گئی۔

تمام ساحروں نے ان کے گرد دائرہ سا بنا لیا اور پھر لگے جنتر منتر پڑھنے۔ وہ پڑھتے جاتے اور کبھی خانی ماں اور کبھی گھوم کر شمال کی طرف پھونکیں مارتے۔ منتر جنتر پڑھنے کے بعد انہوں نے خانی ماں کو مبارک باد دی اور خوشخبری سنائی کہ بد روح ان سے ہزار ہزار کوس دور بھاگ گئی ہے۔ خانی ماں اس وقت ان سے بڑی خندہ پیشانی سے ملا رہی تھیں۔ انہوں نے ساحروں کا شکریہ ادا کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمام ساحر خانی ماں کو چھوڑ کے خیمے کے چاروں طرف پھیل گئے۔ پھر انہوں نے خیمے پر روغن چھڑکا اس میں آگ لگا دی۔ خیمہ اور اس کا سامان جلنے لگا۔ دھواں اٹھ رہا تھا اور شعلے بلند ہو رہے تھے اور اس کے گرد چکر لگا لگا کر پڑھ پڑھ کے پھونک رہے تھے۔ جب تک خیمہ اور اس کا تمام سامان جل کر راکھ نہ گیا وہ اس پر روغن چھینکتے رہے۔

جب تمام سامان جل گیا اور دھواں اٹھنا بھی بند ہو گیا تو ساحروں کے سردار یعنی گرو ساحر نے ایک نیچے بھیجا۔ نیچے وادی میں ایک جگہ پر لوگ خانی ماں کے استقبال کے لیے پہنچ چکے تھے۔ ساحر وہاں ایک گھوڑا لے کر آیا۔ تمام ساحروں نے مل کر اس گھوڑے کو ذبح کیا اور اس کا خون خیمے کی راکھ پر چھڑکا۔ یہ خیمے کے بارے میں یہ آخری چیز تھی۔

بڑے ساحر کے اشارے پر خانی ماں کے لیے سجی سجائی گاڑی بھیجی گئی۔ گاڑی کے آگے آگے ا کا خاص خاص گھوڑے پر سوار، نیزہ تانے بڑی شان سے آ رہا تھا۔ گاڑی خانی ماں کے پاس آ کے رکی۔ گل عذار اور گل عذار نے سہارا دے کر خانی ماں کو گاڑی پر سوار کیا۔ گل عذار نے پلٹ کر راکھ کے ڈھیر پر ایک نظر جس کے نیچے اوغلو خان کے خون کے علاوہ اس کی عزت و حرمت کی داستان بھی چھپی ہوئی تھی۔ پھر وہ بھی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی ہچکولے کھاتی نشیب کی طرف چلی۔

خانی ماں کے استقبال کو تو پوری خیمہ گاہ الٹ آئی تھی۔ گاڑی نیچے پہنچی تو لوگ ان کے ہاتھ چو ٹوٹ پڑے۔ ایاس خواجہ نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا اور انہیں سہارا دے کر گاڑی سے اتارا۔ اس ساتھ اس کا سپہ سالار بیک جمہ بھی تھا۔ بڑے بڑے سرداروں نے خانی ماں کے ہاتھ چومے اور ا سونا چاندی نچھاور کیا۔

خانی ماں کی واپسی کا آخری مرحلہ بڑا سخت تھا۔ استقبال کرنے کی جگہ سے خانی ماں کا گھر تقریباً ایک اور یہ فاصلہ خانی ماں کو بغیر سہارے کے پیدل چل کر طے کرنا تھا۔

گل عذار اب تک تو خانی ماں کے ساتھ سایہ کی طرح لگی ہوئی تھی لیکن اب اسے ان سے دس گز دور کر دیا وہی کیا ایاس خواجہ کو بھی ان کے قریب جانے کی اجازت نہ تھی

● خانی ماں نے پہلا قدم اٹھایا تو اس کے ساتھ تمام لوگوں کے قدم اٹھے۔ خانی ماں پیدل چل رہی تھیں ہے دوسرے سواری استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بھی پیدل چل رہے تھے۔ یہ جلوس آہستہ آہستہ منزل

ا رہا تھا۔

گل عذار، خانی ماں کی کامیابی کی دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی۔ خانی ماں کی کامیابی اس کی کامیابی ی کی زندگی گل کی زندگی تھی۔

ساٹھ سالہ خانی ماں پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہی تھیں۔ ان کے گرد محافظ دستے نے حلقہ بنا لیا تھا۔ ے باہر چاروں طرف آدمی ہی آدمی تھے لیکن وہ نہایت خاموشی سے چل رہے تھے۔ ان کے چہروں پر یے جانے لہرا رہے تھے۔ ہر ایک کی دلی تمنا تھی کہ خانی ماں خیریت سے اپنے گھر پہنچ جائیں۔

اس تقریب میں خیمہ گاہ کے تمام بڑے بڑے سردار موجود تھے۔ اگر کوئی نہیں تھا تو اوغلو خان نہیں تھا۔ ایاس نے کئی بار پوچھ چکا تھا لیکن اس کی غیر حاضری کا سبب کوئی نہ بتا سکا۔ ایاس خواجہ کا خیال تھا کہ وہ کے گھر پہنچ کے اوغلو خان کو اُن کے سامنے پیش کرے گا۔ اسے امید تھی کہ اس خوشی کے موقع پر خانی ماں رحان کر دیں گی۔ اس کے اچانک غائب ہو جانے سے ایاس خواجہ سخت برہم تھا۔ اس برہمی کی ایک تھی کہ اس کی بیوی نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ آج وہ اوغلو خان کو خانی ماں سے معافی دلا دے گا۔ اس کی خطرہ تھا کہ اگر خانی ماں نے حصار امالیق پہنچ کر خانِ اعظم سے اوغلو خان کی شکایت کر دی تو اس کی تمام لے میں پڑ جائے گی۔

انتظار راستہ خانی ماں نے کسی نہ کسی طرح طے کر لیا لیکن بوڑھی ہڈیاں آرام کی عادی ہو چکی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا راستے کے بعد ان کی سانس پھول گئی اور انہوں نے بیٹھنے کی خواہش کی۔

لڑکی کی چوکی ان کے ساتھ ہی آ رہی تھی۔ وہ ان کے پاس ڈال دی گئی۔ ان کے معتقدین میں گھبراہٹ پیدا عذار کے ہاتھ پیروں کی تو جیسے جان نکل گئی۔ اس نے جھک کر خانی ماں کے کان میں کہا:

انی ماں..... ہمت کرو۔ منزل قریب ہے۔"

نانی ماں نے مسکرا کر اس کا سر تھپ تھپایا اور پانی طلب کیا۔ خانی ماں کے لیے سفید گھوڑی کا دودھ خاص یا گیا تھا۔ فوراً ان کے سامنے بھرے ہوئے دودھ کا پیالہ پیش کیا گیا۔

عذار نے پھر سرگوشی کی:

انی ماں۔ دودھ مت پیو۔ پانی منگاؤ۔"

انی ماں کی سمجھ میں شاید گل عذار کی بات آ گئی۔ انہوں نے دودھ لانے والے سے کہا: "پہلے پانی لاؤ۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر دودھ پیش کرنا۔"

سفید گھوڑی کے دودھ سے انکار گناہ سمجھا جاتا تھا لیکن خانی ماں نے ذہانت سے کام لیا
دودھ سے انکار بھی نہیں کیا اور پانی منگا لیا۔

پانی کا پیالہ انہیں دیا گیا۔ گل نے تیسری بار سرگوشی کی:

"خانی ماں! پانی رک رک کے اطمینان سے پیجیے۔ کسی سانسوں میں۔"

خانی ماں نے گل عذار کی یہ بات بھی بلا عذر مان لی۔ انہوں نے گھونٹ گھونٹ کر کے پانی پیا
ان کے جسم میں کچھ ایسی توانائی پیدا ہوئی کہ وہ پانی پیتے ہی کھڑی ہو گئیں اور کھٹا کھٹ قدم بڑھا
گل عذار ان کے پانی پینے کے دوران برابر دعا مانگتی رہی۔ اس نے خانی ماں کو قدم جما جما کے چلتے
دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

اس وقت لوگوں کے تعجب کا عجب حال تھا جب انہوں نے دیکھا کہ خانی ماں نے اکھاڑا
میں طے کیا تھا اس سے آدھے وقت میں وہ باقی راستہ طے کر کے اکڑتی ہوئی اپنے گھر میں داخل ہو گئیں
خانی ماں کی عظمتیں لوٹ آئیں۔ ان کا وقار پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گیا۔ اب وہ مغلوں کی عز
تھیں۔ بلا دشمال کا خانِ اعظم ان کا بھائی اور ولی عہد الیاس خواجہ ان کا بیٹا تھا۔ بیماری کے دوران
کے ساتھ معاندانہ اور مخاصمانہ تھا اب وہ خانی ماں کے آگے بچھے جا رہے تھے۔ خیمہ گاہ کے ماحو
کے ساتھ بدتمیزی اور ہتک آمیز سلوک کیا تھا۔ وہ خانی ماں کی سب سے زیادہ خاطر مدارات میں لگے
جب خانی ماں کے سامنے نذرانے پیش کیے گئے تو ایک ماہر نے انہیں ہیروں کا ایک ایسا ہا
متعلق اس نے یہ کہا کہ یہ ہار اس کے بزرگوں میں سے کسی کو خود تموجن چنگیز خان نے اپنے دست مبا
میں دیا تھا۔ قیمتی ہونے کے ساتھ ساتھ اس ہار کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ تھی کہ اسے چنگیز خا
نے چھوا تھا۔

یہ ہار اس ماہر نے پیش کیا جو تبتی کنیز کو گھسیٹتا ہوا خانی ماں کے پاس سے لے گیا تھا۔
خیمے میں موجود تھی اور قہر آلود نظروں سے ماہر کو دیکھ رہی تھی لیکن جب خانی ماں نے ہار کو بوسہ
اپنے گلے میں ڈال لیا تو تبتی کنیز کے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے۔

نذرانوں کا خیمے میں ڈھیر لگ گیا۔ سب سے قیمتی نذرانہ مغل سپہ سالار بیک بجکہ خان

ہار کا ایک ہار خانی ماں کی نذر کیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک دوشیزہ کا ہار یہ کہہ کر نذر کیا کہ یہ خانی ماں کی
نذر کے لیے ہے۔ بیک بجکہ نے اس محفل میں گل عذار کو اپنی بہن بنانے کا اعلان بھی کیا۔

خانی ماں نے خوش ہو کر اسے دعا دی:

"بیک بجک۔ تیری سرداری ہمیشہ قائم رہے گی۔ زمانے کا انقلاب تجھ پر اثر نہ کرے گا۔"

مرد نذرانے پیش کر چکے تو خواتین کا نمبر آیا۔

الیاس خواجہ کی پہلی بیوی خانی ماں سے بہت جلتی تھی کیونکہ خانی ماں کی موجودگی میں اس کی کوئی عزت
تھی۔ لوگ اس کی طرف توجہ نہ دیتے تھے لیکن اپنے شوہر کی خوشنودی کے لیے اس نے بھی بیش قیمت
نذر کیے۔ الیاس خواجہ کی دوسری بیگمات اور خاص خاص داشتاؤں نے بھی اپنی حیثیت کے مطابق
خانی ماں کی خدمت کی۔

خواتین کے نذرانوں کا سلسلہ جاری تھا کہ خانی ماں نے جیسے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ پھر الیاس
خواجہ سے پوچھا:

"خان بیٹے۔ کیا اوغلو خان کے دل میں میری اتنی بھی عزت نہیں کہ اس اہم موقع پر وہ سلام
لے آتا؟"

الیاس خواجہ نے گھور کر اپنی بیوی کو دیکھا۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ خانی ماں بولیں:

"خان بیٹے۔ اوغلو خان ایک دن میرے پاس آیا تھا لیکن میں نے ملاقات سے انکار کر دیا تھا۔ اب
بہت بدل چکے ہیں۔ میں پہلے دل سے اس کی گستاخیوں کو معاف کرتی ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ آسمانی
اسے معاف کر دیں۔ تم اس سے کہہ دو کہ میرا دل اس کی طرف سے صاف ہو گیا ہے۔ میں نے سب کو
کر دیا ہے۔ پھر وہ میرے پاس آتے کیوں گھبراتا ہے۔ آخر وہ مغل شہزادہ ہے۔ ابھی بچہ ہے۔ بچے
غلطیاں کیا ہی کرتے ہیں۔"

خانی ماں نے اوغلو خان کے بارے میں کچھ اس خلوص سے گفتگو کی کہ اوغلو کی بہن اپنی جگہ پانی پانی
ہو گئی۔ وہ تو سمجھتی تھی کہ خانی ماں اس کے بھائی کی جانی دشمن ہے اور اسے کسی بھی وقت نقصان پہنچا سکتی ہے۔
خانی ماں کی باتوں سے اس کا دل بالکل صاف ہو گیا۔

اوغلو خان پر جو گزری تھی اس کا علم تبتی کنیز کو نہ تھا اس لیے اس نے ان باتوں پر زیادہ کان نہ دھرے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن گل عذار دل ہی دل میں ہنس رہی تھی۔ اسے اس بات پر ضرور تعجب تھا کہ خانی خاں کے ہر کارندے عقل و ذہانت اتنی شدید بیماری اٹھانے کے بعد بھی ویسے ہی قائم ہے۔

خانی خاں نے اوغلو کا ذکر چھیڑ کر اس بات کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔ انہوں نے یہ باتیں شاید اس لیے کی تھیں کہ اگر آیندہ کبھی اوغلو خان کے اغوا یا قتل کے سلسلے میں کوئی فتنہ کھڑا ہو تو ان کا دامن محفوظ رہے۔ خانی خاں واقعی ذہین اور ذکی الحس تھے۔ انہوں نے آیندہ کے لیے پیش بندی کی تھی لیکن اوغلو کا معاملہ دوسرے ہی دن اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے ایسی خطرناک صورت اختیار کر لی کہ اگر الیاس خواجہ عقلمندی سے کام نہ لیتا تو مغلوں میں خانہ جنگی شروع ہو جاتی۔

اوغلو خان کے قتل کی تمام نشانیاں، خانی خاں نے اپنے طور پر تو مٹا دی تھیں لیکن ایک چیز کو وہ بالکل عذار کا دھیان بالکل نہ گیا۔ اوغلو خان گھوڑے پر سوار ہو کے آیا تھا۔ اس کی قیام گاہ سے خانی خاں کے خیمہ کا کافی فاصلہ تھا۔ پھر رات کے وقت اتنی دور تک پیدل جانا بھی مناسب نہ تھا۔ راستے میں اس کی مڈبھیڑ بھی آدمیوں سے ہو سکتی تھی۔ اس نے اپنے اس مذموم ارادے کی خبر تو اپنے خاص ساتھیوں کو بھی نہ ہونے دی تھی۔ اگر وہ دوستوں سے مشورہ کرتا تو وہ اسے خانی خاں کے خیمے میں جانے کی اجازت ہرگز نہ دیتے۔ پر تو خانی خاں اور گل عذار سے انتقام لینے کا بھوت سوار تھا۔ وہ یہ سوچ کر آیا تھا کہ پہلے وہ گل عذار کو ٹھکانے لگائے اور اگر خانی خاں نے اس میں کوئی رکاوٹ پیدا کی تو وہ انہیں بھی قتل کر دے گا۔ جس رات اوغلو خان قتل ہوا وہ اس کی تیسری کوشش تھی۔ پہلے بھی وہ دو بار خیمے تک پہنچ گیا تھا مگر گل عذار کے جاگ پڑنے سے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

اوغلو خان نے اصارات اپنا گھوڑا خانی خاں کے خیمے سے تقریباً تین سو گز دور ترائی میں چھوڑ دیا تھا۔ اس نے گھوڑے کی لگام ایک شاخ سے باندھ دی تھی۔ وہ خیمے میں گل عذار کے ہاتھوں مارا گیا اور وہ گھوڑا وہیں کھڑا رہا۔ صبح کو خانی خاں کی واپسی کا ہنگامہ تھا۔ وہ دن اور پوری رات اسی طرح گزر گئی۔ غریب جانور بھوکا پیاسا کھڑا رہا۔ پھر جب الیاس خواجہ اور اس کی بیوی نذرانے دے کر واپس آئے تو الیاس خواجہ نے تلاش میں دوبارہ آدمی روانہ کیے۔

اوغلو خان کے دوستوں سے پوچھ گچھ شروع ہوئی اور انہیں حکم دیا گیا کہ اوغلو خان کو ڈھونڈ کر فوراً ورنہ مجرم گردانے جائیں گے۔ اوغلو کے دوستوں میں کھلبلی مچ گئی۔ انہوں نے اس کی تلاش میں ادھر ادھر

[illegible] کیا

[illegible] اوغلو خان کا ایک دوست اسے وادی میں ڈھونڈتا ہوا اس جگہ پہنچ گیا جہاں تین دن کا بھوکا جانور [illegible] بندھا ہوا تھا۔ ممکن ہے کہ اس کی نظر گھوڑے پر نہ پڑتی لیکن بھوکے جانور نے کسی آدمی کی چاپ سن [illegible] کیے اور زور زور سے ہنہنایا۔ اس طرح اوغلو خان کا دوست گھوڑے تک پہنچ گیا۔ وہ عقل سے کچھ [illegible] ہی پیدل تھا۔ فوراً گھوڑے پر سوار ہوا اور سیدھا الیاس خواجہ کے پاس پہنچ گیا۔

اس کا خیال تھا کہ الیاس خواجہ اسے اس کارنامے پر انعام دے گا لیکن جب الیاس خواجہ نے اس سے [illegible] کیا کہ:

"اوغلو خان کہاں ہے؟"

[illegible] جواب نہ دے سکا۔ الیاس خواجہ نے جھٹکا کر اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا اور اسے گرفتار کرا دیا پھر [illegible] ان کے تمام دوست و احباب چن چن کر پکڑ لیے گئے۔ انہیں قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا کیونکہ الیاس خواجہ [illegible] نے بتایا تھا کہ غائب ہونے سے ایک دن پہلے اوغلو خان اس سے ایک قیمتی ہار لے گیا تھا۔ الیاس خواجہ [illegible] کا کہ اوغلو خان کے دوستوں نے ہار حاصل کرنے کے لیے اسے قتل کر دیا ہے۔

الیاس خواجہ کی بیوی، بھائی کے مارے جانے سے بہت برافروختہ تھی۔ اوغلو خان اس کا اکیلا بھائی تھا۔ [illegible] کا چہرہ کا اور قتل کے جرم میں اوغلو کے تمام دوستوں کی گردنیں اڑا دی گئیں۔ اس طرح خیمہ گاہ کو اوغلو [illegible] کے شیطانی گروہ سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا مل گیا۔

اوغلو خان کا گھوڑا جہاں سے ملا تھا اس سے قریب ترین اگر کوئی آبادی تھی تو وہ یا تو خان خاں کا خیمہ [illegible] کے محافظوں کے خیمے تھے لیکن اس طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ اوغلو خان اور اس کے ساتھیوں کے [illegible] اور لوگ اور خاص کر ڈیرے والیاں بہت پریشان تھیں۔ انہوں نے اس گروہ کے خاتمے پر سکھ کا [illegible]

○

[illegible] مولانا زین الدین کو شہر سبزوار واپس بھیج دیا لیکن ان دونوں کے درمیان ایک بدمزہ دست نظر یاتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اختلاف پیدا ہو گیا۔

مولانا چاہتے تھے کہ تیمور فوری جنگ سے پرہیز کرے اور تاتاریوں کو یکجا کرنے کے بعد مغلوں کا مورچہ لے۔ لیکن یہ کہہ کر تیمور نے مولانا کو تقریباً جواب کر دیا کہ گھر میں آگ لگ جائے تو غور و فکر میں وقت ضائع کرنے کے بجائے گھر کو بچانے کی کوشش کرنی چاہیے خواہ اس کوشش میں ہاتھ ہی کیوں نہ جل جائیں۔

تیمور جس وقت سمرقند سے نکلا اس کے پاس صرف تین سو سوار تھے۔ تیمور نے تاتاری دوشیزاؤں کے چشمگی سے چھڑانے کا اعلان اور عہد کیا تھا۔ وہ ایک بار جو فیصلہ کر لیتا پھر اس سے ہٹتا نہیں تھا لیکن تیمور بڑا دور بین انسان تھا۔ اس کے سواروں کا رخ شمال کی طرف تھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ وہ ایلخانی کی خیمہ گاہ پر پہنچ کے اس سے براہِ راست شکایت کرے یا پھر وہ خانِ اعظم کے پاس حاضر ہونے کی لیکن تھوڑی دور چلنے کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کا رخ شمال سے ایک دم جنوب کی طرف پھیر دیا۔

"سردارِ محترم۔ آپ کا گھوڑا برا منہ زور ہے۔ شمال کی طرف بڑھنے سے انکار کر رہا ہے۔" شوہر ظفر باب کو خیال ہوا کہ تیمور کا گھوڑا بگڑ کر گھوم پڑا ہے۔

"نہیں ظفر باب۔"

تیمور نے اس کی غلط فہمی دور کی،

"گھوڑا میں نے خود موڑا ہے۔ گھوڑا تو اس کا غلام ہے جس کی رانوں کے نیچے وہ دبا ہوا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ جنوب کی طرف جا رہے ہیں۔ شاید شہر سبز کی جانب۔" ظفر باب نے کی تصدیق کرنا چاہی۔

"ظفر باب۔"

تیمور نے گھوڑے کو ایڑ دیتے ہوئے کہا:

"تم شاید کسی سردار کی کمان میں آج تک نہیں لڑے ورنہ ایسا سوال ہرگز نہ کرتے۔ جسے سردار تسلیم کر لیا پھر اس سے سوال نہیں کیا کرتے صرف اشارے کے منتظر رہتے ہیں۔"

"معاف کیجیے سردار۔"

ظفر باب شرمندگی سے بولا:

"میں نے تلوار ضرور چلائی ہے لیکن نہ تو کسی بڑی جنگ میں حصہ لیا ہے اور نہ کسی کی کمان میں"

"افسوس نہ ہو۔ تم پہلے ہی بہت دکھی ہو ظفر باب۔"

گھوڑے کو ایڑ دل چکی تھی۔ وہ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ تیمور کے سوار بھی گھوڑے دوڑا کر اس کے پیچھے چلنے لگے۔

تیمور کو معلوم تھا کہ مغلوں نے تاتاری علاقوں میں تین فوجی چھاؤنیاں قائم کر رکھی ہیں جہاں سے وہ پورے تاتار پر اپنا کنٹرول قائم رکھتے ہیں۔ یہ چھاؤنیاں مشرق، مغرب اور جنوب میں تھیں۔ شمالی علاقوں میں مغلوں کی دلچسپی تھی جہاں ایلخانی خواجہ بیس ہزار کا لشکر لیے پڑا تھا۔

تیمور بڑی تیز رفتاری سے سفر کرتا ہوا جنوبی چھاؤنی کے سامنے نمودار ہوا۔ اس نے چھاؤنی کے پاس پہنچنے کے بعد بھی اپنے گھوڑے کی رفتار کم نہ کی بلکہ اپنے تین سو سواروں کے ساتھ چھاؤنی میں گھستا چلا گیا۔

چھاؤنی کا سردار تیمور کو پہچانتا تھا۔ وہی کیا۔ تیمور کی شخصیت اتنی اہمیت اختیار کر گئی تھی کہ تقریباً ہر مغل اسے پہچانتا تھا۔ جس نے اسے نہ دیکھا تھا اسے تیمور کو دیکھنے کی آرزو تھی۔

مغل، تیمور کو اس طرح بے دھڑک چھاؤنی میں گھستے دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ مغل سوار جنھوں میں مقیم تھے سردار قریب کی ایک حویلی میں رہتا تھا۔ اسے تیمور کے آنے کی خبر ہوئی تو گھوڑے پر سوار ہو کر آ گیا۔ تیمور وقت مغل لشکریوں سے الجھ رہا تھا۔ سردار کو آتے دیکھ کر لشکری چپ ہو گئے۔

"تیمور، تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

سردار کی آنکھیں غصے سے کھنچی ہوئی تھیں۔ مغل فاتح تھے اور تاتاری مفتوح و محکوم۔ وہ تیمور کا اس بے خوفی اور بے باکی میں آنا کیسے برداشت کر سکتا تھا۔

مغل سردار۔ اگر تم نے مجھے پہچان لیا ہے تو سن لو کہ تاتاری لڑکیاں میری بہنیں ہیں۔ ان کا اغوا میرے اغوا ہے۔ میں انہیں واپس لینے آیا ہوں۔"

تیمور نے سردار کو اتنے ہی سخت لہجے میں جواب دیا اور ہاتھ تلوار کے قبضے پر رکھ لیا۔ اس کے تمام ساتھیوں نے بھی اس کی تقلید کی۔

مغل سردار کو اس کی جرأت اور بے خوفی پر تعجب تھا۔ بولا:

"چھاؤنی میں کوئی اغوا شدہ لڑکی نہیں ہے۔"

تیمور نے اغوا شدہ لڑکیوں کا ذکر محض قیاس کے تحت کیا تھا لیکن جس وقت مغل سردار، تیمور کو جواب دے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دے رہا تھا۔ اسی وقت ایک خیمے سے ایک لڑکی چیختی چلاتی نکلی:

"بچاؤ۔ بچاؤ۔ ہمیں ان ظالموں سے بچاؤ۔"

لڑکی کے پیچھے ایک مغل اسے پکڑنے کے لیے بھاگا آ رہا تھا۔ ایک لمحے میں تیمور کی کمان میں تیر نکلا اور پیچھا کرنے والے مغل کے سینے میں پیوست ہو گیا۔

یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ مغل سردار سمجھ ہی نہ سکا۔ پلک جھپکتے میں تیمور کا کمان سنبھالنا، تیر جوڑنا اور نشانہ لگانا۔

یہ سب ایک ساتھ کیسے ہوا؟

اس شور و غل میں دو ہزار مغل سوار تیار ہو کر اپنے سردار کے پاس آ گئے۔ انہوں نے تیمور اور اس کو گھیرے میں لے لیا۔

"تم کس کے حکم سے مغل چھاؤنی میں مسلح ہو کر آئے ہو؟" سردار نے بڑے رعب سے پوچھا۔

"اور تم نے کس کے حکم سے تاتاری لڑکیوں کو اغوا کر کے قید کر رکھا ہے۔" تیمور کا لہجہ بھی سخت

مغل سردار نے اپنے دو ہزار سروں پر نظر ڈالی۔ بولا:

"ہم فاتح ہیں۔ مفتوح کی ہر چیز فاتح کی ہوتی ہے۔"

"مغل سردار۔"

تیمور شیر کی طرح گرجا:

"میں لڑکیوں کو آزاد کرانے آیا ہوں۔ خالی ہاتھ ہرگز نہ جاؤں گا۔"

"اگر میں انہیں آزاد نہ کروں تو ــــ" مغل سردار نے دو ٹوک فیصلہ کرنا چاہا۔

"تو میں بادشاہ کے خانِ اعظم کے حکم کے تحت تم سے جنگ کروں گا۔" تیمور نے اسی طرح

خانِ اعظم کا نام سن کر مغل سردار پریشان ہو گیا۔ اس کے سواروں کے چہرے بھی دھواں دھواں

سردار نے ڈرتے ڈرتے پوچھا:

"کیا خانِ اعظم نے تمہیں ہم سے جنگ کرنے کے لیے بھیجا ہے؟"

تیمور نے دیکھا کہ مغل سردار رعب میں آ گیا ہے تو اس نے اور زیادہ چلا کر کہا:

"خانِ اعظم کا ہم سے معاہدہ ہے کہ اگر کوئی مغل، کسی تاتاری لڑکی کو بری نظر سے بھی دیکھے

اور اس کے ساتھ ہی تیمور نے تلوار بلند کر لی۔ تین سو مزید تلواریں تیمور کے ساتھ ہی نیاموں سے باہر

مغل سواروں کے ہاتھ بھی تلواروں تک گئے مگر وہ تلوار نکال نہ سکے۔ انہیں اپنے سردار کے حکم کا

مغل سردار بڑا مضطرب تھا۔ خانِ اعظم کا حکم اس کے کانوں تک پہنچ گیا تھا اگرچہ یہ حکم ایک تاتاری

کے ذریعے پہنچا تھا:

"تیمور اگر ہم یہ لڑکیاں تمہارے حوالے کر دیں تو کیا تم ــــ"

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ آگے کیا کہے۔

"مغل سردار۔ اطمینان رکھو۔"

تیمور نے فوراً تلوار نیام میں کر لی۔

"ہمارے آباؤ اجداد اور خانِ اعظم کے آباؤ اجداد میں معاہدہ ہوا تھا کہ مغل بادشاہت کریں گے اور تاتاری

رہیں گے۔ خانِ اعظم ہمارا بادشاہ ہے اور ہم اس کے سردار۔ جو شخص بھی خانِ اعظم کے معاہدے سے انکار

کرے گا وہ باغی ہو گا۔ ہم اس سے لڑیں گے۔ مغل خانِ اعظم نے مجھے تاتاری لڑکیوں اور عورتوں کی آبرو کی

ذمہ داری دی ہے۔ میں اس کی حفاظت کروں گا۔ اگر شہزادہ الیاس خواجہ بھی اس حکم کی تعمیل نہ کریں تو میں ان سے

بھی جنگ کروں گا۔"

مغل سردار اور زیادہ مرعوب ہو گیا۔ اس نے حکم دیا کہ تمام اغوا شدہ لڑکیاں تیمور کے حوالے کر دی جائیں۔

اس کا پہلی کامیابی تھی۔ اس کامیابی میں بہادری سے زیادہ عقل و فراست کا دخل تھا۔ تیمور کو یقین تھا کہ تاتاری

سردار کرارٹلا اور انوا کے واقعات چھاؤنی کے سرداروں کے تعاون کے بغیر نہیں ہو سکتے اس لیے ان لیڈروں کو

بھی میں مزید پناہ لینا پڑتی ہو گی۔ اس چھاؤنی میں لڑکیوں کی موجودگی تو صرف ایک قیاس تھا جو یقین میں

بدل گیا۔

مغلوں نے چپ چاپ بارہ لڑکیوں کو تیمور کے حوالے کر دیا۔ تیمور کا کوئی نقصان نہ ہوا۔ ایک مغل

سردار کا شکوہ یا گلہ کرنے کی بھی مغل سردار کو ہمت نہ پڑی۔

تیمور ان بدنصیب لڑکیوں کو لے کر قریبی آبادی میں پہنچا۔ اسے دیکھ کر بستی والوں نے آنکھیں بچھا دیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تیمور نے لڑکیاں ان کے حوالے کیں تاکہ انہیں جلد سے جلد ان کے وارثوں کے حوالے کر دیا جائے۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر تیمور نے مغرب کا رخ کیا۔

مغربی چھاؤنی پہنچنے سے پہلے ہی تیمور کو مغلوں سے ایک معمولی جھڑپ لینا پڑی۔ تیس چالیس کسی تاتاری بستی کو لوٹ کر آ رہے تھے۔ سامان کے علاوہ وہ چار لڑکیاں بھی پکڑ لائے تھے۔ تیمور کو روک لیا۔ مغل اکڑ گئے۔ تلواریں نکل آئیں۔

تیمور نے ڈپٹ کر کہا:

"مغل سردار، جب تم اپنے زخمیوں کو لے کر شہزادہ الیاس خواجہ کے پاس پہنچو تو اسے یہ بتانا کہ تیمور نے بلادِ شمال کے خانِ اعظم کے حکم کے تحت تم سے جنگ کی ہے۔"

مغل سردار کے سر سے اوپر اٹھی ہوئی تلوار ذرا سی لرزی:

"کیا خانِ اعظم نے تمہیں ہمارے ساتھ جنگ کرنے کا حکم دیا ہے؟"

"ہاں۔ ان کا حکم ہے کہ تاتاریوں کی عزت و آبرو کی حفاظت کی جائے۔" تیمور نے اس پر طنز کی کوشش کی۔

مغل سردار کچھ دیر سوچتا رہا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے بھی مشورہ کیا۔

"الیاس خواجہ اور بیگ جگتہ نے ہمیں اجازت دی ہے۔"

مغل سردار نے اصل بات اگل دی۔

"ہم لوٹ مار میں سے انہیں حصہ دیتے ہیں۔ ہم لڑکیاں واپس نہیں کر سکتے۔"

"لڑکیاں واپس کرنا ہوں گی۔"

تیمور نے صرف لڑکیوں کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا اور اب بھی اس کا یہی مطالبہ تھا۔ مغل چڑھ چکا تھا۔ اس نے حملے کا حکم دے دیا۔ تاتاریوں نے چند ہی منٹ میں لٹیروں کے چھکے چھڑا دیے۔ باقی چھوڑ کر مغل بھاگ کھڑے ہوئے۔ تیمور کے صرف چند سوار زخمی ہوئے۔ لڑکیوں کو آزاد کرا کے ان کے گھر میں بھیج دیا گیا۔

مغربی چھاؤنی سے تیمور کو کچھ حاصل نہ ہوا۔ وہاں کوئی اغوا شدہ لڑکی موجود نہ تھی۔ مغربی چھاؤنی اور تیمور میں تھوڑی سی تو تو میں میں ہوئی لیکن تلواریں نیام میں ہی رہیں۔

ظفر یاب بہت اداس تھا۔ اب تک جتنی تاتاری لڑکیاں آزاد کرائی گئی تھیں ان میں گل عذار موجود نہ تھی۔ مشرقی چھاؤنی کی طرف بڑھتے ہوئے تیمور نے تین اور لڑکیوں کو آزاد کرایا لیکن گل عذار اب تک ظفر یاب کے لیے ایک پہیلی ہی تھی۔

تیمور کو اس کی افسردگی کا احساس تھا۔ ایک جگہ قیام کے دوران تیمور نے کہا:

"ظفر یاب تمہاری بیوی بھی کسی نہ کسی طرح مل ہی جائے گی۔ غمگین ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"میں پر امید ہوں سردارِ محترم۔" ظفر یاب نے اپنا غم چھپاتے ہوئے کہا۔

"امید کوئی چیز نہیں ظفر یاب۔"

تیمور نے اسے اپنا فلسفہ سمجھایا:

"تاتاری یقین کے ساتھ قدم اٹھاتے ہیں۔" یقین ہمارے جوش کو ابھارتا ہے۔ امید کے سہارے نہیں رہا کرتیں۔"

"چغتائی ہمارے ہاتھ سے قتل ہو چکے ہیں۔ اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟" ظفر یاب نے ایک نئے خدشے کا

"پھر وہی بزدلی کی باتیں۔" تیمور جھلا گیا۔

"سامانِ نیچے کی پروا نہیں کیا کرتے ظفر یاب۔ جب ہم سمرقند سے نکلے تو کیا ہمیں نہیں معلوم تھا کہ ہم کن باتیں ہزار مغلوں کے سامنے بلند کی ہیں۔ یاد رکھو سخن کی سرخی دلوں کو گرماتی ہے۔ ہمارا میں حرارت پیدا کرے گا اور آج نہیں تو کل تاتاری غلامی کا جوا گردن سے اتارنے کے لیے ہو جائیں گے۔ تاتاریوں کی آزادی کا ایوان ہمارے خون کی بنیادوں پر قائم ہوگا۔"

تیمور کی باتوں سے ظفر یاب کا دل ایک نئے جذبے سے بھر گیا۔ اس نے اپنے اندر نئی توانائی محسوس کی۔ افسردگی کی بھاری چادر اس نے ذہن سے اتار پھینکی۔ اس نے امید کی جگہ یقین کو اپنے دل میں جگہ دی۔ کسی قسم کا شکوہ نہ کرنے کی قسم کھائی۔

مغلوں کی مشرقی چھاؤنی میدانِ جنگ کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ تیمور کے چھاؤنیوں میں بے دھڑک گھومنے کی اطلاع اپنے سردار کو پہنچا دی تھی۔ تیمور جب مشرقی چھاؤنی کے سامنے نمودار ہوا تو مغل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فوج اسے صف بستہ دکھائی دی۔ اس نے گھوڑے کی راسیں کھینچ لیں۔ اس کے ساتھی بھی رک گئے۔

تیمور نے اپنے ساتھیوں کو وہیں چھوڑا اور خود گھوڑا بڑھا کر مغل لشکر کی طرف چلا۔ اسے لگا کہ ایک ہزار سوار اس کے سامنے صف آرا ہیں۔

تیمور کو اکیلا آتا دیکھ کر مشرقی کی ان کا سردار بھی گھوڑا آگے بڑھا کر میدان میں آ گیا۔ دونوں قریب ہو گئے۔ کنوتیوں سے کنوتیاں مل گئیں۔

دونوں ایک دوسرے کو تیز نظروں سے دیکھ رہے تھے لیکن نہ لب ہلتے تھے اور نہ ہاتھ طرف جاتے تھے۔

کئی منٹ اسی طرح گزر گئے۔ آخر تنگ آ کر مغل سردار سخت لہجے میں بولا:

"تیمور۔ مسلح سواروں کے ساتھ چھاؤنی کے قریب آنا بغاوت ہے۔ تم مغل حاکموں کے باغی ہو"

"مغل سردار۔ زبان سنبھالو"۔

تیمور نے کڑک کر جواب دیا:

"تم نے خانِ اعظم کے حکم کی توہین کی ہے۔ میں خانِ اعظم کی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔ سزا یہ ہے کہ میں تمہارا سر قلم کر دوں"۔

تیمور نے بڑی تیزی سے تلوار نکالی۔

مغل سردار گھبرا گیا۔ خانِ اعظم کا حکم۔ حکم کی توہین۔ وہ الجھ سے رہ گیا۔ اس نے بھی تلوار نکالی اپنا گھوڑا تھوڑا پیچھے ہٹا لیا۔

"تیمور۔ قبل اس کے کہ میں تم پر ہاتھ اٹھاؤں۔ مجھے بتلاؤ کہ خانِ اعظم کا کیا حکم ہے اور میں نے حکم کی توہین کی ہے؟"

مغل سردار کا لہجہ معالجانہ تھا۔

"مجھے تمہارا لہجہ پسند آیا"۔

تیمور نے جس پھرتی سے تلوار نکالی تھی اتنی ہی پھرتی سے تلوار نیام میں کر لی:

"مغل سردار۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ملک تاتار ہے اور اس ملک کا بادشاہ جلادِ شمال عزت آب خان تغلق خان تمور ہے۔ ہم تاتاری اس کی رعیت ہیں۔ تم نے ایک ذمہ دار تاتاری کی

توہین کی ہے۔ خانِ اعظم نے تاتاریوں کی عزت و آبرو کی حفاظت کی ضمانت دی ہے اور تم تاتاری بچیوں کو پامال کر رہے ہو۔ تاتاری لڑکیوں کو اغوا کر کے انہیں کنیز بنا رہے ہو۔ یہ بغاوت کو دعوت ہے۔ تم خانِ اعظم کو اپنی بدعنوانیوں کا حساب دینا ہو گا۔ جواب دو۔ میں تمہارا جواب لے کر خانِ اعظم کے پاس جاؤں گا"۔

مغل سردار، تیمور کو باغی کہہ کر افسوس کر رہا تھا۔ اس نے صفائی پیش کی:

"تیمور۔ اگر تم خانِ اعظم کو اپنا بادشاہ سمجھتے ہو تو پھر باغی نہیں ہو سکتے۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں"۔

"تمہیں صرف الفاظ واپس نہیں لینا ہیں"۔

تیمور کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے محسوس کر لیا کہ مغل سردار پوری طرح اس کے رعب میں آ گیا ہے۔

"اور تم کیا چاہتے ہو تیمور"۔ مغل سردار نے جان چھڑانے کے لیے جلدی سے پوچھا۔

"تمہاری چھاؤنی میں جتنی اغوا شدہ تاتاری لڑکیاں موجود ہیں انہیں میرے حوالے کر دو"۔ تیمور نے حکم دیا۔

"لیکن تیمور۔ تیمور یقین کرو اس چھاؤنی میں کوئی تاتاری لڑکی موجود نہیں"۔ مغل سردار کو پسینہ آ گیا۔

"مجھے تمہاری بات کا یقین ہے"۔

تیمور نے جیسے ہنس کر سانس لی پھر بولا:

"لیکن یہ بات تم شمال کی طرف منہ کر کے ایک بار پھر دہراؤ"۔

مغل آسمان کی طرف دیکھ کر یا شمال کا رخ کر کے کوئی جھوٹی بات کہتے اور نہ کوئی وعدہ کرتے تھے۔ آسمان پر روحوں کا قیام تھا اور شمال میں ان کا خاندانی قبرستان تھا جہاں ان کا عظیم ترین پیشوا اور سردار چنگیز خان تھا۔

مغل سردار نے شمال کا رخ کر کے اپنی بات دہرائی۔ تیمور گھوڑے سے اتر پڑا۔ مغل سردار بھی گھوڑے سے اتر گیا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر بغل گیر ہوئے۔

"ہمارا تمہارا کوئی جھگڑا نہیں"۔ تیمور اس سے الگ ہوتا ہوا بولا۔

"ٹھیک ہے تیمور۔ لوگوں نے خواہ مخواہ افواہیں اڑا رکھی ہیں"۔ مغل سردار نے مزید صفائی کے لیے کہا۔

تیمور اچک کر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اچھا حضت۔ ہمیں ابھی بہت لمبا سفر کرنا ہے۔"

"ٹھہرو تیمور۔ ایک ضیافت تو ہو جائے۔" مغل سردار نے اسے دعوت دی۔

"شہزادہ الیاس خواجہ ہمارا انتظار کر رہا ہو گا۔"

تیمور گھوڑا موڑ کر اپنے ساتھیوں میں جا ملا۔ مغل سردار کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

تیمور جس شان سے چھاؤنی کے سامنے نمودار ہوا تھا اسی شان سے واپس ہوا۔ تیمور کے اس رویے نے اس کے ساتھیوں کے حوصلے بلند کر دیے اور انہیں تسلیم کرنا پڑا کہ اگر تاتاریوں میں کوئی سردار ہے تو وہ امیر تیمور ہے جو جرأت اور وفاداری کے ساتھ مغلوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا ہے۔

⊙

تیمور اپنے تین سو سواروں کے ساتھ مغل چھاؤنیوں میں جس بے باکی سے گھومتا رہا اس کی صدائے بازگشت مغل خیمہ گاہ میں بھی سنائی دی۔ شہزادہ خواجہ الیاس خان نے ان اطلاعات کو بڑی حیرت اور بے چینی سے سنا۔ اسے بڑی مشکل سے یقین آیا کہ تیمور بڑی بے خوفی سے اس کی چھاؤنیوں میں دندناتا پھر رہا ہے اور مغل لشکری اور سردار اسے روکنے سے قاصر ہیں۔

اس نے اس حادثے اور سانحے پر غور کیا تو اس کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ خود اس کی غلطی اور بد انتظامی تھی۔ خانِ اعظم نے اسے ملکِ تاتار کا حکمران بنایا تھا لیکن اس نے یہ کب اجازت دی تھی کہ تاتاری بستیوں کو تاراج کیا جائے۔ پُرامن تاتاریوں کی بہو بیٹیوں کو اغوا کر کے سرِ بازار نیلام کیا جائے۔ اگر اس نے بیک جک کے مشورے سے اس لوٹ مار کی اجازت نہ دی ہوتی تو آج تیمور کو نہ تو اس طرح تلوار بلند کرنا پڑتی اور نہ اس کی ضرورت ہی پیش آتی۔

اسے تاتاریوں کے ہاتھوں مغلوں کے قتل کی بھی خبر ملی تھی۔ عام حالات میں کسی ایک مغل کا قتل بھی قیامت برپا کر دیتا لیکن اس صورت حال میں الیاس خواجہ کو مغلوں کے مارے جانے کو بھی نظر انداز کرنا پڑا۔

الیاس خواجہ کو علم تھا کہ تاتاری بستیوں میں لوٹ مار خیمہ گاہ کی شہ پر ہو رہی ہے۔ فساد پھیلانے والوں اور اغوا کرنے والوں کو کھلی چھٹی بھی تھی اور خیمہ گاہ کی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ وہ لوٹ کے مال کا پانچواں

حصہ چنگیز خانی کو ادا کر کے بری الذمہ ہو جاتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ جو سفاکی اور بربادی کریں، اس کی ان سے کوئی باز پرس نہ ہو گی۔

اس نے جتہ سردار بیک جک کو بلا کر مشورہ کیا۔ الیاس خواجہ چاہتا تھا کہ اگر جتہ سردار جو کہ مغل سردار دوسپہ سالار تھا، رضامند ہو جائے تو مغلوں کو لوٹ مار اور اغوا سے منع کر دیا جائے لیکن جتہ نے ایک بھیانک قہقہے کے ساتھ اسے بتایا:

"لوٹ مار اور اغوا کا کاروبار خود بخود کم ہو گیا ہے۔ اب کوئی مغل یہ کام کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا بیگ جک؟"

الیاس خواجہ کو بڑا تعجب ہوا:

"کیا تم نے مغلوں کو منع کر دیا ہے؟"

بیگ جک نے دوسرا قہقہہ لگایا:

"چنگیز خان کے منشی نے اپنا کام بند کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک مہینے سے نہ کوئی کوٹ کا مال آیا ہے اور نہ اغوا ہو کے آئی ہیں۔ مغل، تاتاری بستیوں میں جاتے ڈرتے ہیں۔"

"کیا مغل اس قدر بزدل ہو گئے ہیں۔" الیاس خواجہ نے پہلو بدل کے پوچھا۔

جتہ سردار بیگ جک نے تیسرا قہقہہ بلند کیا۔ جب وہ غصے میں ہوتا تو ہر بات سے پہلے قہقہہ لگاتا۔ ممکن ہے اس طرح اپنے غصے کی شدت کو کم کرنا چاہتا ہو۔

الیاس خواجہ اس کے دو بے محل قہقہے تو برداشت کر گیا لیکن تیسرے قہقہے پر وہ چڑ اٹھا۔

"بیگ جک۔ یہ فضول قہقہے بند کرو اور سنجیدگی سے جواب دو۔ کیا مغل، تاتاریوں سے خوفزدہ ہو گئے ہیں؟"

"اگر ایسا ہے تو ہمیں کوئی دوسری صورت اختیار کرنا چاہیے۔"

بیگ جک نے حسبِ معمول پھر قہقہہ لگانا چاہا لیکن فوراً سنبھل کر منہ بند کر لیا۔ ذرا ٹھہر کر بولا:

"مغل نہ ڈرتے ہیں اور نہ تاتاریوں سے خوفزدہ ہیں۔ مغل ان تین سو تاتاری سواروں سے پریشان ہیں جو تیمور اپنے ساتھ لیے پورے ملک میں گھوم رہا ہے۔ یہ سوار لوٹ مار کا مال چھین کر لڑکیوں کو آزاد کرتے ہیں اور اگر کوئی مزاحمت کرے تو اسے مار ڈالتے ہیں۔"

"مغلوں کا خون اتنا سستا ہو گیا ہے کہ اسے یوں بیدردی سے بہایا جائے۔" الیاس خواجہ کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پتلیاں تیزی سے گردش کرنے لگیں۔ اس کے باپ خانِ اعظم کی بھی غصے کے وقت یہی حالت ہو جاتی تھی۔

"اگر تم خیمہ گاہ میں بیٹھے یونہی شراب اور گھوڑی کا دودھ پیتے رہے تو مغلوں کا خون اور بھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

بیک جک نے جلتی پر تیل ڈال دیا۔

"نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

الیاس خواجہ غصے سے کانپتا کھڑا ہو گیا:

"ہم تاتاریوں سے انتقام لیں گے۔"

"چھوٹے خان۔ تم خون کیوں جلاتے ہو۔ صرف زبان ہلاؤ اور تماشہ دیکھو۔" بیک جک نے اس دوران بجائے اپنی بات کے اختتام پر اپنا بھیانک روایتی قہقہہ بلند کیا۔

"کیا چاہتے ہو بیک جک؟" الیاس خواجہ نے اسے ناگواری سے گھورا۔

"صرف ایک اشارہ۔ ویسا ہی اشارہ جیسا ہم نے مغلوں کو لوٹ مار کے لیے دے دیا ہے۔"

"صاف بات کرو بیک جک۔ میں اب کسی مزید الجھن میں نہیں پھنسنا چاہتا۔"

"مجھے حکم دو چھوٹے خان۔"

بیک جک کا چہرہ خوف ناک ہو گیا:

"میں سپہ سالار ہوں اور تم حاکمِ تاتار۔ تم مجھے حکم دے سکتے ہو کہ میں تیمور اور اس کے ساتھیوں کو تمہارے قدموں میں لا کے ڈھیر کر دوں۔"

الیاس خواجہ کا غصہ کم ہو گیا اور چہرہ سنجیدہ پڑ گیا:

"لیکن میں یہ حکم کیسے دے سکتا ہوں۔"

اس نے بیٹھتے ہوئے کہا:

"میں ملکِ تاتار کا حاکم ہوں لیکن خانِ اعظم نے تیمور کو سمرقند کا مقامی حاکم بنایا ہے۔ میں یہ حکم کیسے دے سکتا ہوں۔"

"الیاس خواجہ شہزادہ ہے۔ مغل حکومت کا ولی عہد اور ملکِ تاتار کا حاکم۔"

بیک جک چلا کے بولا: "شہزادے کو اپنے اختیارات سے کام لینا چاہیے۔ تیمور کی جرأت

مقامی سردار۔ وہ مغل بھی نہیں ہے۔ ہماری رعیت ہے۔ رعایا غلام ہوا کرتی ہے۔ اگر تم ایک معمولی تاتاری کو قتل کا حکم نہیں دے سکتے تو پھر تمہارے حاکم ہونے سے کیا فائدہ۔ حاکم حکم چلانے کے لیے ہوتا ہے لوٹ کے مال کا حصہ لینا اس کا کام نہیں۔"

بیک جک نے الیاس خواجہ کا خون گرم کرنے کی بہت کوشش کی مگر اسے تو غصہ نہ آیا بلکہ اس میں سنجیدگی پیدا ہو گئی۔

"میں نے کہا ہے کہ تاتاریوں سے انتقام لیا جائے گا لیکن میں تیمور کے قتل کا حکم نہیں دے سکتا تیمور کو خانِ اعظم نے مقرر کیا ہے۔ میں تو اسے اس کے عہدے سے بھی معزول نہیں کر سکتا۔"

"لیکن کیوں؟"

بیک جک دھاڑا۔

"تم اتنے مجبور نہیں ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں چھوٹے خان۔"

"بیک جک میں تمہاری وفاداری کی قدر کرتا ہوں۔"

الیاس خواجہ نے متانت کا دامن نہ چھوڑا۔

"لیکن میں تیمور کے قتل کا حکم دے کر خانِ اعظم کی ناراضگی مول نہیں لے سکتا۔ وہ مجھے ولی عہدی سے ہٹا سکتے ہیں۔"

"الیاس خواجہ خان!"

بیک جک نے اپنی آواز دھیمی کر لی تاکہ دور کھڑا محافظ اس کی بات نہ سن سکے:

"اگر خانِ اعظم نے تمہیں ولی عہدی سے معزول کرنے کی کوشش کی تو میرا تیس ہزار کا لشکر تمہاری پشت پر ہوگا۔ میں تمہارے خاقان ہونے کا اعلان کر دوں گا۔ وہ شمال کا خاقان اور تم جنوب کے خانِ اعظم۔ سمجھے الیاس خواجہ خان۔"

یہ اتنا بڑا منصوبہ اور سنہرا خواب تھا کہ ایک بار تو الیاس خواجہ بھی بہک کر رہ گیا۔ بیک جک کا تیس ہزار کا لشکر۔ اس میں الیاس خواجہ کے حواریوں کے لشکری بھی شامل ہو جاتے تو یہ تعداد پچاس ہزار سے بھی بڑھ جاتی۔ اتنے بڑے لشکر سے تو الیاس خواجہ آدھا ایشیا فتح کر سکتا تھا لیکن اس میں شجاعت کے ساتھ ساتھ دانش بھی موجود تھا۔ مغلوں کی خاقانی اور خانِ اعظمی۔ اس دور کی عظیم ترین نعمت تھی لیکن الیاس خواجہ خود کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باپ کے خلاف بغاوت پر تیار نہ کر سکا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بیک جک کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتا تھا کہ زمانۂ حال اور مستقبل میں اسے بیک جک جیسا بہادر اور بااثر سردار کی سخت ضرورت تھی۔

الیاس خواجہ نے ایک پیالہ اٹھا کر اپنے سامنے رکھا۔

اس میں گھوڑی کا دودھ انڈیلا۔ پھر دوسرا پیالہ اس کے برابر رکھ کر اس میں بھی دودھ بھرنے لگا۔ بیک جک اس کے اس فعل کو بڑے غور اور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ الیاس خواجہ نے ایک پیالہ اپنے ہاتھ میں اٹھا کر بیک جک کی طرف بڑھایا۔ بیک جک نے بڑی حیرت سے الیاس خواجہ کے چہرے کو دیکھا۔ الیاس خواجہ مسکرا رہا تھا۔

بیک جک نے پیالہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اسے بوسہ دیا۔

مغلوں کے قاعدے کے مطابق یہ شاہِ وقت یا حاکمِ وقت کے انتہائی التفات کا طریقہ تھا۔ مغل سردار جب کسی سردار سے خوش ہوتا تو شراب یا گھوڑی کے دودھ سے پیالہ بھر کے اسے اٹھانے کا اشارہ کرتا۔ لیکن اگر شاہِ وقت بھرا ہوا پیالہ خود اپنے ہاتھ سے اٹھا کر کسی سردار کو پیش کرے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ شاہ کی نظر میں اس سردار سے زیادہ اہم اور کوئی شخصیت نہیں۔

الیاس خواجہ نے اپنے عمل کی زبان سے بھی تصدیق کر دی۔

"بیک جک۔ تمہاری بات سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم ہر حال اور ہر موقعے پر اعتماد کیے جانے کے لائق ہو۔ تمہاری وفاداری نے میرے دل میں سب سے اعلیٰ مقام حاصل کر لیا ہے۔ تاتاریوں سے انتقام لیا جائے گا۔ تیمور اور اس کے ساتھیوں کا سر بھی اتار دیا جائے گا۔ تم جو چاہتے ہو یا تم نے جو مشورہ مجھے دیا ہے اسے قبول کرتا ہوں۔ . . . . اس پر عمل ہو گا اور میرے خیال میں اس کا یہی صحیح حل ہے لیکن گھی سیدھی انگلی سے نکل آئے تو ٹیڑھی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مغل لشکریوں کا خون اتنا سستا نہیں کہ خانِ اعظم اسے نظر انداز کر دیں۔"

الیاس خواجہ نے رک کر سانس لی۔

بیک جک نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ آخر اسے اس اعزاز کا شکریہ بھی تو ادا کرنا تھا۔ بولا:

"چھوٹے خان۔ تم نے مجھے جو اعزاز بخشا ہے میں خود کو اس کا اہل ثابت کروں گا۔ دشمن کا گھوڑا اس وقت تک پہنچ سکتا ہے جب میں اور میرا لشکر ختم ہو گیا ہو۔ میں تمہارا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

الیاس خواجہ نے اب تک پیالے کو منہ نہ لگایا تھا۔ اس نے پیالہ منہ سے لگایا اور ایک ہی سانس میں پی گیا۔ بیک جک نے بھی پیالہ منہ سے لگایا اور غٹا غٹ پی لیا۔ وہ پیالہ ہاتھ میں لیے یہی انتظار کر رہا تھا کہ بیک الیاس خواجہ دودھ پیے۔

الیاس خواجہ نے ریشمی آستین سے منہ پونچھتے ہوئے کہا:

"ہاں بیک جک۔ میں آج ہی خانِ اعظم کو تیمور کی بغاوت کی خبر بھیجتا ہوں۔ خان، باغی کو برداشت نہیں کیا کرتے۔ تیمور نے تو بغاوت کر کے اُن کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ اس کے قتل کا فوراً اعلان ہو جائے گا۔ اور پھر ہم تیمور ہی نہیں پورے ملکِ تاتار سے انتقام لیں گے۔ ایسا خوفناک انتقام جسے صدیوں یاد رکھا جائے گا۔"

بیک جک نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہاں اس کا قہقہہ ضرور بلند ہوا جو اس بات کو ظاہر کرتا تھا کہ بیک جک الیاس خواجہ کی رائے کی تصدیق کر دی ہے۔

الیاس خواجہ نے اسی روز ایک قاصد کو خانِ اعظم کے مستقر قراقرم روانہ کیا۔ خانِ اعظم کو زبانی اور تحریری دونوں طرح سے مطلع کیا گیا کہ تیمور نے مغلوں کے خلاف بغاوت کر دی ہے وہ مغل چھاؤنیوں پر حملے کر رہا ہے اور کتنے ہی بے گناہ مغل اب تک اس کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔ مغل فوجیں خانِ اعظم کے منتظر ہیں۔

○

دوسرے دن دوپہر کو بیک جک کسی کام کے سلسلے میں الیاس خواجہ کے پاس آیا ہوا تھا کہ ایک تیز رفتار سوار الیاس خواجہ کے خیمے میں ایک ایسی خبر دی جسے سن کر بیک جک اور الیاس خواجہ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

"سمرقند کا مقامی حاکم تیمور، تقریباً تین سو سواروں کے ساتھ بڑی تیزی سے خیمہ گاہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ خود بھی ہتھیاروں سے لیس ہے۔ ذرا توقف کے بعد بیک جک نے تبصرہ کیا۔ "اس کی موت اسے گھیر کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہاں لا رہی ہے۔ مغل خون آج رنگ لائے گا۔"

الیاس خواجہ اس خبر سے سخت متوحش تھا۔ اسے جیسے چپ لگ گئی۔ سوار لب بستہ خیمے میں داخل ہوئے اور اس نے مزید انکشاف کیا:

"تیمور کے ساتھ دو گاڑیوں پر عورتیں بھی ہیں۔"

"کتنا دیدہ دلیر ہے تیمور۔"

الیاس خواجہ کو اعتراف کرنا ہی پڑا۔ پھر اس نے اعلان کیا:

"دربار سجایا جائے۔ تمام سرداروں کو حاضر ہونے کا حکم دیا جاتا ہے۔"

"دربار؟" بیگ جک نے حیرت سے پوچھا۔

"خانِ اعظم تو نہیں آ رہا ہے الیاس خواجہ۔ دربار لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ ہمارا حکمران ہے۔ معمولی تاتاری، مقامی حاکم۔"

"نہیں بیگ جک۔"

الیاس خواجہ نے اسے تقریباً ڈانٹ دیا۔

"تیمور جب پہلی بار سمرقند میں آیا تھا تو اس وقت بھی خانِ اعظم نے اس کے لیے دربار لگایا، خانِ اعظم کا بنایا ہوا ایک حاکم ہے۔ ہم اس کے ساتھ بعد میں جو چاہے سلوک کریں لیکن پہلے اسے عزت سے بٹھائیں گے۔"

بیگ جک کو یہ مدارات کا طریقہ پسند نہ آیا لیکن وہ مصلحتاً خاموش ہو گیا۔ شام ہوتے ہی الیاس خیمے کے سامنے قالینوں کا فرش بچھ گیا۔ درمیان میں، الیاس خواجہ کے لیے سفید نمدے کی نشست گئی۔ اس کے تمام سردار اس کے سامنے نیم دائرے کی شکل میں آ کر بیٹھ گئے۔ بیگ جک کو الیاس کے بالکل قریب جگہ ملی۔ خیمہ سے دور دور تک مغل سواروں کے دو رویہ دستے کھڑے کر دیے گئے۔ وہ لباس پہنے تھے۔ لانبی کمانیں ان کی پشت پر آویزاں تھیں۔ لانبے اور چھوٹے نیزے زمین پر لگے تھے۔

تیمور اس جگہ پر آ کر رک گیا جہاں سے الیاس خواجہ کے خیمے تک مسلح سواروں نے راستہ بنا رکھا تھا۔ اس نے اس راستے پر نظر دوڑائی۔ کافی دور اُسے الیاس خواجہ بیٹھا دکھائی دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ الیاس نے اس کا رعب کرنے کے لیے یہ اہتمام کیا ہے۔

تیمور نے سوار اور خواتین کی گاڑیاں وہیں چھوڑ دیں اور ظفر یاب کو اپنے ساتھ لیے اس راستے میں داخل ہو گیا جو موت کے گھیرے سے کم نہ تھا۔ ایک اشارے میں اس کا اور ظفر یاب کا کام تمام کیا جا سکتا تھا۔ تیمور کے چہرے پر فکر و تردد کا کوئی نشان نہ تھا۔ وہ ایک شان بے نیازی کے ساتھ اور پُر وقار انداز میں گھوڑا آگے بڑھا رہا تھا۔ ظفر یاب کا گھوڑا اس کے پیچھے تھا۔

الیاس خواجہ کے مسلح سوار اس سردار کی بے خوفی پر عش عش کر رہے تھے۔ تمام لوگوں کو دربار تک آنے کی توقع نہ تھی۔ جنہیں خبر مل گئی تھی وہ دور سے کھڑے تیمور کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے کوئی عجوبۂ روزگار چیز ہو۔ تیمور کی دزدیدہ نظروں سے الیاس خواجہ کے اس اردوئے معلّٰی کی فرودگاہ کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اسے حدِ نظر تک خیموں کی قطاریں، گھوڑوں کے دستے اور نمدے کے خیمے نظر آ رہے تھے۔

تیمور نے الیاس خواجہ کو مغل علم کے نیچے سفید نمدے پر بیٹھا دیکھا تو اسے بے ساختہ بادشاہ کا خانِ اعظم یاد آ گیا۔ وہی رنگ روپ، چوڑا چکلا منگول چہرہ، رخساروں کی ہڈیاں تھوڑی تھوڑی ابھری ہوئیں، ہلکی داڑھی، چھوٹی چھوٹی کھنچی ہوئی آنکھیں۔ آنکھوں کے اندر بے قرار پتلیاں۔ الیاس خواجہ اور خانِ اعظم میں اگر کوئی فرق تھا تو صرف یہ کہ اس کے رخسار زیادہ بھدے اور کھردرے تھے۔

تیمور نے قالین کے فرش کے پاس اپنا گھوڑا روکا۔ گھوڑے سے اتر کر وہ دو قدم آگے بڑھا اور ادب سے کرنش (کورنش) بجا لایا۔ پھر سیدھا ہو کر بولا:

"اے عالی نسب خانِ اعظم تغلق تیمور کے عالی مقام ولی عہد شہزادہ الیاس خواجہ خان اور اے اردوئے معلّٰی کے امیر، میں قبیلہ برلاس کا سردار اور سمرقند کا حاکم تیمور ہوں۔"

الیاس خواجہ کی نظریں تیمور کی فولادی کڑیوں والی نقرئی کام کی زرہ، چہار آئینہ، بازو بند اور شانہ گیر پر جمی تھیں۔ تیمور کے سر پر جو خود تھا اس کی جھول گردن کو ہر طرف سے محفوظ کیے ہوئے تھی اور خود زرّیں کام سے جگمگا رہا تھا۔

الیاس خواجہ اسے جواب دینے والا تھا کہ بیگ جک کا بھیانک قہقہہ بلند ہوا۔ اس نے بڑی حقارت سے کہا:

"تیمور۔ تو سمرقند کا حاکم نہیں وہاں کا مقامی منتظم ہے۔"

پھر اس حقارت کو مزید تقویت دینے کے لیے دو قہقہے اور لگا دیے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"شہزادہ الیاس خواجہ!"

تیمور نے کڑک کر کہا:

"مغل سردار کو تیمور کی توہین سے منع کیا جائے کیونکہ یہ توہین تیمور کی نہیں بلکہ بلادِ شمال کے تغلق تیمور کی ہے جس نے مجھے سمرقند کا حاکم مقرر کیا ہے۔ اگر مغل سردار نے اپنے الفاظ واپس نہ خانِ اعظم کی توہین کے جرم میں اس کا سر قلم کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

بیگ جک، تیمور کی اس جرأت پر ہکا بکا رہ گیا۔ وہ غصے سے بھنّایا ہوا اٹھ کھڑا ہوا لیکن الیا اسے سختی سے ڈانٹا۔

"بیگ جک بیٹھ جاؤ۔ تمہیں خانِ اعظم کے مقرر کردہ کسی حاکم کی توہین کرنے کی اجازت نہیں تیمور ہم سے مخاطب ہے۔ جواب ہم دیں گے۔"

بیگ جک منہ بناتا اور ہونٹ کاٹتا ہوا بیٹھ گیا۔

تیمور نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنی فطری ذہانت کا سہارا لیا:

"عالی نسب باپ کے عالی نسب بیٹے نے یہ ثابت کر دیا کہ اس کے رگوں میں وہی چنگیزی خون دو جو شاہِ وقت کی توہین برداشت نہیں کر سکتا اور عہد ناموں کی پاسداری میں خانِ اعظم کی طرح اٹل اور ثابت

الیاس خواجہ بھی عقلمند تھا۔ اس نے بھی تیمور پر ذکاوت کا کوڑا استعمال کیا۔ پوچھا:

"تیمور، تمہارے قول کے مطابق خانِ اعظم کی توہین ناقابلِ برداشت ہے۔ اب یہ بھی بتاؤ کہ شخص خانِ اعظم سے بغاوت کرے تو اس کی کم از کم سزا کیا ہے؟"

"شہزادہ محترم۔ بغاوت کی کم از کم سزا موت ہے۔"

تیمور نے بلا جھجک جواب دیا:

"لیکن خانِ اعظم سے بغاوت کرنے والے کی سزا یہ ہے کہ باغی کا سر کاٹا جائے اور اس کی لاش تشہیر کی جائے۔ پھر اس کے بیوی بچوں کو سولی پر چڑھایا جائے اور اہلِ خاندان کو نیست و نابود کر

الیاس خواجہ کو اس جواب پر بڑی حیرت ہوئی۔ وہ تمسخر کی مسند پر پہلو بدل کر بولا:

"تیمور، کیا تم نے مسلح سواروں کے ساتھ مغل چھاؤنیوں پر چھاپے نہیں مارے۔ کیا تم سے کئی بے گناہ مغل نہیں مارے گئے۔ تمہارا یہ فعل بغاوت نہیں تو اور کیا ہے۔ تمہارے اس جرم کی یہ

کیوں نہ ہم تمہارا سر قلم کر کے اس کی نمائش کریں تاکہ ان بیواؤں کے دل کو ٹھنڈک ملے جن کے والیوں کو تم نے قتل کیا ہے۔"

الیاس خواجہ نے نہ صرف تیمور پر بغاوت کا الزام لگایا بلکہ اس کی سزا بھی فوراً ہی تجویز کر دی۔ یہ لمحہ تیمور کے لیے بڑا سخت تھا لیکن وہ جذبات سے بے قابو ہونے کے بجائے متانت سے بولا:

"شہزادۂ محترم۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ مغلوں کے جدِّ امجد قبل خاں اور تیموریوں کے جدِّ امجد قاچولی خان میں معاہدہ ہوا تھا کہ مغل بادشاہت کریں گے اور تاتاری ان کے ماتحت سردار ہوں گے۔ یہ معاہدہ اب تک قائم ہے اور ہمیشہ قائم رہے گا۔ بلادِ شمال کا خانِ اعظم تغلق تیمور میرا اور تمام تاتاریوں کا بادشاہ ہے اور شہزادہ الیاس خواجہ اس کا ولی عہد ہے۔ پھر بھلا مجھ پر بغاوت کا الزام کون لگا سکتا ہے۔ اگر کسی دشمن نے مجھ پر یہ الزام لگایا ہے تو خانِ اعظم کے دربار میں پہنچ کر اس کی صفائی پیش کروں گا۔ میں اپنی کچھ شکایتیں لے کر حصار الملیق جا رہا ہوں۔ بغاوت کے اس تازہ الزام کی تردید بھی وہیں پہنچ کر کروں گا۔"

"تم حصار الملیق جا رہے ہو؟"

الیاس خواجہ کے ہاتھ پیر پھول گئے:

"لیکن ــــ لیکن تم وہاں کیوں جا رہے ہو؟"

بغاوت کا الزام تو الٹ رہا الیاس خواجہ کو اپنی فکر پڑ گئی۔ اگر تیمور خانِ اعظم تک پہنچ گیا تو نہ معلوم کیا کرے گا۔ اس نے دل میں فیصلہ کیا کہ وہ تیمور کو کسی نہ کسی تدبیر سے حصار الملیق جانے سے روکے گا۔

تیمور کو اس کی گھبراہٹ سے اس کے دلی جذبات کا اندازہ ہو گیا۔ سو وہ اکڑ کر بولا:

"شہزادہ الیاس خواجہ ..... افسوس کہ میں نے آپ کو مغل لٹیروں اور پردہ فروشوں کی ناشائستہ حرکات سے کئی بار آگاہ کیا مگر آپ نے اس سلسلہ میں کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اب میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ میں خانِ اعظم کے دربار میں جا کر فریاد کروں اور پوچھوں کہ کیا انہوں نے مجھے اس لیے مغلوں کے ماتحت کر دیا ہے کہ مغل میرے گھروں میں گھس کر بہو بیٹیاں اٹھاتے رہیں اور تاتاری بستیوں کو لوٹتے رہیں۔ آپ کے باپ دادا نے ہمارے باپ دادا سے ہماری عزت و ناموس کی حفاظت کا عہد کیا تھا۔ پھر یہ خلاف ورزی کیوں ہوئی ہے؟"

تیمور کی باتوں سے بیگ جک کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے تیمور کی توہین کی تھی اور اسی کے مشورے سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

الیاس خواجہ نے مغلوں کو تاتاری بستیاں اجاڑنے اور لڑکیاں اغوا کرنے کی اجازت دی تھی۔ اس نے الیاس کے کان میں کہا:

"چھوٹے خان۔ تیمور کو یہیں ختم کر دینا چاہیے۔ حصار الماليق پہنچ کر یہ بڑا غضب ڈھائے گا۔ مجھے حکم دو میں ابھی اس کا خاتمہ کیے دیتا ہوں۔"

الیاس خواجہ بھی تیمور کی باتوں سے پریشان تھا۔ اس نے یہ تو سوچ لیا تھا کہ تیمور، خانِ اعظم سے باہر نہ جانے کیا کہہ دے گا لیکن وہ روکے گا کس طرح؟ اس کے متعلق اس نے ابھی تک کچھ نہ سوچا تھا..... بیک بک کے مشورے نے اسے ایک نئی راہ دکھائی۔ لیکن یہ آخری اقدام ہوگا۔ یہ قدم اٹھانے سے پہلے بہت کچھ سوچنا ہوگا۔

تیمور ابھی تک کھڑے گفتگو کر رہا تھا۔ الیاس خواجہ نے نرمی سے کہا:

"ہمارے درمیان غلط فہمیاں ہو بھی سکتی ہیں۔ تمہارا یوں کھڑے ہو کر گفتگو کرنا مناسب نہیں۔ تم بیٹھ کے اپنی شکایت بیان کرو۔ ہم پوری توجہ سے سنیں گے۔"

الیاس خواجہ نے گفتگو میں پورا شاہانہ انداز اختیار کیا لیکن تیمور نے اس کا کوئی اثر قبول نہ کیا اور بڑے اطمینان سے مغل سرداروں کے نیم دائرے سے آگے بڑھ کر الیاس خواجہ کے سامنے بیٹھ گیا۔ تیمور کی بے خوفی اور بے باکی سے اس کے سردار اور خود الیاس خواجہ ہر لمحہ مرعوب ہوتا چلا جا رہا تھا۔

"شہزادہ الیاس خواجہ۔ میری شکایت آپ تک پہنچ چکی ہے۔"

تیمور نے اس سے آنکھیں ملاتے ہوئے کہا:

"یہ شکایت نہیں بلکہ میرا اور تاتاریوں کا حق ہے۔ مغلوں اور تاتاریوں کے معاہدے کے تحت مغل بادشاہ ہیں۔ بادشاہ کا فرض ہے کہ وہ رعیت کی عزت آبرو اور جان و مال کی حفاظت کرے۔ میں یہی حق طلب کرتا ہوں۔ اسے شکایت نہیں کہا جا سکتا۔ اگر ہمیں یہ حق آپ سے مل جاتا تو ہمیں حصار الماليق جانے کی ضرورت نہ پڑتی۔"

تیمور نے خطرے کی بُو سونگھ لی تھی اس لیے اس نے نرم لہجہ اختیار کیا۔

"ہم تمہیں حصار الماليق جانے سے روک بھی سکتے ہیں تیمور۔"

الیاس خواجہ نے بالکل سپاٹ لہجے میں کہا جس سے یہ قطعی اندازہ نہ ہوتا تھا کہ وہ دشمنی پر آمادہ ہے۔

یا صورت نکالنا چاہتا ہے۔

تیمور کو یہ فیصلہ کرنے میں کئی لمحے لگ گئے۔ آخر وہ بڑی سوچ بچار کے بعد الفاظ تولتے ہوئے بولا:

"عالیمقام شہزادے۔ مجھے حصار الماليق جانے سے روکنے کے لیے دو طریقے ہیں۔ ایک تو طاقت کا۔ تین ہزار سواروں کو جن کے ساتھ خواتین بھی موجود ہیں۔ پچیس ہزار کا مغل لشکر، اگر قتل کر دے تو اچھا کارنامہ نہ ہوگا لیکن آپ کا یہ فعل مغلوں اور خصوصاً آپ کے لیے خطرناک ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے ان کا ہر فرد تیمور بن کر مغلوں کے سامنے کھڑا ہو جائے جنہیں سنبھالنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوگا۔ آپ کا یہ قدم مناسب نہیں ہوگا کہ اس طرح آپ خانِ اعظم کے ایک وفادار سردار اور اس کے ساتھیوں کو اپنے ان کی نظروں سے گرا جائیں گے۔ آپ کی ولی عہدی خطرے میں پڑ جائے گی۔ خانِ اعظم یہ کبھی برداشت نہیں کریں گے کہ مغلوں اور تاتاریوں کے صدیوں پرانے معاہدے کو ان کا ولی عہد توڑ ڈالے۔"

الیاس خواجہ، تیمور کے ایک ایک لفظ کو غور سے سن رہا تھا۔ تیمور کے ہر لفظ سے سچائی جھلکتی تھی۔ اس بات نے الیاس خواجہ کو ہلا کے رکھ دیا اور اسے مجبوراً اپنے مستقبل میں جھانکنا پڑا۔ اس نے گھمبیر آواز میں پوچھا:

"تمہارے خیال میں دوسری صورت کیا ہو سکتی ہے؟"

تیمور، اس کے لہجے کی لرزش محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ دبے دبے لفظوں میں بولا:

"دوسری صورت معاہدے کی تجدید ہے۔ آپ تاتاریوں کا مطالبہ یا شکایت دور کر دیں۔ میں حصار الماليق واپس کر دوں گا۔"

"تیمور۔"

الیاس خواجہ نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا:

"گزشتہ ایک ماہ سے لوٹ مار یا اغوا کا کوئی واقعہ ہمارے علم میں نہیں آیا۔ ہم نے سختی سے اس کی روک تھام کی ہے۔"

"شہزادہ الیاس خواجہ۔"

تیمور مسرت سے بولا:

"آپ واقعی خانِ اعظم کے سچے جانشین ہیں۔ آپ نے لوٹ مار اور اغوا کی ممانعت کر کے خود ہی معاہدے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی تجدید اور توثیق کر دی ہے۔ اب مجھے حصار الملایق جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ اغوا شدہ لڑکیوں کی واپسی کا حکم دے دیجیے۔ میں انہیں لے کر سمرقند واپس چلا جاؤں گا اور مغل بادشاہت کے تحت اپنے فرائض انجام دوں گا۔"

الیاس خواجہ نے جھوٹ بول کر تیمور کو تو مطمئن کر دیا لیکن اب اپنے ہی جھوٹ میں پھنس گیا تھا۔ اپنے سچ ثابت کرنے کے لیے تمام لڑکیوں کو واپس کرنا ضروری ہو گیا تھا لیکن یہ واپسی بہت دقت طلب کام تھا۔ اکثر نیلام ہو کر کنیزیں بنائی جا چکی تھیں۔ اسے خطرہ تھا کہ اگر خریدنے والوں نے کنیزیں واپس کرنے سے انکار کر دیا تو کہیں کوئی ہنگامہ کھڑا نہ ہو جائے۔

"تیمور۔ بعض باتیں نادانستگی میں ہو جاتی ہیں۔ جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ اب اگر کوئی لڑکی اغوا کرنے والے کا سر قلم کرا دیں گے۔" الیاس خواجہ نے بڑی چالاکی سے لڑکیوں کی واپسی کے پہلو تہی کی۔

تیمور اس فریب میں کب آنے والا تھا۔ فوراً بولا:

"شہزادے عالی مقام۔ چند تاتاری لڑکیوں کو واپس کر کے آپ ہزاروں تاتاریوں کی دعائیں اور ہمدردیاں حاصل کر لیں گے۔ آپ کے ماتحت اتنے خود سر تو نہیں کہ وہ آپ کے حکم کو ٹال سکیں۔ وہ بھی یہ میں کہ جب آپ ایک قدیم معاہدے کا عملی مظاہرہ کر رہے ہیں۔"

الیاس خواجہ الجھن میں پھنس گیا۔ وہ بیک جک کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

"کیوں بیک جک۔ لڑکیوں کو واپس کرنے میں کوئی ہرج تو نہیں۔"

بیک جک، تیمور کی باتوں سے پہلے ہی قائل ہو چکا تھا۔ اسے سب سے زیادہ ڈر خانِ اعظم کا تھا۔ دو ساتھیوں کا انجام دیکھ چکا تھا۔ اس نے الیاس خواجہ کی ہاں میں ہاں ملائی:

"یہ کون سی بڑی بات ہے چھوٹے خان۔ کنیزیں خریدنے والوں کو اگر قیمت واپس کر دی جائے تو خوشی لڑکیاں واپس کر دیں گے ورنہ میں۔۔۔۔"

"جتہ سردار۔"

تیمور نے بیک جک کو مخاطب کیا:

"آپ قیمت کی فکر نہ کریں۔ میں انہیں منہ مانگی رقم ادا کر دوں گا۔"

بیک جک نے جواب میں اپنا دانتوں والا قہقہہ بلند کیا جو خوشی اور غصہ دونوں حالتوں میں خود بخود اس کے چہرے پر پھیل پڑتا تھا۔

"آج تم ہمارے مہمان رہو گے تیمور۔"

الیاس خواجہ نے مسرت سے تیمور سے کہا:

"تمہارے سپاہیوں کے جہاں کہو خیمے لگا دیے جائیں۔ خواتین کو چاہو تو بیگمات کے خیموں میں بھیج دیں۔"

"شہزادے!"

تیمور بڑے رعب سے بولا:

"مغلوں کی طرح تاتاریوں کی چھت آسمان اور بستر گھوڑے کی زین ہوتا ہے۔ میرے سوار خیمہ گاہ سے باہر رہیں گے۔ میری بیوی الجائی خاتون آپ کی بیگم کو کورنش پیش کرنے ضرور جائے گی۔"

مخاصمت کی فضا صاف ہو گئی۔ دشمنی کے بادل چھٹ گئے۔ الیاس خواجہ اور بیک جک مطمئن تھے کہ تیمور کی بلا سے نجات ملی۔ تیمور کے ساتھی اس کی فراست کے ایک بار پھر قائل ہو گئے۔ اس نے بڑے انداز میں مغلوں کو اغوا شدہ لڑکیاں واپس کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔

○

پرندوں کا گوشت، گھوڑوں کے پٹھوں اور ران کے کباب، چپڑی ہوئی میٹھی روٹیاں۔ مغلوں کی یہ ضیافت الیاس خواجہ کے اس ضیافتی دسترخوان پر موجود تھیں جس کا اہتمام تیمور کے لیے کیا گیا تھا۔ دسترخوان پر الیاس خواجہ کے ساتھ بیٹھا۔ الیاس کے بائیں جانب جتہ سردار بیک جک تھا۔ اب اس کا رویہ اس کے ساتھ بے انتہا دوستانہ تھا اور وہ ملکے نخروں کے ساتھ تیمور سے باتیں کر رہا تھا۔ تیمور نے بھی شاہی کو دل سے یا مصلحتاً نظر انداز کر دیا تھا۔

دسترخوان پر یہ تمام کھانے موجود تھے لیکن تیمور نے ان کی طرف توجہ نہ کی۔ اس نے الیاس خواجہ سے کہا کہ اس کا مذہب مغلوں سے مختلف ہے اس لیے وہ صرف ان جانوروں کا گوشت کھائے گا جن کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ خود ذبح کرے گا۔ الیاس خواجہ نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ تیمور کے لیے اس کے ہاتھوں ہوئی پہاڑی بکریوں کی بھنی ہوئی رانیں اور کباب لائے گئے۔ اس کے ساتھ کے سواروں کے خیموں کے سامنے قالین کے فرش پر کھانا چُنا گیا۔ کھانے کے دوران تیمور نے شراب کے بجائے استعمال کیا جس کا اس کے لیے خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔

تیمور نے الیاس خواجہ سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی بیوی الجائی خاتون، الیاس خواجہ کی بیگم کے لیے آئے گی۔ اس لیے الیاس خواجہ کی بیگم نے الجائی خاتون کو اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دی اجازت سے الجائی خاتون نے دعوت قبول کر لی۔ اس زنانہ دعوت کا انتظام الیاس خواجہ کی بیگم کے کیا گیا۔

الجائی خاتون کے لیے خیمے کا یہ گھر بالکل نیا اور ایک عجوبہ سا تھا۔ وہ مکانوں میں رہنے کی جب اسے خیمے میں رہنا پڑتا تو وہ بھی عام قسم کے معمولی خیمے ہوتے تھے لیکن یہ گھر تو اندر سے پورا میں مزین کر رکھے تھے۔ گلیچہ بافی تھیں۔ قالینوں کا فرش۔ دیبا اور حریر کے پردے۔ ستونوں پر چاندی پترّ چڑھے ہوئے۔ مغلوں کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر وہ بڑی حیران ہوئی۔

الیاس خواجہ کی بیوی نے بڑے اصرار سے خانی خورہ کو بھی اس دعوت میں بلایا تھا۔ دراصل کو یہ دکھانا چاہتی تھی کہ تیمور جیسے خود سر تاتاری سردار کی بیوی اس کی سامی کو آئے گی۔ خانی خورہ انکار کیا۔ پھر کچھ سوچ کر رضامند ہو گئیں۔ انہوں نے صرف شرکت کی رضامندی ظاہر کی تھی کھانا انکار کر دیا تھا۔ انہیں الیاس خواجہ کی بیوی پر اعتبار نہ تھا اور زہر خوانی کی شرمناک وبا مغلوں میں تھی اور وہ خواہ مخواہ میں اپنی جان دینا نہیں چاہتی تھیں۔

گل عذار نے جب سے سنا تھا کہ تاتاریوں کا سردار تیمور مغلوں کی خیمہ گاہ میں تاتاری لڑکیوں کے لیے آیا ہے اس وقت سے اس کا عجب حال تھا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ خانی ماں سے اس سلسلے میں کرے لیکن ہر بار اس کی ہمت نے جواب دے دیا۔ خانی ماں کی شفقتوں نے گل عذار کو اس کا عادی بنا دیا تھی کہ خانی ماں نے اسے اپنی بیٹی بنایا ہے اور وہ اسے کسی حالت میں اپنے سے جدا کرنے پر تیار نہ تاہم کچھ کچھ امید تھی کہ خانی ماں شاید اس پر رحم کھا کر تیمور کے ساتھ جانے کی اجازت دیدیں لیکن اس وقت دم توڑ گئی جب خانی ماں نے زنانہ دعوت میں تنہا جانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے تتی نیز اگر

تاکید کی کہ وہ گھر سے باہر نہ نکلیں اور جب وہ اپنی شاندار گاڑی پر سوار ہو کر چلنے لگیں تو انہوں نے محافظوں کو بلا کر گھر کی حفاظت کے خاص احکام صادر کیے۔

خانی ماں بہو کے گھر میں کھانے کے بعد پہنچیں۔ یہی ان کا وعدہ تھا۔ خانی ماں کا استقبال الیاس خواجہ کی تمام بیگمات اور دوسرے معزز سرداروں کی بیویوں نے کچھ اس انداز سے کیا کہ الجائی خاتون کے دل پر اس بزرگ ہستی کا رعب پڑ گیا۔

"یہ ہیں خانی ماں"۔

الیاس خواجہ کی بیوی نے الجائی خاتون سے ان کا تعارف کرایا:

"خانی ماں مغلوں کی بزرگ ترین اور محبوب ترین خاتون ہیں۔ ان کی دست بوسی پر مغل فخر کرتے ہیں"۔

الجائی خاتون نے اسے ایک اشارہ سمجھا اور بڑھ کر ان کے دونوں ہاتھ چوم لیے:

"میں ہوں الجائی خاتون۔ تاتاریوں کے عظیم قائد امیر قزغن کی پوتی اور شہر سبز کے تاتاری سردار تیمور کی شریک زندگی"۔

الجائی خاتون نے خانی ماں سے خود اپنا تعارف کرایا۔

خانی ماں، الجائی خاتون کی سلیقہ مندی سے بہت خوش ہوئیں اور محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"تم شہر سبز سے آئی ہو؟"

خانی ماں نے نہ جانے کیا سوچ کر سوال کیا اور پھر اس طرح آنکھیں بند کیں جیسے وہ کوئی بھولی بسری بات یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

"ہاں۔ مغلوں کی عظیم ترین خاتون"۔

الجائی نے کمال ادب سے کہا:

"سردار تیمور کا گھر شہر سبز میں ہے۔ میں جب سے بیاہ کر آئی ہوں شہر سبز میں رہتی ہوں"۔

خانی ماں "ہوں" کہہ کر خاموش ہو گئیں۔

تمام بیگمات اور معزز مہمان خواتین نے خانی ماں کے ہاتھوں کو چوما اور دعائیں حاصل کیں۔ پھر خواتین اپنی فطرت کے مطابق دو دو، چار چار کی ٹولیوں میں بٹ کر خوش گپیوں میں لگ گئیں۔ الیاس خواجہ کی بیگم کا مقصد کل ہو چکا تھا۔ وہ خانی ماں کو دکھانا چاہتی تھی کہ سمرقند کے حاکم کی بیوی خود چل کر اس کے گھر آئی ہے اس لیے وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خانی ماں کو چھوڑ کر اپنی سہیلیوں سے گفتگو میں لگ گئی۔ البانی خاتون کے لیے یہ ماحول اجنبی تھا اس لیے وہ خانی ماں کے پاس بیٹھی رہی۔

"کیا نام بتایا ہے تم نے اپنا؟" خانی ماں نے آہستہ سے پوچھا۔

"خاتونِ آغا البانی خاتون"۔ البانی خاتون نے سر جھکا کر کہا۔ "البانی خاتون میرا نام اور خاتونِ آغا میرا خطاب ہے"۔

"شہرِ سبز میں مغلوں نے ایک بار رات کو لوٹا تھا"۔

خانی ماں نے اک دم سوال کر دیا تو البانی خاتون گھبرا گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے حالانکہ اسے اس واقعے کی پوری تفصیل معلوم تھی۔ اس نے خاموشی ہی میں بہتری سمجھی۔

"گھبراؤ نہیں خاتونِ آغا۔ میں تاتاریوں کی ہمدرد ہوں"۔ خانی ماں نے اسے تسلی دی۔

"بزرگ مادرِ محترم!"

البانی کو بولنا ہی پڑا:

"وہ بڑا دردناک واقعہ تھا۔ ہماری ایک دلہن کو جملہ عروسی سے اغوا کیا گیا مگر اب چھوڑ دیے ان ماؤں کو۔ مغلوں اور تاتاریوں کے دل صاف ہو گئے ہیں"۔

"اس دلہن کے شوہر کا نام ظفر یاب ہے"۔ خانی ماں جیسے خواب میں بڑبڑائیں۔

خانی ماں کے منہ سے یہ جملہ سن کر البانی خاتون اچھل پڑی۔

ان بڑی بی کو ظفر یاب کا نام کس نے بتایا۔ البانی کا ذہن الجھنے لگا۔ اس نے خانی ماں کو یوں دیکھا جیسے چاہتی ہو کہ وہ اس کے ذہن کی الجھن دور کریں۔

"ظفر یاب کہاں ہے؟" خانی ماں نے جواب کا انتظار کیے بغیر دوسرا سوال کر دیا۔

البانی خاتون کی الجھن دور کیا ہوتی اس میں اور اضافہ ہو گیا۔

"ظفر یاب ہمارے ساتھ آیا ہے بزرگ ماں"۔ البانی خاتون نے سر جھک کے خانی ماں کے سوال کا یہ جواب دے دیا۔

البانی خاتون جواب دینے کے بعد خانی ماں کا منہ غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ خانی ماں کچھ اور کہیں تاکہ یہ عقدہ کھلے کہ انہیں ظفر یاب کا نام کیسے معلوم ہوا۔ اور انہیں شہرِ سبز کے واقعے سے اتنی دلچسپی

[illegible] خانی ماں نے چپ سادھ لی۔ وہ تو یوں بیٹھی تھیں جیسے انہوں نے البانی سے کوئی گفتگو ہی نہیں [illegible] البانی خاتون نظروں سے دیر تک ان کا چہرہ دیکھتی رہی لیکن خانی ماں اس کی موجودگی سے لاتعلق ایک ٹک [illegible] کو دیکھے جا رہی تھیں۔ ان کے ہونٹ جیسے گویائی سے محروم ہو گئے تھے۔

[illegible] دیر یہی کیفیت طاری رہی۔ پھر ایاس خواجہ کی بیگم نے آ کر خانی ماں کو اطلاع دی کہ ان کی گاڑی تیار [illegible] بغیر کچھ کہے اٹھیں اور بیگم کے ساتھ خیمے کے دروازے کی طرف چل پڑیں۔ البانی خاتون کا الوداعی [illegible] لیے اٹھا ہوا ہاتھ اٹھا ہی رہ گیا۔ خانی ماں نے اس کی طرف ذرا بھی التفات نہ کیا۔ حالانکہ وہ خود بھی انہیں [illegible] رخصت کرنے گئی تھی۔

البانی خاتون دعوت سے فارغ ہو کر تیمور کے ساتھ اپنے خیمے میں آ گئی۔ اس نے کئی بار ارادہ کیا کہ راستے [illegible] خانی ماں والی بات بتائے لیکن تیمور کسی فکر میں غلطاں و پیچاں تھا۔ وہ راستے میں خاموش رہی [illegible] پہنچتے ہی پھٹ پڑی:

[illegible] ہیں آپ۔ ظفر یاب کا نام مغلوں کو معلوم ہو گیا ہے"۔

"پھر اس میں تعجب کی کیا بات ہے خاتونِ آغا؟" تیمور نے البانی کے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھ [illegible] کرنے کے لیے کہا۔

"لیکن انہیں ظفر یاب کا نام کیسے معلوم ہوا؟" البانی نے اور زیادہ پریشانی اور حیرت کا اظہار کیا۔

"ممکن ہے ظفر یاب نے کسی دشمن کو اپنا نام بتایا ہو"۔

تیمور نے چہرے پر بگڑی ہوئی البانی کے بالوں کی لٹ کو چھیڑتے ہوئے کہا:

"ظفر یاب کوئی اہم ہستی تو نہیں کہ مغلوں کو اس کی جستجو ہو"۔

"انہیں ظفر یاب کی جستجو ہے میرے سرتاج"۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو"۔

"تو سے خانی ماں نے ظفر یاب کے بارے میں پوچھا تھا"

"خانی ماں یہ کون ہیں؟" تیمور کو دلچسپی پیدا ہوئی۔

"خانی ماں مغلوں کی بزرگ ترین اور معزز ترین ہستی ہیں"۔ البانی نے بتایا۔ "انہیں شہرِ سبز میں بارات لوٹنے [illegible] ہے۔ انہوں نے زور دے کر مجھ سے پوچھا کہ ظفر یاب اس وقت کہاں ہے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"پھر تم نے کیا جواب دیا؟" تیمور کی دلچسپی نے فکر کی صورت اختیار کر لی۔

"میں اُن کی بزرگی سے اس قدر مرعوب ہو گئی کہ جھوٹ نہ بول سکی۔" الجائی نے نظریں جھکا لیں۔ اس سے غلطی ہو گئی ہو اور اب وہ تیمور سے شرمندہ ہو۔

"تم نے بتا دیا کہ ظفریاب ہمارے ساتھ ہے؟"

"ہاں سرتاج۔ مجھے اپنی غلطی پر افسوس ہے۔"

"کوئی غلطی نہیں الجائی۔"

تیمور نے اس کی لٹ کو پھر چھیڑا۔

"اگر تم جھوٹ بولتیں تو شاید یہ زیادہ بڑی غلطی ہوتی۔"

"لیکن سرتاج۔۔۔۔۔"

"سو جاؤ الجائی۔ کل ہمیں سمرقند واپس جانا ہے۔"

تیمور اس کی پیشانی تھپتھپاتا ہوا اپنے خیمے میں چلا گیا۔

⊙

خانی ماں نے جس طرح الجائی خاتون کو الجھن میں ڈال دیا تھا اسی طرح گل عذار بھی ان کی وجہ سے الجھن میں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ تیمور تاتاری لڑکیوں کی واپسی کے سلسلے میں خیمہ گاہ آیا ہے اور غلط قیمت ادا کر کے ان لڑکیوں کی واپسی پر رضامند ہو گئے ہیں۔ وہ بھی امیر لڑکی تھی۔ تیمور اسے بھی واپس لے جا سکتا تھا۔ کون بتائے گا کہ اسے خانی ماں نے اپنی بیٹی بنا کر اپنی محبت اور شفقت کے پنجرے میں بند کر لیا تھا۔ وہ بھی نہیں کر سکتی۔ فریاد سے بھی مجبور ہے۔

خانی ماں کی عدم موجودگی میں گل عذار نے سسکیوں اور آنسوؤں کے درمیان اپنی لونڈی کو سنا دی تھی۔ تتنی لڑکی بھی اسی کی طرح قید تھی لیکن ان دونوں میں فرق یہ تھا کہ تتنی لڑکی مع اہل قبیلہ قیدی بنائی گئی تھی۔ اس کے ماں باپ اور دوسرے عزیز و اقارب، مغلوں کے گھریلو ملازم بن گئے تھے۔ لڑکی کو ان سے جینے میں صرف ایک بار ملنے کی اجازت تھی۔ وہ اسی کو غنیمت سمجھتی تھی۔ یہ اجازت

اسے سفارش پر حاصل ہوئی تھی۔

گل عذار بالکل ہی مجبور تھی۔ اپنے شہر سے دور۔ ماں باپ، بہن بھائیوں سے دور۔ اسی کا شوہر حملہ آوروں میں اس کا گھونگھٹ بھی نہ اٹھا سکا تھا کہ وہ ظالموں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر خیمہ گاہ پہنچا دی گئی۔ وہ تو خدا نے کرم کیا کہ بے خانی ماں اپنے ساتھ لے آئیں۔ ورنہ معلوم نہیں اس کا کیا حال ہوتا۔

گل عذار کی کہانی اس قدر دردناک تھی کہ تتنی کنیز بھی اس کے ساتھ رونے لگی۔ اس نے گل عذار کی یہ درخواست بھی منظور کر لی تھی کہ وہ صبح کو کسی بہانے تیمور کے سواروں تک پہنچے گی اور ان سے شہر سبز کے ظفریاب کے بارے میں معلوم کرے گی۔ یہ کام آسان جوکھوں کا تھا مگر تتنی کنیز اس کے لیے بھی تیار ہو گئی۔

پھر گل عذار نے خود ہی یہ ارادہ بدل دیا۔ اسے اس میں سراسر اپنی خود غرضی نظر آئی۔ اگر تتنی کنیز پکڑی گئی اور اسے قتل کر دیا گیا تو یہ خون اس کی گردن پہ ہو گا۔

گل عذار نے یہ بھی سوچا کہ اگر تتنی لڑکی نہ بھی قتل کی گئی اور یہ راز کسی طرح کھل گیا تو پھر خانی ماں اس کے بارے میں کیا فیصلہ کریں گی۔ وہ اسے ضرور احسان فراموش سمجھیں گی۔ ممکن ہے کہ وہ اسے اپنے سے الگ کر کے کسی اور مغل کے حوالے کر دیں۔ وہ اس خیال سے ہی تھرا اٹھی اور اس نے تتنی لڑکی کو تیمور کی طرف بھیجنے کا خیال چھوڑ دیا۔

گل عذار اپنی قسمت پر صبر شکر کر کے بیٹھی تھی کہ خانی ماں کی گاڑی خیمے پر آ کر رکی۔ گل عذار بڑی امیدوں کے ساتھ بھاگ کر دروازے پر گئی۔ خانی ماں گاڑی سے اتر کر دروازے پر آ چکی تھیں۔ گل عذار نے تجسس بھری نگاہوں سے انہیں دیکھا لیکن خانی ماں کھوئی کھوئی سی خیمے میں داخل ہو گئیں۔ گل عذار دل مسوس کر رہ گئی۔ اس کی امیدوں کے تارے ٹوٹ گئے۔ وہ صبر کر کے دل پر جبر کر کے رہ گئی۔ اس نے خانی ماں سے یہ امید کیوں باندھی کہ وہ اسے رہا کر کے مغویہ لڑکیوں کے ساتھ اس کے گھر بھیج دیں گی۔ خانی ماں کو اس کے گھر اور گھر والوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ انہیں تو صرف گل عذار سے محبت تھی۔ اس محبت میں ان کی ضرورت بھی شامل تھی۔ گل عذار کے علاوہ کسی اور سے ان کی خدمت کرنی تھی تو کسی کنیز سے ممکن نہ تھی۔ گل عذار تو ایک فرمانبردار بیٹی کی طرح ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھی۔ اس نے خانی ماں کو "ماں" کا درجہ دیا تھا۔ ان کی شفقت اس کی حقدار بھی تھی۔

گل عذار دیر تک بستر پر لیٹی کروٹیں بدلتی رہی۔ اسے کسی پہلو چین نہ آ رہا تھا۔ ایک بار تو اس کے دل میں یہ خیال آیا۔ کیوں نہ وہ بھاگ کر تیمور کے خیمے میں پہنچ جائے۔ تیمور شہر سبز کا رہنے والا ہے۔ وہ اسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ضرور پہچان لے گا۔ لیکن ــــ لیکن کیا وہ تیمور تک پہنچ سکے گی؟ خانی ماں کے محافظ اسے کیوں جانے دیں گے؟ وہ پکڑی جائے گی۔ پھر ــــ اور پھر ــــ!

وہ آگے نہ سوچ سکی۔

اس کا دماغ الجھ کر رہ گیا۔ اس کی نظریں خیمے کی مخروطی چھت پر لگی ہوئی تھیں۔ زبردستی آنکھیں بند کر کے اس نے سونے کی کوشش کی لیکن خیالات کا لامتناہی سلسلہ اس کے دل و دماغ کو گھیرے ہوئے تھا۔ ایسے میں نیند کیسے آتی۔

خانی ماں نے واپسی پر اس سے ایک بات بھی نہ کی۔ کیا وہ ناراض ہیں؟ اس نے خیال سے جھنجھوڑ ڈالا۔ جھپکتی ہوئی پلکیں پھر کھل گئیں۔

پتہ نہیں رات کتنی گزر چکی تھی کہ اس نے خانی ماں کی آواز سنی۔

"گل عذار۔ سو گئی کیا؟"

گل عذار کی آنکھوں سے تو نیند کوسوں دور تھی:

"نہیں خانی ماں"۔ اور وہ دوڑتی ہوئی ان کے کمرے میں پہنچ گئی۔

"آپ اب تک جاگ رہی ہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟" گل عذار دو زانو ہو کر ان کے قریب بیٹھ گئی۔

خانی ماں کی آنکھوں کے پٹ کھلے ہوئے تھے اور وہ بھی خیمے کی چھت کو اس طرح گھور رہی تھیں جیسے گل عذار دیر تک دیکھتی رہی تھی۔

"تو بھی تو نہیں سوئی ابھی؟"

خانی ماں نے پلکیں جھپکائیں:

"تو کیوں جاگ رہی ہے اب تک؟"

گل عذار کا دل رو پڑا۔ جی چاہا کہ خانی ماں سے لپٹ کر خوب روئے اور سینہ چیر کے اپنا دل نکال کر اس کے ہونٹوں پر چپ کی مہر لگ گئی۔ آنسوؤں کا سیلاب آنکھوں تک آ گیا تھا۔ اس نے فوراً آنکھیں بند کر لیں۔

"میں آج دعوت میں گئی تھی"۔ خانی ماں کی آواز گھٹی گھٹی تھی۔ "تاتاری سردار تیمور کی بیوی مجھ سے ملی تھی

"خاتونِ آغا"۔ گل عذار کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا اور شہر سبز کا پورا نقشہ اس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔ وہ خاتون آغا سے کئی بار مل چکی تھی۔ اس نے پانچ سال پہلے خاتون آغا کو آخری بار دیکھا تھا۔ اسوقت خاتون آغا کے ہاں پہلا بچہ جہانگیر پیدا ہوا تھا۔

"ہاں خاتونِ آغا"۔ خانی ماں کی آواز دور کہیں غاروں سے آتی ہوئی سنائی دی۔

گل عذار کے خیالات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس نے جھک کر خانی ماں کو دیکھا۔ فانوس کی روشنی میں ان کی آنکھوں میں جھلک رہی تھی اور شاید نمی بھی لرز رہی تھی۔

"کیا کہہ رہی تھیں خاتونِ آغا"۔ گل عذار نے بڑے چاؤ سے پوچھا۔

"جا سو جا گل عذار۔ رات بہت گزر چکی ہے"۔ خانی ماں نے اک دم آنکھیں بند کر لیں۔ ان کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ شکنیں گہری ہو گئیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ خانی ماں کسی اندرونی درد یا کرب کو دبانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

گل عذار ہکا بکا انہیں دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ خانی ماں نے اسے کیوں بلایا۔ خاتونِ آغا کا ذکر کس لیے کیا اور اب سونے کا حکم کیوں دے رہی ہیں۔

گل عذار نے ان سوالوں کا جواب خانی ماں سے پوچھنا چاہا لیکن وہ تو آنکھیں بند کیے چپ چاپ لیٹی تھیں۔ گل عذار بھاری قدموں سے اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔

○

شہزادہ الیاس خواجہ خان کا دربار لگ گیا۔ ایک چھوٹے سے سبزہ زار میں قالینوں کا فرش بچھایا گیا۔ بیچوں بیچ سفید سنگ مرمر کے مسند پر الیاس خواجہ بیٹھا تھا۔ دائیں طرف تیمور اور بائیں جانب بیگ جلد سامنے والے حلقے میں الیاس خواجہ کے دوسرے سردار بیٹھے تھے۔ ظفر یاب مغل سرداروں کے پیچھے ایک کونے میں کھڑا تھا۔

الیاس خواجہ نے گزشتہ شام ہی اعلان کرا دیا تھا کہ مغویہ تاتاری لڑکیوں کو صبح دربار میں حاضر کیا جائے۔ گل عذار کا خیال تھا کہ خیمہ گاہ میں زیادہ سے زیادہ چالیس پچاس تاتاری لڑکیاں ہوں گی لیکن اسے رات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مطلع کیا گیا کہ خیمہ گاہ میں تقریباً تین سو لڑکیاں موجود ہیں جو صبح کو تیمور کے حوالے کر دی جائیں گی۔

تیمور کو تعجب بھی ہوا اور اپنی بے بسی پر افسوس بھی ہوا۔ غصے سے اس کا خون کھول گیا۔ اسے مغلوں کے علاوہ تاتاریوں پر غصہ آیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ تاتاری ذہنی طور پر مغلوں کے غلام ہو چکے ہیں اور ان کا خون اس حد تک سرد پڑ گیا ہے کہ اب وہ اپنے ناموس کی حفاظت کی پروا بھی نہیں کرتے۔

ظفر باب پیچھے اس لیے بیٹھ گیا تھا کہ وہ مغویہ لڑکیوں کو دیکھ سکے۔ اس کے دل میں امید کے چراغ ایک بار پھر جل اٹھے تھے۔ مغل چھاؤنیوں پر اسے ناکامی ہوئی تھی۔ خیمہ گاہ وہ آخری جگہ تھی جہاں کل عذرا کے ملنے کا زیادہ امکان تھا لیکن جب وہ اس امکان پر غور کرتا تو یہ خیال اس کا راستہ روک لیتا کہ مغلوں کا اصل مرکز حصار الملایتق ہے ممکن ہے کچھ لڑکیاں وہاں بھیج دی گئی ہوں۔ انسان امید کے سہارے زندگی گزارتا ہے لیکن وہ اللہ کی ذات سے کیوں ناامید ہو جس نے اسے یہاں تک پہنچایا ہے۔ وہ اسے حصار الملایتق تک بھی پہنچا سکتا ہے۔ ظفر باب نے اپنے دل کو تسکین دی۔

مغویہ لڑکیاں آتشہ ع ہوئیں جن مغلوں نے یہ لڑکیاں خریدی تھیں وہ لڑکیوں کے ساتھ لڑکیاں بہت خوش تھیں۔ ان کے چہرے مسرت سے کھلے ہوئے تھے۔ جب ان کے مالک خشمگیں نظروں سے انہ دیکھتے تو وہ خوفزدہ ہو کر نظریں نیچی کر لیتی تھیں۔

مغلوں کو اس بات پر غصہ تھا کہ ان کا خریدا ہوا مال ان سے زبردستی چھینا جا رہا ہے۔ لڑکیوں کو انہوں نے رقم دے کر حاصل کیا تھا۔ انہیں اب تک یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ تیمور نے لڑکیوں کی قیمت واپس کرنے کا اعلان کیا ہے۔ الیاس خواجہ نے بھی تیمور کے اس اعلان پر کوئی توجہ نہ دی تھی۔ وہ تو یہ سمجھا تھا کہ تیمور نے وقار بحال اور برقرار رکھنے کے لیے اس قسم کا اعلان کر دیا تھا لیکن تیمور اس معاملے میں سنجیدہ تھا۔ اس کا قول تھا کہ دولت اس لیے ہوتی ہے کہ اسے صحیح وقت پر خرچ کیا جائے۔ اس کے خیال میں دولت کے صرف کا موقع تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے سکوں اور جواہرات کی تھیلیاں لایا تھا جو اس کے گھوڑے کی زین سے بندھی ہوئی تھیں۔

بیک جک کو اپنی سپہ سالاری کی فکر تھی۔ اس لوٹ مار میں اس کا سب سے بڑا ہاتھ تھا اس لیے وہ جانتا تھا کہ خانِ اعظم کو اس کی خبر نہ ہونے پائے۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ وہ ناراض ہو کر اسے اس عہدے سے ہٹا دے یا حصار الملایتق واپس بلا لے۔ وہ رات بھر اپنے خاص دستے کے ساتھ خیمہ گاہ میں گھومتا رہا تھا اور اب

[illegible] کرا رہا تھا کہ اگر کسی مغل نے تاتاری لڑکی کی واپسی سے انکار کیا یا اسے پوشیدہ رکھنے [illegible] کی تو اسے خانِ اعظم کا باغی تصور کیا جائے گا۔ باغی کی سزا کم از کم موت تھی۔

[illegible] اس کی دلجوئی کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اور صبح ہوتے ہی کنیزیں خریدنے والے اپنی اپنی کنیزوں کو ساتھ لیکر [illegible] لینے والے میدان میں جمع ہو گئے۔

الیاس خواجہ نے اعلان کیا:

"تاتاری لڑکیوں کو ایک ایک کر کے حاضر کیا جائے۔"

الیاس خواجہ کا اعلان بیک جک کے ذریعے اعلانچی تک پہنچا اور اعلانچی نے میدان میں جا کر لوگوں کو [illegible] کر دیا۔

[illegible] تو منہ مانگا ایک تاتاری لڑکی کو ساتھ لے کر دربار کے فرش تک پہنچا۔ اس نے تیمور کو قہر بھری نظروں [illegible] حقارت بھری آواز میں بولا:

"میں اس کنیز کو چھوٹے خان کے حکم پر قربان کرتا ہوں۔" اور اس نے ہاتھ پکڑ کر ایک جھٹکے سے [illegible] طرف دھکیل دیا۔

"اٹھو مغل لشکری۔" تیمور نے واپس جاتے مغل کو آواز دی۔

[illegible] کے قدموں تک گئے۔ اس نے پلٹ کر تیمور کو دیکھا۔

"کیا چاہیے۔ میں نے صرف یہی ایک لڑکی خریدی تھی۔" اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"خبردار۔ تم نے اس کی کیا قیمت ادا کی تھی؟" تیمور قدم بڑھا کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

"تم قیمت واپس کر دگے۔" مغل اسے گھورنے لگا

"برادر۔"

[illegible] نے بڑی نرمی سے جواب دیا:

"[illegible] واپس لیا جائے تو قیمت بھی واپس کی جاتی ہے۔"

[illegible] نے تیمور کو عجیب نظروں سے دیکھا۔ پھر وہ رقم بتائی جو اس نے نیلامی کے وقت ادا کی تھی۔ تیمور نے [illegible] ظفر باب کو اپنے پاس بلایا اور اس کے کان میں کچھ کہا۔ ظفر باب تیمور کے گھوڑے کی طرف چلا جو دربار [illegible] کھڑا ہوا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مغل برادر"۔

تیمور نے اسے رکنے کے لیے کہا:

"تمہارے کہنے کے مطابق میں تمہیں قیمت واپس کر رہا ہوں لیکن اگر تم چاہو تو میں تمہیں وہ رقم دے سکتا ہوں جو تم نے اب تک اس کے کھانے پر خرچ کی ہے"۔

مغل کو پہلے تو تعجب ہوا۔ پھر شاید اس کی رگ پھڑک گئی۔ ترشی سے بولا:

"نہیں۔ مجھے بھیک نہیں چاہیے"۔

ظفر یاب تھیلیاں لے کر واپس آ گیا۔ تیمور کے بتانے پر اس نے مطلوبہ رقم مغل کو گن کر دلا دی۔ اپنی والی لڑکی کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔

مغل واپس جانے لگا تو تیمور نے اسے پھر روکا۔

"برادر"۔

تیمور نے ایک جگمگاتا ہیرا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ ہیرا میں تمہاری نذر کرتا ہوں"۔

مغل کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ہیرے کی چمک دمک دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔

"لے لو برادر۔ یہ بھیک نہیں۔ ایک بھائی کا دوسرے بھائی کو تحفہ ہے"۔

مغل نے تیمور کے ہاتھ سے ہیرا اچک لیا۔ پھر تیز قدموں سے واپس ہوا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں ہیرے پر اپنا حق جتا کر اس سے لے نہ لے یا پھر حکومت کا حصہ نہ طلب کر لے۔ مغلوں کو لوٹ مار کے حصہ حکومت کے خزانے میں جمع کرانا پڑتا تھا۔

الیاس خواجہ یہ تماشا دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ ہیرے کی چمک نے اس کی آنکھیں بھی خیرہ کر دی تھیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بیک جک کے ساتھ تیمور کے پاس آ کھڑا ہوا۔

تاتاری لڑکیاں اپنے آقاؤں کے ساتھ آتی رہیں۔ تیمور ہر مغل سے اس کی ادا شدہ رقم دریافت کرتا۔ ظفر یاب اس کی ادائیگی کرتا۔ پھر تیمور جواہرات کی تھیلی میں ہاتھ ڈال کر ایک قیمتی ہیرا یا موتی مغل کے حوالے کرتا۔ مغلوں کے منہ کھلے ہوئے تھے۔ ہیرے جواہرات بٹ رہے تھے اور لڑکیاں آزاد ہو رہی تھیں۔ الیاس خواجہ بیک جک اس تقسیم کو لالچ بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اب انہیں افسوس ہو رہا تھا کہ انہوں نے

اپنی قیمت خود ہی کیوں نہ وصول کر لی۔

جب کوئی نئی لڑکی آتی تو تیمور کی نظر ظفر یاب کے چہرے پر جاتی لیکن اس کی افسردگی ہر نئی لڑکی کی آمد پر بڑھ جاتی۔

تیمور نے قیمت ادا کر کے تمام لڑکیوں کو آزاد کرا لیا۔ اسے لڑکیوں کی رہائی کی بہت خوشی تھی لیکن جب اسکی نظر ظفر یاب کے چہرے پر پڑتی تو وہ افسردہ ہو جاتا۔

"کوئی اور تاتاری لڑکی باقی تو نہیں رہ گئی؟" تیمور نے ظفر یاب کی خاطر الیاس خواجہ سے سوال کیا۔

الیاس خواجہ نے بیک جک کی طرف دیکھا۔ اس نے جواب دیا:

"نہیں۔ اب کوئی تاتاری لڑکی خیمہ گاہ میں موجود نہیں ہے میں نے حکم دے دیا تھا کہ اگر کسی مغل نے کسی تاتاری لڑکی کو چھپانے کی کوشش کی تو اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ کسی میں ہمت ہے کہ وہ میرے حکم کی تعمیل نہ کرے"۔

تیمور نے ظفر یاب کو دیکھا۔ ظفر یاب کیا کہتا، صرف سرد آہ بھر کے رہ گیا۔

"ظفر یاب ہماری کوششیں جاری رہیں گی"۔

تیمور نے الیاس خواجہ اور بیک جک کی موجودگی کی وجہ سے بند بند الفاظ میں اسے تسلی دی:

"تم ان لڑکیوں کو لے جاؤ اور ان کے لیے سواری کا انتظام کرو"۔

ظفر یاب نے وہ تھیلیاں جو ابھی تک کھلی بھی نہ تھیں، تیمور کے اشارے پر فرش پر رکھ دیں اور سر جھکائے لڑکیوں کی طرف چلا گیا۔

تیمور نے وہ تھیلیاں وہیں پڑی رہنے دیں اور الیاس خواجہ کے ساتھ نشست گاہ پر واپس آ گیا مگر وہ اپ سیٹ تھا۔

"سردار تیمور"۔

الیاس خواجہ نے اسے افسردہ دیکھ کر پوچھا:

"کچھ فکرمند ہو۔ کیا تمہیں تاتاری لڑکیوں کی رہائی کی خوشی نہیں ہوئی"۔

"کون نہیں شہزادۂ معظم"۔ تیمور نے فکرمند چہرہ اوپر اٹھایا:

"مجھے بہت خوشی ہے لیکن ابھی کچھ تاتاری لڑکیاں مغلوں کی قید میں ہیں۔ ان کی تلاش ضروری ہے اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے تلاش جاری رکھنا پڑے گی۔"

الیاس خواجہ کو طیش آ گیا:

"تم ہم پر بد دیانتی کا الزام لگا رہے ہو۔ ہم نے تمام لڑکیاں واپس کر کے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ تمہیں یہ حق نہیں دے سکتے کہ تم ہماری نیت پر شبہ کرو۔"

"ہرگز نہیں شہزادۂ عالی مقام۔"

تیمور نے فوراً بات کو سنبھالا:

"آپ پر شبہ کرنا خود اپنے اوپر شک کرنے کے مترادف ہے۔ ممکن ہے کہ وہ لڑکیاں آپ کے علم میں ہوں اور آپ کو یہ بھی معلوم نہ ہو کہ وہ اس وقت کہاں اور کس کی قید میں ہیں۔"

"تیمور، معلوم ہوتا ہے تمہیں مجھ پر شبہ ہے۔"

بیک جک نے جھلا کر دخل دیا:

"لڑکیوں کی بازیابی کی ذمہ داری شہزادے نے میرے سپرد کی تھی۔ میں اس الزام کو برداشت نہیں کر سکتا۔ میں تمہارا شک اس طرح دور کر سکتا ہوں کہ تمہیں مغلوں کے ہر خیمے میں لے چلوں اور تم ہر خیمے میں جا کر اطمینان کر لو۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میرے الفاظ سے آپ کے وقار کو صدمہ پہنچا۔ میں اس کے لیے معذرت بھی کر سکتا ہوں۔"

تیمور نے معاملے کو سنبھالنے کے لیے لچک پیدا کی:

"میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ممکن ہے کچھ لڑکیوں کو اغوا کر کے خیمہ گاہ کے بجائے براہِ راست آپ کے صدر مقام حصار الملایق پہنچا دیا گیا ہو جس کا آپ کو علم نہ ہو۔"

تیمور کی یہ بات واقعی قابلِ غور تھی۔ حالانکہ اس نے تو یہ بات محض اپنی صفائی میں کہی تھی۔ الیاس خواجہ اور بیک جک کے پاس اس کا معقول جواب نہ تھا۔

آخر کچھ سوچ کے الیاس خواجہ نے کہا:

"تیمور۔ بظاہر یہ بات ناممکن معلوم ہوتی ہے۔ ملک تاتار میں مقیم کسی خیل کو یہ اجازت نہیں کہ وہ حصار الملایق سے براہِ راست کوئی رابطہ قائم کرے۔ وہ تو بغیر اجازت حصار الملایق کا سفر اختیار کر ہی نہیں سکتے۔ پھر بھی ہم یقین دلاتے ہیں کہ اگر کوئی لڑکی یا لڑکیاں حصار الملایق پہنچائی گئی ہیں تو وہ تمہیں واپس کر دی جائیں گی۔"

"ہاں یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔"

بیک جک نے نقطہ دیا:

"یہ ذمہ داری بھی میں قبول کرتا ہوں۔ تیمور تم ہمیں ان لڑکیوں کے نام اور گھر کے پتے لکھ کر دے دو۔ جو لڑکیاں ہیں میں خود حصار الملایق جا کر واپس لاؤں گا۔"

"میں لڑکیوں کی تعداد اور نام تو فی الحال نہیں بتا سکتا لیکن ان کی مکمل فہرست بہت جلد آپ کو مہیا کر دی جائے گی۔"

تیمور نے ٹالنے کے لیے کہا۔

"لیکن ایک لڑکی کے بارے میں، میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اب تک برآمد نہیں ہو سکی۔ وہ میرے پہرے میں رہنے والی ہے۔ اسے عین شادی کے دن اغوا کیا گیا تھا۔ اس کا نام گل عذار ہے اور اس کے شوہر کا نام ہے۔"

"گل عذار؟"

یہ نام الیاس خواجہ اور بیک جک کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ پھر وہ ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھنے لگے۔ ان کے لیے یہ نام کی تو مغلوں میں داستانیں بن گئی تھیں۔

تیمور کو انہیں حیرت زدہ دیکھ کر پہلے تعجب ہوا۔ پھر غصہ آ گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ گل عذار سے واقف ہیں۔ کم از کم انہوں نے یہ نام پہلے بھی سنا ہے۔ اس نے موقع کی نزاکت کے تحت غصے کو دبایا اور نرمی سے بولا:

"کیا آپ گل عذار کو جانتے ہیں۔ کہاں ہے وہ اس وقت؟"

بیک جک نے نظریں چرائیں۔

الیاس خواجہ نے بڑی افسردگی سے جواب دیا:

"تیمور۔ ہمیں افسوس ہے کہ گل عذار تمہیں نہیں مل سکتی۔"

"وہ زندہ تو ہے شہزادۂ محترم؟" تیمور کو شبہ ہوا کہ کہیں اسے قتل تو نہیں کر دیا گیا۔

"ہاں۔ زندہ ہے تیمور۔ اس کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔"

"یہ بات میرے لیے بڑی طمانیت کا باعث ہے۔"

تیمور نے اطمینان کا سانس لیا:

"آپ کی بات سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ گل عذار کسی مضبوط اور محفوظ ہستی کی تحویل میں ہے۔ لیکن شہزادے!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آپ یہ تو غور فرمائیں کہ اس دلہن کے دل کا کیا حال ہو گا جسے اس کے نقاب اٹھنے سے پہلے اغوا کر لیا گیا ہو
کتنے ہی آرام میں رکھا گیا ہو یا اس کی عشرت کا کوئی بھی سامان مہیا کیا گیا ہو، وہ کیسے خوش رہ سکتی ہے
اپنے عزیز و اقارب اور وہ شوہر یاد نہ آتا ہو گا جس کی دید کا تصور لیے وہ حجلۂ عروسی میں بیٹھی تھی۔ اس
حالِ زار پر بھی آپ نے غور نہیں کیا۔ ظہیر بابر جسے میں نے ابھی لڑکیوں کے ساتھ بھیجا ہے گل عذار
ہے۔ وہ اتنے دنوں سے میرے ساتھ یہ امید لیے مارا مارا پھر رہا ہے کہ ایک دن اسے اس کی بیاری بیوی
گی۔ اس کی بے چین تنہائیوں اور کربناک زندگی کا آپ تصور نہیں کر سکتے۔ اس کے اداس چہرے کو
پر چوٹ سی لگتی ہے۔"

"بس کرو تیمور۔"

الیاس خواجہ نے اسے ٹوکا:

"ہمیں تمہاری بات کا یقین بھی ہے اور گل عذار کے شوہر کے ساتھ ہمدردی بھی لیکن ہم مجبور
واپس نہیں کیا جا سکتا۔ جس کی تحویل میں وہ ہے اس سے واپس لینا مشکل نہیں بلکہ ناممکن ہے۔"

"تو میرا یہ خیال درست ہے کہ گل عذار کو خانِ اعظم کے پاس بھیج دیا گیا ہے۔"

تیمور نے اپنے شبہ کی تصدیق کے لیے کہا:

"اگر ایسا ہوا ہے تو آپ فکر نہ کریں۔ میں خود حصارِ امالیق جا کر خانِ اعظم سے گل عذار کی واپسی
درخواست کروں گا۔"

"ایسا بھی نہیں ہے تیمور۔"

الیاس خواجہ نے اس کے شبہ کی تردید کی:

"گل عذار اسی خیمہ گاہ میں موجود ہے لیکن ہم اسے کسی قیمت پر حاصل نہیں کر سکتے۔"

"معزز شہزادے!"

تیمور نے ایک نئی پیش کش کی طرف اشارا کیا:

"دولت وہ طاقت ہے جس کے زور سے پہاڑ بھی اپنی جگہ چھوڑ دیتے ہیں۔ آپ اس امیر کو بلوائیے جس نے گل عذار کو خریدا ہے میں اسے منہ مانگی قیمت ادا کر دوں گا۔ سامنے پڑی ہوئی خزانہ
کی تھیلیاں میں اسے پیش کروں گا۔ امید ہے وہ انکار نہ کر سکے گا۔"

یہ خواجہ مسکرایا۔ اس کے ساتھ ہی بیک جک کا بے ڈھنگا قہقہہ بلند ہو گیا:

"تیمور تم غلطی پر ہو۔ ہر مغل لالچی یا طمع کا بندہ نہیں ہوتا۔ گل عذار، خانِ اعظم کی بہن اور میری چھوٹی خانی
ہے اور اس گھر میں، میں تو کیا خانِ اعظم بھی ان کی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہو سکتا۔ وہ
ترین بزرگ ہستی ہیں۔ انہوں نے مجھے دودھ پلایا ہے اور بچے کی طرح پرورش کی ہے۔
گل عذار کو آنکھ کی پتلی بنا کر رکھا ہے۔ میں پتلی کو آنکھ سے جدا کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ گل
میں کوئی بات نہ کرو تیمور۔ ہم بالکل مجبور ہیں۔ اگر تمام دنیا کے لشکر اکٹھا ہو کر گل عذار کو حاصل
تو بھی انہیں ناکامی ہو گی۔ مغلوں کا بچہ بچہ خانی ماں کے لیے اپنی جان قربان کر دے گا۔"

"خانی ماں!"

تیمور نے زیرِ لب دہرایا:

"خانزادۂ معظم! جہاں تک میرا خیال ہے۔ بزرگ خاتون خانی ماں کے سینے میں ایک شفیق و مہربان
ہے۔"

الیاس خواجہ چونک پڑا:

"تم خانی ماں کو جانتے ہو تیمور؟"

پھر اس کی نظریں تیمور سے ہٹ کر بیک جک کے چہرے پر پہنچ گئیں۔ اس نے سوچا شاید اس نے
کے بارے میں تیمور کو بتایا ہو۔

"اس شہزادے الیاس خواجہ۔"

تیمور نے اعتراف کیا:

"میں خانی ماں کو جانتا ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ان کے دل میں تاتاریوں کے لیے ہمدردی اور
کے جذبات ہیں۔"

"لیکن تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا۔ کس نے بتایا تم کو؟"

الیاس خواجہ پھر بیک جک کو تیز نظروں سے گھورنے لگا۔ بیک جک غالباً الیاس خواجہ کی نظروں کا
نہ کر سکا۔ وہ خاموش رہا اور الیاس خواجہ سے نظریں ملانے کے بجائے تیمور کی طرف دیکھنے لگا۔

"کل رات میرے خیموں کو خانی ماں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔" تیمور نے انکشاف کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میری بیوی کا بیان ہے کہ خانی ماں جس قدر بزرگ اور باعظمت ہیں اسی قدر مہربان اور شفیق بھی ہیں بلکہ خانی ماں، گل عذار کے شوہر ظفریاب کو بھی جانتی ہیں۔"

الیاس خواجہ کو تیمور کے پہلے جملے سے کچھ اطمینان ہوا۔ لیکن آخری بات نے اسے پھر الجھن میں ڈال دیا۔

"تمہیں یہ کیسے یقین ہے کہ خانی ماں گل عذار کے شوہر کو جانتی ہیں۔" الیاس خواجہ نے اس سے پوچھا۔

"یقین کرنے کی یہ وجہ ہے کہ خانی ماں نے میری بیوی سے ظفریاب کا نام لے کر پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟"

"اس کا مطلب ہے کہ خانی ماں یہ بھی جانتی ہیں کہ گل عذار کو تمہارے شہر سے اغوا کیا گیا ہے۔"

"اس بات کا بھی قوی امکان ہے شہزادے۔"

تیمور نے کہنا شروع کیا:

"گل عذار ان کے پاس موجود ہے۔ ممکن ہے کہ اس نے خانی ماں کو اپنی درد بھری کہانی سنائی ہو۔"

"ہوں!"

الیاس خواجہ نے اپنا بڑا سا سر اور چوڑے شانے ہلاتے ہوئے کئی بار "ہوں" کہا۔

"ہر بات ممکن اور ہر امکان موجود ہے لیکن یہ بات ناممکن ہے کہ خانی ماں، گل کو اپنے سے الگ کر دیں۔ انھوں نے اسے اپنی بیٹی بنا لیا ہے۔ . . . . ماں اپنی بیٹی کو کس طرح چھوڑ سکتی ہے۔ ہم تمہاری مدد نہیں کر سکتے۔"

الیاس خواجہ نے تیمور کو روکھا سا جواب دے دیا۔ لیکن تیمور، مولانا زین الدین کا تربیت یافتہ تھا۔ ہر بات میں جرح کرتے تھے۔ تیمور نے بھی وہی وتیرہ اختیار کیا۔ بولا:

"ٹھیک ہے شہزادے بہادر۔ آپ میری مدد نہ کیجیے لیکن آپ اتنا تو کر سکتے ہیں کہ مجھے خانی ماں کے سامنے پیش کر دیں۔"

"تیمور بات سمجھنے کی کوشش کرو۔"

الیاس خواجہ نے بُرا سا منہ بنایا:

"میں تمہیں اس بیکار کوشش کی بھی اجازت نہیں دے سکتا۔ میں خانی ماں کی نظروں سے گر

شہزادے عالی مقام۔"

تیمور نے پھر اپنی بات پر زور دیا:

"کوشش کامیابی کا پہلا زینہ ہے۔ مجھے اس کی اجازت ہونا چاہیے۔"

الیاس خواجہ عجیب مخمصے میں پھنس گیا۔ اس آخری وقت پر وہ تیمور سے الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ آخر اس کے ذہن میں تیمور کو ٹالنے کی ایک ترکیب آ گئی۔ اس نے کہا:

"ہم خانی ماں کے پاس تمہاری درخواست بھیجیں گے۔ اگر انھوں نے اجازت دے دی تو آج شام یا کل تمہیں ان کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔"

تیمور شکریہ ادا کر کے فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ جب اپنے خیمے میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کے سوار گھوڑوں پر زینیں کس رہے ہیں۔ اس نے کہا:

"زینیں کھول دی جائیں۔ ہم آج رات یا کل اسی وقت کوچ کریں گے۔"

تیمور کے سوار حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگے مگر کسی نے پوچھنے کی کوشش نہ کی۔ انہیں پوچھنے کی ہمت بھی نہ تھی۔ انہیں تیمور پر پورا اعتماد تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کا سردار جو قدم اٹھاتا ہے اس میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور پوشیدہ ہوتی ہے۔

الجائی خاتون نے بھی اس سے تاخیر کی وجہ نہ پوچھی۔ وہ تاتاری لڑکیوں کے رہا ہو جانے سے اس قدر خوش تھی کہ پھولے نہ سماتی۔ لڑکیوں کی سواری کے لیے الیاس خواجہ نے گھوڑے بھجوا دیے تھے۔ الجائی لڑکیوں کے ساتھ ان سے شام تک ہنستی بولتی رہی۔ ایک دو بار تیمور کا سامنا بھی ہوا لیکن وہ باہر کے معاملات میں دخل نہیں دیا کرتی تھی اور جب تک تیمور اس سے خود بات نہ کرتا وہ خواہ مخواہ سے نہ کریدتی تھی۔ اس نے یہ ضرور محسوس کیا کہ تیمور آج معمول سے کچھ زیادہ ہی خاموش ہے۔ پھر بھی اس نے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔

○

رات ہو گئی۔ خیموں میں چراغ روشن کر دیے گئے۔ الجائی خاتون لڑکیوں کے پاس سے اٹھ کے اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خیمے میں آ گئی۔ لڑکیوں کی رہائش کے لیے مزید خیمے آ گئے تھے وہ اپنے خیموں میں چلی گئیں۔

رات گزرتی جا رہی تھی لیکن تیمور اب تک اپنے خیمے میں نہیں آیا تھا۔ الجائی کو پریشانی اور خطرے کا احساس ہوا۔ مغلوں نے اگرچہ لڑکیاں آزاد کر دی تھیں لیکن یہ لوگ اب تک مغل خیمہ گاہ میں تھے اور کسی وقت کوئی حادثہ پیش آ سکتا تھا۔

وہ اسی الجھن میں تھی کہ تیمور سر جھکائے ہوئے خیمے میں داخل ہوا۔ اور خاموشی سے ایک طرف بڑھا الجائی اس کا اسلحہ اتارنے کے لیے آگے بڑھی۔ رات کو الجائی، تیمور کا اسلحہ اتارنے میں مدد دیتی تھی۔

"ابھی رہنے دو خاتون آغا۔"

تیمور نے نظریں اٹھا کر الجائی کو دیکھا،

"ہو سکتا ہے کہ ہمیں جنگ کرنا پڑے۔"

اتنا سننا تھا کہ الجائی خاتون نے تیزی سے بڑھ کر اپنی چھوٹی تلوار اٹھا لی۔ خنجر کمر سے لگایا اور خیمے کے سرہانے جا کر بیٹھ گئی۔

"گھوڑے تیار ہیں ہمارے۔" الجائی نے پوچھا۔

"ہاں۔ میں نے سواروں کو بھی تیار رہنے کا حکم دے دیا ہے۔"

تیمور اٹھ کر خیمے کے دروازے تک گیا۔ باہر جھانک کر دیکھا۔ اس کے سوار اپنی پوری تیاری کے ساتھ اپنے اپنے گھوڑوں کے قریب کھڑے تھے۔ جلتے ہوئے الاؤ کی روشنی میں، اس وقت ان کی صورتیں خوفناک اور پُراسرار دکھائی دے رہی تھیں۔

"گل عذار خیمہ گاہ میں موجود ہے۔" تیمور واپس آ کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

"ظفریاب کی دلہن گل عذار۔" الجائی نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"ہاں خاتون آغا۔"

تیمور کھڑا ہو کر ٹہلنے لگا۔

"تم خانی ماں سے ملی تھیں۔ گل عذار ان کے پاس ہے۔ الیاس خواجہ نے اس کی واپسی سے صاف انکار کر دیا ہے۔"

الجائی حیرت سے تیمور کا منہ دیکھنے لگی۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی:

"یہ بات درست معلوم ہوتی ہے۔ خانی ماں نے مجھ سے ظفریاب کے بارے میں پوچھا تھا۔ میں نے ٹالنا چاہا لیکن ان کے اصرار پر میں نے گل عذار کے اغوا کی تفصیل بیان کر دی مگر وہ ایک دم چپ ہو گئیں۔ آخر تک مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ ان کے جاتے وقت میں سلام کے لیے بھی گئی لیکن انہوں نے کوئی توجہ نہ دی۔"

تیمور اپنے خیالات میں گم تھا۔ اس نے شاید الجائی کی باتیں سنی ہی نہیں۔ الجائی نے بھی اس کے خیالات کا سلسلہ نہ توڑا اور چپ ہو رہی۔

وہ رات خانی ماں کے گھر میں بھی کچھ عجب طرح سے گزری۔ خانی ماں نے بھی حکم دے دیا کہ ان کے کمرے میں کوئی نہ آئے۔ گل عذار اپنے کمرے میں منہ لپیٹ کے پڑ رہی۔ اسے امید تھی کہ دعوت سے واپسی پر خانی ماں اسے کچھ بتائیں گی لیکن انہوں نے یہ حکم دے کر گل عذار کا داخلہ بھی بند کر دیا۔

بڑی رات گئے گل عذار پر نیند کا غلبہ ہوا اور اس کی پلکیں جھپکنے لگیں۔ اس وقت اسے باہر کچھ کھٹکا محسوس ہوا۔ وہ اٹھ کے بیٹھ گئی۔ اس کی نظر خانی ماں کے کمرے پر پڑی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ان کے پاس الیاس خواجہ خان بیٹھا ہوا آہستہ آہستہ باتیں کر رہا ہے۔

خانی ماں اور الیاس خواجہ میں تقریباً ایک گھنٹے تک بڑے رازدارانہ انداز میں گفتگو ہوتی رہی۔ پھر الیاس واپس چلا گیا اور خانی ماں کے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

گل عذار بھی بستر پر لیٹ گئی اور قسمت کی ستم ظریفیوں پر غور کرتے کرتے نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔

○

تیمور کے جانباز رات بھر اپنے خیموں کے گرد پہرہ دیتے رہے۔ باقی سوار بھی اسلحہ لگائے جاگتے رہے اور الجائی نے بھی رات آنکھوں میں کاٹ دی۔

تیمور نے ایک دو بار خیمے سے نکل کر مغل خیمہ گاہ کی طرف نظریں دوڑائیں گہرا اندھیرا تھا۔ کچھ نظر نہ آیا۔ البتہ زور محسوس ہوا جیسے خیمہ گاہ میں لوگ چل پھر رہے ہیں حالانکہ گزشتہ رات وہاں مکمل خاموشی تھی۔ لیکن معمولی بات نے اسے چوکنا کر دیا لیکن صبح تک کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رات تو خیریت سے گزر گئی لیکن تیمور پریشان تھا کہ الیاس خواجہ کی طرف سے اب تک کوئی جواب کیوں نہیں آیا۔ اگر خانی ماں نے ملاقات سے انکار کر دیا تھا تو یہ خبر اسے رات ہی مل جانی چاہیے تھی۔ لیکن اب دن ہو گیا تھا اور سورج نکلنے والا تھا۔

تیمور انہی خیالات میں غرق تھا کہ اسے خیمے کے باہر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ جلدی سے باہر نکلا۔ اس کا غلام دروازے پر کھڑا تھا۔ شاید تیمور کو آواز دینے والا تھا۔

"سردارِ محترم! مغل شہزادہ آرہا ہے۔" اور غلام نے مغل خیمہ گاہ کی طرف اشارا کیا۔

تیمور اُس طرف دیکھنے لگا۔ غلام کی آواز اس کے کانوں میں آئی:

"مغل شہزادے نے اطلاع بھیجی ہے کہ وہ آپ سے اسی وقت ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ بہت ضروری گفتگو کرنا ہے۔"

تیمور کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ شہزادے کو کیا ضروری گفتگو کرنا ہے۔ وہ خود یہاں کیوں آرہا ہے اسے دربار میں بلا سکتا تھا۔ وہ شہزادہ ہے، ملکِ تاتار کا حکمران۔ اسے سمرقند کے مقامی حاکم سے ملنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

تیمور کے دماغ میں یہ باتیں گھوم رہی تھیں اور شہزادہ الیاس خواجہ کی شاہانہ سواری آہستہ آہستہ اِدھر آرہی تھی۔ الیاس خواجہ بیش قیمت لباس میں ایک اعلیٰ نسل گھوڑے پر سوار تھا جبکہ مردار بیگ جگ اس کے ہاتھ پر سوار گھوڑے سے گھوڑا ملائے چل رہا تھا۔ ان کی پشت پر پچاس نیزہ بردار محافظ تھے جن کے نیزوں کے ساتھ ریشمی کپڑے لٹک رہے تھے۔ ان کا لباس بھی قیمتی تھا۔

تیمور اپنے چند سواروں کے ساتھ استقبال کے لیے آگے بڑھا۔

تیمور کے قریب پہنچ کر الیاس خواجہ خان گھوڑے سے اتر پڑا۔ بیگ جگ اور تمام نیزہ بردار بھی گھوڑوں سے اتر پڑے۔ الیاس خواجہ مسکراتا ہوا دونوں ہاتھ پھیلا کر تیمور کی طرف بڑھا جیسے وہ اس سے بغل گیر ہونا چاہتا ہو۔ تیمور نے بھی چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کی اور ہاتھ پھیلا کر آگے بڑھا۔ پھر وہ دونوں ایک دوسرے سے اس طرح لپٹ گئے کہ جیسے دو بچھڑے ہوئے دوست مدتوں بعد ملے ہوں۔

تیمور کے سوار دور کھڑے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ خواتین پردوں کی آڑ سے نظارہ کر رہی تھیں لیکن سب حیران و پریشان تھے کہ شہزادے کا یہ التفات اور بے تکلفی کس وجہ سے ہے۔

الیاس خواجہ اور تیمور لپٹے ہوئے تھے اور بیگ جگ بے ڈھنگے اور وحشیانہ قہقہے لگا کر ہلہ کر رہا تھا اور وہ اپنے گھوڑے کے گرد اس طرح چکر لگا رہا تھا جیسے رقص کر رہا ہو۔

"تیمور مبارک ہو۔ خانی ماں نے تمہاری بات مان لی۔" الیاس خواجہ نے اس سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔

"الحمدللہ۔"

تیمور کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔

"مجھے کب ان کی قدم بوسی کے لیے جانا ہوگا؟"

"قدم بوسی کے لیے نہیں۔ دامن رخصت کرانے۔" اور الیاس خواجہ ہنسنے لگا۔

"دامن۔ کس کی دامن؟"

تیمور نے آگے بھی کچھ کہا لیکن الیاس خواجہ کو کچھ سنائی نہ دیا۔ بیگ جگ کے بھیانک قہقہوں میں اس قدر شدت اور تسلسل پیدا ہو گیا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی اور اب تو بیگ جگ کے قہقہوں میں الیاس خواجہ کے نسبتاً کم خوفناک قہقہے بھی شامل ہو گئے تھے۔

بیگ جگ یونہی قہقہے لگاتا تیمور کے پاس آیا اور بولا:

"میں نہ کہتا تھا کہ ہماری خانی ماں آسمانی روحوں جیسی مقدس ہیں۔ تم ظفر یاب کی برات لے چلو۔ خانی ماں اپنے ہاتھوں سے دامن رخصت کریں گی۔"

خانی ماں کے خیمے میں الیاس خواجہ اور خانی ماں میں رات بھر یہی خاموش کھچڑی پکتی رہی تھی۔ خانی ماں کے سامنے ایک طرف ان کی گل عذار سے محبت تھی۔ دوسری طرف گل عذار کے مستقبل اور اس کی خوشی کا معاملہ تھا۔ آخر خانی ماں نے گل عذار کے حق میں فیصلہ کیا اور الیاس خواجہ کو حکم دیا کہ مسرت کا یہ پیغام لے کر وہ خود تیمور کے پاس جائے اور اسے ظفر یاب کی برات چڑھانے کے لیے کہے۔

الیاس خواجہ پیغام دے کر واپس چلا گیا۔

ایک گھنٹے کی تیاری کے بعد تیمور نے ظفر یاب کی دھوم دھام سے برات چڑھائی اور اپنے بیس سواروں کے ساتھ مغل خیمہ گاہ کی طرف چلا۔

اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ پوری خیمہ گاہ کو ایک رات کے مختصر عرصہ میں آراستہ و پیراستہ کر دیا گیا تھا۔ لوگ دور دویہ برات کے استقبال کے لیے کھڑے پھول بکھیر رہے تھے۔ کئی مقامات پر چاندی بھی نچھاور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی گئی۔ خانی ماں کے گھر پر تمام معزز مغل سردار الیاس خواجہ کے ساتھ برات کے استقبال کو کھڑے تھے۔ خانی ماں کا خیمہ بھی خوب آراستہ کیا گیا تھا اور کیوں نہ آراستہ کیا جاتا۔ آخر خانی ماں کی بیٹی کی شادی تھی۔

خیمے کے اندر تمام بڑی بڑی بیگمات اور معزز خواتین دلہن کے گرد اکٹھا تھیں۔ دلہن کو اس قدر زیور پہنایا گیا تھا کہ وہ حرکت بھی مشکل ہی سے کر سکتی تھی۔ خانی ماں کی خوشنودی کی خاطر مغل خواتین نے دلہن کے لیے زیورات کے ڈھیر لگا دیے تھے۔ تیمور اور اس کے ساتھیوں کی سادے مشروب سے خاطر کی گئی۔ اس نے شراب سے انکار کر دیا تھا۔

رخصتی کے وقت خانی ماں، گل عذار سے لپٹ کر اتنا روئیں کہ بے ہوش ہو گئیں۔ بڑی مشکل سے انہیں ہوش میں لایا گیا اور دلہن کو ایک آراستہ گاڑی میں رخصت کیا گیا۔

تیمور سمرقند تو خیریت سے پہنچ گیا لیکن کچھ ہی عرصے بعد مغل لشکر پھر سمرقند پر چڑھ آیا اور تیمور کو سمرقند ہی نہیں، ملکِ تاتار بھی چھوڑنا پڑا۔

○

دلشاد آغا بیگم

دلشاد آغا بیگم واقعی حسین و جمیل عورت تھی۔

تیکھے نقوش، کھنچے ابرو، بھاری پلکیں، عمر بائیس سال کے قریب۔ جاذب نظر ایسی کہ دیکھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ گھر میں شوہر کے سامنے رنگین تتلی کی طرح اڑتی پھرتی لیکن میدانِ جنگ میں شعلہ جوالہ بن جاتی۔ بجلی کی طرح چمکتی۔ بادل کی طرح گرجتی۔ چھوٹی کمان سے اس تیزی سے تیر برساتی جیسے بندوق سے گولیاں نکلتی ہیں۔ اس کا نشانہ بہت کم خطا ہوتا۔ میدے سے جیسے مرمریں ہاتھ سے جب نیزہ پھینکتی تو دشمن نیزے کے آگے آگے بھاگتی۔

وہ امیر حسین کی بیوی تھی۔

امیر حسین، امیر قزغن کا پوتا اور الجائی خاتون کا بھائی تھا۔ دبلا پتلا، گٹھیلا مگر بڑا سجیلا جوان تھا۔ ہمت شخص تھا اور بیوی کا عاشق اور محبوب بھی۔

دلشاد آغا اس کی الٹ تھی۔ پُر وقار، سنجیدہ اور دور اندیش۔ ایک طرف ناز و غمزے کے تیر چلاتی تو دوسری طرف مصیبت کے دنوں میں شوہر میں حوصلہ پیدا کرتی۔ دورانِ جنگ اس کے گھوڑے سے گھوڑا ملا دشمن کا مقابلہ کرتی۔ اسے نیک مشورے دیتی۔

امیر حسین کابل کا حکمران تھا اور دلشاد اس حکومت میں برابر کی شریک تھی۔ امیر حسین اپنے سیاسی معاملات سے خود بھی واقف تھا۔ وہ اہم معاملات میں دلشاد سے مشورہ کرتا اور اکثر اس کی رائے پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عمل کرتا تھا۔

۱۳۷۰ء میں بلادِ شمال کے خانِ اعظم نے ایک بار پھر تاتاری علاقوں کا رخ کیا۔ مغلوں اور تاتاریوں میں معاہدہ تھا لیکن خانِ اعظم اس معاہدے کی پروا نہ کرتے ہوئے جنوب میں اتر آیا تھا۔

خانِ اعظم نے امیر حسین کو اپنے زیرِ سایہ کابل پر حکومت کرنے کا پروانہ عطا کیا تھا۔ پھر اس وقت اس کا رخ کابل کی طرف بھی نہ تھا۔ امیر حسین چاہتا تو خانِ اعظم کے سامنے اپنی صفائی پیش کر سکتا تھا کیونکہ اس نے مغلوں کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا تھا لیکن یہ صنفِ تاتاری حکمران ہر معاملہ تلوار کی زبان سے حل کرنے کا عادی تھا۔ مغلوں کی یلغار کی خبر پاتے ہی اس نے مقابلے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

ذہین اور دور اندیش دلشاد کو خطرہ محسوس ہوا۔ اسے کابل کی سلطنت ہاتھ سے نکلتی ہوئی معلوم ہوئی۔ وہ امیر حسین کے سامنے دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔

"حسین! مغلوں سے ٹکرانا بہت بڑی غلطی ہو گی۔" دلشاد نے محبت سے شوہر کو سمجھایا۔

"جانِ حسین!"

امیر حسین اس کے قریب آتے ہوئے بولا:

"ملکۂ کابل کی زبان سے بزدلی کی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ کابل کی حکومت امیر حسین نے بزورِ شمشیر حاصل کی ہے۔ مغل اسے شمشیر ہی کے زور سے حاصل کر سکتے ہیں۔"

"لیکن خان نے کابل پر تو فوج کشی نہیں کی۔"

دلشاد جلدی سے اس سے دو قدم پیچھے ہٹ گئی:

"سانپ کے بل میں خود انگلی ڈالنا کوئی عقلمندی نہیں۔"

"میں مداری نہیں ہوں دلشاد۔"

امیر حسین نے اسے پھر پکڑ لیا:

"پھنکارتے سانپ کے سامنے میں بین نہیں بجا سکتا۔ میں اس کا سر کچل کے رکھ دوں گا۔۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ عورت جتنی زیادہ حسین ہو گی اتنی ہی بزدل بھی ہو گی۔ تم چاہو تو کابل میں رہ سکتی ہو۔"

دلشاد کے جیسے کسی نے طمانچہ مار دیا۔ تڑپ کے بولی:

"حسین۔ تم میری توہین کر رہے ہو۔ اپنے الفاظ واپس لو ورنہ۔۔۔۔" دلشاد غصے سے بے قابو ہو گئی۔

ورنہ ملکۂ کابل، شہنشاہِ کابل سے روٹھ جائے گی۔" امیر حسین نے زور کا قہقہہ لگایا۔

دلشاد کا چہرہ غصے سے تپ اٹھا تھا۔ شوہر کی چھیڑ چھاڑ نے اس میں حیا کی سرخی بھی شامل کر

"ہرگز نہیں حسین۔"

دلشاد بڑے استقلال سے بولی:

"روٹھنے منانے کی باتیں جنگ کے امڈتے بادلوں میں اچھی نہیں لگتیں۔ مغلوں کے مقابلہ بردار ہیں کابل کو پھونک کر نہ رکھ دیں۔"

امیر حسین اب تک چھیڑ خانی پر اترا ہوا تھا۔ ہنس کر بولا:

"پھر کونسا جنگی ترانہ سنانے کی ملکۂ کابل؟"

"تم بزدلی کا طعنہ واپس لیتے ہو یا نہیں۔"

دلشاد چیخ اٹھی:

"میں۔۔۔۔ میں خون کر ڈالوں گی۔"

"خون۔۔۔۔ خون کس کا کرو گی؟ اپنا یا میرا؟" امیر حسین برابر مسکرا رہا تھا۔

"نہ اپنا نہ تمہارا۔"

دلشاد بل کھاتی ہوئی بولی:

"تم مجھے کھو گے تو میں تم سے پہلے آگے بڑھ کر خانِ اعظم پر حملہ کر دوں گی اور تاتاری آن پر قربان جائے گی۔"

"تم۔۔۔۔!"

امیر حسین سنجیدہ ہو گیا:

"تم واقعی بہادر ہو دلشاد۔۔۔۔ پھر مجھے مقابلے سے کیوں روک رہی ہو؟"

"ذرا سوچو تو امیر حسین۔"

دلشاد بھی نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولی:

"خانِ اعظم کی کمان میں تیس چالیس ہزار کا خونخوار لشکر ہو گا۔ ہمارے دس بارہ ہزار سوار کیا کریں گے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہمیں اس سے مصالحت کر لینی چاہیے۔"

"مگر دلشاد؟"

امیر حسین سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

"مغلوں کا کوئی اصول نہیں۔ طاقت اصولوں کی پابند نہیں ہوا کرتی۔"

"ٹھیک ہے حسین۔"

دلشاد نے بات کو دوسرا رخ دیا:

"لیکن ہم معاہدہ کیوں توڑیں۔ کیا معاہدے میں یہ درج نہیں کہ قبیلی خان کی اولاد حکومت کرے گی اور قاچولی خان کا خاندان اس کے ماتحت رہے گا۔ تم قاچولی خان کی نسل سے ہو۔ تمہارے لیے مناسب نہیں کہ تم قبیلی خان کی اولاد سے بغاوت کرو۔"

دلشاد کی دلیل نے امیر حسین کو کچھ کچھ قائل کر دیا۔ سوچتے ہوئے بولا:

"لیکن دلشاد۔ یہ تو غور کرو کہ تاتاری علاقوں کو میں تاراج ہوتے ہوئے کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ یہ میرا علاقہ ہے۔ اس پر میرا حق ہے۔ مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔"

"مگر تمہارا حق تو خود تاتاریوں نے بھی تسلیم نہیں کیا۔ کس نے تمہیں امیر قزغن کا جانشین تسلیم کیا ہے؟"

دلشاد نے دوسری دلیل دی۔

"سمرقند پر سب ہی اپنا اپنا حق جتا رہے ہیں۔"

امیر حسین کو دلشاد کی دلیلوں کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑے۔ اس نے بے بسی سے دلشاد کو دیکھا۔ تیاریاں بند کر دی گئیں۔ امیر حسین، دلشاد کی چوکار میں کھو گیا۔ ایک ہفتہ اسی طرح گزر گیا۔

دوسرے ہفتے اُسے ایک دہشت ناک خبر ملی:

"مغلوں نے سمرقند میں لوٹ مار مچا دی ہے۔" سمرقند سے آنے والے ایک سوار نے اسے بتایا۔

"لیکن سمرقند کا حاکم تو تیمور ہے۔ اس نے نہیں روکا مغلوں کو۔" امیر حسین نے دانت پیستے ہوئے پوچھا۔

"اے امیر کابل!"

سمرقندی سوار نے بتایا:

"بہادر تیمور نے مغلوں کے خلاف تلوار اٹھائی۔ مغل سوار، تاتاری لڑکیوں کو پکڑ پکڑ کر شمال میں بھیج رہے

تھے۔ تیمور نے مغل چوکیوں کو گھیر لیا۔ لڑکیوں کو رہا کروا لیا۔ پھر وہ مغلوں کے لشکر میں بھی گھس گئے اور اس دلیر نے کئی سو لڑکیاں آزاد کرا لیں۔"

"لیکن اب وہ ہے کہاں؟ کیا کر رہا ہے وہ؟"

امیر حسین بپھر گیا:

"کیا وہ چوڑیاں پہنے شہر سبز میں پڑا ہے۔"

"نہیں امیر۔"

سمرقندی سوار، تیمور کی توہین برداشت نہ کر سکا:

"سردار تیمور ایسے نہیں ہیں۔ یلغار کے وقت وہ سمرقند میں موجود تھے۔ انہوں نے مقابلے کی تیاری کی لیکن اتاری سردار ان کا ساتھ چھوڑ گئے۔ کسی نے بھی ساتھ نہ دیا ان کا۔ وہ دل برداشتہ ہو کر روپوش ہو گئے۔ نہیں کدھر گئے وہ۔"

"ممکن ہے وہ کابل آ رہے ہوں امیر۔" دلشاد نے خیال ظاہر کیا۔ وہ اس گفتگو کے وقت امیر حسین کے ساتھ تھی۔

"ہم نے اس کا ٹھیکہ نہیں لیا۔"

امیر حسین چڑ گیا:

"جب مصیبت پڑتی ہے تو وہ کابل آتا ہے۔"

"تو کیا ہوا حسین۔ وہ الجائی خاتون کے شوہر ہیں۔ تمہارے بہنوئی۔"

دلشاد نے امیر حسین کے غصے پر محبت کا چھینٹا دیا۔ وہ اسی طرح اس کا غصہ ٹھنڈا کیا کرتی تھی۔

"تمہیں تیمور کا انتظار کرنا چاہیے۔ ایک سے دو بھلے۔ ممکن ہے کہ وہ کوئی بہتر ترکیب بتائے۔"

"بہتر ترکیب۔"

امیر حسین منہ بناتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا:

"وہ آئے گا تو ہم پر بار بنے گا۔ مدد مانگے گا۔" امیر حسین پیر پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔

تیمور تو کابل نہ آیا۔ لیکن دو ہی دن بعد ایک سوار اس کا خط لے کر امیر حسین کے پاس پہنچا۔ خط مختصر لیکن تمام ضروری باتیں تحریر تھیں۔ لکھا تھا:

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"امیر حسین!

کابل سے نکلنے کی کوشش ہرگز نہ کرنا۔ تاتاری قوم سو گئی ہے۔ تمہارا ساتھ کوئی نہ دے گا۔ خانِ اعظم لالچی ہے۔ دولت کی بڑی اس کا علاج ہے۔ میری گرفتاری اور سر کے لیے انعام کا اعلان ہوا ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ کہاں؟ یہ خود مجھے معلوم نہیں۔"

تیمور"

"بزدل!"

امیر حسین نے چلا کر خط دلشاد کی طرف بڑھا دیا:

"خود ڈر کے بھاگ گیا ہے۔ مجھے بھی یہی حکم دے رہا ہے۔ میں اس کا غلام نہیں کوئی۔ میں مقابلہ ضرور مقابلہ کروں گا۔"

دلشاد اپنے ہونٹ کاٹ کے رہ گئی۔ امیر حسین اپنی ضد کا پکا تھا۔ جو بات دل میں بیٹھ جاتی نکلنا ناممکن تھا۔ یہی ہوا بھی۔ امیر حسین نے فوراً لشکر کی تیاری کا حکم دیا اور آٹھ ہزار سواروں کے ساتھ شاہ طرف چلا۔ چار ہزار سوار کابل کی حفاظت کے لیے چھوڑے۔ دلشاد چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لی۔ اس کوئی گلہ کیا نہ شکوہ۔ نہ حرفِ شکایت زبان پر لائی۔

○

خانِ اعظم اس مرتبہ بڑے اہتمام سے آیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ پورے تاتاری طاقتوں کو اس طرح روند رکھ دے کہ پھر کبھی انہیں بغاوت کی جرأت نہ ہو۔

اس کا بیٹا ایاس خواجہ خان اور جمعہ سردار بیگ جگ پہلے ہی سمرقند کے نواح میں موجود تھے۔ خواجے نے بظاہر تو تاتاری لڑکیوں کو واپس کر کے تیمور کے فتنے کو دبا دیا تھا لیکن وہ تیمور سے خائف تھا اور چاہتا تھا کہ اس کانٹے کو ہمیشہ کے لیے دور کر دیا جائے۔ اس نے تیمور کی شکایت پہلے ہی خانِ اعظم کو لکھ بھیجی تھی اور اس میں اشارہ کیا تھا کہ تیمور کے تیور ٹھیک نہیں لگتے اور اس کی گفتگو اور عمل سے بغاوت کی بو آتی ہے۔

تھا کہ خانِ اعظم اس شکایت پر زیادہ توجہ نہ دیتا لیکن جس وقت ایاس خواجہ کا شکایت نامہ خانِ اعظم وقت ان مغلوں کی بیوائیں جن کے شوہر تیمور کے ہاتھ سے مارے گئے تھے، خانِ اعظم کے پاس پہنچ گئیں۔

اب خانِ اعظم کو تیمور کی بغاوت کا پورا یقین ہو گیا۔ اس نے نہ صرف تیمور کی گرفتاری اور قتل کا حکم دیا بلکہ خود لشکر لے کر جنوب میں آ گیا۔

امیر حسین جس وقت کابل سے نکلا تو اس کے ساتھ گھٹیلے جسموں کے افغان قبائل، غوری قبائل اور خود اس کے دستے تھے۔ یہ لوگ بڑے جنگجو تھے اور امیر حسین کو بہادر پر ناز تھا۔ راستے میں اس کے ساتھ کچھ اور بھی شامل ہو گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جو مغلوں کو پسند نہ کرتے تھے اور امیر حسین کے زیرِ سایہ مغلیت کی جڑ کاٹنے کے خواہش مند تھے۔

امیر حسین بڑی تیزی سے بڑھا تاکہ خانِ اعظم اور ایاس خواجہ کے لشکروں کے درمیان حائل ہو جائے۔ خواجہ کو اس کی خبر مل گئی۔ اس نے فوراً بیگ جگ کو پندرہ ہزار سواروں کے ساتھ امیر حسین کو روکنے کے لیے بھیجا۔ بیگ جگ ابھی امیر حسین تک نہ پہنچا تھا کہ اسے سمرقند سے پانچ ہزار کی اور کمک پہنچ گئی۔ خانِ اعظم کو پتا چلا تھا اسے امیر حسین کی شورش کی اطلاع ملی تو اس نے بیگ جگ کو کمک کے ساتھ یہ پیغام بھی بھیجا تھا کہ شکست دے کر اسے زندہ یا مردہ سمرقند بھیجا جائے۔

امیر حسین بڑی شان سے آگے بڑھ رہا تھا کہ اسے معلوم ہوا کہ مغل لشکر راستہ کاٹ کر کابل کی طرف گیا ہے اور کے حواس جاتے رہے۔ وہ لشکر لے کر فوراً پلٹا۔ مغل لشکر کابل کی حدود میں داخل ہو چکا تھا کہ امیر حسین نے مغلوں کے مورچہ بندی کرنا چاہی لیکن امیر حسین نے بغیر کسی انتظار کے مغلوں پر حملہ کر دیا۔

امیر حسین کا حملہ اس قدر طوفانی تھا کہ بیگ جگ جیسا تجربہ کار سردار بھی گھبرا گیا لیکن مغل بھی ویسے ہی جنگجو تھے۔ خاصا خون خرابہ کرنے کے بعد انہوں نے امیر حسین کو گھبرانا شروع کر دیا۔ آٹھ ہزار اور بیس ہزار کا مقابلہ تھا۔ امیر حسین کے افغان اور غوری قبائل اس بے جگری سے لڑے کہ بیگ جگ حیران رہ گیا۔

اس خوفناک جنگ کے بعد امیر حسین کا لشکر گھٹ کے رہ گیا۔ دلشاد آغا بیگم، شوہر کے پہلو بہ پہلو لڑائی کے حوصلے بڑھا رہی تھی۔ ایک موقعہ پر امیر حسین کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی۔ قریب تھا کہ وہ گر پڑتا کہ دلشاد فوراً گھوڑا بڑھا کر امیر حسین کے برابر پہنچی۔ اسے سہارا دے کر اپنے گھوڑے پر کھینچ لیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک گھوڑے پر دو سوار ہوتے تو لڑائی جاری رکھنا مشکل ہو گیا۔ جان بچانے کے بھی لالے پڑ گئے۔ سے امیر حسین کو گھیرے ہوئے تھے۔ بیگ جگ نے انہیں امیر حسین کا سر اتارنے کا حکم دیا تھا۔

افغان اور غوری قبائل نے امیر حسین کو موت کے منہ میں دیکھا تو اس کے گرد دیوار بن کر کھڑ پھر امیر حسین کو ایک خالی گھوڑا مل گیا۔ لیکن اب جنگ جاری رکھنا ناممکن تھا۔ مغل ہر طرف سے یلغار کر کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ غوری اور افغانوں نے اپنی جانیں لڑا دیں اور لڑتے بھڑتے امیر حسین اور دلشاد سے صاف نکال لے گئے۔

جنگ ختم ہو گئی۔ کابل کا لشکر ادھر ادھر بکھر گیا اور پسپا ہو کر میدان چھوڑ بھاگا۔ مغلوں نے امیر سورج غروب ہونے تک کیا۔ جب رات کے اندھیرے نے راستوں کو نگل لیا تو مغل واپس ہو گئے۔ کے راستوں سے واقف نہ تھے اور گم ہو جانے کا خطرہ تھا۔

امیر حسین نے آدھی رات بیت جانے کے بعد جب ایک جگہ قیام کیا تو اسے معلوم ہوا کہ اس صرف چالیس سوار وفادار ہیں جو خون کا دریا پار کر کے اسے بچا لائے تھے۔

امیر حسین بت افسردہ اور شرمندہ تھا۔ دلشاد کے سامنے اس کی نظریں نہ اٹھتی تھیں۔ دلشاد وہ شوہر سے شکوہ کر کے اس کا دل اور نہ دکھانا چاہتی تھی۔ مغلوں سے ٹکرانا سراسر حماقت تھی۔ تیمور نے منع بھی کیا تھا لیکن وہ تو ضدی اور خود سر تھا۔ وہ بہادر ضرور تھا لیکن دور اندیشی اسے چھو کر نہیں گئی تھی۔ شکست سے کابل کی طاقتور سلطنت اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ پھر وہ پہاڑوں اور صحراؤں میں پناہ لینے دلشاد آغاب بھی اس کا ساتھ دے رہی تھی۔

زندگی میں شاید پہلی بار امیر حسین کو اپنی بے جا ضد کا احساس ہوا۔ اس کا اعلان اس نے دلشاد کیا اور وعدہ کیا کہ آئندہ دلشاد کے مشورے پر عمل کرے گا۔

○

تیمور اگرچہ امیر حسین کی طرح ضدی نہ تھا لیکن تاتاریوں میں یہ عیب مشترک تھا کہ وہ اکثر اپنی بے جا اظہار کر کے نقصان اٹھاتے تھے۔ تیمور بھی اسی عیب کا شکار تھا۔ مغل اپنی طاقت کے زور پر

ے۔ انھوں نے لوٹ مار مچا رکھی تھی اور تاتاری لڑکیوں کو اغوا بھی کر رہے تھے لیکن تیمور نے ت کا اندازہ کیے بغیر ان کا مقابلہ شروع کر دیا تھا۔ وہ شجاعت کے زور پر مغل لشکر گاہ تک سے تاتاری لڑکیوں کو چھڑا لایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاتاری علاقے میں متعین مغل لشکری لاف ہو گئے اور شمال سے خانِ اعظم بھی اسے سزا دینے کے لیے سمرقند پہنچ گیا۔ تیمور ب اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا کہ وہ ملکی سیاست پر لعنت بھیجے اور اپنے خاندان کر لے۔

ور اگر چاہتا تو وہ کچھ دنوں کے لیے کابل جا سکتا تھا لیکن وہ بار بار امیر حسین کا احسان ہتا تھا۔ اس لیے اس نے امیر حسین کو خط بھیجنے کے بعد بیوی بچوں کو ساتھ لیا اور سُرخ ے قزل قم کہتے ہیں، میں اپنا گھوڑا ڈال دیا۔ اس تق و دق صحرا میں جب وہ داخل ہوا تو اس رف بیس وفادار سوار تھے۔ کچھ گھوڑوں پر ضروری سامان لاد لیا تھا۔ تیمور نے اپنے ساتھ جو اشرفیاں لے لی تھے اور وقت بے وقت کے لیے پانی سے بھرے مشکیزے ساتھ تھے۔

غرب میں دور تک پھیلا ہوا یہ بے آب و گیاہ صحرا..... انسانوں اور جانوروں سے یکسر یہاں دن بھر سرخ ریت کے بگولے اڑتے رہتے اور دھند سے آسمان تاریک رہتا ول کا یہاں نام و نشاں نہ تھا۔ یہ صحرا دراصل اُن مجرموں کا مسکن تھا جو سزائے موت سے یہاں آ چھپتے تھے۔ یا پھر کہیں کہیں میٹھے پانی کے کنوؤں کے گرد ان صحرائی ترکمانوں کے تے تھے جو اپنے ریوڑوں کی رکھوالی کے ساتھ ساتھ اکا دکا قافلوں کو بھی لوٹ لیا کرتے تھے اس صحرا میں مجرموں اور قزاق ترکمانوں کی حکومت تھی۔ تیمور اس بیابان میں آگے ہی آگے ا۔ رات ہوتی تو یہ لوگ اپنے گھوڑوں کو سوکھی گھاس چرنے کے لیے چھوڑ دیتے۔ یہ گھاس ریت میں آدھے آدھے دھنسے ہوئے نرسل کے چھوٹے چھوٹے پودے ہوتے۔ رات ا اپنے گھوڑوں کی حفاظت بھی کرنا پڑتی۔ تیمور چاہتا تھا کہ کسی طرح اس صحرا کو عبور کر کے ارزم کے پہنچ جائے جہاں سے تجارتی راستے گزرتے تھے۔ ان راستوں پر بڑے بڑے جہاں سے سامان خورد و نوش حاصل کیا جا سکتا تھا لیکن منزل ابھی دور تھی۔ بہت دور۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک رات تیمور کے ساتھ جیسے ایک معجزہ ہوگیا۔ تیمور اپنے آدمیوں کے ساتھ
کے ایک کنوئیں کے پاس پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ گھوڑوں کی حفاظت کے لیے چار آدمیوں
باری باری رات بھر پہرہ دیتی تھی۔ اس رات پہرہ دینے والوں میں خود تیمور شامل تھا۔ تیمور
الجائی خاتون کو لیے مشرقی سمت پہرے پر تھا۔ رات بڑی تاریک تھی اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا
تیموں کے سامنے جلنے والے الاؤ بجھ چکے تھے۔ صرف ایک الاؤ سے چھوٹی چھوٹی چنگاریاں نکل رہی تھی۔ ایسے سناٹے اور تاریکی میں تیمور کو دو گھوڑوں کے بھاگنے کی آواز سنائی دی۔ یقیناً یہ
ترکمان لٹیرے ہیں۔ تیمور کے دماغ میں فوراً یہ خیال پیدا ہوا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا..... الجائی
اس کے گھوڑے قریب ہی موجود تھے۔ دونوں گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ تیمور نے الجائی کو خیمہ
طرف بھیجا کہ وہ سب کو جگا کر خبردار کرائے اور خود کمان سنبھال کر کھڑا ہوگیا۔

ٹاپوں کی آواز سے تیمور نے اندازہ لگایا کہ آنے والوں کی تعداد چالیس پچاس کے قریب
اس سے تیمور کو کچھ اطمینان ہوا۔ اس کے ساتھ بیس سوار تھے لیکن ان میں ہر سوار دس دس پر بھاری تھا۔ آنے والوں کی رفتار کم تھی جیسے وہ احتیاط سے قدم بڑھا رہے ہوں۔ ادھر الجائی
نے سب کو جگا کر خطرے سے آگاہ کیا اور ساتھی الاؤ سے اٹھتی ہوئی چنگاریوں کو بھی بجھا دیا تاکہ
والوں کو ان کی تعداد کا صحیح اندازہ نہ ہو سکے۔ سب سوار تیمور کے پاس آکر کھڑے ہوگئے تھے۔

آنے والوں کو بھی شاید ان کی موجودگی کا علم ہوگیا۔ انہوں نے رفتار اور کم کر دی اور کچھ دور آ
گئے۔ تیمور نے کچھ دیر انتظار کے بعد پُر رعب آواز میں کہا "کون ہو تم لوگ۔ کس ارادے سے
آئے ہو؟"

"ہم کون ہو؟" اُدھر سے بھی ایک بھاری آواز آئی۔

الجائی خاتون نے فوراً ہاتھ دبا کر تیمور کے کان میں سرگوشی کی "یہ آواز میرے بھائی امیر حسین
سے ملتی جلتی ہے۔"

تیمور تو یہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اُسے الجائی کی سرگوشی پر یقین نہیں آیا۔ اُس نے پھر ڈپٹ
کہا "جلدی بتاؤ ورنہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ تم ہمارے تیروں کی زد میں ہو۔"

دوسری طرف کچھ کھسر پھسر ہوئی۔ شاید آنے والے خوفزدہ ہوگئے تھے یا اپنی کوشش پر

ے تھے۔ پھر وہی پہلی آواز بلند ہوئی "ہم چور، ڈاکو یا لٹیرے نہیں ہیں۔ مسافر ہیں۔ راستہ بھول گئے
ہمارے پاس کھانے پینے کو بھی کچھ نہیں ہے۔"

"امیر حسین!" الجائی خاتون برداشت نہ کر سکی اور چیخ پڑی۔ یہ واقعی امیر حسین کی آواز تھی۔ خون نے
ارادی تو امیر حسین بھی چلایا "خاتون آغا تم ہو۔ میں امیر حسین ہوں۔"

الجائی خاتون (خاتون آغا) نے فوراً گھوڑا آگے بڑھا دیا۔ دونوں طرف کے سواروں میں خوشی کی
ئی۔ فوراً الاؤ روشن کر دیئے گئے۔ امیر حسین کے ساتھ اس کی خوبصورت اور وفادار بیوی دلشاد
بھی تھی۔ تیمور کو یہ ایک معجزہ ہی معلوم ہوا۔ کہاں کابل اور کہاں یہ سرخ ریگستان۔ وہ دونوں بڑے
ے ملے۔ دلشاد آغا نے ٹھیک کہا تھا کہ ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں۔ تیمور تو کابل نہ پہنچا لیکن
نے ان دونوں کو دیارِ غیر میں اُس وقت ملا دیا تھا جب انہیں ایک دوسرے کی سخت ضرورت تھی۔
کے ساتھ چالیس سوار تھے۔ تیمور کے بیس سوار ملا کر اُن کی تعداد ساٹھ ہوگئی تھی۔ ساتھ ہی دونوں
ربت ہوتی تھی اور اس حالت میں کہ ان میں سے ہر سوار کوہ گراں تھا۔

امیر حسین اور اس کے ساتھی بھوک پیاس سے بے حال ہو رہے تھے۔ اُن کا سامان خورد و نوش دو
ختم ہوا تھا اور وہ کھانے پینے کی تلاش میں دو دن سے اِدھر اُدھر بھٹک رہے تھے۔ پانی تو
را مہیا کر دیا گیا۔ پھر کھانے کا انتظام شروع ہوا۔ تیمور کا یہ طریقہ تھا کہ وہ راستے میں جہاں بھی
ٹیڑ ملتا کے..... ریوڑ سے اُن میں سے حسبِ ضرورت بھیڑیں خرید لیتا۔ کچھ تو اسی وقت
عالی جاتیں باقی کا گوشت، پتھر پر ترخا کے خورجینوں میں بھر لیا جاتا۔ جب تازہ گوشت نہ ملتا
یوں کے گوشت پر گزارہ ہوتا۔ اس وقت بھی ان کی خورجینوں میں ترخایا ہوا گوشت بھرا تھا
ن نکال کے الاؤ پر گرم کیا گیا۔ پھر ان کے سامنے رکھا۔ امیر حسین کے ساتھی دو دن کے بھوکے
..... انہوں نے خوب پیٹ بھر کے کھایا۔ تیمور اور الجائی خاتون انہیں اس طرح کھاتے دیکھ کر
ش ہو رہے۔

کھانے کے بعد امیر حسین، تیمور، اُن کی بیویاں سر جوڑ کے بیٹھے..... ماضی اور مستقبل کی
گفتگو شروع ہوئی۔ تیمور کو سخت تعجب تھا کہ امیر حسین، کابل سے یہاں کس طرح پہنچا اور اس کا یہ
لکر کیسے ہوا؟ وہ انتظار کرتا رہا کہ امیر حسین اس کے بارے میں خود ہی بتائے گا لیکن امیر حسین

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنی جگہ شرمندہ تھا۔ اس لیے اس طرف نہ آرہا تھا۔ آخر تیمور نے مجبور ہو کر پوچھا "امیر اخطا تم سے ہو گیا ہوگا۔ امیر حسین؟"

امیر حسین کے لیے اب اصل حالات بتانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا لیکن وہ عمر میں ایک سال بڑا تھا۔ اس لیے عقل و دانش میں خود کو تیمور سے افضل سمجھتا تھا اس نے بہت گھما کر جواب بولا "تیمور، تم جانتے ہو جب دو حریف فوجیں ٹکراتی ہیں تو ایک کو شکست یقینی ہوتی ہے۔"

تیمور بڑا ذہین تھا۔ وہ امیر حسین کا مطلب سمجھ گیا اور کہا "امیر حسین! جنگ کا یہ کوئی قاعدہ نہیں ہے۔ حریفوں میں صلح بھی ہو سکتی ہے اور ایک حریف دوسرے حریف کے مقابلے میں اگر کمزور تو پسپا ہو کر قلعہ بند بھی ہو سکتا ہے۔ یہ سب حالات پر منحصر ہے۔"

"بہرحال! تم یہ سمجھو کہ میں نے مغلوں کا بہادری سے مقابلہ کیا لیکن شکست کھا گیا۔" امیر حسین نے اتنی بے پرواہی سے کہا جیسے اس کی شکست کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

"جنگ کابل میں ہوئی یا کابل سے باہر ہوئی؟" تیمور نے مزید تفصیل معلوم کرنے کی کوشش کی۔

"ہم نے کابل سے نکل کر مغلوں کا مقابلہ کیا تھا۔" امیر حسین کے بجائے اس کی خوبصورت بیوی دلشاد نے تیمور کو جواب دیا۔ "ہمارے افغانی اور غزر سوار یہ گوارا نہ کر سکے کہ ہم کابل میں قلعہ بند ہو کر مدافعتی جنگ لڑیں۔ ہمارے لشکر نے بڑی شجاعت کا مظاہرہ کیا لیکن مغلوں کا لشکر بیس ہزار سے بھی زیادہ تھا اس لیے ہمیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔"

دلشاد آغا بیگم نے بڑی عقل مندی سے اپنے ضدی شوہر کو مزید شرمندہ ہونے سے بچا لیا۔ تیمور کو جنگ کی پوری تفصیل سے بھی آگاہ کر دیا۔ دلشاد نے بڑے سلیقے اور متانت سے گفتگو کی۔ تیمور اس کے طرز گفتگو سے بڑا متاثر ہوا۔ دلشاد آغا واقعی بہت خوب صورت تھی لیکن ایک خاتون ایک بچے کی ماں ہونے کے باوجود دلشاد سے کسی طرح کم حسین نہ تھی۔ اس لیے دلشاد نے تیمور کو متاثر ضرور کیا لیکن یہ تاثر اس کے دماغ پر اس کی ذہانت اور متانت کی وجہ سے قائم ہوا۔

اب مستقبل کے بارے میں منصوبہ بندی شروع ہوئی۔ تیمور نے بتایا کہ وہ قزل قم پہنچ کر چغتائی سردار تغلق کے پاس اپنی آمد کی خبر لے جانے کا حکم دیا۔ ایلچی بہادران لوگوں کو فصیل شہر کے باہر چھوڑ کر اندر پہنچا اور تغلق کو تیمور کے آنے کی خبر دی۔ تغلق یہ خبر ملتے ہی گھوڑے پر سوار ہو کے ایلچی بہادر کے ساتھ ہو لیا۔ وہ تیمور کے پاس پہنچ کے اس سے بڑی گرم جوشی سے ملا اور اسے اپنا مہمان بنانے کی پیش کش کی۔ تیمور نے اس کی یہ پیش کش قبول کرتے ہوئے کہا "سردار تغلق! ہم آپ کی اس پیش کش کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہم سب مسلح ہیں اور مسلح سواروں کا کسی غیر کے قلعہ میں داخل ہونا عام مصلحت کے خلاف ہوتا ہے۔ اگر آپ ہمیں مہمان بنانا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے فصیل کے باہر خیمے لگوا دیجیے۔ یہ آپ کی بہت بڑی مہمان نوازی ہوگی۔"

سردار تغلق نے دیر حیران نظروں سے تیمور کو دیکھتا رہا۔ پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ "اے سبز کے امیر۔ کیا آپ سردار تغلق کو اس قدر بیوقوف سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے قلعے میں کسی دشمن

رات کافی گزر چکی تھی اور صبح ہونے والی تھی۔ یہ لوگ سونے کے لیے لیٹ گئے کیونکہ صبح ہوتے ہی انہیں روانہ ہونا تھا۔

صبح کو پھر وہی ریت کا سمندر تھا اور ساٹھ آدمیوں کا یہ قافلہ۔ امیر حسین کے آجانے سے تیمور کو بڑی تقویت ہوئی تھی۔ ایک تو ان کی نفری میں اضافہ ہو گیا تھا۔ دوسرے الجائی خاتون کو ایک ساتھی مل گئی تھی۔ دلشاد آغا بڑی خوش مزاج عورت تھی۔ الجائی خاتون اس کی باتیں سن کر بہت خوش ہوتی۔ یوں اس سفر میں دلشاد کی وجہ سے ایک دلچسپ ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ پڑاؤ کے دوران دلشاد اپنی دلچسپ باتوں سے الجائی خاتون اور اس کے ننھے بیٹے جہانگیر کو خوب ہنساتی رہتی تھی۔

آخر خدا خدا کر کے اس ریگستان میں ایک شہر نظر آیا۔ اس کا نام خیوہ تھا گو کہ یہ شہر چھوٹا تھا لیکن ریگستان کا ایک عرصہ کے بعد ان لوگوں نے یہ شہر دیکھا تھا۔ شہر کے قریب پہنچ کے ایک آدمی سے اس شہر کی ہیئت دریافت کی۔ تیمور کو جیب بتایا گیا کہ خیوہ کا حاکم تغلق نام کا ایک صحرائی ہے..... تو وہ بہت سردار تغلق کو تیمور بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ تیمور کے شہر سبز میں اکثر آیا کرتا تھا۔ تیمور نے تغلق کی کئی بار دعوت بھی کی تھی۔ آخر طے ہوا کہ تغلق کے یہاں قیام کیا جائے اور جب اس تکلیف دہ سفر کی تکان دور ہو جائے تو آگے..... بڑھا جائے۔

شہر کے دروازے پر پہنچ کر تیمور نے اپنا گھوڑا روک لیا اور اپنے معتمد سردار ایلچی بہادر کو تغلق کے پاس اپنی آمد کی خبر لے جانے کا حکم دیا۔ ایلچی بہادر ان لوگوں کو فصیل شہر کے باہر چھوڑ کر اندر پہنچا اور تغلق کو تیمور کے آنے کی خبر دی۔ تغلق یہ خبر ملتے ہی گھوڑے پر سوار ہو کے ایلچی بہادر کے ساتھ ہو لیا۔ وہ تیمور کے پاس پہنچ کے اس سے بڑی گرم جوشی سے ملا اور اسے اپنا مہمان بنانے کی پیش کش کی۔ تیمور نے اس کی یہ پیش کش قبول کرتے ہوئے کہا "سردار تغلق! ہم آپ کی اس پیش کش کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہم سب مسلح ہیں اور مسلح سواروں کا کسی غیر کے قلعہ میں داخل ہونا عام مصلحت کے خلاف ہوتا ہے۔ اگر آپ ہمیں مہمان بنانا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے فصیل کے باہر خیمے لگوا دیجیے۔ یہ آپ کی بہت بڑی مہمان نوازی ہوگی۔"

سردار تغلق نے دیر حیران نظروں سے تیمور کو دیکھتا رہا۔ پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ "اے سبز کے امیر۔ کیا آپ سردار تغلق کو اس قدر بیوقوف سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے قلعے میں کسی دشمن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنے کی دعوت دے گا۔"

"دوست دشمن کی بات نہیں سردار۔" تیمور متانت سے بولا۔ "سپاہی کو ہر وقت ہر طرف سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ دشمنی کسی کے ماتھے پر نہیں لکھی ہوتی۔ میں نے ایک اصولی بات کی ہے۔ میں خود اس پر عمل کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ ہر سردار اس اصول کی پابندی کرے۔"

سردار تنگل نے دوسرا قہقہہ لگایا۔ یہ پہلے سے زیادہ زوردار اور خوف ناک قسم کا قہقہہ تھا۔ "امیر کو علم ہونا چاہیئے کہ صحرائی لوگ سیدھے سادے ضرور ہوتے ہیں لیکن وہ تاتاریوں ہی جیسے بہادر بھی ہیں۔ پھر آپ کی تعداد ہی کتنی ہے۔ ہمیں کم از کم آپ سے کوئی خطرہ نہیں۔ ویسے آپ کی مرضی ہے آپ کے لیے باہر ہی خیمے لگوا دیں گے۔"

"شکریہ، سردار تنگل۔" شہر سبز کے امیر تیمور نے کمال خندہ پیشانی کا اظہار کیا۔ پھر اس نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہ ہیں میری بیگم اور تمہاری بھابی الجائی خاتون آغا۔" سردار تنگل نے سر کو ذرا سا خم کر کے تعظیم کا اظہار کیا۔ الجائی کی گود میں ننھا بہادر تھا۔ نصف چہرے پر ہلکا سا نقاب تھا۔ تاتاری اور ازبک خواتین کی بہت عزت کرتے تھے جو اپنے شوہر کے ساتھ بزم کی محفلوں اور رزم کی صعوبتیں برداشت کرتی تھیں۔

پھر تیمور نے اپنے سالے سے تعارف کرایا۔ "یہ ہیں امیر حسین والی کابل اور الجائی خاتون کے بھائی اور ان کے ساتھ ان کی بیگم دلشاد آغا بیگم۔"

دلشاد آغا الجائی خاتون کے پیچھے کھڑی تھی۔ اس کا نام لیا گیا تو وہ ایک دم آگے بڑھ آئی تاکہ گھر کے میزبان کو یہ احساس نہ ہو کہ وہ مغرور یا غیر شائستہ ہے۔ دلشاد آغا پر نظر پڑتے ہی جیسے سردار تنگل کے خرمن دل پر بجلی سی گری۔ دلشاد کا بے نقاب دمکتا چہرہ، سرخ و سفید رنگت اور الانگ انگ پھوٹتی جوانی۔ سردار تنگل تو ہکا بکا رہ گیا۔ اس کی نظر سے ایسا حسن کبھی نہ گزرا تھا۔ سردار تنگل کی عمر چالیس کے قریب تھی۔ چار بیویوں کے علاوہ اس نے ایک درجن سے زیادہ داشتائیں اور لونڈیاں رکھ چھوڑی تھیں لیکن اس کی بوالہوس نظریں دلشاد کے چہرے پر کچھ اس طرح جم گئیں کہ وہ گھبرا کر الجائی کی آڑ میں ہو گئی۔

سردار تنگل جیسے خواب کے عالم میں بولا۔ "ماشاءاللہ والی کابل اور ان کی ملکہ لاجواب ہیں۔"

تیمور بڑے غور سے سردار تنگل کی نظروں کو دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنے طویل سفر کے دوران پہلی مرتبہ کسی مقام سے خوف کا احساس ہوا۔ تیمور نے تو احتیاط کے طور پر شہر سے باہر ٹھہرنے کا فیصلہ کیا تھا، اس وقت وہ مغل خانِ اعظم کا باغی تھا اور توغلق خان اعظم کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کوئی بھی قدم اٹھا سکتے تھے لیکن اس وقت سردار تنگل کی نظریں دیکھ کر اسے یقین ہو گیا کہ اس نے صحیح فیصلہ کیا۔

تیمور کے لیے شہر سے باہر خیمے لگا دیے گئے۔ سردار تنگل دونوں وقت مہمانوں کے لیے بہترین کھانا بھجوا کرتا اور تیمور کے ساتھ خود بھی بیٹھ کے کھانا کھاتا۔ کھانے کے اوقات کے علاوہ وہ دن میں ایک دو مزاج پرسی کے بہانے بھی آجاتا اور خواہ مخواہ کی باتیں کرتا رہتا۔ سردار تنگل دراصل دلشاد آغا کے دیدار کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ دلشاد سے ملنے کے بہانے تلاش کرتا رہتا۔ دلشاد نے بھی یہ بات محسوس کر لی تھی۔ وہ زیادہ وقت اپنے خیمے کے اندر ہی رہتی لیکن سردار تنگل امیر حسین سے ملاقات کے بہانے سے خیمے میں گھس جاتا۔ یہ بات امیر حسین کو بھی ناگوار گزرتی لیکن میزبان کے لحاظ کی وجہ سے سب خاموش رہتے۔

ایک رات جب کھانے کے بعد سردار تنگل ان لوگوں کے پاس دیر تک بیٹھا رہا تو تیمور نے دبی زبان سے کہا۔ "سردار تنگل! آپ کی میزبانی کے ہم بہت بہت شکر گزار ہیں۔ یہاں گزارے ہوئے یہ دن ہم زندگی بھر نہ بھول سکیں گے۔ اب ہمیں اجازت دیجئے۔ ہم بخارہ و خوارزم کی طرف جانا ہے۔ ہمیں بڑے شہر میں جا کر قسمت آزمائی کریں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے شہر سبز کے امیر۔" سردار تنگل نے سخت مخالفت کی۔ "ابھی آپ کا خیمہ سے کسی طرح مناسب نہیں۔ خانِ اعظم آپ کا دشمن ہے۔ اس نے آپ کی گرفتاری کے لیے اقدام مقرر کیا ہے۔ میں اپنے ایک عزیز دوست کو کس طرح بے یار و مددگار چھوڑ سکتا ہوں۔ خیمہ آپ لوگوں کے لیے سب سے زیادہ امن کی جگہ ہے۔ آپ یہاں اس وقت تک آرام و سکون سے رہیں جب تک آپ کو دوبارہ طاقت حاصل نہیں ہو جاتی۔"

تیمور اس کی باتوں سے سناٹے میں آگیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ سردار تنگل سمرقند کے حالات سے بالکل واقف نہیں لیکن سردار تنگل نے انعام کا ذکر کر کے اسے ایک اور نئے خطرے سے دوچار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر دیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ تنکل کے دل میں کھوٹ ہے اور وہ انعام کے لالچ میں اس کے ساتھ کوئی بھی حرکت کر سکتا ہے۔

تیمور نے اپنے خدشات چھپاتے ہوئے کہا۔ "سردار تنکل آپ میری فکر نہ کریں۔ مجھے مغلوں کا کوئی خوف نہیں۔ میری مختصر سی جماعت کے مقابلے پر مغلوں کو ایک لشکر لانا پڑے گا اور جن راستوں سے گزر کر میں آیا ہوں وہاں سے کسی لشکر کا گزرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ آپ کو پورے حالات کا علم ہے میں نہیں چاہتا کہ میری میزبانی کی وجہ سے آپ کی اور خانِ اعظم کی دوستی میں کوئی فرق آئے۔ ابھی آپ کے پاس زیادہ دن قیام نہیں کر سکتے۔"

"ٹھیک ہے آپ کی جیسی مرضی۔ میں مجبور نہیں کرتا لیکن دو ایک روز تو اور ٹھہر جاتے۔" سردار تنکل نے تیمور کو بالکل پا بہ رکاب دیکھا تو ایک دو دن اور ٹھہرانے کی کوشش کی۔

تیمور تو فوراً روانہ ہونا چاہتا تھا لیکن بیہ بات مہمان اور مہمان نوازی کے اصولوں کے خلاف تھی اس نے سردار تنکل کی بات مان لی۔ سردار وہاں سے بڑا مضمحل سا اٹھا۔ اس کے جانے کے بعد تیمور نے کہا۔

"امیر حسین اب یہاں ایک لمحہ بھی ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ آج ہی رات چپکے سے نکل چلو صبح تک ہم کافی دور نکل چکے ہوں گے۔"

امیر حسین نے حسبِ معمول مخالفت کی۔ "خطرے کی کیا بات ہے۔ ہم کوئی مٹی کے بنے ہیں۔ تنکل کے پاس زیادہ سے زیادہ چار پانچ سو سوار ہوں گے کیا ہم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ میرا تو خیال ہے ہمیں خجوہ پر قبضہ کر لینا چاہیے۔ یہ شہر ہمارے لیے ایک بہترین پناہ گاہ بن سکتا ہے۔ ادھر ادھر مارے پھرنے سے ایک جگہ ٹھہرنا زیادہ اچھا ہو گا۔"

"میں اس احمقانہ رائے کی تائید نہیں کر سکتا۔" تیمور کو غصہ آ گیا۔ "تنکل اپنے مستقر پر ہے اس کے پاس ایک سو سوار ہوں تو وہ بھی بہت ہیں اسے شہر سے پوری کمک اور مدد مل سکتی ہے۔ اگر ایک مارا جائے گا تو دو آ جائیں گے۔ ہماری ایک کی کمی بھی پوری نہ ہو سکے گی۔"

کمن تھا سالے بہنوئی میں تو تو میں میں بڑھ جاتی کہ عقلمند الجائی نے دخل دیا۔ مسکرا کے بولی۔ "دونوں بیکار جھگڑ رہے ہیں۔ مجھے تو کچھ اور ہی خطرہ ہے۔"

"تجھے کیا خطرہ ہے بہن؟" امیر حسین جھلا کے بولا۔

"مجھے..... مجھے دلشاد آغا کا خطرہ ہے۔" الجائی ہنسنے لگی.....

دلشاد کے نام پر امیر حسین کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے پوچھا۔ "دلشاد کا کیا خطرہ ہے بہن؟"

"امیر حسین!" الجائی اسی طرح مسکراتے ہوئے بولی۔ "دلشاد اتنی خوب صورت ہے۔ دیکھا نہیں سردار تنکل آتا ہے تو اس کی نظریں دلشاد ہی کو تلاش کرتی رہتی ہیں۔"

یہ خطرہ ان چاروں کے دل میں پوشیدہ تھا اور اب پہلی بار الجائی خاتون کی زبان پر آیا تھا اس کا اثر سب پر ہوا۔ دلشاد نے "توُ الجائی باجی" کہہ کر شرم سے سر جھکا لیا اور تیمور اور امیر حسین گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

"ٹھیک ہے۔ صبح ہم تنکل سے کہہ دیں گے کہ ہم جا رہے ہیں۔" امیر حسین فکرمند لہجے میں بولا۔

"کل کیوں۔ ابھی کیوں نہیں؟" تیمور نے زور دے کر کہا۔

"بس کل۔ کہہ تو دیا میں نے۔" امیر حسین بڑے ناگوار انداز میں بولا۔

تیمور نے مصلحتاً خاموشی اختیار کر لی۔ وہ امیر حسین کی ضدی طبیعت سے واقف تھا۔ اس سے بحث کرنا بیکار تھی۔

صبح کو ان کی مشکل خود ہی آسان ہو گئی۔ انہیں تنکل سے کہنے کی کوئی ضرورت نہ پڑی۔ سردار تنکل بڑا خوش بخت آیا اور بولا۔ "آج آپ لوگوں کی آخری ضیافت ہے۔ شام، میرے پندرھویں بیٹے کی سالگرہ ہے۔ سالگرہ کے کھانے کے بعد آپ لوگ جب چاہیں جا سکتے ہیں۔"

"ہم آج رات ہی روانہ ہو جائیں گے۔" امیر حسین نے فوراً اپنی بے صبری ظاہر کر دی۔

"والی کابل!" سردار تنکل بڑے خوشگوار لہجے میں بولا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں والی کابل اور ٹھہر سبز کے امیر کی شایانِ شان خاطر مدارت نہ کر سکا لیکن میں ان کے منصوبے میں حائل نہیں ہونا چاہتا شام تک آپ لوگوں کے لیے کھانے پینے اور جانوروں کے لیے خشک چارہ اور ضرورت کے مطابق سامان پہنچا دیا جائے گا۔ سالگرہ کی تقریب کے بعد میں خود آپ کو رخصت کرنے آؤں گا۔"

سردار تنکل تھوڑی دیر بعد ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اسی طرح خوش خوش واپس ہو گیا جس طرح آیا تھا۔ آج اس نے زیادہ دیر بیٹھنے کی کوشش بھی نہ کی۔ زیادہ تعجب کی بات یہ تھی کہ آج اس کی نظروں نے دلشاد کو تلاش کرنے کی بھی کوشش نہ کی۔ امیر حسین اور تیمور کو اس نے بڑا اطمینان حاصل ہوا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہم نے سردار تنگل کے متعلق غلط اندازہ لگایا۔" امیر حسین نے اپنی رائے ظاہر کی۔

"شاید۔" تیمور مختصر جواب دے کر خاموش ہو رہا۔

"اگر اس کی نیت میں فتور ہوتا تو وہ ہمیں کسی نہ کسی بہانے روکنے کی ضرور کوشش کرتا۔" امیر حسین نے خواہ مخواہ بات بڑھانے کی کوشش کی لیکن تیمور خاموش رہا۔ وہ ایسی فضول باتوں کا عادی نہ تھا

○

خیمہ کے اندر دن بھر سردار تنگل نے پندرہ بیس بیٹے کی سالگرہ کی تیاریاں ہوتی رہیں۔ سردار نے اس خوشی میں پورے شہر کی دعوت کی تھی۔ اس کا حکم تھا کہ آج کسی کے گھر میں چولھا نہیں جلے گا۔ دوپہر اور رات کا کھانا سردار کی طرف سے ہر ایک کو بھیجا جائے گا۔ تیمور ذخیرہ کے لیے دوپہر کو جو کھانا بھیجا گیا وہ معمول سے کہیں بہتر تھا۔ سردار تنگل اپنے مہمانوں کی روزانہ دعوت کرتا تھا اور انواع و اقسام کے کھانے پکوا کے بھیجتا تھا لیکن آج کا کھانا تمام دنوں سے عمدہ تھا۔ شام ہوتے ہوتے سردار تنگل نے تیمور کے ساتھ لے جانے کے لیے ٹٹو اور خچر پر چٹایا ہوا گوشت بھیجا تاکہ اسے خورجیوں میں بھر لیا جائے۔ گھوڑوں کے لیے خشک چارہ اور پانی سے بھرے ہوئے مشکیزے بھی بھیجے گئے۔ امیر حسین اس مہمان نوازی سے بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

اندھیرا ہونے سے کچھ دیر پہلے شہر سے سردار تنگل کی چاروں بیگمات مع درجن بھر کنیزوں اور سردار کی داشتاؤں کے مہمانوں کے خیمے پر آئیں۔ سردار تنگل کی بڑی بیگم نے بڑے ادب سے تیمور سے درخواست کی کہ ننھے جہانگیر کو الجائی خاتون کے ساتھ سالگرہ میں شریک ہونے کے لیے بھیجا جائے کیونکہ بچے کی تقریب تھی اور اس میں مہمان کے بچے کی شرکت ضروری تھی۔ تیمور کو فی الحال کسی خطرے کی بو نہ آئی۔ ایسے موقع پر اس کی چھٹی حس ہمیشہ چوکنے لگتی تھی وہ ابھی کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ امیر حسین بول پڑا "ضرور ضرور۔ سردار تنگل کا بیٹا ہمارا بیٹا ہے اس کی تقریب میں ننھا جہانگیر ضرور شریک ہوگا۔ یہ موقع تو سال میں ہی آتا ہے۔" پھر اس نے دلشاد آغا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "دلشاد۔ تم بھی الجائی کے ساتھ جاؤ۔ ایک سے

ے ہوتے ہیں۔"

ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں۔" تیمور دیر لب بولا..... مگر موقعہ کی نزاکت کے تحت اسے اپنی ی بندی رکھنا پڑی۔ عورتیں تو ایسے موقعہ کی تلاش ہی میں رہتی ہیں اور اب تو دلشاد کو امیر حسین ہی حکم دیا تھا۔ الجائی خاتون اور دلشاد جلدی جلدی تیار ہوئیں اور خیمہ کی عورتوں کے ساتھ ی اترتی چل پڑیں۔ جب وہ شہر کے دروازے میں داخل ہو رہی تھیں تو تیمور کا دل نہ جانے کیوں ر سے دھڑک رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی بوجھ تلے دبتا چلا جا رہا ہے۔

الجائی اور دلشاد خیمہ شہر میں پہنچیں تو وہاں عورتوں کا بڑا ہجوم تھا۔ فصیل کے ساتھ سپاہیوں رہنے کے لیے کوٹھڑیاں بنی تھیں۔ تھوڑی دور آگے بڑھ کے شہر کا بازار تھا۔ اس کے گرد کچے پکے ی مکانات تھے۔ بازار اور گلیوں میں سینکڑوں مسلح سپاہی اور سوار گھومتے ہوئے دکھائی دیے۔ بند تھا لیکن جگہ جگہ روشنی کا انتظام تھا۔ یہ روشنی تقریب کے سلسلے میں کی گئی تھی۔ اس کے ے بڑے مکانات اور حویلیاں تھیں۔ پھر انہیں برابر چار حویلیاں دکھائی دیں۔ یہ چاروں حویلیاں روشن تھیں۔ ایک حویلی کو توخب آراستہ کیا گیا تھا۔ ایک ترکمان عورت نے بتایا کہ اسی حویلی قوب کا اہتمام کیا گیا ہے اور یہ چار حویلیاں سردار تنگل کی چار بیگمات کی ہیں۔

تقریب والی حویلی میں عورتوں اور بچوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ راستہ نہ ملتا تھا۔ اس حویلی کے نے پر تو کچھ سوار رکھائی دیے لیکن اندر کوئی مرد نہ تھا۔ تمام انتظامات عورتوں کے ہاتھوں تھا۔ ان مسلمان ہو چکے تھے لیکن ان کی رسموں میں ابھی تک قدیم وحشیانہ رنگ موجود تھا۔ بچے کو سجا ایک اونچی جگہ کھڑا کیا گیا۔ پھر چھ بھیڑیں اور چھ گھوڑیاں لائی گئیں۔ گھوڑوں کے چاروں پیروں رسیاں باندھ کر ان کی پیٹھ کی اوپر سے رسیاں گزار دی گئیں تھیں بچے کے ہاتھ میں ایک لا دے دی گئی اور اس کے سامنے سے ایک ایک کر کے بھیڑیں اور گھوڑیاں گزاری گئیں ں کی ماں کی ہدایت پر ہر جانور کے سر کو چھری سے چھوتا۔ یہ اس کی چھٹی سالگرہ تھی اس لیے چھ بھیڑوں گھوڑوں کا اہتمام تھا۔

جب یہ جانور بچے کی چھری کے نیچے سے گزر گئے تو ان کی قربانی دی گئی۔ جانوروں کو ذبح نے والے وہی تھے۔ الجائی اور دلشاد کو یہ تو سمجھ ترکمان عورتیں بڑی بھیانک معلوم ہوئیں بھیڑوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو آسانی سے ذبح کر لیا گیا لیکن گھوڑوں میں سے کئی ایک کی رسیاں کھل گئیں یا ٹوٹ گئیں۔ لیکن ان مرد نما عورتوں نے جلد ہی انہیں گرا کر ذبح کر ڈالا۔ قربانی کے دوران بچے خوشی سے تالیاں بجا رہے اور حویلی کے دروازے پر ڈھول تاشے بجتے رہے۔ ننھا جہانگیر الجائی کی گود میں تھا اس کے لیے یہ رسم اجنبی تھی لیکن بھیڑوں اور گھوڑیوں کے ذبح ہوتے وقت جب خون کی پچکاریاں اچھلیں تو اس نے خوش ہو کر خوب خوب تالیاں بجائیں۔

الجائی خاتون کے یہاں تک آتے آتے ہی چراغ جل گئے تھے۔ اب اس تقریب کے اختتام میں کافی وقت لگ گیا۔ کھانا ابھی باقی تھا۔ الجائی نے سردار تکل کی بیگم سے اجازت مانگی وہ خیمے پر پہنچ کر وہیں کھانا کھائیں گی لیکن عورتوں نے ان دونوں کو کھانے تک روکے رکھا۔ پھر کھانے کا دور شروع ہوا۔ یہ انتظام نہیں بد انتظامی تھی بھنے گوشت اور میلیٹی روٹیوں کے تھال آتے رہے اور بڑھ بڑھ کے اس میں سے حسب مرضی کھاتا لیتی رہیں۔ نہ تو دسترخوان بچھا اور نہ رکابیاں لگا رکھے گئے۔ جن خواتین کے ساتھ بچے نہ تھے انہوں نے چھیڑے مار مار کر کھانا حاصل کیا کیونکہ کی گود میں بچے تھے انہیں بڑی دقت پیش آئی۔ ان کے لیے تھال زمین پر رکھ دیے گئے اور نے اس کے گرد بیٹھ کر کھانا شروع کر دیا۔ الجائی نے اس بد انتظامی کو بڑی نفرت سے دیکھا۔ کو تو وحشت ہونے لگی اس کا تو وہاں سے بھاگ نکلنے کو دل چاہ رہا تھا۔

بہ ہزار دقت کھانا ختم ہوا اور عورتیں ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگیں۔ الجائی خاتون نے پھر بڑی بیگم سے اجازت طلب کی۔ وہ مسکرا کے بولی "راہ بیگم امیر تیمور۔ کیا تم تنہا جاؤ گی؟ تمہیں رخصت کرنے کے لیے شہر کے دروازے تک چلیں گے۔"

الجائی اس بے ہنگم ہجوم سے پریشان ہو گئی تھی۔ جہانگیر الگ منہ بنا رہا تھا۔ اس نے کہا "آپ کا بہت بہت شکریہ سردار بیگم۔ آپ ہمیں دو گھوڑے منگوا دیں اور یہیں سے رخصت کر دیں۔ نہیں، خاتون آغا تکل کی بیگم کو جیسے الجائی کا نام یاد آ گیا۔ "یہ تو مہمان نوازی کے سراسر خلاف ہے۔ پھر آپ کے ساتھ کابل کے بادشاہ کی ملکہ بھی ہیں۔ وہ کیا سوچیں گی کہ ان کے ساتھ تم نے کیسا سلوک کیا۔" یہ کہتے ہوئے سردار بیگم نے دلشاد کو کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ دلشاد کو اس کا اس طرح دیکھنے کا انداز بڑا ناگوار گزرا۔ اسے ان نظروں میں حقارت اور نفرت کی جھلک

دکھائی دی۔

اس عرصے میں سردار تکل کی باقی بیگمات اور وہ تمام عورتیں اکٹھا ہو گئیں جو الجائی خاتون اور کو لے کر آئی تھیں اور ایک بار پھر یہ اس جلوس کی صورت میں شہر کے دروازے کی طرف چلیں طرح یہاں تک آئی تھیں۔ راستے میں جگہ جگہ چراغ جل رہے تھے کہیں روشنی زیادہ تھی اور کہیں نہ نے کے برابر۔ ایسی تاریک جگہوں سے گزرتے ہوئے دلشاد کو یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے آس پاس سے لوگ موجود ہیں۔ اس کی کمر میں صرف چھوٹا خنجر لٹک رہا تھا۔ آتے وقت وہ تلوار یا تیر کمان ساتھ اس لیے نہ لائی تھی کہ سالگرہ کی تقریب میں مسلح ہو کر جانا کچھ اچھا معلوم نہ ہوتا تھا۔

شہر کا دروازہ دور پرے دکھائی دے رہا تھا۔ دلشاد اور الجائی برابر چل رہی تھیں ان آگے پیچھے عورتیں ہی عورتیں تھیں۔ دروازے کے پاس کافی روشنی تھی اس لیے انہیں اطمینان گیا۔ شہر کا بڑا دروازہ بند تھا لیکن اس کے بیچ میں لگا ہوا چھوٹا دروازہ کھلا تھا۔ آگے چلنے والی رتیں ایک ایک کر کے باہر نکلنے لگیں۔ الجائی اور دلشاد دروازے سے صرف چند قدم پیچھے تھیں ایک دم اندھیرا ہو گیا۔ گھپ اندھیرا۔ اسی وقت دلشاد کی آواز آئی "بڑا جی!" الجائی نے بھی واب میں "دلشاد" کہا لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا۔

یہ حادثہ ایک لمحے میں گزر گیا۔ پھر ہر طرف روشنی پھیل گئی۔ الجائی خاتون نے گھبرا کر چاروں اف نظر دوڑائی۔ دلشاد اسے کہیں نظر نہ آئی۔ چھوٹا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اسی وقت باہر سے کسی عورت نے کہا "دلشاد یہاں ہے باہر آ جاؤ۔" الجائی جہانگیر کو سنبھالتی ہوئی تیزی سے باہر نکل آئی۔ الجائی کے باہر نکلتے ہی باہر کی عورتیں بھرا مار کے الجائی کو دھکیلتی دروازے کے اندر داخل ہو گئیں اور دروازہ بند ہو گیا۔

"دھوکہ"۔ الجائی کے ہونٹ لرزے اور پھر اس نے زور سے چیخ ماری۔ اس کی چیخ کے جواب میں دروازے کے اوپر کی برجیوں میں سے کئی قمقمے ایک ساتھ بلند ہوئے۔ الجائی گھبرا گئی اور چیختی ہوئی خیموں کی طرف بھاگنے لگی۔

تیمور اور امیر حسین وغیرہ رات کی ضیافت سے فارغ ہو چکے تھے۔ سردار تکل ان کا کھانا لے کر خود ساتھ آیا تھا۔ کھانے کے دوران بھی وہ کچھ دیر بیٹھا ان سے ہنس ہنس کے باتیں کرتا رہا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور واپس جاتے وقت کہہ گیا کہ وہ اپنے شہر کے مہمانوں کو رخصت کر کے، ان لوگوں کو الوداع کہنے آئے گا۔ سردار ترکل اس وقت بڑے خوشگوار موڈ میں تھا وہ امیر حسین سے بڑی دل چسپ باتیں کرتا رہا۔ امیر حسین اس کی باتوں اور رویے سے بہت خوش ہوا۔

کھانے کے بعد تیمور نے سامان باندھنے کا حکم دیا۔ فالتو سامان خالی گھوڑوں پر بار کر دیا گیا۔ سواری کے گھوڑے بھی تیار کر لیے تھے کہ خواتین کے واپس آتے ہی وہ روانہ ہو جائیں گے ان کا ارادہ تھا کہ وہ رات بھر آہستہ آہستہ سفر کریں گے تاکہ صبح تک کسی ایسے مقام پر پہنچ جائیں جہاں وہ گھوڑوں کو کچھ دیر آرام دینے کے بعد پھر سفر کر سکیں۔ سردار ترکل نے ان کے ساتھ ایک راہبر بھیجنے کا بھی وعدہ کیا تھا تاکہ وہ راستہ نہ بھول جائیں۔

انہیں تیار ہوئے کافی وقت گزر گیا لیکن الجائی خاتون اور دلشاد آغا اب تک واپس نہ آئی تھیں۔ ان کے دل میں طرح طرح کے وسوسے اور خطرات جنم لینے لگے پھر انہوں نے فیصلہ کیا کہ اپنی بہادر کمر شہر بھیجا جائے تاکہ وہ فوراً دونوں عورتوں کو واپس لے آئے۔ ابھی وہ یہ فیصلہ کر ہی رہے تھے کہ ان کی نظر شہر کے بڑے دروازے پر پڑی۔ دروازے پر روشن قندیلیں ایک دم بجھ گئیں۔ تیمور اور امیر حسین اس غیر معمولی بات پر چونک اٹھے لیکن جلد ہی پھر روشنی ہو گئی اور انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ان کی خیمہ گاہ اور دروازے کا درمیانی فاصلہ مشکل سے دو سو گز تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ کچھ عورتیں صدر دروازے سے باہر آ رہی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی الجائی کی چیخ رات کے سکوت کو توڑتی ہوئی ان کے کانوں تک پہنچی۔ الجائی کی پہلی چیخ پر انہوں نے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا۔ پھر اسی وقت دوسری چیخ بلند ہوئی اور پھر چیخوں کے ساتھ کوئی عورت ان کی طرف بھاگتی ہوئی دکھائی دی۔ تیمور نے الجائی خاتون کی آواز پہچان لی اور تیزی سے دوڑا۔ امیر حسین بھی اس کے ساتھ بھاگنے لگا۔

الجائی خاتون چیختی چلاتی آ رہی تھی اس کی گود میں جہانگیر تھا لیکن وہ پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ تیمور نے بھاگتے ہوئے چیخ کر کہا۔ "الجائی گھبرا نہیں میں آ رہا ہوں۔"

"دھوکہ میرے سرتاج دھوکہ۔" الجائی نے ان کے پاس پہنچ کر ہانپتے ہوئے کہا۔

جہاں پر یہ لوگ ملے تھے وہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ قلعے کی روشنی وہاں تک نہ پہنچ رہی تھی۔ امیر حسین نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھا اور چیخ کر بولا۔ "دلشاد کہاں ہے الجائی؟"

"دھوکہ امیر حسین۔ زبردست دھوکہ۔" الجائی نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "ان لوگوں نے دلشاد کو چرا لیا ہے اور مجھے دھوکے سے باہر نکال کر دروازہ بند کر لیا ہے۔"

"میں خون کی ندیاں بہا دوں گا۔" امیر حسین پاگلوں کی طرح چیخا اور پھر تیزی سے خیمے کی طرف چلا۔

تیمور ایک لمحے میں سارا معاملہ سمجھ گیا۔ سالگرہ کا بہانہ۔ یہ پُرتکلف دعوت، جہانگیر کو اندر بلانا۔ تمام کڑیاں اس کے ذہن میں جڑتی چلی گئیں۔ اس نے جہانگیر کو الجائی کی گود سے لے لیا اور تیز واپس ہوا..... خیمے کے پاس پہنچا تو خیموں سے آنے والی مدھم روشنی میں اس نے امیر حسین کو گھوڑے پر سوار ہوتے دیکھا۔ وہ جہانگیر کو زمین پر اتار کر امیر حسین کی طرف دوڑا۔ امیر حسین پورا اسلحہ جسم پر گھوڑے پر سوار ہوا تھا۔ وہ ایڑ دینا چاہتا تھا کہ تیمور نے قریب پہنچ کر گھوڑے کی لگام مضبوطی سے

"امیر حسین ہوش میں آؤ۔" کہتے ہوئے تیمور نے ایک ہاتھ سے امیر حسین کی پیٹی پکڑ کر پوری طاقت سے کھینچی..... امیر حسین بھی طاقتور جوان تھا لیکن اس وقت بدحواس تھا اس لیے توازن قائم نہ رکھ سکا اس کے پیر رکابوں سے نکل گئے۔ امیر حسین گھوڑے سے لڑھکا تو تیمور نے باگ چھوڑ کر اپنے بازوؤں میں اسے جکڑ لیا۔

"میں تمہیں نہیں جانے دوں گا امیر حسین۔" تیمور نے اس پر اپنی گرفت اور مضبوط کر لی۔

امیر حسین نے بچنے کے لیے زور کرنے کے اپنا جسم بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا اور اس طرح ہانپنے لگا جیسے پہلوانی کے داؤ کھانے کے بعد ہانپتا ہے۔ "مجھے جانے دو تیمور۔" امیر حسین نے بچوں کی طرح مچلتے ہوئے کہا۔ "فصیل سے سر ٹکرا کر مر جاؤں گا۔ میری دنیا اجڑ گئی تیمور۔" اور امیر حسین جیسا عالی ہمت انسان رویا۔

الجائی خاتون جہانگیر کو لیے ان کے پاس پہنچ گئی تھی۔ تیمور نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ امیر حسین گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا لیکن وہ بالکل بے جان ہو رہا تھا اور پھٹی پھٹی نظروں سے فصیل کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"دلشاد کو واپس لے آؤں گا تیمور۔" امیر حسین کی آواز میں بڑا اضمحلال تھا۔ "کوئی تدبیر کرو دلشاد کو واپس لے آؤں۔"

تیمور نے فصیل پر نظر ڈالی۔ فصیل پر جگہ جگہ آگ روشن کر دی گئی تھی جو اس بات کی علامت تھی کہ قلعہ والے نیا رہیں۔ تیمور نے ہاتھ پکڑ کر امیر حسین کو اٹھایا۔ "امیر حسین اگر تم ہوش و حواس درست

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رکھو تو کوئی نہ کوئی تدبیر نکل آئے گی اس طرح دل چھوڑنے اور غلط قدم اٹھانے سے کچھ حاصل نہ ہو
ہمیں یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ ہمارے غلط قدم اٹھانے سے دلشاد کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

تیمور اُسے تسلی دیتا ہوا اپنے خیمے میں لے آیا۔ تیمور اور امیر حسین کے تمام سوار پریشانی کے عالم
کھڑے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے لیکن امیر کے خیمے میں جانے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ خیمے
پہنچ کر تیمور نے الجائی کو بھاری زرہ لانے کو کہا۔ تیمور ہلکی زرہ پہن کر سفر کرتا تھا بھاری زرہ وہ صرف
خاص خاص موقعوں پر پہنا کرتا تھا۔ تمام سامان گھوڑوں پر لادا جا چکا تھا الجائی نے باہر نکل کر اپنی بہادر
بلایا اور اس کی مدد سے سامان اتار کر تیمور کی زرہ نکالی۔ وہ زرہ لے کر آئی تو اس نے دیکھا کہ امیر حسین
کی نظریں خیمے کی چھت پر لگی ہیں اور تیمور بڑی بے چینی کے عالم میں خیمے میں ٹہل رہا تھا۔

الجائی خاتون نے زرہ پہننے میں تیمور کی مدد کی۔ تیمور نے ہلکی زرہ کے اوپر بھاری زرہ پہن لی
ہلکے خود کی بجائے بھاری خود سر پر رکھا جس میں گلوبند کے طور پر آہنی جھالر لٹکی ہوئی تھی۔ دائیں بازو
جوشن چڑھایا۔ بائیں پر ڈھال چڑھائی۔ تیار ہو کر وہ باہر نکلنے لگا تو امیر حسین کو جیسے ہوش آگیا۔ وہ دوڑ
تیمور کے پاس آیا۔

"کہاں جا رہے ہو تیمور؟" امیر حسین نے گھبرا کے پوچھا۔

"میں فصیل کے قریب جا رہا ہوں۔"

"کیوں؟ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

"تم نہیں جاؤ گے امیر حسین۔" تیمور نے امیر حسین کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "میں جنگ کرنے
جا رہا ہوں بلکہ یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ خیوہ والے جنگ کے لیے کس حد تک تیار ہیں۔ تم تمام سواروں کے
ساتھ رہنا اگر خیوہ والے دروازہ کھول کے مجھ پر حملہ کرنے آئیں تو تم بھی بڑھ کے آجانا۔"

امیر حسین کچھ نہ سمجھ سکا۔ تیمور کی حکمت عملی اُس کی سمجھ سے باہر تھی۔ تیمور نے باہر نکل کر اپنی بہادر
بلایا اور حکم دیا کہ کسی درخت کی بھاری شاخ کاٹ کر لائی جائے۔ اپنی بہادر فوراً بھاگ کے ایک بڑی
شاخ کاٹ لایا۔ تیمور نے شاخ کو رسّی کے ساتھ اپنی زین سے باندھ دیا۔ پھر اس نے جہانگیر کو پیار کیا
الجائی خاتون کو اُس مخصوص نظر سے دیکھا جس نظر سے وہ جنگ پر جاتے ہوئے اُسے دیکھا کرتا تھا۔

"خدا تمہارا حافظ و ناصر ہے..... سرتاج"..... الجائی نے جہانگیر کو سینے سے بھینچ لیا۔

تیمور سوار ہونے لگا تو امیر حسین بولا۔ "تیمور! تم میری دلشاد کے لیے موت کے منہ میں جا رہے
نہیں کچھ ہو گیا تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔"

"اگر تم نے فصیل سے سر ٹکرا کر جان دے دی تو میں الجائی کے سامنے ہمیشہ شرمندہ رہوں گا۔"
گھوڑے پر بیٹھ گیا اور اُسے ایڑ لگائی۔

درخت کی شاخ زمین پر گھسٹ رہی تھی جس سے گرد اڑنا شروع ہو گئی۔ پہلے تو گرد نظر نہ آئی لیکن
تیمور فصیل سے سو گز کے قریب پہنچا اور قلعے سے آنے والی روشنی اس پر پڑی تو گرد کا ایک طوفان سا
اٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ تیمور نے اپنے گھوڑے کو قلعے کے سامنے دائیں سے بائیں دوڑانا شروع کر دیا۔ گرد
وجہ سے تیمور نظر نہ آرہا تھا بس ایک بگولا سا دکھائی دیتا تھا جو دائیں بائیں تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔ اس
نے قلعے سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی۔ کئی تیر تیمور کی خود اور زرہ سے ٹکرائے لیکن دہری زرہ
وجہ سے اُسے نقصان نہ پہنچا۔ تیمور کئی بار صدر دروازے کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ تیمور یہ چاہتا تھا کہ کسی
قلعے والے باہر نکل کر حملہ کریں۔ صرف اُسی صورت میں قلعے کے اندر داخل ہونے کی کوئی تدبیر ہو سکتی
لیکن قلعے والے رات کے وقت باہر آنے کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نظر نہ آتے تھے۔ تیمور نے ایک
فصیل کے بالکل قریب پہنچ کر اپنی کمان سے کئی تیر اوپر پھینکے لیکن خیوہ والوں کو دروازہ کھولنے کی
بھی جرأت نہ ہوئی۔

نصف گھنٹے تک تیمور گرد اڑاتا اور گھوڑا دوڑاتا رہا۔ خیوہ والوں کے تیر تیمور کو نشانہ بنانے میں
مایوس ہو گئے۔ جب دروازہ کسی طرح نہ کھلا تو تیمور واپس آگیا۔ "خیوہ والے رات کے وقت باہر نکل کر
حملہ نہیں کریں گے۔" تیمور نے گھوڑے سے اترتے ہوئے امیر حسین کو بتایا۔

"پھر ہم صبح تک انتظار کریں گے۔" امیر حسین بولا۔

"نہیں امیر حسین۔" تیمور نے نرمی سے کہا۔ "دن کے وقت اور کھلے میدان میں ہم اُن کا مقابلہ
نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاس صرف ساٹھ سوار ہیں۔ وہ ہمارے مقابلے پر چھ سو سوار لا سکتے ہیں۔ ان
سے لڑنا خودکشی ہو گی۔"

"پھر ہم کیا کریں تیمور؟" امیر حسین بیزاری سے بولا۔

"صبح ہونے سے پہلے ہمیں خیوہ سے کم از کم ایک منزل دور نکل جانا چاہیے۔" تیمور نے اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

منصوبے کا اعلان کیا۔ یہ منصوبہ وہ گھوڑا دوڑانے کے دوران ہی بنا چکا تھا۔ "فجر کو تڑکے پوری تیاری کے ساتھ خیوہ سے نکلے گا اور چاروں طرف ہماری تلاش کرے گا۔ وہ ہماری تلاش میں قلعے سے زیادہ دور جائے گا۔ وہ رات پڑنے سے پہلے قلعے میں واپس چلا جائے گا۔"

"لیکن تیمور!" امیر حسین الجھتے ہوئے بولا۔ "اس طرح تو ہم دشت سے اور دور ہو جائیں گے۔ اس سے ہمیں کیا حاصل ہوگا؟"

"اس کا جواب فی الحال میرے پاس موجود نہیں۔ منزل پر پہنچ کر کچھ سوچا جائے گا۔" تیمور نے خفگی بھرے لہجے میں کہا اور فوراً کوچ کا حکم دیا۔ تیمور نے یہ بھی حکم دیا کہ خالی خیموں میں آگ لگا دی جائے۔ یہ خیمہ والوں نے انہیں بھیجے تھے۔

تیمور جب وہاں سے مغرب کی طرف چلا تو اس کی پشت پر خیمے جل رہے تھے اور دور پرے خوارزم کی فصیل پر بھی آگ روشن تھی۔ خیوہ والوں کو یقین ہو گیا کہ تیمور اور امیر حسین مایوس ہو کر آگے بڑھ گئے ہیں۔ یہ لوگ تیزی سے سفر کرتے ہوئے اندازے کے مطابق ایک منزل دور نکل آئے۔ یہاں پہاڑی سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ان لوگوں نے ایک پہاڑی پر پڑاؤ ڈالا اور پہرے کا انتظام کر کے آرام کرنے لگے۔ تیمور کو ڈر تھا کہ امیر حسین کوئی حرکت نہ کر بیٹھے اس لیے اس نے امیر حسین کو اپنے برابر لٹایا تھا۔ انہیں آرام کرتے ہوئی تھی کہ بیدار ہو گیا۔ تیمور نے دیکھا کہ امیر حسین اس سے کچھ دور بیٹھا ہے۔ اس کا منہ خیوہ کی طرف ہے اور وہ خلا میں گھورے جا رہا ہے۔

"امیر حسین تم بہادر اور عالی ہمت جوان ہو۔" تیمور اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ "اپنے ساتھیوں کو موقع نہ دو کہ ہمیں دیکھ کر مسکرائیں۔"

"تیمور میں کیا کروں؟ کیا کروں؟" امیر حسین کے منہ سے ایک آہ سی نکل گئی۔

"تحمل سے کام لو۔ مجنوں کی طرح خود کو ناکارہ نہ بناؤ۔" تیمور نے بڑی محبت سے سمجھایا۔ "اب ہم خطرے سے باہر ہیں۔ کوئی صورت نکل آئے گی۔" اس وقت تیمور کی نظر ایلچی بہادر پر پڑی جو دور نماز جھکائے بیٹھا تھا۔ تیمور نے اسے پاس بلا کے کہا۔ "ایلچی بہادر! تم خیوہ جاؤ گے۔ دشت کی خیریت ہمیں فوراً درکار ہے۔"

ایلچی بہادر نے سر جھکا دیا۔ "سردار! کاش میرا خون، میری کھال اور ہڈیاں آپ کے کام آ سکیں۔"

"وقت سے پہلے کچھ نہیں ہو سکتا ایلچی بہادر۔" تیمور نے مغرب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مولانا زین الدین نے کہا ہے کہ اللہ کے حکم کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ راستے کی مشکلات، منزل کو قریب تر کر دیتی ہیں۔" پلٹ کر بولا۔ "دیکھو ایلچی..... خود کو ضائع نہ کرنا۔ جاؤ خدا تمہیں خیریت سے واپس لائے۔"

ایلچی بہادر عجیب و غریب شخصیت کا مالک تھا۔ اس کا اصلی نام کیا تھا؟ اس کا علم کسی کو نہ تھا۔ قبیلے یا کہاں کا رہنے والا تھا۔ اس کا بھی کہیں ذکر نہیں ملتا۔ لیکن امیر تیمور کے کارناموں میں اُسے ل حاصل ہے اور تاریخ نے اس کے ایسے ایسے کارناموں کو بیان کیا ہے کہ جنہیں پڑھ کر تعجب ے۔ تیمور سے اس کی وفاداری اور عقیدت کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی زخم آ جاتا تو فوراً کہتا کہ یہ تیمور لنگی کی وجہ سے ہوا ہے۔ کہیں فتح حاصل ہوتی تو اسے تیمور کی بلند اقبالی سے تعبیر کرتا اور شکست کو نی کہتا۔ تیمور کو ایلچی بہادر پر اس قدر اعتماد تھا کہ اہم مہم پر ایلچی بہادر کو رابطہ افسر مقرر کرتا۔ خفیہ احکامات اسی کے ذریعے بھیجتا۔ اس لیے اس کا نام ایلچی بہادر پڑ گیا تھا۔ بہادر اس لیے کہ امن کے زمانے میں تو وہ اپنی دلچسپ حرکتوں سے تیمور کے لیے سامانِ فرحت مہیا کرتا لیکن دورانِ کوہ گراں کی طرح میدان میں جم کر کھڑا ہو جاتا۔ زخم پر زخم کھاتا مگر اس کے قدم پیچھے نہ ہٹتے۔

ایلچی بہادر اپنے ساتھ بہت مختصر سامان رکھتا۔ اسلحے کے علاوہ اس کے پاس چمڑے کی ایک تھیلی تھی ں ایک طرے دار اونچی ٹوپی والا خود، جھلملاتا پٹی دار لباس اور کامدار جوتے ہوتے۔ جس وقت وہ پڑے، کامدار جوتے اور طرے دار خود پہن کر نکلتا تو ایک جوکر معلوم ہوتا۔ لوگ اسے دیکھ کر مسکراتے ا بڑی بے پروائی سے ادھر اُدھر گھومتا رہتا۔ اس ہیئت کذائی سے اس نے کئی معرکے بھی مارے اپنی کسی مہم پر روانہ ہوتے وقت نہ تو تیمور سے کوئی ہدایت حاصل کرتا اور نہ خود تیمور اُسے کوئی رہ دیتا۔ ایلچی بہادر خود اپنے طور پر مہم کے لیے لائحہ عمل تیار کرتا اور اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق پر عمل کرتا۔

تیمور کا حکم پا کر ایلچی بہادر نے اپنے چمڑے کے تھیلے کی تلاشی لی۔ رنگین کپڑے، جوتے اور نکالا اور ایک طرحدار تجوی کا روپ دھار کر خیوہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ تیز رفتاری سے سفر کرتا ام کر خیوہ کے دروازے پر پہنچا، رات شہر سے باہر ایک بستی میں گزاری اور صبح کو گھوڑے پر سوار ر آہستہ آہستہ شہر کے دروازے پر پہنچا۔ شہر پناہ کے بڑے دروازے کا چھوٹا دروازہ

کھلا تھا۔ اندر باہر مسلح سواروں اور پیادوں کا سخت پہرہ تھا اور ہر آنے جانے والے پر نگاہ رکھی جا رہی تھی۔ ایلچی بہادر کو فصیل پر بھی پہرہ نظر آیا۔ وہ یہ تمام انتظامات کن انکھیوں سے دیکھتا ہوا دروازے پر پہنچ کر رکا اور گھوڑے سے اترا۔ اس کا حلیہ کچھ ایسا مضحکہ خیز اور طرفہ تماشا تھا کہ لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ بعض اس کا مذاق اڑانے لگے کچھ آوازے کسنے لگے۔

دروازے پر کافی مجمع لگ گیا تو پہریداروں کا حاکم، لوگوں کو ہٹاتا باہر آگیا۔ دروازے کا حاکم بہت بھاری بھرکم آدمی تھا۔ ایلچی بہادر اسے پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اس نے حاکم کو پہچان لیا لیکن حاکم اس وقت قطع میں کیسے پہچانتا۔ اس نے بھاری آواز میں پوچھا۔ "تو کون ہے؟ کیوں مجمع لگایا ہے؟"

ایلچی بہادر زور سے ہنسا۔ "تو جتنا موٹا ہے تیری عقل بھی اتنی ہی موٹی ہے۔"

حاکم خشمگیں ہوا۔ "تو میرا مذاق اڑاتا ہے؟" حاکم بگڑ گیا۔ "میں تیری گردن مروڑ دوں گا۔"

ایلچی بہادر پھر ہنسا۔ "تو ایک نجومی اور رمال کی گردن مروڑے گا؟ تو تیرا سر دار تکل تیرا ہیڈ دے گا؟"

"تو تو رمال ہے! نجومی ہے؟ غیب کی باتیں بتاتا ہے؟" حاکم نے حیرت سے دیکھتے ہوئے سے پوچھا۔

"ہاں۔ میں بتا سکتا ہوں کہ تیرے پیٹ میں کتنی آنتیں ہیں تیرے منہ میں کتنے دانت ہیں۔" بہادر نے قہقہہ لگایا اور پھر ہنستے ہنستے دہرا ہو گیا۔

حاکم نے مجمعے کو ڈانٹ کے بھگا دیا۔ پھر خوشامد سے بولا۔ "نجومی جی۔ تم تو سب کچھ جانتے ہو مجھے بھی بتاؤ۔ میرا درجہ کب بڑھے گا؟"

ایلچی بہادر نے ادھر اُدھر دیکھا۔ مجمع تو چھٹ گیا تھا لیکن کچھ محافظ قریب کھڑے اُسے سے دیکھ رہے تھے۔ ایلچی بہادر بولا۔ "میں نے کہا تھا کہ تیری عقل بھی موٹی ہے۔ یہ باتیں سب سامنے بتائی جاتی ہیں۔"

حاکم شرمندہ ہو گیا۔ بولا۔ "میرے ساتھ اندر آجاؤ..... نجومی جی۔"

ایلچی بہادر اس کے پیچھے چھوٹے دروازے سے اندر آگیا۔ اندر پہنچتے ہی بولا۔ "گھوڑا باہر کھڑا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اس کی فکر نہ کر نجومی جی۔" حاکم نے ایک محافظ کو آواز دے کر گھوڑا اندر لانے کا حکم دیا۔ صدر دروازہ کیا اور ایلچی بہادر کا گھوڑا قلعے میں لے آیا گیا۔

"اب تو کچھ بتاؤ نجومی جی.....؟" حاکم نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔

"سب کچھ بتاؤں گا۔ کسی اکیلے کمرے میں چل کے بیٹھ۔" ایلچی بہادر نے اس کی بے صبری میں اور اضافہ دیا۔

حاکم اُسے لے کر سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپری منزل پر لے آیا۔ یہاں سے پورا شہر اور فصیل کا بیشتر حصہ ارا تھا۔ شہر کے اندر مسلح سوار نظر آ رہے تھے اور فصیل پر سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ ایلچی بہادر نے "کمرہ بند کر دے۔ جب تک میں تیرا کام کرتا رہوں کوئی اندر نہ آنے پائے۔"

حاکم نے باہر نکل کے کچھ ہدایات دیں پھر واپس آکر کمرہ اندر سے بند کر لیا۔ اور دوزانو ہو کے ایلچی بہادر کے سامنے بیٹھ گیا۔

"سیدھا ہاتھ سامنے لا۔" ایلچی نے حکم دیا اور پھر تھیلی سے ایک پوتھی نکال کر اس کے ورق دیکھنے لگا ایک صفحے پر رک کے اس نے کہا۔ "دیکھو جو میں پوچھوں سچ سچ جواب دینا ورنہ سب حساب گڑبڑ ہو جائے گا۔"

"سچ سچ بتاؤں گا نجومی جی۔" حاکم گھگیا کے بولا۔

..... ایلچی بہادر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کے ہاتھ کی لکیروں کو بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ کبھی پوتھا کبھی انگلیاں کھینچ کے دیکھتا۔ پھر کھلے ہوئے صفحے کو دیکھنے لگتا۔ "ہاں سب پوچھ..... کیا جاننا چاہتا ہے؟"

"میری ترقی کب ہو گی؟ دولت کب ہاتھ آئے گی؟ میں بہت غریب آدمی ہوں۔ تین بیویاں ہیں۔" حاکم اپنا شجرہ خود ہی بیان کرنے لگا۔ ایلچی سر جھکائے بیٹھا تھا لیکن اس کے کان حاکم کی باتوں پر لگے تھے۔

حاکم جتنا مرضی بولتا تو ایلچی بہادر بولا۔ "تیری عمر چالیس سال ہے نا؟"

"چالیس۔ ہاں اتنی ہی ہو گی۔" حاکم نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"ٹھیک ٹھیک بتا۔ حساب گڑبڑ نہ کر۔"

"ہاں جی بالکل چالیس سال ہے۔" حاکم نے فوراً تائید کر دی۔

"تیری چار شادیاں ہوں گی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تین تو ہو چکی ہیں۔ چوتھی بھی کرنا چاہتا ہوں لیکن آمدنی کم ہے۔"

"چوتھی کرنا پڑے گی۔ اس کا تعلق تیری قسمت سے ہے۔"

"لیکن میری قسمت میں کیا ہے؟ کب پلٹے گی قسمت؟" حاکم نے اُلجھتے ہوئے پوچھا۔

"تیرے نام کا پہلا اور آخری حرف کیا ہے؟" ایلچی بہادر نے جیسے سنی ان سنی کر دی۔

"میں نہیں جانتا جی۔ میرا نام ترگل ہے۔ تم خود دیکھ لو۔" حاکم نے اپنے ان پڑھ ہونے کا اظہار کر دیا۔

ایلچی بہادر سمجھ گیا کہ حاکم نرا جاہل ہے۔ اب اس کا دماغ اور تیزی سے کام کرنے لگا۔ پھر وہ چونک کر بولا۔ "تو نے ایک قتل کیا ہے؟"

"نہیں جی۔ میں نے کوئی قتل نہیں کیا۔" ترگل نے فوراً انکار کر دیا۔

ایلچی بہادر ذرا بھی پریشان نہ ہوا اور فوراً کہا۔ "جبھی تیری قسمت اب تک نہیں پلٹی۔"

"جی میں مطلب نہیں سمجھا، کیا کسی کو قتل کرنے کے بعد میری تقدیر بدلے گی؟" ترگل نے گھبرائے ہوئے پوچھا۔

"تو کیسا ترکمان ہے۔ آج تک ایک آدمی بھی نہیں مارا۔ اچھا ٹھہر میں پھر دیکھتا ہوں۔" ایلچی بہادر اپنی پوتھی کے اوراق پھر اُلٹنے لگا۔ ایک جگہ رک کر پوچھا۔ "کیا نام بتایا تو نے؟"

"ترگل۔ میں بتا چکا ہوں۔"

"ترگل۔" ایلچی بہادر نے یہ نام زیر لب دہرایا۔ پھر صفحے پر انگلیاں پھیرنے لگا۔ وہ بار بار ترگل کہہ کر انگلیاں پھیرتا پھر ایک دم زور سے چیخا۔ "ترگل سردار۔ ترگل حاکم۔" ترکمانوں کا سردار ترگل۔ قابل احترام ترگل۔" اور ایلچی بہادر نے بڑی حیرت سے ترگل کے چہرے کا جائزہ لیا۔

ترگل کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ "کیا مطلب ہے اس کا نجومی جی؟" اس نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

"مطلب۔" ایلچی بہادر جلدی سے اٹھا اور ترگل کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ "سردار ترگل جاگو ترگل، میں آپ کو اور آپ کی اولاد کو مبارک باد دیتا ہوں اور تعظیم پیش کرتا ہوں۔"

ترگل اس کا منہ تکنے لگا۔ "نجومی جی۔ میں تو ایک معمولی سردار ہوں۔ محافظ دستے کا سردار۔ خیوہ کا حاکم تو سردار ترگل ہیں۔ آپ کو دھوکہ ہوا ہے۔"

"قابل احترام ترگل۔" ایلچی بہادر نے سر جھکاتے ہوئے ادب سے کہا۔ "اے حاکم خیوہ میرا علم

ہو سکتا۔ ترگل اور ترگل کی آوازیں یکساں ہیں۔ دونوں ناموں کے شروع میں ت اور آخر میں ل ہے میرا
تا ہے کہ ترگل کے بعد ترگل کو خیوہ کا حاکم اور ترکمانوں کا سردار ہونا ہے۔"

"لیکن نجومی جی یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" ترگل بوکھلا گیا۔ "تم نے کہا کہ میں نے ایک قتل کیا ہے۔ یہ
ہے، تم نے مجھے اور میری اولاد کو مبارک باد دی۔ جب کہ میری تینوں بیویوں سے اب تک کوئی اولاد
ہوئی۔ پھر ترگل کی زندگی میں میں حاکم خیوہ کیسے بن سکتا ہوں مجھے یہ سب خواب سا معلوم ہوتا ہے۔"

"معزز حاکم خیوہ۔" ایلچی بہادر نے اسی لجاجت اور ادب سے کہا۔ "آپ علم پر شبہ نہ کریں۔ آپ
یکہ آپ کے کوئی اولاد نہیں۔ میں نے آپ کی چوتھی شادی کی پیش گوئی کی ہے۔ ممکن ہے اس کی اولاد
کی اولاد ہو۔ جہاں تک ایک آدمی کے قتل کا معاملہ ہے۔ اس کا اظہار کرتے ہوئے مجھے خوف
آتا ہے۔"

"نہیں نہیں۔ خوف کی کوئی ضرورت نہیں۔" مجھے بتاؤ۔ میں کسے قتل کروں گا اور خیوہ کا حاکم کیسے
ہوں گا؟" ترگل اُسے جھٹلانے کے باوجود پھر فریب کھا گیا۔ حاکم خیوہ کا خواب اتنا دلفریب تھا کہ وہ ایلچی
کی مدد حاصل کرنے پر مجبور ہو گیا۔

ایلچی بہادر نے ڈرتے ڈرتے بند دروازے کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ "اے حاکم خیوہ۔
قتل کی اطلاع مجھے میرے علم نے دی ہے، ممکن ہے وہ ترگل کا قتل ہو کیونکہ آپ قتل کے بعد ہی حاکم
بنیں گے۔"

ترگل اپنے حاکم کا نام سن کر پہلے تو کانپ اٹھا لیکن حاکم ہونے کا نشہ جیسے اُس پر ابھی سے سوار ہو
گیا وہ سنبھل کے بولا۔

"نجومی جی۔ اگر تمہاری بات سچ نکلی تو میں تمہارا منہ جواہرات سے بھر دوں گا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ میں
کب قتل کروں گا؟"

"اے ترکمانوں کے سردار۔" ایلچی نے چہرے پر افسردگی طاری کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے افسوس
ہے میں نہیں بتا سکتا کہ ترگل کب قتل ہو گا۔ اس کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ میں سردار ترگل کا ہاتھ
دیکھ کر اس کا زائچہ بناؤں۔ اگر مجھے سردار ترگل کا ہاتھ دیکھنے کا موقع مل گیا تو میں آپ کو شاید دن
تک بتا دوں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ترنگل سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا "سردار تنکل کے پاس میں تمہیں لے جا سکتا ہوں۔"

"اے محترم سردار! آپ کی خاطر مجھے تنکل کے پاس جانے میں کوئی عذر نہیں لیکن کہیں ایسا ہم پر شبہ نہ ہو جائے اور ہم دونوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑیں۔ آپ ایسے ہاتھ دکھانے پر کیا کریں گے؟"

"بخوبی جی یہ کوئی مشکل بات نہیں۔" ترنگل نے قدرے اکڑ کر کہا۔ "میں سردار تنکل کے پاس جا کر آپ کی تعریفیں کروں گا۔ تقدیر کا حال کون نہیں جاننا چاہتا۔ وہ ضرور آپ کو بلوائے گا۔"

"معزز سردار۔" ایلچی بہادر نے بولا۔ "آپ مستقبل میں خیوہ کے حاکم ہونے والے ہیں اور ہم تجھ کے لیے حکم ہے کہ حاکموں کا کہنا مانو۔ اس لیے میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔ مجھے تنکل نے بلا بھیجا کی مشکل آسان ہو جائے گی۔ اب میں آپ کے پاس ٹھہروں گا۔ باہر نکلوں گا تو لوگ پھر مجھے گھیر لیں گے عام آدمیوں کے ہاتھ نہیں دیکھا کرتا۔ آپ محبت سے پیش آئے تھے اس لیے میں نے آپ کا ہاتھ دیکھا مجھے خوشی ہے کہ مجھے آپ کا ہاتھ دیکھ کر معلوم ہو گیا کہ خیوہ کا ہونے والا حاکم اور ترکمانوں کا کماندار کہ

ایلچی بہادر نے اپنی باتوں سے پورا یقین دلایا کہ آئندہ کا حاکم وہی ہو گا۔ ترنگل کے دماغ میں اس قدر بیٹھ گئی کہ وہ اب ہر وقت خیوہ کی حاکمیت کے نشے میں چور رہنے لگا۔ اس نے اس دو دو ایک سخت غلطیاں کیں لیکن وہ اپنے ماتحتوں میں بہت مقبول و ہر دلعزیز تھا اس لیے بات د گئی۔ ورنہ اگر تنکل کو خبر ہو جاتی تو معلوم نہیں وہ کیا غضب ڈھاتا۔ ایلچی بہادر کی خوب خاطر مدارت وہ اوپر کے کمرے میں بیٹھے پورے شہر کا تماشا دیکھتے اور معلومات حاصل کرتے رہتے تھے۔

○

سردار تنکل کو جب تیمور کے خیوہ کے دروازے پر آنے کی خبر ہوئی تو وہ اس خیال سے خوش ہوا تھا کہ تیمور جیسا شکار اتنا خطرناک ریگستان پار کر کے خود اس کے جال میں آ پھنسا ہے فوراً فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ تیمور کو گرفتار کر کے بلادِ شمال کے خانِ اعظم سے ایک بھاری رقم حا گا۔ اس کے ساتھ ہی اسے تیمور کا وہ اسلحہ بھی حاصل ہو جائے گا جو وہ اور اس کے آدمی ا

ے لیکن جب تیمور سے ملا اور اس نے دلشاد آغا کو دیکھا تو اس کے دماغ میں دوسرا ہی فتور پیدا ہو یور کی گرفتاری کا خیال پس پشت پڑ گیا اور اب وہ دلشاد آغا جیسی حسین عورت کو اپنے قابو میں کرنے یبیریں کرنے لگا۔ تیمور کی گرفتاری یوں بھی ذرا مشکل ہو گئی تھی کیونکہ تیمور نے بڑی چالاکی سے تاتاریوں ب جنگی رسم کا سہارا لے کر قلعے کے اندر جانے سے انکار کر دیا تھا اور اپنے خیمے باہر لگوائے تھے۔

پھر جب تیمور نے آنے والے خطرے کو بھانپ کر فوری روانگی کا اظہار کر دیا تو سردار تنکل نے پ کی سالگرہ کا ڈھونگ رچا کر دلشاد آغا کو گرفتار کر لیا۔ دلشاد آغا کو اس کے آدمیوں نے اندھیرے ور ڈال کر پکڑا تھا۔ وہ اس کشمکش میں بے ہوش ہو گئی۔ اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک آرام دہ پر پڑے پایا۔ ایک ہی لمحے میں سارا معاملہ اس کی سمجھ میں آ گیا۔ وہ سمجھ گئی کہ اسے دھوکے سے پکڑا ہے اور اب اس جگہ سے رہائی مشکل ہے۔ پھر بھی اس نے ہمت نہ ہاری۔ وہ بڑی دلیر عورت تھی ں کے ساتھ جنگوں میں حصہ لے چکی تھی اور اپنے ضدی شوہر سے کہیں زیادہ عقلمند تھی۔ اس کے کمرے روز بردست پہرہ تھا اور وہاں سے بھاگنے کی کوشش موت کو دعوت دینے کے مترادف تھی۔ اس لیے نے خود کو حالات کے سانچے میں ڈھالنے کا فیصلہ کیا اور غصہ کی بجائے نرم رویہ اپنانے کو بہتر سمجھا۔

صبح کے وقت اُسے کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ آرام و آسائش کا پورا سامان بھی پہنچا دیا گیا۔ ان لے کر اس کے پاس کئی خادمائیں آئیں۔ جب وہ سامان رکھ کر واپس جانے لگیں تو دلشاد نے ان سے ایک عورت کو روک کر کہا۔ "تم ہمارے پاس رہو گی۔"

دلشاد کا انداز بڑا شاہانہ تھا۔ وہ کابل کی ملکہ رہ چکی تھی۔ خادمہ گھبرا گئی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ردار کا حکم ہے کہ ہم سامان پہنچا کر واپس آ جائیں کسی کو اندر رہنے کی اجازت نہیں۔"

"اگر ہمیں کسی چیز کی ضرورت پڑی تو ہم کسے پکارتے پھریں گے۔" دلشاد نے تیوریوں پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

"میں کیا بتاؤں جی۔ یہ تو آپ سردار سے کہیں۔" خادمہ نے اپنی مجبوری ظاہر کی۔

"جاؤ اور اپنے سردار سے کہو کہ ہم ایک خادمہ کو ہر وقت اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں۔" دلشاد ا ے رعب سے خادمہ کو حکم دیا۔ خادمہ سر جھکا کے چلی گئی۔ دروازہ باہر سے بند ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد خادمہ واپس آئی۔ مسکراتے ہوئے مگر ادب سے بولی۔ "جی آپ کسی ملک کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملکہ ہیں؟"

"کل تک ہم ملکہ تھے آج تمہارے سردار کے قیدی ہیں۔" دلشاد نے جھلا کر جواب دیا۔

"آپ جی۔ وہ آپ کس ملک کی ملکہ ہیں؟" خادمہ نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "سردار نے پوچھا تھا میں نام بھول گئی ملکہ جی۔ آپ بتا دیجئے سردار ناراض نہ ہو جائیں۔"

خادمہ بہت کم عمر تھی۔ دلشاد کو اس کی بھولی باتوں میں بڑا لطف آ رہا تھا۔ پیار سے بولی۔ اگر میں بتائیں کہ ہم ملک کابل کی ملکہ تھے تو تم کیا کرو گی؟"

"ہاں کابل کی ملکہ جی۔" خادمہ خوش ہو گئی۔ "یہی نام بتایا تھا سردار نے..... اور جی سردار نے کہا ہے کہ کابل کی ملکہ سے کہنا جتنی خادمائیں چاہے وہ اپنے پاس رکھیں جس چیز کی ضرورت ہو منگوا لیں۔"

دلشاد کی دلچسپی بڑھی۔ اس نے پوچھا۔ "اور کیا کہہ رہے تھے تمہارے سردار؟"

"جی۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ..... ملکہ وہ جی کابل کی ملکہ کو غصہ تو نہیں تھا؟"

"پھر تم نے کیا جواب دیا؟"

"جی میں نے کہہ دیا کہ وہ ناراض تو نہیں لگتیں۔"

"اور کچھ کہا تھا سردار نے؟"

"اور تو کچھ نہیں کہا تھا۔" خادمہ رک کر سوچنے لگی۔ پھر اسے کچھ یاد آیا۔ بولی۔ "ہاں ملکہ جی سردار کہہ رہے تھے ملکہ اجازت دیں تو وہ ملنے آ جائیں؟"

"نہیں۔" دلشاد کو ایک دم غصہ آ گیا۔ خادمہ سہم کر واپس جانے لگی۔ "تم کہاں جا رہی ہو؟" دلشاد نے پوچھا۔

"سردار کے پاس جا رہی ہوں ملکہ جی۔" خادمہ نے سادگی سے کہا۔

"تم نہیں جاؤ گی۔ یہیں بیٹھو۔" دلشاد نے اسے بٹھا لیا۔ خادمہ ڈرتے ڈرتے بیٹھ گئی۔ دلشاد کو اس کی بھولی صورت پر ترس آ گیا۔ پوچھا۔ "کیا ہمارے پاس بیٹھنا اچھا نہیں لگتا۔ واپس کیوں جانا چاہتی ہو؟"

"میں تو ہر گھڑی آپ کے پیروں میں رہنا چاہتی ہوں ملکہ جی۔" خادمہ نے خلوص سے کہا۔ "پر سردار کو جواب دینا تھا۔"

کیا جواب دینا تھا سردار کو؟" دلشاد فکر کے دھاروں میں ذرا دیر پہلے کی بات بھول گئی۔

خادمہ نے اسے قدرے تعجب سے دیکھا۔ "ملکہ جی..... آپ نے کہا نہیں تھا کہ آپ سردار سے ملیں گی۔"

دلشاد اپنی بھول پر مسکرائی۔ "یاد آ گیا۔ اچھا تم بیٹھی رہو۔ ہم سوچ کے جواب دیں گے۔"

خادمہ اسے ٹکر ٹکر دیکھنے لگی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" دلشاد نے اسے مسکرا کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ساتری۔ ملکہ جی۔ سب تو ساتری ساتری پکارتے ہیں پر وہ۔" خادمہ کہتے کہتے شرما گئی۔

"وہ کون؟" دلشاد نے دلچسپی سے پوچھا۔ ساتری جواب دینے کے بجائے کچھ اور سمٹ گئی۔

"تمہاری شادی ہو گئی ساتری؟" دلشاد نے دوسرا سوال کیا۔

"جی ملکہ جی ہو گئی ہے، پر شادی ابھی نہیں ہوئی ہے۔" ساتری جلدی جلدی انگلیاں چٹخانے لگی۔

دلشاد ہنس پڑی۔ "ہو گئی ہے، نہیں ہوئی۔ کیا کہہ رہی ہے؟ میاں کے گھر نہیں گئی ابھی تک؟"

"ہاں ملکہ جی۔ بالکل یہی بات میں کہہ رہی تھی۔" سیدھی ساتری کی مشکل دلشاد نے آسان کر دی۔

"اس وقت دروازے پر کھٹکا ہوا۔ دلشاد نے کہا۔ "دیکھو دروازے پر کون ہے؟" حالانکہ دلشاد نے سردار تکل کو دروازے کی آڑ میں کھڑے دیکھ لیا تھا۔ شاید وہ ساتری کے پیچھے ہی پیچھے آ گیا تھا۔ اسے دیکھ کر ہنس ہنس کے باتیں کرنا شروع کر دی تھیں تاکہ سردار تکل پر اس کا دلی رنج و غم ظاہر نہ ہو۔ سردار تکل نے جب دلشاد کو اس بے فکری سے باتیں کرتے دیکھا تو اس نے جواب کا انتظار کیے بغیر دلشاد سے ملنے کا ارادہ کر لیا اور دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔

ساتری باہر دیکھ کر گھبرائی ہوئی واپس آئی۔ "ملکہ جی۔ ملکہ جی۔ بڑے سردار آئے ہیں۔"

"تو گھبرا کیوں رہی ہے؟" دلشاد نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "آئے ہیں تو آنے دے۔"

ساتری واپس ہوئی تھی کہ سردار تکل خود ہی اندر آ گیا۔ دلشاد نظریں نیچی کیے اسے کن انکھیوں سے دیکھتی رہی۔ تکل اس سے کچھ دور آ کر کھڑا ہو گیا۔ "کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟" تکل نے گھبرا کے

اجازت اندر آنے سے پہلے مانگنا چاہیئے تھی حاکم خیوہ۔" دلشاد خواہ مخواہ مسکرا دی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سردار ٹکل کو دلشاد کے مسکرانے سے ذرا ہمت ہوئی۔ بولا "غلطی ہوگئی۔ معاف کردو دلشاد"

"قیدی سے معافی نہیں مانگا کرتے سردار ٹکل" دلشاد کا لہجہ شکایت آمیز تھا لیکن وہ بدستور مسکرا دی۔

"تم قیدی نہیں دلشاد آغا" ٹکل نے ہمت کر کے کہا "تم ملکہ کابل ہو۔ میں تمہیں اب بھی واپس نہیں جانا چاہتا ہوں۔"

"ملکہ کابل۔ دیے زخموں کو نہ چھیڑو سردار ٹکل" دلشاد نے بڑے درد سے کہا "کابل تو کے لیے چھوٹ چکا ہے۔ کابل والوں نے جو بے وفائی کی ہے۔ اس سے ہمیں نفرت ہوگئی ہے۔ اب واپس نہیں جانا چاہتے۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں دلشاد آغا" ٹکل لگاوٹ سے بولا "میں تمہیں کابل سے زیادہ عظمت دوں گا۔ تم میرے دل کی....." معاً ٹکل کی نظر ساتری پر پڑی۔ وہ ساتری کو قہر سے گھورتے ہوئے بولا "تو یہاں کھڑی کیا کر رہی ہے۔ جاتی کیوں نہیں باہر۔"

ساتری ڈر کے پیچھے ہٹی۔ دلشاد نے کہا "سردار ٹکل جو لوگ اپنے ملازموں سے محبت نہ وہ قابل اعتماد نہیں ہو سکتے۔ ملازم تو اپنے آقا کے دست و بازو ہوتے ہیں۔"

سردار ٹکل شرمندہ ہو گیا بولا "ٹھیک ہے دلشاد آغا" پھر ساتری سے کہا "مت جا، اپنی نئی مالکن کی دل لگا کر خدمت کر۔ تجھے انعام ملے گا۔"

"نئی مالکن" دلشاد نے نظریں اٹھا کر ٹکل کو کچھ یوں دیکھا کہ وہ جھوم اٹھا۔ "سردار ٹکل تم کے یہ طریقے نہیں ہوا کرتے۔ دل کا سودا دل سے ہوتا ہے اور زبردستی کر کے کسی کا دل نہیں جیتا جا

"میں تم سے بہت شرمندہ ہوں دلشاد آغا" سردار ٹکل نے تاسف سے کہا "تم آزاد ہو جہاں چاہو گھوم پھر سکتی ہو لیکن یہاں سے فرار کی کوشش بیکار ثابت ہوگی تم اپنا اغنیا بھی کھو

"سردار ٹکل ہمیں غلط نہ سمجھو۔ تمہارا یہ قلعہ ہمیں پسند آیا تھا لیکن تم نے غلط طریقہ اختیا نے ذرا کھل کے کہا۔

"دلشاد آغا میں غلطی کی معافی مانگ چکا ہوں....." ٹکل انکسار سے بولا "مجھے نہ کرو۔"

"ہم نے جس دن تمہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ اسی وقت تمہاری نظروں کا پیغام سن لیا تھا" دلشاد دھیرے بولی "اس نے ٹکل کی بات سنی ہی نہیں۔" پھر انتظار کرتے رہے کہ نظروں کا پیغام زبان پر لاؤ گے مگر تم نے....."

"دلشاد نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

"ملکہ دلشاد آغا" سردار ٹکل ذرا انتظار کے بعد بولا "دل کا پیغام زبان پر تو آگیا ہے۔ اب تو ب لانا چاہیے۔"

"سردار ٹکل" دلشاد نے مدبرانہ انداز اختیار کیا "ابھی ہمارے درمیان بہت سی دوریاں ہیں۔ ہی مسئلے حل ہونا ہیں۔ اگر تم نے صبر سے کام نہ لیا تو تم ہمیں کھو دو گے۔" دلشاد نے کپڑوں میں چھپا ہوا ایک خنجر نکالا۔ سردار ٹکل گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور حیرت سے دلشاد آغا کو دیکھنے لگا۔

"گھبراؤ نہیں سردار ٹکل" دلشاد مسکرائی۔ "یہ خنجر کسی دشمن کے لیے نہیں۔ اگر تم نے بے صبری کا ہرہ کیا تو یہ خنجر خود ہمارے خون سے رنگین ہوگا۔ ہم نے اسے صرف اپنی حفاظت کے لیے رکھا ہے۔"

"میں صبر کروں گا دلشاد۔ جب تک تم کہو گی صبر کرتا رہوں گا" سردار ٹکل نے اسے مطمئن کرنے کو "مجھے صرف یہ یقین ہونا چاہیے کہ ایک دن میں تمہیں اپنا سکوں گا۔"

"سردار ٹکل تم بھی مسلمان ہو اور جانتے ہو..... کہ شوہر کے مرنے کے بعد بھی عورت کو چار پانچ ماہ گوشہ نشین ہونا پڑتا ہے۔" دلشاد نے مناسب موقع سمجھ کے بات چھیڑی۔ "ابھی تو یہ بھی نہیں معلوم امیر حسین مارا گیا یا قید ہے۔"

"اس کا مارا جانا بہتر ہوگا یا قید ہونا دلشاد آغا کو کس بات سے خوشی ہوگی؟" سردار ٹکل نے اس الٹا سوال کر دیا۔

سردار ٹکل کے اس سوال سے دلشاد آغا گھبرا گئی۔ اسے قطعی علم نہ تھا کہ امیر حسین اور تیمور وغیرہ بارگری۔ اگر وہ قید ہیں اور دلشاد یہ کہتی ہے کہ اس کا مارا جانا بہتر ہے تو کہیں سردار ٹکل اسے قتل دے۔ اسے فوراً جواب دینا تھا۔ اس نے فوراً جواب دیا۔ "سردار ٹکل۔ یہ تمہارے سوچنے کی بات ہے۔ ہمیں تو دونوں صورتوں میں چار پانچ ماہ تک گوشہ نشین ہونا پڑے گا۔ اس سے یہ فائدہ بھی ہوگا کہ پانچ ماہ کی قطعی بھول کے نئی زندگی اپنانے کے لیے خود کو تیار کر لیں گے۔"

دلشاد نے اپنے جواب سے سردار ٹکل کو مطمئن بھی کر دیا اور بڑی چالاکی سے چار پانچ ماہ تک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خود کو محفوظ بھی کر لیا تھا۔ سردار تکل نے اپنے اطمینان کا زبان سے بھی اقرار کیا۔" دلشاد آغا۔ میں آپ کی دل آزاری نہیں کرنا چاہتا۔ امیر حسین اور تیمور کو میں نے خود معاف کر دیا۔ وہ یہاں سے جا چکے ہیں۔ ان کا اور بچیرہ خوار و زم جانے کا تھا لیکن بغیر کسی راہنما کے وہاں تک پہنچنا قطعی ناممکن ہے۔ وہ صحرا میں بھٹک بھٹک کر مر جائیں گے۔"

دلشاد نے خدا کا شکر ادا کیا کہ امیر حسین وغیرہ اس ظالم کے ہاتھ سے بچ کے نکل گئے ہیں۔ اُسے یہی فکر تھی کہ امیر حسین اپنی خدی طبیعت سے مجبور ہو کر کہیں جبوہ والوں سے لڑ بھڑ کر خود کو ختم نہ کر لے۔

سردار تکل مطمئن ہو کر چلا گیا۔ اب وہ روزانہ تھوڑی دیر کے لیے دلشاد آغا کے پاس آتا اور رسمی گفتگو کر کے چلا جاتا۔ دلشاد کو قلعے کے اندر گھومنے پھرنے کی اجازت مل گئی تھی لیکن اس نے اس حویلی کے باہر قدم نہیں نکالا جس کے ایک کمرے میں وہ قید تھی۔ پوری حویلی دلشاد کے حوالے کر دی گئی تھی۔ اس کے آرام و آسائش کا ہر سامان وہاں موجود تھا۔ اندر باہر درجنوں خادم اور خادمائیں اس کے اشارے کی منتظر رہتیں، لیکن وہ سوائے ساتری کے کسی کو منہ نہ لگاتی۔

دلشاد ایک دن بہت اداس بیٹھی تھی۔ سردار تکل تھوڑی دیر پہلے اس سے ملاقات کر کے گیا تھا ساتری کسی کام سے باہر گئی تھی۔ واپس آئی تو دلشاد کو خاموش اور پریشان دیکھ کر تڑپ اٹھی۔ وہ دلشاد سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔ اس نے پوچھا۔" ملکہ جی! کیا آپ بیمار ہیں؟"

"نہیں تو۔" دلشاد نے فوراً اپنے چہرے پر مصنوعی خوشی سجالی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا غم کسی پر ظاہر ہو۔

"تو پھر سردار نے آپ کا دل دکھایا ہوگا۔" ساتری سادگی سے بولی۔" وہ سب کو یونہی ڈانٹتے ڈپٹتے رہتے ہیں۔"

"اپنی بیویوں کو بھی ڈانٹتے ہیں کیا؟" دلشاد نے اسے ٹٹولا۔

"ملکہ جی۔ سردار کی عورتیں تو اس سے کانپتی ہیں۔" ساتری بھولپن سے بتانے لگی۔" اگر کوئی جواب دے دے تو پھر اس کو خوب پیٹتے ہیں۔ ڈنڈوں سے مارتے ہیں اور ملکہ جی....." ساتری ادھر اُدھر دیکھ کر چپ ہو گئی۔

"کہو ساتری۔ ڈرو مت۔ جب تک میں یہاں ہوں تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" دلشاد نے اُسے

تسلی دی۔ وہ تکل کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی۔

ساتری دلشاد کے پیروں کے پاس کھسک آئی اور پیر دباتے ہوئے آہستہ سے بولی۔" ملکہ جی اپنے سردار تکل ہیں نا، یہ بڑے ظالم ہیں۔ ہر سال ایک بیوی کو مار ڈالتے ہیں اور نئی شادی کر لیتے ہیں۔ کوئی بڑے تو اسے بھی قتل کرا دیتے ہیں۔"

دلشاد کو سردار تکل سے اور زیادہ نفرت ہو گئی۔ وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی۔

"ساتری ہم تاتاری ہیں۔" دلشاد بولی۔" تاتاری عورتیں اپنے دوستوں کو دھوکہ نہیں دیتیں ہم جس سے محبت کرتے ہیں ٹوٹ کے محبت کرتے ہیں۔"

"کیا آپ سردار تکل سے بھی محبت کرتی ہیں ملکہ جی؟" ساتری نے پتہ نہیں کیوں یہ سوال کیا۔

"تجھے شک کیوں ہوا ساتری؟ تو نے سنا نہیں ہم اُس سے شادی کرنے والے ہیں۔" دلشاد نے ہنس کر کہا لیکن اس کی ہنسی میں ہزاروں کرب پوشیدہ تھے۔

"ملکہ جی۔ ایک بات کہوں۔ آپ بُرا تو نہ مانیں گی؟" ساتری سادگی سے بولی۔

"تو بری بات کہے گی تب بھی ہم ناراض نہ ہوں گے اس لیے کہ تو ہم سے محبت کرتی ہے۔" دلشاد ہنس کر کہا۔

ساتری خاموش رہی۔ شاید وہ کہتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ دلشاد بولی۔" تجھے ہم پر اعتبار نہیں ساتری؟"

"ہے ملکہ جی! پر ڈر لگتا ہے۔" ساتری نے کہنا شروع کیا۔" ملکہ جی میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتا کہ آپ تکل سے کیوں محبت کرتی ہیں۔ اس نے آپ کو آپ کے لوگوں سے چھین لیا۔ آپ کو اپنا کوئی رشتہ یاد نہیں آتا؟"

دلشاد حیرت سے ساتری کا منہ دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔" ساتری کیا تجھے اپنے شوہر سے بہت محبت ہے؟"

"ہاں ملکہ جی بہت ہے۔" ساتری جذباتی ہو گئی۔" وہ مجھے نہ ملا تو میں اپنی جان دے دوں گی۔"

"تجھے اگر اس سے چھین کر اس طرح قید کر دیا جائے تو تیرا دل کیا کرے گا؟" دلشاد سوال کر کے اس کا چہرہ غور سے دیکھنے لگی۔

"میں تڑپ تڑپ کے مر جاؤں گی ملکہ جی۔" ساتری کے جذبات میں جیسے اُبال آ گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہمارا بھی یہی حال ہے ساتری۔" دلشاد کی آنکھیں بھر آئیں۔ "ہم نے بھی جان دے دی ہوتی لیکن بس ایک اُمید پر زندہ ہیں۔ شاید یہاں سے چھٹکارے کی کوئی صورت نکل آئے۔"

"ملکہ جی آپ کتنی دکھی ہیں۔" ساتری دلشاد کے پیروں پر سر رکھ کے رونے لگی۔

○

سردار تہکل، اِدھر کچھ دنوں سے دلشاد کے پاس دونوں وقت آنے لگا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ پرسی کی طرف چلا جاتا تھا لیکن اب وہ گھنٹوں بیٹھا دلشاد کا دماغ چاٹتا رہتا۔ کبھی کہتا کہ میں شادی کے بعد تمہارے لیے ایک عالی شان محل بنواؤں گا کبھی اپنے خزانوں کا ذکر کرتا۔ دلشاد ان باتوں سے اُلجھتی لیکن مجبوراً اُسے تہکل کی ہاں میں ہاں ملانا پڑتی۔ سردار تہکل میں کچھ زیادہ ہی حوصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ اکثر وہ دلشاد کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیتا۔ اس کے بال بکھیر دیتا۔ گدگدانے لگتا۔ زبردست مارے اور رونے نہ دے۔ دلشاد دل میں کڑھتی، مگر ہنستی، مسکراتی رہتی اور خود کو کسی نہ کسی طرح اس سے بچاتی رہتی۔ اُسے یہ تو معلوم تھا تیمور اور امیر حسین بچ کر نکل گئے اور وہ کسی نہ کسی تدبیر میں لگے ہوں گے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی پریشانی بڑھتی جاتی تھی۔ اسے خطرہ پیدا ہو رہا تھا کہ کہیں سردار تہکل طاقت کے زور پر اس پر قابو نہ حاصل کر لے۔ اس نے فرار کی تمام صورتوں پر غور کیا تھا اسے ساتری کی ہمدردیاں اور مدد حاصل تھی۔ ساتری نے اپنے ہونے والے شوہر سے مل کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ اگر دلشاد کسی طرح شہر سے نکل کر باہر آجائے تو اسے بھاگنے کے لیے ایک تیز رفتار گھوڑا مہیا کر دیا جائے گا۔ ساتری کی یہ ہمدردی دلشاد کے لیے بڑی طمانیت کا باعث تھی۔ لیکن وہ فرار کے لیے آمادہ نہ تھی۔ اُسے اپنے آدمیوں کا کوئی پتہ نہ تھا۔ یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ خیوہ سے جانے کے بعد ان پر کیا گزری۔ ہاں اُسے یہ ضرور یقین تھا کہ وہ لوگ خیوہ کے زیادہ دور نہ گئے ہوں گے اور ایک نہ ایک دن اُسے چھڑانے ضرور آئیں گے۔

ایک صبح سردار تہکل آیا تو وہ معمول سے کچھ زیادہ ہی خوش تھا۔ اس کی اس خوشی سے دلشاد کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ دلشاد نے دل پر جبر کرتے ہوئے مسکرا کے پوچھا۔ "حاکم خیوہ بہت خوش نظر آرہا ہے؟"

"ہاں دلشاد آغا۔" تہکل خرمستی سے جھومتا نہ سما رہا تھا۔ "خیوہ میں ایک نجومی آیا ہے اس کا دعویٰ ہے کہ وہ ماضی اور مستقبل کی تمام باتیں بتا سکتا ہے۔"

"نجومی" کے نام پر دلشاد کے خون کی گردش ایک دم تیز ہو گئی لیکن وہ بڑا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ "گمراہ خوش ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ نجومی تو بے سر پیر کی اُڑاتے ہیں۔ ان کی باتوں پر بیوقوف یقین کرتے ہیں۔"

"نہیں دلشاد۔" تہکل سنجیدہ ہو گیا۔ "وہ ملکوں ملکوں گھوما ہے۔ پورا ملک تاتار اس کا چھانا ہوا ہے۔ وہ تمہارے کابل بھی ہو آیا ہے۔"

"سردار تہکل۔" دلشاد مصنوعی غصے سے بولی۔ "کابل کا نام ہمارے سامنے نہ لایا جائے۔ چھوٹے دیس کا رشتہ کیلہ اب خیوہ ہمارا ہے اور ہم خیوہ کے ہیں۔"

سردار تہکل خوشی سے پھول گیا۔ "کیوں نہیں، دلشاد آغا۔ اب تو آپ خیوہ کی ملکہ بننے والی ہیں۔"

دلشاد نے سر جھکا لیا۔ پھر حیا آلود نظروں سے تہکل کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "سردار تہکل! وہ وقت بھی آجائے گا بشرطیکہ تم نے صبر کا دامن نہ چھوڑا۔"

سردار تہکل سنبھل گیا۔ "دلشاد آغا! مطمئن رہیں۔ میں وعدہ خلافی نہیں کروں گا۔"

ابھی اسی قدر گفتگو ہوئی تھی کہ باہر سے اطلاع آئی کہ صدر دروازے کے محافظوں کا سردار سلام کے لیے حاضر ہوا ہے۔ سردار تہکل اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "وہ آگیا، دلشاد آغا۔ میں اس سے مل کے تمہارے پاس آؤں گا۔"

"کون آگیا ہے؟" دلشاد نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ اس کا دل اُچھلنے لگا۔ وہ جان گئی تھی کہ وہی نجومی آیا ہے جس کا ذکر ابھی تہکل نے کیا تھا۔

"ارے بھئی۔ وہی نجومی۔" سردار تہکل جلدی جلدی بتانے لگا۔ "وہ ہمارے محافظ سردار کے پاس کئی دن سے پڑا ہوا ہے۔ محافظ سردار نے اس کی بہت تعریف کی ہے۔ وہ دلوں کا حال بتا دیتا ہے پہلے میں اپنا ہاتھ دکھاؤں گا پھر۔" اور سردار تہکل ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔

سردار کے جانے کے بعد دلشاد نے ساتری سے کہا۔ "ذرا جا کے دیکھ تو نجومی کس صورت و شکل کا آدمی ہے۔ تو بھی اپنا ہاتھ دکھا دیجیو۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"واہ، ملکہ جی! میں کیوں غیر مرد کے سامنے اپنا ہاتھ کروں۔" ساتری شرماتے ہوئے بولا۔ "ہاتھ تو بس اپنے ہی مرد کے ہاتھ میں دیتے ہوئے اچھا لگتا ہے۔"

ساتری تو یہ سادہ سا جملہ کہہ کے باہر نکل گئی لیکن دلشاد کے دل میں جیسے اس کا جملہ تیر بن کر اٹک گیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ساتری نے اپنی سادگی میں کتنی بڑی بات کہہ دی ہے۔ ہاتھ تو اپنے ہی مرد کے ہاتھ میں اچھا لگتا ہے اور میں بدقسمت ہوں کہ اپنوں سے دور اس سنہرے قید خانے میں پڑی ہوں۔ پتہ نہیں امیر حسین کا کیا حال ہوگا۔ وہ تو میرے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ اب کیا ہوگا؟ اس کا جی چاہا کہ چیخ چیخ کے امیر حسین کو پکارے یا پھر دیواروں سے سر ٹکرا کے جان دے دے۔ وہ بڑی دیر تک انہی خیالوں میں ڈوبی رہی۔

گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد ساتری واپس آئی تو اس کی حالت دیکھ کر دلشاد چونک پڑی۔ اس کے سر پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ آنکھوں میں گرد گھسی ہوئی تھی اور کپڑے جگہ جگہ سے مسکے ہوئے تھے۔ ساتری ہانپتی ہوئی آئی اور دلشاد کے پاس بیٹھ کر اپنی سانس درست کرنے لگی۔

"یہ کیا حال بنایا ہے تو نے ساتری؟" دلشاد نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ "یہ بکھرے بال، چہرے پر گرد۔ جگہ جگہ سے مسکے ہوئے کپڑے۔ کسی نے کسی....."

ساتری ٹھٹھا مار کے ہنس پڑی۔ "ملکہ جی! کسی کی کیا مجال کہ میرے ہاتھ بھی لگا سکے۔ میں اس کی بوٹیاں نہ نوچ ڈالوں۔ یہ تو میں نجومی کو دیکھنے گئی تھی جو یہ حال ہوا ہے میرا۔"

"تو کیا نجومی نے تیرے کپڑے پھاڑے ہیں؟" دلشاد نے ہنس کے پوچھا۔

"ملکہ جی! بس نہ پوچھیے کچھ۔" ساتری نے مزے لے کے بتانا شروع کیا۔ "اتنی بھیڑ تھی، اتنا تھا کہ سر ہی سر دکھائی دیتے تھے۔ اور وہ بیچارہ نجومی ان میں دبا جا رہا تھا۔"

"تو پھر دکھایا تو نے اپنا ہاتھ؟" دلشاد نے اپنے مطلب کی بات کی۔

"ہاتھ دکھانا کیسا ملکہ جی۔" ساتری ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔ "میں تو اس کے پاس بھی نہیں پہنچ سکی۔ وہ سب کا ہاتھ بھی تو نہیں دیکھتا۔ بس حاکموں اور بڑے بڑے سرداروں کا ہاتھ دیکھتا ہے۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ اس نے بڑے دروازے والے سردار کا ہاتھ دیکھا تھا اور اس کے باپ دادا اور ان کے بھی باپ دادا تک کا حال بتا دیا۔ بہت بڑا نجومی ہے ملکہ جی۔"

"تو نے اس کی شکل و صورت تو دیکھی ہوگی؟" دلشاد نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"ملکہ جی!" ساتری سوچتے ہوئے بولی۔ "شکل تو دور سے اچھی طرح دکھائی نہیں دی۔ ہاں اس کی پگڑی چوخ دار ٹوپی دکھائی دے رہی تھی۔ کپڑے بڑے بھڑکیلے پہن رکھے تھے۔ ملکہ جی اس پر مچھیاں ہی مچھیاں پڑی تھیں، اوپر سے نیچے تک۔"

"اور اس کے جوتے کا مدار تھے۔ سفید سنہرے تاروں سے بنے ہوئے؟" دلشاد نے ایک دم بھر کر پوچھا۔

ساتری نے بڑی حیرت سے دلشاد کو دیکھا بولی۔ "ملکہ جی! یہ بات آپ سے کس نے کہی۔ میں نے اس کے جوتے نہیں دیکھے لیکن لوگ کہہ رہے تھے کہ اس کے جوتوں پر سونے چاندی کے تار لگے ہیں۔"

دلشاد کا دل مسرت سے بھر گیا۔ وہ سمجھ گئی کہ مجوسی سوائے ایلچی بہادر کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ایلچی بہادر اپنے طرحدار..... خود اور کامدار جوتوں کے لیے مشہور تھے۔ ان کا یہ لباس اور سامان اس نے بھی دیکھا تھا۔ دوران سفر ایلچی بہادر نے کئی بار طرحدار خود اور کامدار جوتے نکالے تھے لیکن تیمور نے انہیں منع کر دیا کہ ابھی ان کے پہننے کا وقت نہیں آیا کیونکہ اس صورت میں وہ کہیں پہچان نہ لیے جائیں۔ تاتاریوں کا تو بچہ بچہ ایلچی بہادر سے واقف تھا۔

اب دلشاد ایلچی بہادر کو دیکھنے اور اس سے ملنے کے لیے بے چین ہو گئی۔ اس نے پوچھا "مجوسی کہاں ہے اس وقت؟"

"سردار اپنے ساتھ لے گئے ہیں اسے۔" ساتری نے کہا۔ "اس کے تو بڑے دماغ ہیں ملکہ جی۔ کسی سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتا۔ ملکہ جی!" ساتری ذرا قریب ہوتے ہوئے آہستہ سے بولی۔ "ملکہ جی! آپ اسے اپنا ہاتھ ضرور دکھائیں۔ کیا پتہ وہ کوئی اچھی بات بتا دے۔"

"ہاں ساتری! ہم ہاتھ دکھائیں گے اسے۔" دلشاد نے کہا۔

"میں بھی ہاتھ دکھاؤں گی پھر تو!" ساتری خوش ہو گئی۔ "آپ کہہ دیجیے گا سردار سے۔"

دلشاد اپنے خیالوں میں گم سوچ رہی تھی کہ ایلچی بہادر یہاں تک پہنچے ہیں تو ضرور کوئی پیغام لائے ہوں گے۔

سردار نکل جب دلشاد کے پاس سے اٹھ کے اپنی حویلی پر پہنچا تو وہاں لوگوں کا بڑا اژدہام تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مرد اور عورتیں، نجومی کو ایک نظر دیکھنے کے لیے ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ صدر دروازے کے محافظ نجومی کا زبردست پرچار کیا تھا۔ چنانچہ جب وہ نجومی کو لے کر سردار تنکل کی حویلی کی طرف جا رہا تھا لوگوں نے اُسے گھیرنا شروع کر دیا اور سردار تنکل کی حویلی تک پہنچتے پہنچتے کئی سو آدمی اکٹھا ہو گئے۔ تنکل نے لوگوں کو سخت سست کہہ کر بھگا دیا اور نجومی کو ساتھ لے کر اندر چلا گیا۔ نجومی کو ساتھ لانے والا محافظ سردار بھی ان کے پیچھے ہی اندر پہنچ گیا۔

"نجومی جی! تمہارا نام کیا ہے اور کہاں کے رہنے والے ہو؟" سردار تنکل ذرا رعب سے بولا۔

نجومی نے سردار کو گھورا اور بے پروائی سے بولا "اے خیوہ کے حاکم! ہم لوگوں کا نہ کوئی نام ہے اور ٹھکانہ۔ ہر ایک ہمارا ایک نیا نام رکھتا ہے۔ جہاں شام ہوئی وہی اپنا ٹھکانہ ہو گیا لیکن تم خیوہ کو یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ نجومی نہ تو کسی کی رعایا ہوتے ہیں اور نہ غلام۔ وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ ان کی مرضی پر کوئی اپنی مرضی مسلط نہیں کر سکتا۔ نہ انہیں کسی بات پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔"

سردار تنکل، نجومی کے رعب میں آ گیا۔ نرمی سے بولا "نجومی جی! معاف کیجئے۔ میں نے تو یہ پوچھا تھا۔ میں آپ کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ محافظ سردار نے آپ کی تعریف کی ہے تو ملنے کا شوق پیدا ہوا۔ میں آج خود ہی آپ سے ملنے کے لیے آنے والا تھا۔"

ایلچی بہادر کا تیر نشانے پر لگا تھا۔ وہ دل ہی دل میں ہنسا اور بولا "حاکم خیوہ! تم اپنی صورت نہیں لیکن دل کے اچھے لگتے ہو۔ مجھے تمہاری خدمت کر کے خوشی ہو گی۔"

سردار تنکل نے فوراً اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ "تو میرا ہاتھ دیکھئے نجومی جی۔ میری قسمت کیا کہتی ہے؟"

ایلچی بہادر نے اس کا ہاتھ آہستہ سے نیچے ہٹاتے ہوئے کہا "سردار بہادر! میں گلوں میں گانے والا نجومی نہیں کہ جب اور جہاں کسی کا ہاتھ دیکھنے بیٹھ جاؤں۔ ہاتھ دیکھنے اور زائچہ بنانے کے لیے کچھ ہوتے ہیں۔ آپ کو ان کی پابندی کرنا ہو گی۔"

"میں پابندی کروں گا۔ آپ حکم دیجئے۔" سردار تنکل گھبرا گیا۔ "اگر معاوضے کی پیشگی ادائیگی کا ہو تو وہ حاضر کیا جائے۔"

ایلچی بہادر نے قریب کھڑے ہوئے محافظ سردار کو تیز نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔ "سچ سچ بتانا سردار۔ میں نے تجھ سے کتنا معاوضہ طلب کیا ہے؟"

"کچھ بھی تو نہیں لیا آپ نے۔" محافظ سردار نے ادب سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "آپ نے میرے بارے میں جو کچھ بتایا اس کے صلے میں تو میں اپنی جان تک دینے پر آمادہ تھا لیکن آپ کو مجھ سے کچھ نہیں ملا۔ میں قسم کھا سکتا ہوں اس کے لیے۔"

"سن لیا حاکم خیوہ؟" ایلچی نے سردار تنکل کی طرف رُخ کر کے کہا۔ "قلندر کو روٹیوں اور دو گز کپڑے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم معاوضہ لے کر کیا کریں گے؟ کہاں خرچ کریں گے؟ اپنا کام تو شہروں شہروں سیاحت کرنا ہے۔ ہم صرف ضرورت مندوں کی مدد کے لیے ہاتھ دیکھتے اور مستقبل کا حال بتاتے ہیں۔ یہ ہمارا پیشہ نہیں حاکم خیوہ۔"

"مجھے اپنی باتوں پر بڑا افسوس ہے نجومی جی۔" سردار تنکل شرمندگی سے بولا۔ "دراصل میں ان دنوں ایک ایسی الجھن میں گرفتار ہوں جس نے میرا چین، آرام چھین لیا ہے۔ اس لیے آپ کو تکلیف دینا چاہتا ہوں۔"

"اچھا تو تخلیہ کرایا جائے۔ ہم تخلیے میں اپنا حساب لگاتے ہیں۔" ایلچی بہادر نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"تخلیے سے آپ کا کیا مراد ہے نجومی جی۔ یہاں تو ہمارے سوا اور کوئی نہیں ہے۔" سردار نے ادب سے پوچھا۔

ایلچی بہادر نے محافظ سردار کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے ادب سے کھڑا تھا۔

"اگر نجومی جی کا اشارہ محافظ سردار کی طرف ہے تو میں اُسے ابھی باہر بھیجے دیتا ہوں۔" اور سردار تنکل نے محافظ سردار کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔

"تخلیے کا مطلب ہے کہ جس جگہ ہم بیٹھے ہیں یہاں سے بیس بیس گز تک کوئی انسان موجود نہ ہونا چاہیئے۔" ایلچی بہادر نے اس پر اپنے فن کا اور رعب جمایا۔

سردار تنکل فوراً اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اس کے حویلی کے محافظ کو حکم دیا کہ فوراً حویلی سے تمام لوگوں کو باہر نکال دیا جائے اور کسی کو اندر نہ داخل ہونے دیا جائے۔ جب تک حویلی خالی نہ ہو گئی سردار تنکل وہیں کھڑا رہا۔ محافظ نے فوراً تمام لوگوں کو حویلی سے نکال باہر کیا۔ اُدھر سے اطمینان ہونے کے بعد سردار تنکل نجومی کے پاس واپس آ گیا۔

"ایلچی بہادر نے پوچھا۔ "غالباً تخلیہ ہو گیا ہے۔ ہم اپنا کام شروع کر سکتے ہیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نجومی جی! میں نے پوری حویلی خالی کرا دی ہے۔ آپ بے خوف اپنا کام شروع کریں۔"

ایلچی بہادر نے اپنی پوتھی کھولی اور ورق گردانی شروع کر دی۔ وہ کسی صفحے کو غور سے

پھر سردار تکل کے چہرے کو گھورتے۔ کبھی کچھ حساب لگاتے۔ کچھ دیر تک اسی قسم کی حرکتیں

بعد بولے "ہاں حاکم خیوہ! اب میں آپ کا ہاتھ دیکھ کر آپ کے مستقبل کا حال بتاؤں یا آپ

کوئی سوال کرنا چاہتے ہیں؟"

"پہلے آپ میرا ہاتھ دیکھئے۔" تکل نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ "سوال میں آپ سے

کروں گا۔"

ایلچی بہادر نے سردار تکل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھنا شروع کیا۔ وہ ایک ایک

جھک کر دیکھتے۔ پھر سیدھے ہو کر آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنے لگتے۔ کبھی منہ ہی منہ میں کچھ

ایک لکیر کو ——— وہ دیر تک دیکھتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی سردار تکل کا چہرہ بھی

نے کئی بار دیکھا۔ پھر پوتھی کے اوراق الٹتے ہوئے ایک صفحے پر رک گئے۔

"حیرت۔ بڑی حیرت۔" ایلچی بہادر چیختے ہوئے بولے اور نظریں سردار تکل کی پیشانی

دیں۔ "یہ سب کب اور کیسے ہوگا؟ میں نہیں جانتا مگر ہونا ضرور ہے۔" ایلچی بہادر نے جیسے

سے کہا۔

"کیا ہوگا نجومی جی؟" سردار تکل نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

"قابل احترام سردار!" ایلچی بہادر نے آنکھیں بند کر لیں۔ "اگر میرا علم غلط نہیں تو مجھے

پیشانی پر دو اور تاج نظر آ رہے ہیں۔ ایک تاج شاہ تاتار کا اور دوسرا تاج سلطنت افغان کا۔

قدموں میں شاہ تاتار اور حاکم کابل کے سر جھکے ہوئے صاف دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ سب

ہوگا؟ میں نہیں جانتا لیکن وہ دونوں آپ کے پاس آئیں گے اور آپ کے آگے سر جھکائیں

سردار تکل کا حیرت سے منہ کھل گیا۔ "آپ عظیم ہیں، نجومی جی! آپ کا علم سچا ہے۔"

کی زبان سے نکلا۔

"مگر میں یہ نہیں بتا سکتا کہ ایسا کب ہوگا۔" ایلچی بہادر نے آنکھیں کھول دیں۔ "اے

اور شاہ کابل! میں آپ کو تعظیم پیش کرتا ہوں۔ آپ کو دونوں ممالک کی تاجداری مبارک ہو۔"

سردار تکل کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "اے عظیم نجومی اگر وہ دونوں حاکم میرے قدموں میں آ جائیں

ان سے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیئے؟"

"اے حاکم!" ایلچی بہادر نے بڑے رعب سے کہا۔ "اس کا جواب ستارے اور ہاتھ کی لکیریں نہیں

یں عقل کے پاس اس کا جواب موجود ہے۔ تخت و تاج خون کی قربانی مانگتا ہے۔ دشمن کو زندہ نہ

نا چاہیئے۔ موقع ملتے ہی اس کا خاتمہ کر دینا چاہیئے۔"

سردار تکل سوچ میں پڑ گیا۔ نجومی کی بات اسے سچی معلوم ہوئی۔ ملک تاتار کا سردار تیمور اور حاکم کابل

ے پاس خود چل کے آئے تھے اس نے انہیں گرفتار کرنے کا ارادہ بھی کیا تھا لیکن وہ دلشاد کی محبت

پھر گیا اور وہ دونوں جان بچا کر نکل گئے۔ اس نے پوچھا۔ "اے عظیم نجومی! ذرا یہ تو دیکھئے اگر میں انہیں

کر دوں تو بھی کیا مجھے تاتار اور کابل کی حکومتیں مل جائیں گی؟"

"وہ حکومتیں تو حاکم خیوہ کی تقدیر کا حصہ ہیں۔ آپ کے سر پر ان حکومتوں کا تاج تو ضرور رکھا جائے

ایلچی بہادر نے اس کے دل کی الجھن محسوس کر لی تھی۔ اس لیے اس نے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے کہا۔

ایک تاجدار کی اعلیٰ ظرفی ہوگی کہ وہ اپنے دشمنوں کو معاف کر دے۔ یا ان کی جان بخشی فرمائے۔"

سردار تکل کو اس سے اطمینان ہو گیا اس نے تیمور اور امیر حسین کو چھوڑ کر غلطی کی تھی لیکن جب اس

یر میں دونوں سلطنتوں کی حکمرانی لکھی ہے تو پھر چھوڑنے یا مارنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس نے

عظیم نجومی! آپ نے بڑی خوشخبری سنائی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی کوئی خدمت کروں۔"

"اے حاکم! شاہوں کی تعظیم اور خدمت ہم نجومیوں کا فرض ہے۔" ایلچی بہادر نے بے نیازی سے

میری خدمت یہی ہے کہ مجھے عزت سے رخصت کر دیا جائے۔" پھر ذرا ٹھہر کر بولا۔ "اگر حاکم کو کوئی اور مشکل

ا ہو تو میں خدمت کے لیے حاضر ہوں۔" ایلچی بہادر نے اب سردار تکل کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔

"ایک مشکل ہے۔" سردار تکل ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولا۔ "اگر نجومی اس کے حل کی صورت پیدا

یں تو میں زندگی بھر احسان مند رہوں گا۔"

"میں اپنی خدمات پہلے ہی پیش کر چکا ہوں حاکم خیوہ ....." ایلچی بہادر نے کہا۔ "اپنی مشکل بیان کیجئے۔"

"شرم محسوس ہوتی ہے۔ آپ کے سامنے کہتے ہوئے۔" سردار تکل سر جھکا کے بولا۔ "عظیم نجومی مجھے

رت سے عشق ہے۔ مجھے وہ کس طرح حاصل ہوگی؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایلچی بہادر نے دوبارہ پوتھی کھولی اور پوتھی کے اوراق اور سردار تنکل کے ہاتھ کی لکیروں کی مدد سے حساب کتاب کرنے لگے۔ ذرا دیر بعد بولے..... "حاکم خیوہ اپنی محبوبہ کا نام بتائیں؟"

"نام دلشاد ہے عظیم نجومی۔"

"دلشاد۔" ایلچی بہادر نے نام دہرایا اور ورق اُلٹنے لگے۔ پھر ایک جگہ ٹھہر کے پوچھا: "نام غلط تو نہیں لکھ رہے ہیں؟"

"نہیں عظیم نجومی! اس دلربا کا نام دلشاد ہی ہے۔" سردار تنکل سرمستی کے عالم میں بولا۔

ایلچی بہادر نے سردار کا ہاتھ دیکھا پھر پوتھی، پھر ہاتھ، پھر پوتھی، یہ عمل اس نے کئی بار دہرایا۔ اس کے بعد اس نے بڑے غصے سے سردار تنکل کو دیکھا۔ سردار تنکل اس کی قہر آلود نظروں سے سہم گیا۔ بولا "کیا ہوا عظیم نجومی! کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی؟"

ایلچی بہادر نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور پوتھی بند کرتے ہوئے غصے سے بولا۔ "حاکم خیوہ! یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ آپ نے میری بات کا اعتبار نہ کیا۔ آپ مجھے جھوٹا اور مکار سمجھتے ہیں۔ ورنہ آپ مجھ سے آزمانے کا کام نہ کرتے۔"

"نہیں..... نہیں آپ کو آزما نہیں رہا ہوں عظیم نجومی۔" تنکل گھبرا گیا۔ "میں نے اپنی مشکل بیان کی۔"

"جھوٹ، بالکل جھوٹ۔" ایلچی بہادر گرجے۔ "اپنی محبوبہ کا نام دلشاد بتاتے ہیں۔ یہ نام دال سے شروع ہو کر دال ہی پر ختم ہوتا ہے اور دال کے دونوں ستارے آپ کی قسمت کے خانے میں موجود ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ کی محبوبہ آپ کے پاس ہے۔ آپ کے قبضے میں ہے۔ آپ مجھے خواہ مخواہ ہی آزما رہے ہیں۔"

سردار تنکل کچھ گھبرایا لیکن زیادہ نجومی کے علم کا قائل ہو گیا۔ فوراً لجاجت سے بولا۔ "عظیم نجومی مجھے معاف کر دیجئے۔ سوال کرنے میں مجھ سے غلطی ہو گئی۔ دلشاد واقعی میرے پاس ہے لیکن اس کی محبت مجھے اب تک حاصل نہیں ہو سکی۔ میری یہی مشکل ہے۔"

ایلچی بہادر کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ مسکرا کے بولے۔ "ہم نجومیوں کو کسی کا مذاق پسند نہیں۔ آپ نے پہلے ہی یہ پوچھا ہوتا ہمیں اتنی محنت کیوں کرنا پڑتی۔"

"چلیے اب معاف کر دیجئے۔ بتائیے مجھے اُس کی محبت کب حاصل ہو گی؟" سردار تنکل نے پوچھا۔

"حاکم خیوہ! جو باتیں آپ سے متعلق تھیں وہ میں نے بتا دیں لیکن اس کا تعلق دوسری ہستی سے ہے۔

میں اس کا ہاتھ دیکھ کر زائچہ تیار نہ کروں۔ آپ کو کیا جواب دے سکتا ہوں۔" ایلچی بہادر آخر حرف پہلے ہی آئے اور دلشاد سے ملنے کی تدبیر پیدا کی۔

"یہ تو کچھ مشکل نہیں۔ میں آپ کو ابھی وہاں لیے چلتا ہوں۔" حاکم خیوہ نے فوراً پیش کش کر دی۔

"لیکن وہ ہاتھ دکھانے پر آمادہ ہو جائے گی؟"

"میں کوشش کروں گا۔ شاید وہ انکار نہ کرے۔"

ایلچی بہادر نے آخر دلشاد سے اپنی ملاقات پکی کر لی۔ اس وقت وہ جس قدر خوش تھے اُس کا بیان نہیں۔ انہیں اپنی کوشش کامیاب ہوتے دکھائی دے رہی تھی۔

سردار تنکل نجومی کو ساتھ لیے ہوئے اپنی حویلی میں داخل ہوا۔ اس نے ایک خادمہ سے دلشاد کے آنے کی اطلاع بھجوائی۔ جب یہ دونوں حویلی کے اس کمرے کے پاس پہنچے جہاں دلشاد موجود تھی تو انہیں بھی ہوئی خادمہ واپس آتی ہوئی دکھائی دی۔ سردار نے پوچھا۔ "کیا جواب دیا ہے دلشاد نے؟"

"انہوں نے اجازت دی ہے، سردار اور کہا ہے کہ سردار کو اجازت مانگنے کی ضرورت نہیں۔" خادمہ نے جواب دیا۔

"دیکھا عظیم نجومی۔" سردار نے نجومی سے کہا۔ "میں نہ کہتا تھا کہ اُسے کوئی اعتراض نہ ہو گا لیکن نام محبوبہ؟"

نجومی ہوں، سر کے سردار کے ساتھ دلشاد کے کمرے میں داخل ہوا۔ دلشاد دروازے کی طرف کے آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ اُس نے آئینے میں سردار کے ساتھ ایلچی بہادر کو داخل ہوتے دیکھا تو اس کا دل خوشی سے کھل اٹھا۔

سردار اور نجومی اس کے قریب پہنچے تو دلشاد نے پلٹ کر ہنستے ہوئے کہا۔ "سردار تنکل۔ اس مہمان سے پکڑ لائے؟"

"دلشاد آغا! کیا کہہ رہی ہو آ" سردار تنکل ترشی سے بولا۔ "یہ عظیم نجومی ہیں۔ ان کی نظریں تمہارے دل تک پہنچ سکتی ہیں۔" اس دوران میں دلشاد اور ایلچی بہادر کی نظریں مل چکی تھیں اور اس خاموش تبادلہ بھی ہو گیا تھا۔ دلشاد نے بڑے نخرے سے کہا۔ "ہوں گے نجومی پھر ہم کیا کریں؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"آپ انہیں اپنا ہاتھ دکھائیں دلشاد آغا" سردار تکل نے نرم لہجے میں کہا۔

"میں نجومیوں پر اعتبار نہیں کرتی میں ہاتھ نہیں دکھاؤں گی۔" دلشاد نے صاف انکار کر دیا۔

سردار تکل شرمندہ سا ہو گیا۔ اُسے بہت غصہ آیا مگر ضبط کر کے بولا۔ "ہماری خاطر ہاتھ دکھا دیں دلشاد آغا۔"

سردار تکل نے اتنی خوشامد اور انکسار سے کہا کہ دلشاد کو ہنسی آ گئی۔ بولی۔ "ہمیں سردار تکل کی خاطر منظور ہے۔" پھر بڑی شوخی سے نجومی کی طرف ہاتھ بڑھا کے کہا۔ "لیجئے۔ دیکھ لیجئے نجومی جی۔ امید ہے آپ کوئی سیدھی بات نہ بتا سکیں گے اور پھر ذلیل کر کے یہاں سے نکالے جائیں گے۔"

"ذلت اور عزت صرف خدا کے ہاتھ میں ہے، لڑکی۔" ایلچی بہادر متانت سے بولے۔ "لیکن میں ہاتھ دیکھ کر اُن تین ستاروں کا حال معلوم کرنا چاہتا ہوں جو تیری پیشانی پہ چمک رہے ہیں۔"

"ستارے، میری پیشانی پر؟" دلشاد نے قہقہہ لگایا۔ پھر دوڑ کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ "نجومی جی آپ کی پہلی بات ہی غلط ثابت ہوئی۔ میرے ماتھے پر کوئی ستارہ نہیں۔"

"ستارے میری نظریں دیکھ رہی ہیں تو نہیں دیکھ سکتی لڑکی۔" پھر نجومی نے سردار تکل کا ہاتھ دیکھا۔ "میں جا رہا ہوں حاکم خیوہ لڑکی بہت ضدی معلوم ہوتی ہے۔ میں اس کا ہاتھ نہیں دیکھوں گا۔"

"واہ دیکھیں گے کیوں نہیں نجومی جی....." دلشاد نے دوبارہ ہاتھ نجومی کی طرف بڑھا دیا۔ "میں سردار کو ناراض نہیں کر سکتی۔"

سردار تکل کے چہرے پر بشاشت آ گئی۔ اس نے مسکرا کے نجومی کو دیکھا جیسے کہہ رہا ہو اب تو ہاتھ دیکھ لو، عظیم نجومی۔"

"تخلیہ۔" ایلچی بہادر نے اپنی مخصوص آواز میں حکم دیا۔

"کیا میں بھی باہر چلا جاؤں؟" سردار تکل نے پوچھا۔

"حاکم خیوہ میں کہہ چکا ہوں کہ علم نجوم اور دست شناسی کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ ان اصولوں کی پابندی ضروری ہے۔" حاکم خیوہ کی طرف منہ پھیر کے دلشاد کو تیز نظروں سے گھورا۔ "پھر یہ لڑکی طرحدار اور شوخ ہے۔"

حاکم خیوہ سر جھکائے چپ چاپ باہر چلا گیا۔ اُس کے حکم سے پوری حویلی خالی کر دی گئی۔ ایلچی

اطمینان کے لیے کھڑکیوں اور دروازوں سے جھانک کر باہر دیکھ لیا۔ انہیں دُور دُور تک کوئی نظر نہ آیا تو وہ مسکراتے ہوئے دلشاد کے پاس آئے۔ دلشاد ایلچی بہادر کے آنے سے بہت خوش تھی اس پر خوف کا بھی غلبہ تھا۔

"ایلچی بہادر۔ مجھے امید تھی کہ آپ لوگ، مجھے بھولے نہ ہوں گے۔" دلشاد نے خود گفتگو کا آغاز کیا۔

"دلشاد آغا وقت بہت کم ہے اور گفتگو بہت ہے۔" ایلچی نے جلدی سے کہا۔ "ہم آپ سے ایک منزل دور ہیں اور جب تک آپ کو آزاد نہ کرا لیں گے آگے قدم نہ بڑھائیں گے۔ آپ اپنا حال بتائیں آپ کو یہاں سے نکالنے کی سوچ رہا ہوں۔ سردار تکل کو آپ سے بہت محبت ہے۔ یہی چیز آپ کو محفوظ رکھے ہوئے ہے۔"

دلشاد نے مختصر طور پر ایلچی بہادر کو اپنی داستانِ غم سنائی اور اس سے درخواست کی کہ اُسے حاکم کے چنگل سے جلد رہائی دلائی جائے ورنہ شاید وہ زیادہ دن تک خود کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ اس نے اپنے طور پر بہت مختصر باتیں کیں لیکن وقت کافی گزر چکا تھا اور خطرہ تھا کہ کہیں سردار تکل آ جائے۔ آخر ایلچی بہادر نے جو ترکیب سوچی۔ وہ دلشاد کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی۔ ایلچی نے کہا۔ "دلشاد آغا میں سردار تکل کو اس بات پر آمادہ کروں گا کہ وہ خیوہ شہر سے قریب ترین پڑاؤ پر تنہا جائے۔ آپ کسی طرح اس کے ساتھ آنے کی کوشش کریں۔ بلکہ ضد کر کے آئیں ہم سواری میں چھپے ہوں گے اور سردار تکل کے وہاں پہنچتے ہی اس پر حملہ کر کے آپ کو آزاد کرا لیں گے۔"

"لیکن ایلچی بہادر تکل اتنا بے وقوف نہیں کہ آپ کے کہنے سے پہاڑی پر اکیلا چلا جائے۔" دلشاد نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔ "اگر وہ جانے پر آمادہ بھی ہو گیا تو اس پہاڑی پر کیسے جائے گا جہاں آپ چھپے ہوں گے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس شہر سے کچھ فاصلے پر چھوٹی بڑی کئی پہاڑیاں ہیں وہ مختلف سمتوں میں ہیں۔"

"یہ آپ کے سوچنے کی چیز نہیں ہے دلشاد آغا۔" ایلچی بہادر نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہا۔ "ہم ایک پہاڑی منتخب کر کے اس پر آگ جلائیں گے۔ اس کا دھواں جب بلند ہو گا تو سردار تکل اس کو دیکھ کر اس پہاڑی پر ضرور جائے گا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مگر کیوں، وہ وہاں کیوں جائے گا، مجھے بھی تو بتایئے ایلچی بہادر؟" دلشاد کو کسی طرح چین نہیں ہو رہا تھا۔

"اچھا تو سنیے، دلشاد آغا" ایلچی نے تفصیل بتانا شروع کی۔ "نکل آپ سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ دلشاد آغا کب تک اس سے ملنے کے لیے آمادہ ہو گی۔ میں اسے جا کر یہ یقین دلانے کی کوشش کروں گا کہ جب پہاڑ دھواں اگلنے لگیں تو وہاں جو دعا کی جائے وہ پوری ہو جاتی ہے۔ امید ہے وہ دھواں دیکھتے ہی پہاڑی کی طرف چل پڑے گا۔ آپ کا اس کے ساتھ یا اس کے بعد پہاڑی کے پاس آنا ضروری ہے۔ اگر سردار نکل کسی وجہ سے نہ آئے تو آپ دھواں دیکھ کر پہاڑی کے پاس آنے کی کوشش کریں۔ پھر ہم سنبھال لیں گے مرد ایک ترکیب ہے اگر ہم اس ترکیب میں ناکام ہو گئے تو پھر کام اور مشکل ہو جائے گا۔"

سردار نکل واقعی واپس آ گیا۔ نجومی پر وہ لاکھ اعتبار کرتا تھا لیکن دلشاد کے پاس اس کی دیر تک رہنا پسند نہ آیا۔ اور وہ بے چین ہو کر آ گیا۔ کسی کے آنے کی آہٹ سن کر نجومی نے زور زور سے بولنا شروع کر دیا اور بڑھ کر خود ہی دروازہ کھول دیا۔ سردار نکل نے متجسس نظروں سے

"بس نے اپنا کام کر لیا ہے حاکم خیوہ" نجومی نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ "منزل قریب اور بہت قریب ہے۔"

"کیا واقعی" سردار نکل خوش ہوتے ہوئے بولا۔ "دلشاد آغا نے تو مجھے چار پانچ مہینے انتظار کرنے کے لیے کہا ہے۔"

"وہ بڑی ضدی لڑکی ہے حاکم خیوہ" نجومی نے قدرے غصے سے کہا۔ "لیکن اس کے دل میں آپ کی محبت موجود ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ بھی دیکھا اور زائچہ بھی بنایا تھا اگر میرا علم اور حساب وغیرہ درست ہے تو آپ کی آرزو ان دنوں پوری ہو گی جب پہاڑیاں آنسو بہائیں گی اور آہیں بھریں گی۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں عظیم نجومی؟" سردار نکل نے رکتے ہوئے کہا۔ "کہیں پہاڑیاں بھی رویا آہیں بھرتی ہیں۔"

"حاکم خیوہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں" نجومی زور دے کر بولا۔ "میں ابھی سمجھاتا ہوں۔"

آہیں ہوں گی۔"

دونوں باتیں کرتے ہوئے دلشاد کی حویلی سے سردار نکل کی حویلی میں آ گئے تھے۔ دوپہر ہونے کی وجہ سے گرمی میں شدت پیدا ہو گئی تھی۔ سردار نکل نے شربت لانے کا حکم دیا۔ سردار نکل شربت پیتا رہا لیکن چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے نجومی کی بات پر یقین نہیں آیا۔ نجومی نے بڑے اطمینان سے شربت کا گلاس خالی کیا پھر بولا۔ "ہاں حاکم خیوہ! کس بات پر تعجب ہے آپ کو؟"

"جی کسی بات پر نہیں عظیم نجومی" سردار نکل نجومی کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتا تھا اور شبہ بھی ظاہر کرنے کا خواہش مند تھا۔ آخر بہت سوچ کے پوچھا۔ "عظیم نجومی! یہ پہاڑیوں کے آنسو بہانے اور آہیں بھرنے کا واقعہ کب تک پیش آتا ہے؟"

"آپ کے دل میں ابھی تک شک ہے، حاکم خیوہ" نجومی نے سنجیدگی سے کہا۔ "یاد رکھیے اس پر یقین کیجیے کہ جس طرح ہم زمانے کے گرم و سرد سے متاثر ہوتے ہیں۔ یہ شجر و حجر بھی متاثر ہوتے ہیں۔ ان میں بھی جان ہے اور ہمارے جیسے جذبات موجود ہیں۔ خوشی ہوتی ہے تو ہنستے ہیں غم ہوتا ہے تو روتے ہیں۔ درخت سے شاخ کو کاٹ دیا جائے تو وہ بے جان ہو جاتی ہے۔ سوکھ جاتی ہے اگر درخت میں جان ہو تو شاخ اس سے الگ ہونے کے کیوں مرجھائے۔ یہی حال پہاڑوں کا ہے لیکن ان کی رفتار اس قدر سست ہوتی ہے کہ ہم اسے دیکھ نہیں سکتے۔"

حاکم خیوہ، نجومی کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے پوچھا۔ "آپ سچ کہتے ہیں عظیم نجومی۔ آپ عقل مند ہیں مجھے آپ کی باتوں پر کوئی شبہ نہیں لیکن مجھے یہ کیسے معلوم ہو گا کہ پہاڑ آنسو بہا رہے ہیں یا آہیں بھر رہے ہیں؟"

"صبر کیجیے حاکم خیوہ! یہ میں بتاؤں گا۔" نجومی نے کہا۔ "شہر خیوہ سے قریب ترین پہاڑی کتنی دور ہے؟" نجومی یعنی ایلچی بہادر کو معلوم تھا کہ یہاں سے قریب صرف ایک پہاڑی سلسلہ ہے جہاں سے گزر کر وہ خود آیا تھا لیکن اس نے سردار نکل کو الجھانے کے لیے یہ سوال کیا۔

"قریب ترین پہاڑی سلسلہ اچھا پانچ فرلانگ ہو گا" سردار نکل نے اندازہ لگا کے کہا۔ "یہ پہاڑی ہماری حویلی کی چھت سے دکھائی دیتی ہے۔"

"بس مسئلہ حل ہو گیا اب میری بات غور سے سنیے۔" نجومی نے اپنی پوتھی فوراً کھولی اور ورق

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اٹھنے لگا۔ ایک جگہ ٹھہر کے بولا

"یہ سال کا مبارک مہینہ ہے ان دنوں سورج برج دخل میں داخل ہو کر عطارد کی طرف جا
ہے۔ عطارد سے شہاب ثاقب پیدا ہوتے ہیں اور یہ ٹھنڈ سے ہو کر پہاڑوں کے دل گداز کر
دیتے ہیں۔ پہاڑ دنیا والوں کے غم سے بے چین ہو کر آنسو بہاتے ہیں جو شبنم کی شکل میں ور
پودوں اور پھولوں پر گرتی ہے۔ پھر پہاڑ آہیں بھرتے ہیں ان کا سینہ شق ہو جاتا ہے اور اس م
سے دھواں نکلتا ہے۔ یہ دھواں ایک لکیر سی بناتا ہوا آسمان کی طرف بلند ہوتا ہے۔ صبح کو یہ دھوا
دھند کی وجہ سے نظر نہیں آتا لیکن بعد دوپہر اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہی وقت دعا کے قبول ہ
کا ہے۔ ایسے وقت میں اگر کوئی شخص پہاڑ پر جا کر دعا مانگے تو اس کی دعا فوراً قبول ہو جاتی
علم نجوم کا یہ اٹل فیصلہ ہے۔ اس میں آج تک کوئی خلل واقع نہیں ہوا۔"

نجومی نے سر اٹھا کے سردار تنکل کو دیکھا اور پوچھا۔ "آ گیا سمجھ میں؟ آپ کی مراد پور
ہونے والی ہے۔"

سردار تنکل حیران حیران نظروں سے نجومی کو تک رہا تھا اس کے سوال پر چونکا اور سنبھ
کے بولا۔

"عظیم نجومی! میں تو سوائے اس کے اور کچھ نہیں سمجھ سکا کہ پہاڑ سے دھواں اٹھے اور
جا کر دعا مانگی جائے تو وہ قبول ہو گی۔"

"آپ کے سمجھنے کی بس یہی بات تھی۔" نجومی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "حاکم خیوہ
کام ختم ہو گیا۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔ آپ کی محبوبہ آپ کو مل جائے گی۔ آپ اپنی مراد کو پہنچیں گ

"لیکن مجھے کیا کرنا ہو گا عظیم نجومی؟" سردار تنکل نے اس کا دامن پکڑ لیا۔ "جانے سے
پہلے مجھے تو کچھ بتاتے جایئے۔"

"حاکم خیوہ میں نے سب باتیں سمجھا دی ہیں۔" نجومی سنجیدگی سے بولا۔ "آپ دوپہر کے بعد
پہاڑی پر نظر رکھا کیجئے۔ جب دھواں اٹھتا ہوا نظر آئے تو وہاں جایئے اور صدق دل سے دعا
مراد فوراً پوری ہو گی۔ دنوں میں بلکہ گھنٹوں میں۔"

"دنوں میں، گھنٹوں میں۔" سردار تنکل کا دیوانہ خوشی سے پھیل گیا۔ "اے عظیم نجومی! میں

شکریہ ادا کروں۔"

"اور اگر تمہارے ساتھ دشمنی بھی چلی گئی تو۔" نجومی نے بڑی رازداری سے کہا۔

"تو پھر کیا ہو گا؟" سردار تنکل نے اسی رازداری سے پوچھا۔

"تمہارا دشمن اسی وقت پورا ہو جائے گا۔"

"اسی وقت؟"

"ہاں ہاں۔ اسی وقت۔ جب تم واپس آؤ گے تو وہ تمہاری غلام ہو چکی ہو گی۔" نجومی نے سردار تنکل پر کچھ یوں
راز کھلا کہ اسے پورا یقین ہو گیا۔

نجومی کا کام ختم ہو چکا تھا اور اب وہ یہاں سے جلد بھاگنا چاہتا تھا۔ اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھاتے
ہوئے کہا۔

"آپ کہاں جائیں گے۔ میں آپ کو پہنچا دوں گا؟"

"قلندروں کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ میں خود چلا جاؤں گا۔" نجومی نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔

"پھر کب آئیں گے عظیم نجومی؟" تنکل نے چلتے چلتے سوال کیا۔

"تمہاری شادی میں یہ قلندر ضرور شریک ہو گا اور تمہیں آخری منزل پر پہنچائے گا۔" نجومی یہ کہتے ہوئے
کمرے سے نکل گیا۔

اب رات پڑ گئی تھی اور ہر طرف سناٹا چھا گیا تھا۔ نجومی نے احتیاط کے طور پر ایک محافظ ساتھ لے لیا تاکہ
راستے کی پریشانی کے صدر دروازے تک پہنچ جائے۔ صدر دروازے کا محافظ حاکم خیوہ ہونے کے خواب آنکھوں
میں سجائے نجومی کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ نجومی کو آتے دیکھا تو دوڑ کے آیا اور بڑی گرمجوشی سے ملا۔ نجومی نے
اپنے والے محافظ کو واپس بھیج دیا اور محافظ سردار کے ساتھ اوپر کے کمرے میں آ گیا۔

"سردار تنکل کا ہاتھ دیکھا آپ نے؟" سردار نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔

"ہاں دیکھا۔" نجومی بیٹھتے ہوئے بولا۔ "منزل بہت قریب ہے۔ سردار تنکل اسی ہفتے مارا جائے گا۔"

"لیکن؟" سردار نے گھبرا کے پوچھا۔ "لیکن میں نے ابھی اسے قتل کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں بنایا۔"

"اس میں فکر کی کیا بات ہے۔" نجومی نے اسے ہاتھ پکڑ کے اپنے پاس بٹھا لیا

"سردار تنکل اسی ہفتے مارا جائے گا۔ اس کی موت تمہاری سرداری کی دلیل ہے۔ تمہیں خیوہ کا حاکم ہونا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تنکل کسی کے ہاتھ سے بھی مارا جائے..... اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب یہ کہ تم کس طرح حاکم بنو گے اس کا
تو اوپر والا جانتا ہے۔ جو کام ہونا ہوتا ہے، اس کے سامان غیب سے خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہوا۔" سردار خوش ہو کے بولا۔ "میں تنکل کو قتل کرنے سے بچ گیا۔"

نجومی دل میں بہت ہنسا کہ یہ کتنا احمق انسان ہے۔ حاکم خیوہ ہونے کے خواب دیکھ رہا ہے اور ایک قتل سے گھبراتا ہے۔ ذرا دیر بعد نجومی نے کہا۔

"میرا گھوڑا صدر دروازے کے باہر پہنچوا دو مجھے فوراً جانا ہے۔"

"اس وقت، رات میں۔ صبح چلے جایئے گا نجومی جی۔" سردار نے بڑے خلوص سے درخواست کی۔

"قلندروں سے بحث نہیں کیا کرتے سردار۔" نجومی نے سردار کو گھور کے دیکھا۔ وہ گھبرا کے اٹھا اور باہر نکل گیا۔

نجومی کے جانے کے تیسرے دن شہر خیوہ سے قریب ترین پہاڑی پر دوپہر کے وقت ہلکا ہلکا دھواں دکھائی دیا۔ دھواں باریک سی لکیر بناتا ہوا آسمان کی طرف بلند ہو رہا تھا۔ تاتاری اور ترک مسلمان ہونے کے اکثر توہم پرستی کا شکار ہو جاتے تھے۔ وہ صوفیوں، قلندروں اور نجومیوں کے بے حد معتقد تھے۔ یہی وجہ تھی حاکم خیوہ ایک اجنبی نجومی کے فریب میں آ گیا۔ اسے نجومی کی باتوں پر اس قدر یقین تھا کہ روز بعد دوپہر حویلی کی اوپری منزل پر چڑھ جاتا اور شام تک سامنے کی پہاڑی پر نظریں جمائے بیٹھا رہتا۔ اس دن جب اسے پہاڑ پر اٹھتا ہوا دھواں نظر آیا تو وہ خوشی سے پاگل ہو گیا۔ فوراً حویلی سے اترا اور گھوڑا تیار کرنے کا حکم دیا۔ اس نے اپنے خاص دوستوں کو بھی تیاری کا حکم دے دیا۔

دلشاد بھی امید و بیم میں مبتلا اس دن کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ اس نے ساتری کو سمجھا رکھا تھا کہ وہ روز بعد دوپہر حویلی کی بالائی منزل پر جا کر پہاڑی پر نظر رکھے اور جس وقت وہاں سے دھواں اٹھتا دکھائی دے تو وہ دلشاد کو اطلاع دے۔ ساتری بھی حویلی کی اوپری منزل پر بیٹھی پہاڑی کو دیکھ رہی تھی کہ اسے دھواں اٹھتا دکھائی دیا۔ وہ بھاگ کر دلشاد کے پاس پہنچی اور اسے اطلاع دی۔ دلشاد تصدیق کے لیے اوپر گئی اور خود اپنی آنکھوں سے اٹھتا ہوا دھواں دیکھا اس کا دل بھی زور زور سے دھڑکنے لگا اس نے ساتری کو کچھ دینا چاہا۔ وہاں سے نکلنے کی تدبیریں سوچنے لگی۔

ایلچی بہادر نے اسے بتایا تھا کہ پہاڑی پر دھواں دیکھ کر سردار تنکل وہاں جائے گا اس لیے اس نے یہ

سردار تنکل سے اس کے ساتھ جانے کی درخواست کرے گی اور ہر صورت سے باہر نکلنے کی کوشش کرے گی۔ اسی فکر میں تھی کہ اسے سردار تنکل کے آنے کی خبر ملی۔ وہ بہت خوش ہوئی اس کی مشکل آپ ہی حل ہو رہی تھی۔ سردار تنکل بغیر اس کے بلائے، اس کے پاس آ گیا تھا۔ یہ ایک اچھا شگون تھا۔ دلشاد نے اسے تائید غیبی سمجھا اور سردار تنکل سے بہت خوش ہو کر ملی۔

سردار تنکل، اس کے کمرے میں داخل ہوا تو اس کے جسم پر پورا اسلحہ موجود تھا۔ دلشاد نے مسکراہٹ کے بکھیرتے ہوئے پوچھا۔ "خیریت تو ہے سردار تنکل کس سے جنگ کرنے جا رہے ہیں؟"

"آج میں ایک خوبصورت حسینہ کو فتح کرنے جا رہا ہوں۔" سردار کی باچھیں خوشی سے کھلی پڑتی تھیں۔ "نجومی نے کہا ہے کہ آج دوپہر کو گوئی سچ ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ کامیابی میرے قدم چومے گی۔"

دلشاد نے بڑی محبت سے سردار تنکل کا ہاتھ پکڑ کر اپنے بستر پر بٹھایا اور اس کے سامنے بیٹھ کے لگاوٹ سے بولی۔

"سردار تنکل یہ تو بڑی بے وفائی ہے اگر تم کسی اور حسینہ کو حاصل کرنا چاہتے تھے تو پھر ہم پر اس فتح کر کے اپنا گرویدہ کیوں بنایا ہے؟"

دلشاد کی یہ محبت اور لگاوٹ سردار کے لیے بالکل نئی تھی۔ اب تک دلشاد اس سے عزت و وقار سے ملتی تھی اور صرف ادھر اُدھر کی باتیں کرتی تھی لیکن آج وہ بڑی مہربان نظر آ رہی تھی۔ دلشاد کے اس رویے نے سردار کو اور یقین دلا دیا کہ اس کی کامیابی کا وقت آ گیا ہے اور یہ سب نجومی کی وجہ سے ہوا اس نے کہا۔

"دلشاد یقین کرو میرے دل میں تمہارے سوا اور کسی کا خیال نہیں۔ پہاڑی کا دل میرے غم سے گداز ہے۔ میں وہاں دعا مانگنے جا رہا ہوں۔"

"سردار تنکل۔" دلشاد نے بڑی محبت سے سردار تنکل کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "اگر تم واقعی میری محبت کے لیے جا رہے ہو تو اپنی دعا میں مجھے بھی شریک کرو۔ اب ہم اور تم الگ الگ نہیں ہیں۔ غیریت اور اجنبیت کی دیوار گرنے والی ہے۔ اب ہم ہر اہم موقع پر تمہارے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔"

سردار تنکل تو بالکل ریشہ خطمی ہو گیا۔ "دلشاد! جان آفرین! کب مجھے ہمیشہ کے لیے اپنے دل میں جگہ دینے کے لیے تیار ہو؟" سردار نے "آپ" کے بجائے "تم" کا لفظ استعمال کر کے اپنی بے تکلفی کا اظہار کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"سردار ترکمل" دلشاد سر جھکاتے اور شرماتے ہوئے بولی "میرے دل کے تمام وسوسے اور خدشات دور ہو چکے ہیں۔ میں بھی تمہارے ساتھ دعا مانگوں گی۔"

"میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے دلشاد۔" سردار ترکمل خوشی سے پھول گیا۔ "بس چلو جلدی کرو وقت دعا نکل نہ جائے۔"

"اس طرح نہیں، سردار ترکمل۔" دلشاد اٹھلا کے بولی "تم نے اپنے جسم پر اسلحہ سجایا ہے۔ میں بھی اسلحہ کے ساتھ چلوں گی تاکہ خیمہ والوں کو معلوم ہو جائے کہ سردار کا انتخاب غلط نہیں ہے۔"

سردار ترکمل نے فوراً دلشاد کے لیے ہلکا زرہ بکتر منگوایا۔

سردار ترکمل اور دلشاد باہر آئے دلشاد کے لیے ایک گھوڑا منگوایا گیا تھا۔ دلشاد نے دونوں گھوڑوں کو دیکھا۔ سردار ترکمل کا گھوڑا اُسے پسند آیا۔ بولی

"میں تمہارے گھوڑے پر بیٹھوں گی۔"

"لیکن ....." سردار ترکمل کچھ ہچکچایا

"لیکن کیا۔ اگر مجھے لوگوں کا خیال نہ ہوتا تو تم سے کہتی کہ تم بھی میرے ساتھ ہی گھوڑے پر بیٹھ جاؤ۔" دلشاد نے کچھ ایسی وارفتگی سے کہا کہ سردار ترکمل جھوم کر رہ گیا۔ اُسے فضاؤں میں پھلجھڑیاں سی چھوٹتی معلوم ہوئیں۔ دلشاد اس کے گھوڑے کے پاس پہنچ کے رکی۔ ترکمل کو مسکرا کے دیکھا بولی "کیا گھوڑے پر سوار ہونے میں میری مدد نہ کرو گے؟"

سردار ترکمل مست ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا بڑھا اور دلشاد کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے گھوڑے پر سوار کر دیا۔ سردار ترکمل خود دوسرے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

جس وقت یہ لوگ خیمہ سے نکلے تو سردار ترکمل کے ساتھ کئی مسلح سوار تھے۔ دلشاد اتنے سوار دیکھ کر گھبرائی مگر ہنس کے بولی "سردار۔ تم دعا مانگنے جا رہے ہو یا جنگ کرنے۔ اس فوج کو ساتھ لینے کی کیا ضرورت ہے؟"

"دلشاد۔" سردار ترکمل سنجیدگی سے بولا "اس ریگستانی علاقے میں جگہ جگہ دشمن چھپے ہوتے ہیں۔ کا پتہ کس وقت کیا ہو جائے۔ گھر سے باہر جاتے وقت انسان کو پورے انتظام کے ساتھ نکلنا چاہیے۔"

"ہم تمہاری دور اندیشی کی داد دیتے ہیں، سردار ترکمل۔" یہ کہتے وقت دلشاد کا دل بیٹھا جا رہا تھا

معلوم تھا کہ امیر حسین اور تیمور کے ساتھ ساٹھ سوار ہیں۔ حاکم خیوہ کو کوئی نہ کوئی خطرہ ضرور تھا جبھی وہ اتنے سے سوار اپنے ساتھ لایا ہے۔

پہاڑی دم بدم قریب ہوتی جا رہی تھی سردار ترکمل اور دلشاد باتیں کرتے ہوئے آگے چل رہے تھے۔ دلشاد نے پہلے فیصلہ کیا تھا کہ وہ پہاڑی کے قریب پہنچ کے سردار ترکمل پر ایک دم حملہ کر کے اسے ختم کرنے کی کوشش کرے گی پھر بھاگ کر اپنے آدمیوں کے پاس پہنچ جائے گی لیکن ایک تو اب تک اُسے پہاڑی پر اپنے آدمیوں کی موجودگی کی کوئی علامت نظر نہ آئی تھی۔ دوسرے سردار ترکمل بھاری زرہ پہنے تھا اس کا ایک وار میں وہیں ختم ہونا کسی طرح ممکن نہ تھا اور اوچھا وار کر کے اپنی موت کو دعوت دینا کوئی عقلمندی نہ تھی۔

یہ لوگ پہاڑی کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ دلشاد کا دل بیٹھنے لگا۔ پہاڑی پر کسی کی موجودگی کا کوئی نشان دکھائی دیا۔ اس کی نظریں پہاڑی کی چوٹی پر لگی تھیں۔ یکایک دلشاد کو چوٹی پر سورج کی آخری کرنوں میں بہادر کی برچھے دار خود دکھائی دی۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے اپنے گھوڑے کی راسیں ایک دم کھینچیں اور دو قدم پیچھے ہو گئی۔ پھر اس نے راسیں کھینچے کھینچے گھوڑے کو ایڑ دی۔ گھوڑے نے زور لگایا اور بے قابو ہونے لگا۔

"سنبھل کے دلشاد! گھوڑا ذرا منہ زور ہے۔" سردار ترکمل نے اُسے آواز دی۔

"تم فکر نہ کرو ترکمل۔" دلشاد نے گھوڑے کو دو تین چکر دیے پھر زور سے ایڑ دے کر راسیں ڈھیلی کر دیں۔ گھوڑا دلشاد کو لے کر اڑا اور ہوا کی طرح سن سے ترکمل کے پاس سے نکل گیا۔ دلشاد نے گھوڑے کا رُخ پہاڑی کی چڑھائی کی طرف کر دیا۔

سردار ترکمل سمجھا کہ گھوڑا بے قابو ہو کر دلشاد کو لے بھاگا ہے۔ اس نے اپنا گھوڑا بھی اس کے پیچھے ڈال دیا لیکن جب سردار ترکمل کی نظر پہاڑی پر پڑی تو اُسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے پہاڑی نے سواروں کو اگل دیا ہے اسے پہاڑی کے ہر راستے پر سوار ہی سوار اترتے نظر آئے۔ ایک طرف وہ نخلی بھی نمایاں کھینچے نظر آیا جس نے کامیابی کی نوید دی تھی۔ سردار ترکمل سمجھ گیا کہ اس سے دھوکا کیا گیا ہے۔ اس نے فوراً اپنا گھوڑا روک لیا اور اپنے پیچھے آنے والے سواروں کا انتظار کرنے لگا۔ دلشاد کا گھوڑا ہوا سے باتیں کرتا ہوا پہاڑی پر چڑھنے لگا اور وہ جلد ہی اپنے آدمیوں میں پہنچ گئی۔ سردار ترکمل کو تیمور اور امیر حسین بھی نظر آئے جو گھوڑے چڑھائے آگے آگے پہاڑی سے اتر رہے تھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حاکم خیوہ کا سوار دستہ اُس کے پاس پہنچ گیا اور اس نے بھی تیمور کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ لچی بہادر نے تیمور کو یقین دلایا تھا کہ حاکم خیوہ تنہا آئے گا یا اس کے ساتھ پانچ دس محافظ ہوں گے لیکن تیمور ایسے موقعوں پر صرف اپنی عقل اور حکمت عملی پر بھروسہ کرتا تھا۔ اس کے خیال میں جنگ ناگزیر تھی اور اس کے لیے اس نے خود کو تیار کر کے حکمت عملی بھی تیار کر لی تھی۔ دلشاد ان کے پیچھے گئی تھی۔ تیمور نے خیوہ والوں کو اوپر چڑھتے دیکھا تو ہاتھ کے اشارے سے انہیں رکنے کا حکم دیا۔ پھر دوسرا اشارہ کر کے اپنا گھوڑا موڑ کر اوپر کی طرف چڑھنے لگا۔ تیمور نے اپنی رفتار سست رکھی۔ خیوہ والے تیزی سے چڑھ کر ان کے پاس پہنچنا چاہتے تھے۔ چوٹی پر پہنچتے پہنچتے خیوہ والے بالکل تیمور کے سر پر پہنچ گئے۔ تیمور اک دم رکا اس نے باگیں موڑ دیں۔ اس کے ساتھ ہی تیمور کے تمام ساتھی پلٹ پڑے اور خیوہ والوں پر برق بن کر گرے۔ یہ حملہ اتنا زبردست تھا کہ خیوہ والے سنبھل نہ سکے اور مار کھا کے پیچھے ہٹے اور ایسا ہوتے ہوتے نیچے میدان میں آ گئے۔

اب تاتاری اور ترکمان سواروں میں ایک خونریز جنگ شروع ہو گئی۔ تیمور کے تمام ساتھی بارہ بارہ کی ٹولیوں میں بٹ گئے۔ وہ گروہ کی شکل میں ترکمانوں کے لشکر میں گھس جاتے۔ پھر وہاں پہنچ کر بکھر کے لڑنے لگتے۔ وہ جتنی تیزی سے اندر داخل ہوتے اتنی ہی تیزی سے لڑتے بھڑتے نکل آتے پھر جمع ہوتے اور اسی طرح گروہ بن کے گھس جاتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گھوڑوں کی کاٹھیاں سواروں سے خالی ہونے لگیں۔ تیمور، امیر حسین اور خیوہ کا حاکم الگ کھڑے اپنے سواروں کی جنگ دیکھ رہے تھے اور ان کی ہمت بڑھا رہے تھے۔ سب سے زیادہ دلچسپ لڑائی ایلچی بہادر کی تھی۔ وہ کمان کا چلّہ کھینچ کر جس طرف کا رُخ کرتا اُسے حیرت سے دیکھتے لیکن حیرت ان کی موت کا پیغام بن جاتی اور ایلچی کی کمان سے نکلے ہوئے تیر اُن کے زرہ چیر کر جسم میں پیوست ہو جاتے۔ ایک موقع پر ایلچی کے گھوڑے کے تیر لگا۔ گھوڑے نے ٹھوکر بھی کھائی اور ایلچی دور جا گرا۔ اس سے پہلے کہ ایلچی دوسرا گھوڑا پکڑنے کی کوشش کرتا وہ وہیں جم کر کھڑا ہو گیا اور تیر چلانے لگا۔ تیمور کی نظر اس پر پڑی تو گھوڑا دوڑا کر ایلچی کے پاس پہنچا اور اس کی کمان کی زہ کاٹ دی۔ ایلچی کو مجبور ہو کر گھوڑے پر سوار ہونا پڑا اور تلوار بھی نکالنی پڑی۔

اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ امیر حسین کو جوش آ گیا۔ وہ ترکمانوں میں گھس کر حاکم خیوہ تک

پہنچا لیکن ترکمانوں نے اسے گھیر لیا۔ اس وقت تیمور کو مجبور ہو کر اس کی مدد کو جانا پڑا۔ اس نے امیر حسین کو تو نکال لیا لیکن خود گھیرے میں آ گیا۔ خوش قسمتی سے اس کے کئی سوار اس کے پاس پہنچ گئے اور تیمور کو اُن کے نرغے سے نکال لائے۔ خیوہ والوں کی اس جنگ میں دلشاد نے بھی ایک ایسا کارنامہ انجام دیا کہ اس کی محبت اور بہادری کا یہ قصہ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہو گیا۔ اس کا شوہر تمر میں بہت جوشیلا تھا اسے حاکم خیوہ سردار تگل سے نفرت ہو گئی تھی اس لیے وہ بار بار اُسے قتل کرنے کے لیے ترکمان سواروں میں گھس جاتا۔ ایک موقع پر ایسا ہوا کہ امیر حسین کے گھوڑے نے تیر کھا کر اسے بے قابو سے اچھال دیا۔ زمین پر گر کے اٹھنا سخت خطرناک تھا کئی ترکمان اس کی طرف بڑھے دلشاد یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ وہ فوراً اپنا گھوڑا بڑھا کر امیر حسین کے پاس پہنچی اور گھوڑے سے کود کر باگیں اس کے ہاتھ میں پکڑا دیں۔ امیر حسین سوار ہو کر پھر لڑنے لگا۔ اور دلشاد تلوار چلاتی اپنی جگہ واپس

تیمور نے دیکھا کہ اس کے آدمی ختم ہوتے جا رہے ہیں اور جنگ کا کوئی فیصلہ نہیں ہو رہا تو اس نے آواز دی اپنے تمام سواروں کو اکٹھا کیا۔ پھر ایک ہاتھ ترکمانوں پر ہلہ بول دیا۔ تاتاریوں کا یہ اجتماعی حملہ فیصلہ کن ہوا کرتا تھا۔ اس کا نتیجہ شکست یا فتح ہوتا تھا۔ ترکمان اس حملے سے دو تک پسپا ہو حاکم خیوہ اس وقت دور کھڑا ہوا اپنے دستوں کو احکامات دے رہا تھا۔ تیمور نے ہلہ بولتے ہی خیوہ کو تاکا اور کمان میں تیر جوڑ کر سردار تگل کا نشانہ باندھا۔ تیر چھوٹا اور سیدھا تگل کا جبڑہ اڑاتا نکل گیا۔ تگل نے چیخ ماری لیکن اس وقت تک تیمور اس کے پاس پہنچ چکا تھا اس نے تیزی سے تگل پر برچھی کا وار کیا تو نیزہ کو پھلانگتی ہوئی تگل کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ حاکم خیوہ زمین پر گر گیا۔ خیوہ والوں کے قدم اکھڑ گئے۔ وہ دہشت زدہ ہو کر ایک جگہ سمٹ گئے۔ تیمور اپنے سواروں کو آوازیں دیتا پہاڑی پر چڑھنے لگا۔

ممکن ہے کہ خیوہ والوں نے اُن کا تعاقب کیا ہو لیکن اندھیرا ہو چکا تھا اس لیے وہ تیمور تک نہ پہنچ سکے۔ تیمور اوپر پہنچ کے بغیر رُکے نیچے اترنے لگا۔ دوسری طرف پہنچ کے جب اس نے اپنے سواروں کو شمار کیا تو ساٹھ سواروں میں سے صرف سات زندہ بچے۔ ان میں سے بھی بیشتر زخمی تھے۔ امیر حسین کو زخم آئے تھے۔ تیمور نے ٹھہر کر آرام کیا تھا لیکن تیمور نے سفر جاری رکھا اور یہ لوگ آدھی رات تک اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دشت میں چلتے رہے۔ آخر وہ ایک کنویں پر پہنچے۔ اس کا پانی میٹھا تھا۔ یہاں انہوں نے قیام کیا اور جگہ انہیں اپنے تین تاتاری سپاہی مل گئے جو بلخ سے پیدل بھاگ کر آئے تھے۔ اب ان کی تعداد سات ہو گئی۔

سب لوگ آرام کرنے لگے۔ امیر حسین اور تیمور جاگتے رہے اور مشورہ کرتے رہے۔ امیر حسین نے خدشے کا اظہار کیا۔

"ہماری تعداد بہت کم ہو گئی ہے ہم کسی بھی مصیبت میں گرفتار ہو سکتے ہیں۔"

تیمور بھی انہی خطوط پر سوچ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"اب اس دشت میں ہم دونوں کا ایک ساتھ سفر کرنا بہتر نہیں ہے۔ اس طرح ہمارے پکڑے جانے کا امکان بھی ہے۔"

"پھر کیا کہنا چاہتے ہو؟" امیر حسین نے پوچھا۔

"ہمیں فوراً الگ ہو جانا چاہیئے تاکہ ہم عام مسافر معلوم ہوں۔" تیمور نے یہی فیصلہ کر لیا تھا۔

"تم کدھر جاؤ گے؟"

"میں بحیرۂ خوارزم پہنچ کر شاہراہِ خراسان تلاش کروں گا اور تم کہاں جاؤ گے؟" تیمور نے پوچھا۔

"میں قندھار پہنچ کر پھر قسمت آزمائی کروں گا۔" امیر حسین نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔

"ٹھیک ہے۔" تیمور نے کہا۔ "میں بھی لشکر فراہم کر کے قندھار پہنچوں گا۔ انشاء اللہ وہاں ملاقات ہو گی۔"

امیر حسین اور تیمور نے باہم مشورہ سے دوسری ملاقات کے لیے گرم سیر ہیرمن کا مقام طے کیا۔ یہ مقام سستان میں قندھار کے قریب دریائے ہلمند کے کنارے واقع تھا۔ یہ منصوبہ بنانے کے بعد وہ دونوں بھی آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔

صبح اٹھے تو ایک اور مصیبت سامنے آئی۔ بلخی سپاہی رات کے کسی پہر تین گھوڑے چرا کر غائب ہو گئے تھے۔ اب صرف چار گھوڑے باقی تھے۔ تیمور نے الجائی کے لیے صرف ایک گھوڑا مانگا۔ اس کے ساتھیوں نے اسے دو گھوڑے دے دیئے۔ دو گھوڑے امیر حسین کے پاس آئے۔ تیمور نے اپنے ساتھ صرف ایک آدمی رکھا اور ایلچی بہادر کو حکم دیا کہ وہ شہر سبز جا کے امیر حسین کی واپسی کا انتظار کرے۔ پہلے امیر حسین، درشاد، ایلچی بہادر وغیرہ روانہ ہوئے۔ یہ منظر بڑا اداس اور دردناک تھا۔ سب کی آنکھیں اشک بار تھیں۔ کسی کو بھی علم نہ تھا کہ وہ دوبارہ مل بھی سکیں گے یا نہیں۔

امیر حسین کے جانے کے بعد تیمور نے ایک گھوڑے پر الجائی اور جہانگیر کو سوار کیا۔ دوسرے گھوڑے پر سامان بار کیا اور بسم اللہ کہہ کر گھوڑے کی لگام پکڑ کے پیدل سفر شروع کیا۔

الجائی خاتون کی آنکھیں غم ناک ہو گئیں۔ اس نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میرے سرتاج! مجھے افسوس ہے آپ کو پیدل چلتے دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہتی۔ میری بدبختی کی یہ انتہا ہے۔"

تیمور نے ایک نظر الجائی خاتون کے تپتے ہوئے چہرے پر ڈالی۔ پھر سر جھکا کے چلنے لگا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مردے کی شادی

جنازے کو قبرستان کے باہر ہی روک لیا گیا۔

پچاس ساٹھ کے قریب بوڑھے جوان تاتاری جنازے کے ساتھ تھے۔ جنازہ رکا تو سب گھبرا گئے سب ہی نے گردنیں اٹھا کے آگے کی طرف دیکھا۔ قبرستان کے دروازے پر ایک مغل سوار راستہ روکے کھڑا تھا۔ تاتاری اگرچہ پوری طرح مسلح نہ تھے لیکن تلوار ہر ایک کی کمر سے لٹکی تھی۔ یہ اس زمانے کا دستور تھا اور ضرورت بھی۔

شہر سبز کے مولانا زین الدین لوگوں کو ہٹاتے آگے بڑھے۔ ہر ایک نے سرگوشی کی۔

"مغل آگئے کسی نے مخبری کی ہے"

مولانا زین الدین بڑھتے ہوئے جنازے کے آگے پہنچ گئے۔ کاندھا دینے والوں نے جنازہ نیچے رکھ دیا۔

"یہ جنازہ ہے مغل سوار؟" مولانا نے مغل سوار کو گھور کے دیکھا۔

"معلوم ہے، لیکن یہ اندر نہیں جائے گا" مغل سوار نے کاندھے سے بھاری کمان اتار کے تیر چڑھا لیا۔

"کیوں نہیں جائے گا۔ خانِ اعظم نے ہمیں مذہبی تحفظ دیا ہے" مولانا بھی اکڑ گئے۔ "بلاد شمالیہ کے خانِ اعظم نے سمرقند پر قبضے کے وقت واقعی یہ اعلان کیا تھا کہ تاتاریوں کے مذہبی معاملات میں کوئی دخل نہ دیا جائے گا۔"

مغل سوار نے کوئی جواب تو نہ دیا لیکن کمان کا چلّہ اس طرح کھینچا جیسے وہ تیر چلا دے گا۔ صورتحال بڑی خوفناک ہو گئی۔ تاتاریوں کے ہاتھ بھی آہستہ آہستہ تلواروں کی طرف بڑھے مگر ہاتھوں میں لرزش تھی اور چہرے دھواں دھواں ہو رہے تھے۔ مغل حاکم تھے اور تاتاری محکوم۔ پچاس تاتاریوں کے سامنے ایک مغل سوار۔ حاکم و محکوم کی زندہ مثال۔ مولانا نے فوراً ہاتھ کے اشارے سے تاتاریوں کو روکا۔ ان کے اٹھتے ہاتھ جہاں تھے وہاں رک گئے۔ بزدلی کو مصلحت کا سہارا مل گیا۔ شجاعت کی لاج رہ گئی۔

مولانا زین الدین نے کھنچی کمان کے سامنے سینہ کر دیا۔ دو قدم بڑھ کے بولے۔

"مغل سوار تمہارا تعلق حاکم طبقے سے ہے۔ تم ہمارے لیے قابلِ احترام ہو لیکن یہ تو بتاؤ تم نے جنازہ کیوں روکا ہے؟ یہ تو ہماری رسم ہے تم بھی اپنے مردوں کو دفن کرتے ہو!"

"پہلے تمہاری تلاشی لی جائے گی" مغل سوار نے کمان نیچی کر لی۔

"بسم اللہ" مولانا نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ "ضرور تلاشی لو۔ ہمارے پاس سوائے کفن کے اور کچھ نہیں ہے" مولانا کی کمر کے ساتھ بھی ایک چھوٹی تلوار لٹکی تھی۔

اس وقت ایک طرف گرد اڑتی دکھائی دی۔ پانچ اور مغل سوار آگئے۔ انہوں نے آتے ہی جنازے اور تاتاریوں کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ تاتاریوں کا خون بالکل ہی خشک ہو گیا۔

"تلاشی ہو چکی؟" آنے والوں میں سے ایک نے پوچھا

"ابھی نہیں" پہلے مغل سوار نے جواب دیا۔

"ہم تلاشی کے لیے تیار ہیں" مولانا نے لقمہ دیا۔ "ہمارے پاس کچھ نہیں ہے"

مغل سواروں میں سے ایک مولانا کے قریب گھوڑا بڑھا کر آیا۔ بولا "مولانا تلاشی تمہاری ہی جنازے کی ہو گی"

ایک لمحے کے لیے تو مولانا زین الدین کا سر چکرایا مگر وہ فوراً سنبھلے۔ انہوں نے پلٹ کر جنازے کو دیکھا۔ پھر تاتاریوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔

"کیا تم میت کی تلاشی لو گے؟" مولانا نے حیرت کا اظہار کیا۔ "جنازے کا کفن اتارو گے تم سوا یہ میت کی بے حرمتی ہے۔ ہم یہ جنازہ لے کر خانِ اعظم کے پاس چلتے ہیں۔ ہمارا فیصلہ خانِ اعظم کے سامنے ہو گا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ حکم بھی خانِ اعظم کا ہے۔" مغل سوار گھوڑے سے اتر پڑے۔ دو مغل آگے بڑھے اور جنازے سے پانچ قدم کے فاصلے پر آ کر رک گئے۔ ایک نے کہا۔

"خانِ اعظم کو بتایا گیا ہے کہ تم لوگ جنازے کا ڈھونگ رچا کر قبرستان میں اکٹھے ہوتے ہو اور یہاں بیٹھ کے بغاوت کے منصوبے بناتے ہو۔ ہم دیکھیں گے کہ کفن کے اندر لاش بھی ہے کہ تم نے دھوکا دیا ہے۔"

جنازے کے ساتھ آنے والے تاتاریوں کو خوف سے پسینہ آ گیا۔ موت انہیں اپنے سامنے کھڑی دکھائی دی۔ مولانا زین الدین نے حواس پر قابو رکھا اور جنازے کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔

"مغل سوارو۔" مولانا نے بڑے استقلال سے کہا۔ "ہم لوگ میت کو نہلا دھلا کر کفناتے ہیں۔ تم بغیر نہائے میت کو کیسے ہاتھ لگا سکتے ہو؟"

مغل شاید جھگڑے سے گریز کرنا چاہتے تھے۔ ایک مغل مولانا کے پاس آیا اور نرمی سے بولا۔ "ذرا کرو مولانا ہم تمہارے مذہب میں دخل دینا چاہتے ہیں اور نہ لاش کو ہاتھ لگائیں گے۔ صرف اپنا شک دور کرنا چاہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" مولانا نے سر ہلایا۔ "تم اپنا شک دور کر لو۔ میں میت کا کفن ہٹا کے تمہیں دکھائے دیتا ہوں پھر تو تمہارا اطمینان ہو جائے گا۔"

مغلوں نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔ مولانا آہستہ آہستہ جنازے کے پاس جا کے رُکے اور جھک کر میت کے سر سے کفن ہٹانے لگے۔ وہ اس قدر جھکے کہ اُن کا سر میت کے سر تک پہنچ گیا۔ مولانا نے کفن ہٹاتے وقت پتہ نہیں کیا پڑھ کر پھونکا کیا کچھ آہستہ سے کہا اور کفن آہستہ سے میت کے سر سے ہٹا دیا۔ میت کا سُنسناتا اور پھیکا پھیکا چہرہ دکھائی دینے لگا۔

مولانا نے گھوم کر کہا۔ "دیکھ لو مغل سوارو۔ چاہو تو ٹٹول کر بھی دیکھ سکتے ہو۔ یہ پوری میت ہے صرف سر نہیں ہے۔ اپنے ساتھیوں کو بھی بُلا کے دکھا دو۔" لیکن مغلوں کے جواب دینے سے پہلے ہی انہوں نے کفن ڈھکنا شروع کر دیا۔

"دیکھ لیا۔ ٹھیک ہے۔ یہ واقعی ایک میت ہے۔" ایک مغل نے دوسرے سے کہا۔ "ہمارا اطمینان ہو گیا۔" دونوں مغل اپنے ساتھیوں کے پاس واپس چلے گئے۔

"اچھی طرح اطمینان کر لیا ہے؟" کسی نے پوچھا۔

"ہاں ہاں دیکھ لیا۔ جوان آدمی کی لاش ہے۔"

"کیا کسی نے قتل کر دیا تھا اسے؟" کسی نے کہا اور سب مغل سوالیہ نظروں سے مولانا کو دیکھنے لگے۔ مولانا اس وقت تک کفن ڈھک کر اوپر چادر بھی ڈال چکے تھے۔ انہوں نے افسردگی سے کہا۔ "قتل کسی نے نہیں کیا۔ صبح تک اچھا بھلا تھا بس اک بلا چمٹ گئی اسے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چٹ پٹ

"بلا چمٹ گئی؟ کیسی بلا؟" تو ہم پرست مغلوں کے کان کھڑے ہو گئے۔

"کیا بتائیں۔ اس بلا نے کئی گھرانے تباہ کیے ہیں۔" مولانا نے جیسے سسکی بھری۔ "جس سے چمٹتی ہے ایڑیاں رگڑنے لگتا ہے اور تڑپ تڑپ کے جان دے دیتا ہے۔ دوا تو اُس کے حلق سے اترتی ہی نہیں۔ ایک ہفتے میں پندرہ آدمیوں کی جانیں لے لی ہیں اس ظالم بلا نے۔ کسی سے کچھ بنائے نہیں بنتا۔"

مولانا زین الدین نے کچھ اس انداز سے بلا کی تفصیل بیان کی کہ مغل گھبرا اُٹھے۔ ایک نے کہا۔ "لے جاؤ اسے جلدی سے ٹھکانے لگا دو۔"

مولانا نے جنازہ اٹھانے کا اشارہ کیا اور تاتاری جنازہ اٹھا کے کلمہ شہادت پڑھتے قبرستان میں لے گئے۔ مولانا نے اطمینان کا سانس لے کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ اُن کا خیال تھا کہ مغل مطمئن ہو کر واپس چلے گئے ہوں گے لیکن اُن کی سانس جیسے رک کر رہ گئی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ مغل گھوڑوں پر سوار جنازے کے پیچھے قبرستان میں داخل ہو رہے ہیں۔ مولانا آگے آگے تھے اور تاتاری جنازہ اٹھائے ہوئے مسافر کی طرح قبرستان کی کچی اور بل کھاتی پگڈنڈیوں پر لرزاں ترساں آگے بڑھ رہے تھے۔ نظریں بڑی تیزی سے قبرستان میں اِدھر اُدھر کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ معاً ایک جگہ ان کی نظر ہاں گورکن ایک قبر کھود رہے تھے۔ مولانا نے جنازہ اٹھانے والوں کو ایک پگڈنڈی کی طرف اشارہ خود قبریں پھاندتے گورکنوں کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے گورکنوں سے جلدی جلدی کچھ باتیں پھر قبر کی مٹی پر کھڑے ہو کر بڑے اطمینان سے جنازے کو ادھر لانے کا اشارہ کیا۔

جنازہ چکر کاٹ کر قبر کے پاس پہنچ گیا۔ بلا کے نام سے مغل سوار خوفزدہ ہو گئے تھے۔ وہ قبر سے ذرا ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ مولانا نے جنازے کو قبر میں اتارنے کا حکم دیا۔ جنازے سے چادر ہٹائی گئی اور روایتی انداز میں قبر میں اتار دیا گیا۔ مغل سوار اب تک وہیں کھڑے تھے۔ اب مولانا کی آنکھوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں بھی آنسو آ گئے۔ ذرا ہچکچاہٹ کے ساتھ انہوں نے قبر کو پتھر سے بند کرنے کا اشارہ کیا۔ پتھر کی لکڑی کے تختوں کے بجائے قبر کو پتھر کی سلوں سے بند کیا جاتا تھا۔ ایک سل قبر پر رکھی گئی۔ دوسری سل قبر پر رکھی جانے لگی تو سل اٹھانے والوں کے ہاتھ کانپنے لگے۔ مولانا کی آنکھوں سے اشک بہہ رہے تھے۔ اسی وقت ایک اور جنازہ قبرستان میں داخل ہوا اور مغل سوار فوراً گھوڑے بڑھا کر اُدھر چل پڑے۔

"جلدی نکالو اسے کہیں مر نہ جائے۔" مولانا گھبرائے ہوئے لہجے میں بولے اور جلدی سے خود قبر میں اتر گئے۔ پتھر کی دونوں سلیں قبر سے ہٹا دی گئیں۔ مولانا نے میت پر سے کفن کھینچ لیا اور کہا۔

"اٹھ جا اللہ کے حکم سے تیری قربانی اللہ کے حضور قبول ہو گئی۔" اور پھر کفن کے اندر سے ایک جوان "اللہ اکبر" کہتا ہوا نکل آیا۔ اس کے جسم پر عام تاتاریوں کے کپڑے تھے جسے کفن سے چھپایا گیا تھا۔ مولانا نے تاتاری جوان کو گلے لگا کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ دونوں قبر سے باہر آ گئے۔ مصنوعی جنازہ لانے والے تاتاریوں کے چہرے خوشی سے دمک اٹھے۔ مغل دوسرے جنازے کی پڑتال میں لگے تھے۔ وہ میت اسی قبر کے لیے آئی تھی جس میں مولانا گورکنوں کے تعاون سے ایک زندہ تاتاری کو دفن کر رہے تھے۔

مغل سوار دوسرے جنازے کی تلاشی لے کر واپس چلے گئے۔ دوسرا جنازہ قبر پر آیا تو وہ طرح شفاف تھی جیسے ابھی ابھی تیار ہوئی ہے۔ مولانا اور اُن کے تمام ساتھی اس جنازے میں شریک ہوئے اور فاتحہ پڑھنے کے بعد واپس ہو گئے۔ مغل سوار پہلے ہی جا چکے تھے۔ مولانا اپنے ساتھیوں کو لے کر قبرستان کے اس تاریک گوشے میں آ بیٹھے جہاں کسی کی نظر نہیں پہنچ سکتی تھی۔ قبرستان کا یہ گوشہ واقعی بغاوت اور جنگِ آزادی کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ شہر میں کسی جگہ اتنے آدمیوں کا اکٹھا ہونا ممکن نہ تھا۔ مغل سوار اور جاسوس ہر جگہ ٹوہ میں لگے رہتے تھے۔ انہیں کسی طرح کا شبہ ہوتا کہ تیمور زندہ ہے اور وہ سمرقند آنے کا ارادہ کر رہا ہے۔

آج کے حادثے نے تمام لوگوں کو پریشان کر دیا تھا۔ اب قبرستان میں جمع ہونا بھی مشکل تھا۔ مولانا کے پیشِ نظر اب سب سے اہم مسئلہ کسی معقول جگہ کا انتخاب تھا جہاں جمع ہو کر وہ اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ لیکن اس پریشانی کے باوجود لوگ آج کے واقعہ پر ہی دل ہنس رہے تھے۔ ایک تاتاری نے مصنوعی میت سے پوچھا۔

"عاصم! مولانا زین الدین نے تمہارا منہ کھولتے وقت تمہارے کان میں کچھ کہا تھا؟"

"ہاں۔ انہوں نے مجھے حریت کا پیغام دیا تھا۔" عاصم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "حریت کا وہ پیغام جو ہمارے سامنے ہمیں آگے بڑھتا ہے۔ مولانا نے مجھ پر جھک کر سرگوشی کی تھی کہ اے عاصم اگر جنگِ آزادی کا پہلا شہید بننا ہے تو خاموشی سے قربانی پیش کر دے۔ اگر تجھے قبر میں دفن بھی کر دیا جائے تو منہ سے اُف نہ نکالو اور میں نے مولانا کے حکم پر عمل کر لیا تھا کہ اس اعزاز کو ضرور حاصل کروں گا۔ وہ تو خدا نے میری جان بچائی ورنہ میں اسی قبر میں دفن ہو جاتا اور حریت پسندوں کا راز نہ کھلنے دیتا۔"

"شاباش عاصم۔" پوچھنے والے نے اس کی پیٹھ ٹھونکی۔ "ہمیں تمہارے ہی جیسے جوانوں کی ضرورت ہے۔ آزادی خون مانگتی ہے اور ہمیں اس کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔"

مولانا زین الدین کے کانوں میں یہ بات پڑی تو وہ افسردگی سے بولے

"آزادی خون مانگتی ہے لیکن خون دینے والے کتنے ہیں۔ تاتاریوں کی آبادی اتنی ہے کہ اگر فوج تیار کی جائے تو کم از کم ایک لاکھ سواروں کا لشکرِ عظیم تیار ہو سکتا ہے لیکن شہر سبز سے سمرقند تک دوڑ دھوپ کرنے کے باوجود مجاہدین کی تعداد اب تک پچاس سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اس میں بھی غدار موجود ہیں۔"

"ہم میں کوئی غدار نہیں مولانا۔" ایک تاتاری نے احتجاج کیا۔ "ہم نے اپنی جانیں آزادی کے لیے وقف کر دی ہیں اگر وقت پڑا تو آپ دیکھیں گے کہ ہم میں سے ہر ایک عاصم جیسا کردار ادا کرے گا۔"

"بہادر اور محبِ وطن تاتاریوں مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں۔" مولانا بولے۔ "افسوس تو ان خبیث لوگوں پر ہے جو ہمارے سامنے بڑھ بڑھ کے باتیں کرتے ہیں اور درپردہ ہمیں تباہ کرنے کے درپے ہیں۔ ہمیں ایسے لوگوں سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ ہمارے اس منصوبے کی خبر بھی کسی ایسے ہی غدار نے خان اعظم تک پہنچائی ہے ورنہ اُسے کیسے معلوم ہوتا کہ ہم قبرستان کیوں آتے ہیں؟"

"خدا ایسے لوگوں کو غارت کرے۔" ایک تاتاری نے بلند آواز سے بددعا دی۔

"آمین۔" کہہ کر لوگوں نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

مولانا گہری سوچ میں ڈوبے تھے۔ بہت سوچ بچار کے بعد انہوں نے سمرقند کے قبرستان کا یہ گوشہ اپنی سرگرمیوں کے لیے ڈھونڈا تھا لیکن اب اس جگہ اکٹھا ہونا خطرے سے خالی نہ تھا۔ بہت دیر بعد وہ سر اٹھا کے بولے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میرے ساتھیو اس قبرستان میں ہمارا یہ آخری اجتماع ہے۔ آئندہ ہم کسی اور جگہ اکٹھے ہو کریں گے۔" اب تم لوگ ایک ایک کر کے قبرستان سے چلے جاؤ۔"

تاتاری اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسی وقت ایک تاتاری مولانا کے پاس پہنچا اور آہستہ سے بولا۔ "مولانا محترم مغرب سے آنے والے ایک مسافر نے مجھے ایک خبر سنائی ہے۔"

مولانا نے فوراً لوگوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ لوگ بیٹھ گئے۔

"کیا خبر سنائی مسافر نے؟" مولانا نے بے چینی سے پوچھا۔ یہ اجتماع اسی لیے ہوا کرتا تھا کہ اگر کسی کو کوئی نئی خبر ملی ہے تو وہ سب کو بتائے یا کوئی نیا مشورہ ہو تو وہ پیش کیا جائے۔

تاتاری نے ذرا خاموشی اختیار کی جیسے وہ خبر کو ذہن میں ترتیب دے رہا ہو۔ پھر بولا۔

"مولانائے محترم۔ مسافر نے سرخ ریگستان میں ایک مرد اور ایک عورت کو دیکھا جن کے پاس ایک مریل گھوڑا اور ایک کمزور سا اونٹ تھا۔ عورت گھوڑے پر سوار تھی اور مرد اونٹ کی نکیل پکڑے پیدل چل رہا تھا۔ میں نے جب اس سے مرد کا حلیہ پوچھا تو اس نے جو بتایا اُس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ہمارے سردار تیمور بہادر تھے اور وہ خاتون، خاتونِ الجائی تھیں۔"

مولانا سوچتے ہوئے بولے۔ "تمہارا اندازہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ سرخ ریگستان میں تو اس طرح مرد اور عورتیں پانی اور کھانے کی تلاش میں بھٹکتے ہی پھرتے ہیں۔"

"مولانائے محترم۔" تاتاری نے ادب سے کہا۔ "آپ صحیح فرماتے ہیں لیکن اس مسافر نے یہ بھی بتایا کہ عورت اپنی گود میں ایک پانچ سال کا بچہ لیے گھوڑے پر بیٹھی تھی۔"

"کیا سچ؟" مولانا خوشی سے چیخ پڑے۔ "اُن کا رخ کدھر تھا۔ کیا وہ شہر سبز یا سمرقند کی طرف آ رہے تھے؟"

"نہیں مولانا۔" تاتاری روہانسی آواز میں بولا۔ "وہ لوگ شاہراہِ خراساں کی تلاش میں تھے۔ مسافر سے انھوں نے اس شاہراہ کے بارے میں پوچھا تھا۔"

"اس میں افسردہ ہونے کی کوئی بات نہیں۔" مولانا نے سب کو یقین دلایا۔ "الجی بہادر نے بھی یہ بتایا تھا کہ شہر سبز کے امیر تیمور کا ارادہ شاہراہِ خراسان پر پہنچنا ہے جہاں سے وہ اپنی عسکری مہموں کا از سرِ نو آغاز کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خبر ہمارے لیے کسی نوید سے کم نہیں۔ ہمارے لیے یہ کیا کم ہے کہ امیر تیمور

اور بہادر الجائی زندہ و سلامت ہیں۔"

○

۱۳۶۰ء اور ۱۳۷۵ء کا درمیانی عرصہ تاتاری قوم کے لیے بڑا دور ابتلا تھا۔ تاتاری علاقہ، کابل کے شمالی علاقے، ایران کے شمالی اضلاع، بخارا، ماوراء النہر اور روسی ترکستان کے بیشتر حصوں پر مشتمل تھا۔ ان حصوں میں خجند، بلخ، شبرغان، بدخشاں، ارجنگ اور سرپول میں تاتاریوں کے مختلف قبائل کی آزاد ریاستیں تھیں جو ہمہ وقت خانہ جنگی کی مبتلا رہتی تھیں۔ تاتاریوں کی اس خانہ جنگی سے مغلوں نے فائدہ اٹھایا اور آخر مغلوں نے اپنے دوسرے حملے میں ان تمام ریاستوں کو ختم کر کے اپنا قبضہ جمایا۔ تمام قبائل تباہ ہو گئے۔ اُن کے سردار یا تو لڑتے ہوئے مارے گئے یا گرفتار ہو کر قتل ہوئے۔ تیمور کو بھی شہر سبز چھوڑنا پڑا اور اس نے قزل قم (سرخ ریگستان) میں دشت نوردی اختیار کی۔

جس وقت تیمور صحرا میں بھٹک رہا تھا اس کے دو جانباز سردار ایلچی بہادر اور رجا کو برلاس پورے ملک تاتار میں حریت اور آزادی کی شمع روشن کر رہے تھے۔ شہر سبز کے مولانا زین الدین یوں تو بظاہر ایک مذہبی پیشوا تھے لیکن اس وقت آزادی کی تحریک کے وہی سب سے بڑے روحِ رواں تھے۔

مغلوں نے ان کے مذہبی اجتماع پر پابندی لگا دی تھی لیکن جس طرح پانی سنگلاخ چٹانوں کو کاٹ کر اپنا راستہ بنا لیتا ہے، اسی طرح آزادی کے یہ متوالے صلاح مشورے کے لیے کسی نہ کسی جگہ جمع ہو جاتے اور مستقبل کے بارے میں منصوبے بناتے رہتے تھے۔ حریت کے اس دور میں تاتاریوں میں بھی جعفر اور صادق جیسے غدار موجود تھے جو اپنے مغل آقاؤں تک جھوٹی سچی خبریں پہنچاتے رہتے تھے۔ ایک ایسی ہی اطلاع کے تحت مغلوں نے تاتاری جنازوں کی تلاشی کا حکم دے دیا جس سے مجاہدوں کو قبرستان کے اجتماع کو خیرباد کہنا پڑا۔

اس طرف ملک تاتار کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک آزادی کے چرچے ہو رہے تھے۔ انہیں امید تھی کہ تیمور کے واپس آتے ہی مغلوں سے بغاوت کر کے آزادی حاصل کر لیں گے لیکن وہ اُن دنوں دھند آلود ریگستان میں موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ امیر حسین، دلشاد اور اس کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمام ساتھی رخصت ہو چکے تھے اور وہ الجائی خاتون کو گھوڑے پر سوار کیے پیدل سفر کر رہا تھا۔ تیمور کے پاس خوراک ختم ہو چکی تھی۔ خوش قسمتی سے اسے ایک جگہ بکریاں چرتی نظر آئیں۔ تیمور نے ادھر کا رخ کیا۔ بکریوں کا مالک بڑی مشکل سے دو بکریاں فروخت کرنے پر آمادہ ہوا۔ تیمور نے فوراً ایک بکری ذبح کر کے اس کا گوشت بھونا پہلے اپنے ساتھ والے ملازم کو دیا۔ پھر میاں بیوی نے تھیلے جہانگیر کے ساتھ خوش ہو ہو کر مزے سے کھایا۔ دوسری بکری کا گوشت انہوں نے بنتے ہوئے پتھروں پر پتچا کر خورجیوں میں بھر لیا۔ اس طرح گوشت عام طور سے طویل سفر کے دوران استعمال کیا جاتا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ پھر سفر کے لیے تیار ہوئے جیوہ سے چلے ہوئے انہیں چھٹا دن تھا۔ چار دن بعد کھانا پیٹ بھر کے کھایا تھا اس لیے ملازم پر نیند یا کمزوری کا غلبہ ہوا اور اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ تیمور نے الجائی کی طرف دیکھا۔ "کیوں نہ کچھ دیر آرام کر لیا جائے؟"

"نہیں میرے سرتاج! ابھی سفر ختم نہیں ہوا۔" حوصلہ مند الجائی خاتون نے فوراً جواب دیا۔

تیمور نے گھوڑے کی لگام مضبوطی سے پکڑ لی اور ملازم سے کہا۔ "ہمت کرو جوان۔ سفر ابھی ختم نہیں ہوا۔"

ملازم سر کو ایک جھٹکا دے کر سنبھلا اور معذرت بھری نظروں سے تیمور کو دیکھنے لگا۔ تیمور نے غلام کی خاموش معذرت قبول کر لی اور گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے آگے بڑھا۔ بکریوں کا مالک اب تک وہیں بیٹھا انہیں بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ تیمور نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے رک کر پوچھا۔ "کیوں بھائی اس ریگستان سے نکلنے کا کوئی اور راستہ بھی ہے؟"

"جب تمہیں نکلنے کا راستہ معلوم نہیں تھا تو اس ریگستان میں داخل کیوں ہوئے تھے؟" گلہ بان نے جواب دینے کے بجائے ہنس کر تیمور سے الٹا سوال کر دیا۔

تیمور کو اس کے اس تمسخر پر غصہ تو بہت آیا لیکن بڑا نہ مانا اور نرمی سے کہا۔ "بھائی عزت اور ذلت اللہ کی طرف سے ہے۔ وہ بندے کو جس حال میں رکھے اسے خوش رہنا اور صبر کرنا چاہیے۔"

گلہ بان تیمور کی بات سے بڑا متاثر ہوا۔ "ٹھیک کہتے ہو مسافر اللہ جس حال میں رکھے ہمیں اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔" یہ کہتے ہوئے گلہ بان اٹھا اور تیمور کے پاس آ کر بولا۔ "گھبراؤ نہیں مسافر میرے ساتھ آؤ میں تمہیں راستہ بتاتا ہوں۔"

گلہ بان تیمور کو ایک اونچے ٹیلے پر لے گیا اور ایک طرف اشارہ کر کے بولا

"دیکھو مسافر یہ راستہ سیدھا ترکمانوں کے جھونپڑوں کو جاتا ہے۔ وہاں سے ایک راستہ تمہیں جنوب کی طرف جاتا ہوا ملے گا۔ اس راستے پر ہو لینا۔ اگر راستے میں کوئی حادثہ پیش نہ آیا تو انشاء اللہ تم اس ریگستان سے باہر نکل جاؤ گے۔ راستے سے بالکل ادھر اُدھر نہ ہٹنا۔" گلہ بان نے آخری بات پر خصوصیت سے زور دیا۔

تاتاریوں اور ترکمانوں کی بول چال کی زبان قدیم ترکی تھی لیکن تحریریں جو زبان استعمال ہوتی تھی وہ وسط ایشیا کی منگولی اور اویغور تھی۔ یہ زبان اب مٹ چکی ہے۔ تاتاری اور ترکمان اپنی بول چال میں عربی کے بہت سے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ عربی کو اس دور میں ایشیا میں ایک ہمہ گیر حیثیت حاصل تھی۔ مغل بھی ترکی بولتے اور سمجھتے تھے کیونکہ ترکی اور اویغوری زبانیں آپس میں بہت مشابہت رکھتی تھیں۔ یہی وجہ تھی تیمور اور گلہ بان ترکمان کو آپس میں گفتگو کرنے وقت کسی طرح کی پریشانی نہ ہوئی۔

تیمور نے ٹیلے سے واپس آ کر الجائی کو بتایا

"یہاں سے ایک راستہ ترکمانوں کے جھونپڑوں کو جاتا ہے۔ اگر ہم ترکمان تک پہنچ جائیں تو وہاں سے جو راستہ ملے گا وہ ہمیں ریگستان کے باہر پہنچا دے گا۔"

تیمور نے محسوس کیا کہ ترکمانوں کے نام پر الجائی خاتون اور اس کے ملازم کے چہرے پر قدرے ناگوار اور خوف کے آثار پیدا ہو گئے ہیں۔ اس نے کہا۔ "الجائی یہ علاقہ ترکمانوں سے بھرا پڑا ہے ہم ان کے تعاون کے بغیر اس ریگستان سے باہر نہیں نکل سکتے۔ یہ خطرہ تو ہمیں مول لینا ہی پڑے گا پھر خدا نے پانچوں انگلیاں برابر نہیں بنائیں۔"

"ہاں میرے سرتاج۔" الجائی خوش دلی سے بولی۔ "ہم یہاں تک پہنچ گئے ہیں تو خدا آگے بھی ہماری مدد کرے گا۔"

تیمور نے اپنا رخ ترکمانوں کے جھونپڑوں کی طرف کر دیا۔ سورج ڈھل رہا تھا اس لیے ان کے قدم تیز تیز اٹھنے لگے۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا کہ تیمور جھونپڑوں تک پہنچ گیا۔ جھونپڑوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ تیمور نے پہلے جھونپڑے کے پاس پہنچ کر جھک کے اندر دیکھا۔ جھونپڑا خالی تھا۔ تیمور نے دوسرے جھونپڑے پر نظر ڈالی۔ تمام جھونپڑے خالی معلوم ہوتے تھے۔ تیمور کو کچھ تعجب ہوا۔ وہاں کوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

متفکس نظر آ رہا تھا۔ تیمور نے الجائی اور جہانگیر کو گھوڑے سے اتار کر اندر بھیج دیا اور ملازم کے ساتھ سامان اتار کر اندر رکھنے لگا۔ ابھی پورا سامان بھی نہ اترا تھا کہ باہر سے لوگوں کے چلنے پھرنے اور بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ تیمور نے گھبرا کر باہر دیکھا اس کا جھونپڑا ترکمانوں نے گھیر لیا تھا۔ تیمور اور اس کا ملازم کمانیں کھینچے باہر نکلے اور ترکمانوں کو خوف زدہ کرنے کی کوشش کی لیکن ان کی کمانیں تیروں سے خالی تھیں۔ ترکش تو خیمہ والوں سے لڑتے ہوئے خالی ہو گئے تھے۔ ترکمان بھلا دو آدمیوں سے کیوں ڈرتے۔ وہ آہستہ آہستہ جھونپڑے کے اور قریب آ گئے۔

ترکمانوں کا سردار آگے آگے تھا اور تیمور کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ تیمور نے جھنجلا کے کمان پھینک دی اور تلوار کھینچ کر مقابلے پر آمادہ ہو گیا۔ ترکمان بڑھتے بڑھتے تیمور کے بالکل قریب پہنچ گئے اور قریب تھا کہ تلواریں ٹکرا جائیں کہ ترکمان سردار چیخا "خبردار کوئی غلط حرکت نہ کرے۔"

ترکمانوں کے قدم رک گئے۔ اٹھی ہوئی تلواریں وہیں ٹھہر گئیں۔ ترکمان سردار نے کمان پھینک دی۔ تلوار نیام میں کر لی اور ہاتھ پھیلا کر تیمور کی طرف بڑھا۔

"خدا کی قسم! میری آنکھیں دھوکا نہیں دے سکتیں۔ آپ تو ماوراء النہر کے امیر ہیں۔ تاتاریوں کے مشہور سردار تیمور۔ ہم آپ کے دوست ہیں۔"

تیمور نے بھی ترکمان سردار کو غور سے دیکھا۔ تلوار نیام میں کر لی۔ "میرا خیال ہے آپ حاجی محمود ہیں۔"

حاجی محمود مسکراتا ہوا تیمور کے پاس پہنچ گیا۔ پھر دونوں سردار بغلگیر ہو گئے۔ حاجی محمود کے ترکمان حیرت سے منہ کھولے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ تیمور اور حاجی محمود جھونپڑے کے اندر چلے گئے۔ حاجی محمود نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"اے شہر سبز کے امیر! یہ ہماری کتنی بڑی بدقسمتی ہوتی کہ آپ کو ہمارے آدمیوں سے کوئی نقصان پہنچتا۔"

"حاجی محمود۔" تیمور نے بڑی خوش دلی سے کہا۔ "آپ سے مل کے جس قدر خوشی ہوئی ہے اسے میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس وقت جب کہ میرے اپنے آدمی میرے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں آپ جیسے دوست سے ملاقات میرے لیے باعث طمانیت ہے۔"

"سردار محترم۔" حاجی محمود لجاجت سے بولا۔ "آپ ہمیں شرمندہ نہ کیجئے۔ آپ تاتاریوں کے سرتاج ہیں۔ ظالم مغلوں نے ہمارے علاقوں پر قبضہ کر کے قتل و غارت کا جو بازار گرم کر رکھا ہے اسے روکنے کے لیے ہمیں آپ جیسے کماندار کی ضرورت ہے۔"

اس وقت حاجی محمود کی نظر جھونپڑے کے ایک کونے میں دبکی ہوئی الجائی خاتون پر پڑی اس سے پوچھا۔

"محترم امیر! آپ کے ساتھ یہ خاتون اور بچہ؟"

"یہ خاتون آغا الجائی خاتون ہیں اور یہ میرا بیٹا جہانگیر ہے۔" تیمور نے جواب دیا۔

"واللہ وہ خاتون جو شوہر کے ساتھ امن و جنگ میں برابر شریک رہے کس قدر قابل احترام ہے۔" حاجی محمود نے فوراً اٹھ کر الجائی خاتون کو سلام کیا۔ الجائی پشت کر کے بیٹھی تھی۔ حاجی محمود کے سلام پر اس نے پلٹ کر اس کے سلام کا جواب دیا اور منہ گھما کے بیٹھ گئی۔

ایک ترکمان نے اندر آ کر حاجی محمود کو اطلاع دی کہ ان کے بیٹھنے کے لیے باہر فرش بچھا دیا ہے۔ حاجی محمود اور تیمور اٹھ کر باہر آ گئے۔ پوستین پوش ترکمان جو کچھ دیر پہلے تیمور کو قتل کرنے آمادہ تھے اب اس کے قدموں میں بچھے جا رہے تھے۔ وہ ایک ایک تیمور کے پاس آتے اور اس کے ہاتھ چوم کر معافی مانگتے۔ تیمور محبت سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرتا اور انہیں اپنے ساتھ بٹھا لیتا۔ حاجی محمود کے حکم پر مہمانوں کے لیے ایک بھیڑ ذبح کر کے کھانا تیار کیا گیا۔ بھیڑ کا بھنا ہوا گوشت ایک بڑے تھال میں نکالا گیا اور حاجی محمود کے علاوہ حاجی کے خاص خاص سرداروں نے تیمور کے ساتھ ایک تھال میں کھانا کھایا۔ دستور کے مطابق اگر کوئی ایک ہی برتن میں کھانا کھائے تو وہ ہمیشہ کے لیے دوست ہو جاتا تھا۔ تیمور کے دل میں اگر ترکمانوں کی طرف سے کچھ شک بھی تھا تو وہ اب بالکل دور ہو گیا۔

تیمور نے اگرچہ اب تک کوئی بڑا کارنامہ انجام نہ دیا تھا لیکن اس نے اپنی حکمت عملی سے قبل از وقت مغلوں کا سیلاب روکا تھا اور تاتاری دوشیزاؤں کی بانیابی کے سلسلے میں جس جرأت کا مظاہرہ کیا تھا اس نے تیمور کو الف لیلہ کا شہزادہ بنا دیا تھا۔ تمام تاتاری سردار ایک ایک کر کے مغلوں کے ہاتھ آ گئے تھے لیکن تیمور ہی وہ شخص تھا جس پر مغل قابو نہ حاصل کر سکے تھے اور وہ اس سے اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قدر خائف تھے کہ اس کی گرفتاری کے لیے بھاری انعام کا اعلان کیا تھا۔ تاتاری اور ترکمان امیر کو پسند نہ کرتے تھے اور اُن کی غلامی کا جوا گردن سے اتارنا چاہتے تھے۔ اُنہیں تیمور میں وہ صلاحیت نظر آئی تھیں جو انہیں اس غلامی سے نجات دلا سکتی تھیں۔

کھانے کے بعد جو باتیں شروع ہوئی ہیں تو یہ سلسلہ ختم ہی ہونے کو نہ آتا تھا۔ ترکمان جھونپڑی میں چہل پہل ہوگئی تھی۔ ترکمان عورتیں الجائی کے جھونپڑے میں جمع ہوگئی تھیں۔ جو بھی ترکمان عورت کے خیمے میں جاتی وہ گردن گھما کر ایک نظر اس تاتاری سردار کو ضرور دیکھتی جس کے قصے اور کہانیاں اُن علاقوں میں مشہور ہو چکی تھیں۔ ترکمان بچے بھی خوش ہو کر تیمور کے پاس آتے اور اس کا ہاتھ تیمور اُن کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتا اور اُن کے رخسار پر بوسہ دیتا۔ اس دوران باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ حاجی محمود اُس کے سردار سوالات کر رہے تھے اور تیمور انہیں مطمئن کرنے کے لیے تفصیل سے حالات بیان کر رہا تھا۔ رات گزرتی رہی اور باتیں ہوتی رہیں۔ نہ سوالات کا سلسلہ ختم ہوتا تھا اور نہ تیمور جواب دیتے ہوئے تھک رہا تھا اس طرح پوری رات گزر گئی اور سویرا حاجی محمود نے خود سویا اور نہ تیمور کو سونے دیا۔

صبح کو بڑی مشکل سے باتیں ختم ہوئیں پھر یہ لوگ آرام کرنے کے لیے لیٹے۔ الجائی خاتون جھونپڑے میں بھی رات بھر بیدار جاگتا رہا اور ترکمان عورتیں اس سے دنیا جہان کی باتیں پوچھتی رہیں۔ دوپہر کے بعد جب یہ لوگ سو کر اٹھے تو کھانا تیار تھا۔ کھانے کے بعد پھر باتیں شروع ہوئیں۔ تیمور نے اظہار دوستی کے طور پر حاجی محمود کو ایک لعل اور دو موتیوں سے جڑے ہوئے جوڑے دیے۔ اس رات بھی آدھی رات تک باتیں ہوتی رہیں۔ صبح کو جب تیمور روانہ ہونے لگا تو حاجی محمود نے کھانے کا سامان اور تین گھوڑے تیمور کو دیے اور تیمور کی آسانی کے لیے ایک رہبر ساتھ کر دیا۔

تیمور اس صحرا میں بارہ دن مسلسل سفر کرتا رہا اور بخیر و خوبی اسے اس پُرخطر صحرا سے نکالنے والے ترکمان رہبر تیمور کو صحرا پار کرا کے واپس ہو گیا۔ تیمور کے پاس کھانے کا سامان تقریباً ختم ہو چکا تھا لیکن اُن کے پاس تندرست گھوڑے تھے اس لیے انہیں سفر جاری رکھنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ تیمور کو اب خراسان کی سڑک کی تلاش تھی۔ آخر وہ سڑک پر پہنچ گئے اور خدا کا شکر ادا کیا۔ ایک سمت سڑک پر انہیں ایک گاؤں نظر آیا۔ یہ گھوڑے برساکر وہاں پہنچے لیکن گاؤں کی ویرانی

انہیں افسوس ہوا۔ اس گاؤں کو پتہ نہیں کیوں اجاڑ دیا گیا تھا۔ گاؤں کے تمام کنوؤں کو بھی بند کر دیا گیا تھا۔ تیمور اور اس کے ملازم کو پانی کے لیے زمین کھودنا پڑی۔ پانی نکلا تو انہوں نے خود پیا، جانوروں کو بھی پلایا۔ گھوڑوں کو چرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا اور یہ لوگ گاؤں کے کھنڈرات میں آرام کرنے کے لیے ٹھہر گئے۔

کہتے ہیں کہ مصیبت اکیلے نہیں آتی۔ خیوہ والوں سے جنگ کے دوران اُن کے تمام ساتھی ضائع ہو گئے تھے اور مشکل سے جان بچی تھی کہ اب دوسری مصیبت نے آگھیرا۔ انہیں ان کھنڈرات میں آرام کرتے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ قبائلیوں نے انہیں گھیر لیا۔ تیمور نے انہیں بہت سمجھایا کہ وہ بے ضرر مسافر ہیں اور راستہ بھول گئے ہیں لیکن قبائلیوں نے اُن کی ایک نہ سُنی پاس پچاس قبائلیوں کا مقابلہ کسی طرح ممکن نہ تھا۔ وہ تیمور کو پکڑ کر اپنے قبیلے میں لے گئے۔ اس قبیلے کا سردار علی بیگ تھا۔ سردار نے تیمور کو دیکھتے ہی پہچان لیا اور خوش ہو کے بولا

"واللہ! آپ تو شہر سبز کے امیر تیمور ہیں۔"

تیمور نے جواب میں خاموشی اختیار کر لی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچانتے تھے اور کئی بار مل چکے تھے۔ علی بیگ نے تیمور کو خاموش دیکھ کر کہا۔

"تیمور تم خاموش رہ کر مجھے دھوکہ نہیں دے سکتے۔ تم وہی تیمور ہو جس نے بلادِ شمال کے خان اعظم تغلق تیمور سے بغاوت کی ہے۔ مغلوں نے تمہاری تلاش میں تاتاری علاقوں کا چپہ چپہ چھان مارا ہے۔ واللہ تم تو بڑے قیمتی مہمان ہو۔ میں تمہاری خوب خاطر کروں گا۔"

تیمور نے اس کی نیت بدلتی ہوئی دیکھی تو سمجھانے کے لیے کہا۔

"علی بیگ! میں نے جو کچھ کیا اپنے ملک اور اپنی قوم کے لیے کیا۔ مغلوں سے ہم آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں اگر تاتار پر مغلوں کا مستقل قبضہ ہو گیا تو تم بھی محفوظ نہیں رہو گے ہمارا ساتھ دو ہم مال و دولت سے تمہارے قبیلے کو مالا مال کر دیں گے۔"

"نادان تیمور۔" علی بیگ ترشی سے بولا۔ "میں ہاتھ آئے ہوئے خزانے کو ضائع کر دوں۔ یہ کون سی عقلمندی ہے؟ مغلوں نے تمہارے سر کی قیمت مقرر کی ہے۔ میں اُن سے منہ مانگے دام وصول کروں گا۔ مستقبل کی موہوم اُمید پر میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تیمور خاموش رہا۔ اس جاہل کو سمجھانا اس کے اختیار میں نہ تھا۔ تیمور کا تمام سامان چھین لیا گیا اور اسے ایک ایسے مکان میں قید کر دیا گیا جو شاید ایک زمانے سے بند تھا۔ جس کمرے میں اسے رکھا گیا اُس میں مکڑی کے جالے لگے ہوئے تھے اور کیڑے مکوڑے رینگ رہے تھے۔ ہوا اللہ شر کے لیے صرف ایک چھوٹا سا روشندان تھا۔ گرمی کا زمانہ تھا چند ہی گھنٹوں میں الجائی خاتون اور جہانگیر کا برا حال ہو گیا۔ الجائی کو بخار آنے لگا اور جہانگیر کے جسم پر کیڑوں کے کاٹنے سے آبلے پڑ گئے۔ تیمور ایک دن ان مصائب سے ایسا پریشان ہوا کہ اس نے فیصلہ کیا کہ آج جب ترکمان غلام کھانا لے کر آئے گا تو وہ اس کا گلا دبا دے گا۔ اور پھر باہر نکل کر ترکمان پہرہ داروں سے مقابلہ کر کے جان دے دے گا۔

یہ پختہ ارادہ کرنے کے بعد اُس نے الجائی سے کہا

"الجائی اب ہماری جدائی کا وقت آ گیا ہے۔ زندگی شاید اتنی ہی تھی پھر کیوں نہ ہم بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے موت کو گلے لگائیں۔"

الجائی تمام دن تیمور کی بے چینی محسوس کرتی رہی۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔ بولی

"میرے سرتاج مسلمانوں کو اللہ کی ذات سے کبھی ناامید نہ ہونا چاہیئے۔ جب تک سانس ہے تب تک آس ہے۔ کیا پتہ اللہ تمہارے صبر کا امتحان لے رہا ہو۔" پھر الجائی نے صبر ایوب کی مثال دے کر کہا۔

"اللہ نیک بندوں کو صبر میں ڈالا کرتا ہے۔ اگر وہ ہم سے ناراض ہے تب بھی ہمیں اس کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ اللہ نے ہمیں سرخ ریگستان سے بچایا ہے تو وہ یہ مصیبت بھی کسی نہ کسی دن ضرور ختم کر دے گا۔"

تیمور کو بیوی کی باتوں سے کچھ سکون ملا مگر اُسے یہ خیال زیادہ پریشان کر رہا تھا کہ علی بیگ بدطینت انسان ہے اگر اُس نے اُسے خانِ اعظم کے حوالے کر دیا تو وہ اس کے ساتھ اور بُرا سلوک کرے گا۔ علی بیگ واقعی اسی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ تیمور کے بدلے میں خانِ اعظم سے بھاری معاوضہ حاصل کرے گا۔ اس سلسلے میں اُس نے اپنا ایک آدمی بھی مغلوں کے پاس بھیج دیا تھا لیکن جس کو اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔ قدرت کو ابھی تیمور سے بہت کام لینے تھے۔ اس نے اُس کی رہائی کا سامان پیدا کر دیا۔

علی بیگ کا قاصد جب مغلوں کے لشکر میں پہنچا تو اس وقت مغلوں کا سردار اعلیٰ تعلق تیمور سمرقند کے شہر حصار امالیق واپس جا چکا تھا اور تاتاری علاقے کا نظم و نسق اپنے بیٹے الیاس خواجہ خان کے سپرد کر گیا تھا۔ الیاس خواجہ خان اور اس کا سپہ سالار بیک جک بہت لالچی آدمی تھے۔ قاصد نے جب گرفتاری کے سلسلے میں بھاری رقم کا مطالبہ کیا تو وہ رضامند نہ ہوئے۔ انہوں نے ترکمان قاصد کو شاہ میں ٹھہرا لیا اور اس پر پہرہ لگا دیا۔ پھر تیمور کو بغیر معاوضے کے حاصل کرنے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ علی بیگ نے اپنے قاصد کو سمجھا دیا تھا کہ وہ مغلوں پر یہ ظاہر نہ کرے کہ تیمور اُس کی قید میں ہے بلکہ انہیں کہے کہ تیمور جس جگہ پوشیدہ ہے اس کا علم علی بیگ کو ہے۔ اور معاوضہ ادا ہونے کی صورت میں اُسے مغلوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔ معاوضہ ادا کرنے کی قاصد نے یہ صورت بتائی تھی کہ پہلے معاوضے کی رقم لے کر اُس کے ساتھ بھیجے جائیں پھر رقم اور تیمور کا تبادلہ قزل قم (سرخ ریگستان) پر کیا جائے۔ یہ صورت الیاس خواجہ کو پسند نہ تھی۔ ایک تو اُسے اس بات کا خطرہ تھا کہ کہیں ترکمان مغلوں سے رقم چھین کر انہیں قتل نہ کر دیں اور ریگستان میں بھاگ جائیں۔ اس خوفناک علاقے میں جاتے ہوئے ہر شخص گھبراتا تھا مغل یہ خطرہ لینے کے لیے آمادہ نہ تھے۔ پھر خود اُن کے دل میں لوٹ تھی۔ وہ تو بغیر کچھ دیئے تیمور کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے یہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ خواجہ نے قاصد پر سختی بھی کی اور اُسے قتل کی دھمکی بھی دی لیکن وہ طوطے کی طرح اسی بات کی رٹ لگائے رہا جو اُسے سکھا کر بھیجا گیا تھا۔ اس نے مغلوں کو تیمور کی گرفتاری کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ اگر اس نے یہ بتا دیا کہ تیمور علی بیگ کی قید میں ہے تو کہیں مغل اپنا لشکر لے کر وہاں نہ پہنچ جائیں۔ تیمور کو حاصل کر کے ترکمانی علاقوں کو بھی پامال کر ڈالیں۔

علی بیگ کا قاصد مغلوں کی قید میں بڑا پریشان ہوا۔ اُسے تو یہ اُمید تھی کہ دشمن کی گرفتاری کے بعد مغل خوش ہو کر اُسے انعام دیں گے لیکن وہ تو اُلٹا مصیبت میں پھنس گیا۔ آخر اُس نے کوئی ایک صورت نکالی۔ ایک ہفتے کی قید و بند کے بعد جب اُسے الیاس خواجہ کے سامنے لایا گیا تو اُس نے بڑی لجاجت سے کہا:

"اے مغلوں کے بادشاہ ہم ترکمان کسی کو دھوکہ نہیں دیتے اور جو کہتے ہیں وہ پورا کرتے ہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اگر آپ کو یہ شبہ ہے کہ تیمور آپ کے حوالے نہیں کیا جائے گا تو میں اپنے سردار کو اس بات پر آما
لوں گا کہ تیمور کو گرفتار کر کے آپ کے آدمیوں کے حوالے کر دیا جائے اور جب تیمور آپ کے قبا
آجائے تو میرے سردار کو مطلوبہ رقم ادا کر دی جائے۔"

قاصد کی یہ بات الیاس خواجہ کو پسند آئی۔ اُس نے ہنس کر کہا

"ترکمان قاصد۔ تم ایک عقلمند آدمی معلوم ہوتے ہو۔ ہم کسی کو دھوکہ نہیں دیتے۔ اگر تم
تیمور کو گرفتار کر کے ہمارے حوالے کر دو تو ہم مطلوبہ رقم کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تم لوگوں
کے طور پر دیں گے۔"

"مغل بادشاہ آپ بالکل فکر نہ کریں۔" قاصد نے بڑی چالاکی سے کہا۔ "ہم ترکمان بھی نہیں
کہ تیمور ہمارے علاقے میں قیام کرے۔ ہم خود اُسے قتل بھی نہیں کر سکتے اس لیے کہ تمام تاتاری
مخالف ہو جائیں گے اور ہم میں اُن کے مقابلے کی طاقت نہیں۔ آپ تیمور کو سمرقند لا کے قتل کر
گا تاکہ ہم پر کوئی الزام نہ آئے۔"

"ایسا ہی ہو گا ترکمان قاصد۔" الیاس خواجہ خوش ہو کے بولا۔ "ہم تیمور کو سمرقند میں ہم
کریں گے اس کے ساتھ ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ اگر تاتاریوں نے تم لوگوں کو پریشان کرنے
کی تو ہم اُن کے شہروں اور قصبوں کو تاخت و تاراج کر کے ایسا سبق دیں گے کہ وہ ترکمان
کبھی زبان پر نہ لائیں۔"

الیاس خواجہ نے ترکمان قاصد کو رخصت کر دیا اور اس پر سخی کے بدلے میں کچھ رقم بھی دی
نے پچاس مغل سواروں کا ایک دستہ قاصد کے ساتھ کیا تاکہ وہ تیمور کو گرفتار کر کے سمرقند
قاصد، مغل سواروں کے ساتھ بڑی تیزی سے سفر کرتا ہوا ترمذ کی سرحد پر پہنچ گیا۔ اُس نے مغل
ہاتھوں جو ذلت اور اذیت برداشت کی تھی اب اُس کا بدلہ لینے کا ——— وقت آگیا تھا۔ قا
کو لے کر اس ہیبت ناک ریگستان میں اُس راستے سے داخل ہوا جو سیدھا موت کی وادی کو جا
دن کے سفر ہی نے مغلوں کے حوصلے پست کر دیے۔ یہاں ہر طرف بگولے اٹھتے اور گرد و غبار
چلتے تھے۔ دھند اتنی کہ سورج نظر نہ آتا تھا۔ مغلوں کا پانی بھی ختم ہو گیا۔ قاصد نے انہیں تسلی دی
پر پانی اور کھانا وغیرہ افراط سے مل جائے گا۔

پھر ایک صبح جب تھکے ماندے مغل سوار نیند سے بیدار ہوئے تو ترکمان قاصد کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ترکمان
اپنی جان بچا کر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ مغل سوار پہلے تو دیر تک قاصد کا انتظار
رہے پھر سمجھ گئے کہ ترکمان قاصد نے اُن کے ساتھ فریب کیا ہے۔ انہیں ریگستان کے راستوں کا کوئی
تھا۔ وہ پُرہول ریگستان میں بھٹکنے لگے۔ پتہ نہیں وہ واپس سمرقند پہنچے یا نہیں۔ ترکمان قاصد اپنے سردار
کے پاس ضرور پہنچ گیا اور اُس نے اپنے سردار کو مغلوں کی زیادتیوں سے آگاہ کیا اور مشورہ دیا کہ
سے کوئی معاملہ نہ کیا جائے ورنہ اُسے نقصان اٹھانا پڑے گا۔

علی بیگ پر اس کا بڑا اثر ہوا لیکن وہ تیمور کو مفت میں چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا۔ تیمور کا اسلحہ
سامان چھین لیا گیا تھا لیکن تیمور نے ہیرے جواہرات چھپا لیے تھے اگر علی بیگ اُس سے رقم کا مطالبہ
کرتا تو تیمور اب بھی اتنی دولت دے سکتا تھا کہ جو اُسے مغلوں سے بھی نہ مل سکتی تھی لیکن علی بیگ کو یہ
نہ ہو سکا کہ اس پھٹے حال میں تیمور کے پاس جواہرات ہو سکتے ہیں۔ قاصد کی واپسی کے کچھ ہی دن
بیگ کے بھائی کا بھی جواب اُسے موصول ہوا۔ علی بیگ نے جس وقت مغلوں کے پاس اپنا قاصد بھیجا
وقت اپنے بھائی سے تیمور کی گرفتاری اور مغلوں سے معاملہ کرنے کے بارے میں مشورہ مانگا۔
کا بھائی شمالی ایران کا ایک بااثر سردار تھا اُس نے علی بیگ کو صرف جواب ہی نہیں دیا بلکہ کئی
بیش قیمت تحائف بھی بھیجے تھے۔ اُس نے علی بیگ کو جو خط لکھا اُس میں تحریر تھا۔

"خبردار۔ قہر سبز کے امیر تیمور اور مغلوں کے جھگڑے میں ہرگز دخل نہ دینا۔ تیمور تاتاریوں کا وہ
ہے جس پر تاتاری جان دیتے ہیں اگر تم نے تیمور کو مغلوں کے حوالے کیا یا اُسے قتل کرنے کی کوشش
تاری تمہارے علاقے کو روند ڈالیں گے اور خاندان کے بچے بچے کو چُن چُن کر مار ڈالیں گے۔"

آخر میں علی بیگ کو مشورہ دیا تھا

تیمور سے دست بستہ معافی مانگو اور اُسے عزت و احترام کے ساتھ جہاں وہ جانا چاہے رخصت
سردار تیمور کے لیے تحائف بھیج رہا ہوں یہ تحفے اُس کی خدمت میں پیش کرنا اور معافی کے
گار ہونا۔ اُمید ہے کہ وہ تمہیں معاف کر دے گا اور تم مستقبل کے عذاب سے محفوظ ہو جاؤ گے۔"

بھائی کے خط نے علی بیگ کو دہلا دیا۔ اُس نے اپنے سرداروں سے مشورہ کیا۔ سب نے اس کے
الے سے اتفاق کیا اور تیمور کو فوراً رہا کرنے کی درخواست کی۔ علی بیگ بھی اب تیمور کی گرفتاری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے پریشان ہو گیا تھا۔ اُس کا قبیلہ بظاہر مویشی چرا کے پیٹ پالتا تھا لیکن اصلی کام قزاقی تھا۔ گا
یہ بھٹکنے والے قافلوں اور اکا دکا آدمیوں کو یہ لوگ لوٹ کر قتل کر دیا کرتے تھے۔ اس وقت ان
کام رُک گیا تھا اُس کے آدھے سے زیادہ سوار تیمور کی حفاظت پر مامور تھے۔ مغلوں سے جو
نے باندھ رکھی تھی وہ بھی ختم ہو چکی تھی۔ آخر وہ تیمور کو رہا کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

تیمور کو اس تاریک اور کیڑے مکوڑوں سے بھری کوٹھڑی میں قید ہوئے بارھ دن ہوئے
کہ ایک شام علی بیگ اپنے چند سرداروں کے ساتھ تیمور کے پاس پہنچا۔ الجائی خاتون اور تھا جہانگیر کو
انہوں نے سمجھ لیا کہ اب اُن کا آخری وقت آ گیا۔ تیمور بھی اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے سوچا کہ وہ
سے جان نہ دے گا اور دو چار کو خالی ہاتھوں سے ختم کر کے مرے گا لیکن علی بیگ کا رویّہ کچھ عجب
وہ اور اُس کے سردار تیمور کے قریب آئے اور اس طرح سر جھکا کر کھڑے ہوئے جیسے تیمور اُن کا
نہیں بلکہ آقا یا سردار ہے۔

"کیا چاہتے ہو علی بیگ؟" تیمور نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا۔

"اے شہر سبز کے امیر!" علی بیگ بغیر سر اٹھائے بولا۔ "آپ ہمیں معاف کر دیجئے ہم نے آپ
بڑی گستاخی کی ہے۔"

تیمور اُسے بھی ایک بھیانک مذاق سمجھا۔ اُس نے پھر پوچھا۔ "علی بیگ مذاق چھوڑو اور اپنا
بیان کرو مگر یہ یاد رکھو کہ تاتاری اپنی جان سے زیادہ اپنی عزت و حرمت کو مقدم رکھتے ہیں۔"
خیمہ والوں کی حرکت دیکھ چکا تھا اُسے شبہ ہوا کہ شاید علی بیگ، الجائی خاتون کو حاصل کرنا چاہتا ہے

"نہیں امیر! ہم لاکھ بُرے سہی لیکن خواتین کی عزت ضرور کرتے ہیں۔" علی بیگ فوراً بولا۔
"خاتون آغا الجائی خاتون۔ امیر قزغن کی پوتی تمہاری محترم بیوی اور علی بیگ کی بہن ہے۔ مجھے
سمجھو امیر! تیمور۔ میں اور میرے سردار تم سے بہت شرمندہ ہیں۔ تم معاف کر دو ہم سب کو۔"

تیمور کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ بولا۔ "اگر تم مجھے اور میرے بیوی بچے کو رہا کر رہے ہو
تمہیں معاف کرتا ہوں مجھے تم سے کوئی گلہ و شکوہ نہیں۔"

علی بیگ نے خوش ہو کے ہاتھ پھیلا دیے اور تیمور نے آگے بڑھ کے اُس کے سینے سے لگا
علی بیگ نے بھائی کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے تیمور کو رہا کر دیا مگر اُس کے بھائی نے جو خائف تیمور

ے پھیے تھے وہ بھاگتے چور کی لنگوٹی کے مصداق اپنے ہی پاس رکھ لیے اور تیمور کو اُس کی ہوا بھی نہ
دی۔ تیمور اب وہاں ایک لمحہ بھی گزارنا نہ چاہتا تھا مبادا کہ اُن کا ارادہ پھر بدل جائے اور وہ کسی اور
یت میں گرفتار ہو جائے۔ اس نے علی بیگ سے اجازت مانگی۔ علی بیگ بھی اُسے رکھنا نہ چاہتا تھا اس
ال تھا تیمور کو مزید روک کر اس کے قیام و طعام پر مزید خرچ کرنا سراسر گھاٹے کا سودا تھا۔ اُس نے تیمور کو
نے کی اجازت دے دی۔

چلتے وقت علی بیگ نے تیمور کو جانے کے لیے صرف ایک گھوڑا اور ایک اونٹ دیا۔ یہ دونوں جانور
ا اور لاغر تھے۔ تیمور کے دونوں گھوڑے علی بیگ نے ضبط کر لیے اور نہایت خاموشی سے اونٹ پر سامان
ا۔ علی بیگ نے اس کا پورا سامان بھی واپس نہ کیا۔ تیمور نے اس کا کوئی گلہ نہ کیا۔ اس نے الجائی خاتون
ہانگیر کو گھوڑے پر سوار کیا اور لگام پکڑ کر چلنے لگا۔ اونٹ کی لگام اس کے ملازم کے ہاتھ میں تھی
یک تماشائیوں کے جھنڈ کے جھنڈ نظر آتے رہے یہ لوگ مطمئن نہ ہوئے انہیں بے چینی سی رہی۔ سواری کے
ا جانور کمزور تھے اس لیے تیمور کو آدھی منزل پر ہی قیام کرنا پڑا۔ اونٹ اور گھوڑے کو آرام دیے
ان کے لیے آگے بڑھنا مشکل تھا۔

عالی ہمت الجائی نے دو ماہ سے زیادہ قید کی صعوبتیں برداشت کی تھیں لیکن اُس کے چہرے پر ذرا
کن نہ آئی تھی۔ وہ تیمور کو پیدل چلتے دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتی لیکن چہرے پر ہر دم شگفتگی طاری
ر منزل پر جب تیمور نے قیام کیا تو الجائی خاتون نے مسکرا کر کہا۔

"میرے سرتاج ابھی سفر ختم نہیں ہوا۔ دیکھیں تقدیر آگے کیا دکھاتی ہے۔"

تیمور نے نظر اٹھا کر الجائی کے مسکراتے چہرے کو دیکھا تو اُس کی تمام تھکن جیسے دور ہو گئی۔

○

سمرقند میں جنازوں کی تلاشی پر سختیاں اس قدر بڑھ گئیں کہ میت کو دفن کرنا مشکل ہو گیا۔ شہر کے
اہر ستانوں پر پہرہ لگا دیا گیا اور مغل حاکموں نے پوری سلطنت میں ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ جس شخص کے
لفت ہو جائے وہ جنازہ اٹھانے سے پہلے مغلوں کی فوجی چوکی پر اس کی اطلاع درج کرائے اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جب تک مغل فوجی تحقیقات نہ کرلیں، جنازہ نہ اٹھایا جائے۔ مولانا زین الدین نے تیمرستان میں اپنی سرگرمیاں ختم کردی تھیں اور وہ شہر سبز واپس آگئے تھے۔ اب وہ مجاہدین کے اجتماع کے لیے دوسرے ٹھکانے پر غور کر رہے تھے۔ غیر ملکی قبضے کے خلاف جب کسی ملک میں ایک بار آزادی کی تحریک شروع ہو جاتی ہے تو وہ اپنے ذرائع خود بخود پیدا کرلیتی ہے۔

پھر ایسا ہوا کہ ملک میں مرنے والوں کی تعداد میں کمی واقع ہوگئی اور اسی لحاظ سے شادیوں کی تعداد میں ایک دم اضافہ ہوگیا۔ شادیوں کا یہ اضافہ شہر سبز میں کچھ زیادہ ہی ہوا۔ ہر ہفتے کسی نہ کسی گھر میں شادی کا ہنگامہ ہوتا۔ باجے بجتے، کھانے پکتے اور مہمان اکٹھے ہوتے۔ اُدھر مغلوں کو یہ یقین دلایا گیا کہ تیمور ایلک واپس آگیا ہے اور پوشیدہ طور پر مغلوں کا تختہ الٹنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مغل اور زیادہ محتاط ہوگئے اور جہاں بھی تاتاریوں کے گھر کوئی تقریب ہوتی، وہ آدھمکتے۔ مفاد پرستوں اور ملک کے غداروں نے مغلوں کے کان میں یہ بات ڈالنا بھی شروع کردی کہ شادی کے اکثر اجتماع فرضی ہوتے ہیں اور لوگ اس بہانے یکجا ہو کر بغاوت کے منصوبے بناتے ہیں۔ مغلوں کو مولانا زین الدین کی سرگرمیوں کی خصوصیت سے اطلاع دی گئی تھی لیکن مولانا کی مذہبی شخصیت کچھ ایسی با اثر تھی کہ مغل ان پر ہاتھ ڈالتے ہوئے گھبراتے تھے۔ انہیں مولانا کے خلاف ابھی تک کوئی ٹھوس ثبوت بھی نہیں ملا تھا جس کی بنا پر اُن کے خلاف کوئی کارروائی کی جاسکتی۔ بہرحال مفاد پرست مولانا کو رنگے ہاتھوں پکڑوانے کے لیے پوری تگ و دو کر رہے تھے۔

اُن دنوں مغل حاکم الیاس خواجہ خان اپنے سپہ سالار بیگ جگ کے ساتھ شہر سبز کے دورے پر آیا ہوا تھا۔ مغلوں نے قصر سفید میں تیمور کی حویلی کو خالی کروا کر اُس میں اپنی چھاؤنی قائم کی تھی۔ مغل حاکم کا دورہ خالی از علت نہ تھا۔ اُس نے سوچا تھا کہ اگر تیمور واقعی واپس آگیا ہے تو وہ اپنے شہر سبز میں ضرور آئے گا۔ اسی لیے الیاس خواجہ نے اپنا دورہ طویل کر دیا تھا بلکہ شہر سبز کو عارضی طور پر اپنا مستقر بنا کر وہیں ڈیرا جمانے پڑا تھا۔

الیاس خواجہ اپنے محافظ دستوں کے ساتھ شہر سبز کی ایک سڑک سے گزر رہا تھا۔ دائیں بائیں مشہور تاتاری غداران وطن جعفر اور صادق چل رہے تھے۔ الیاس خواجہ کو ایک بڑی حویلی میں کافی روشنی آتی حویلی کا پھاٹک بند تھا اور چھوٹے دروازے سے لوگ اندر باہر جا رہے تھے۔ پھاٹک کے باہر کھڑا رہا تھا۔ الیاس خواجہ نے پوچھا۔

"اس حویلی میں کیا ہو رہا ہے؟"

غدار جعفر نے جواب دیا۔ "مغل بادشاہ یہاں شادی ہو رہی ہے۔"

"کہیں یہ شادی بھی تو کوئی دھوکہ نہیں؟" الیاس خواجہ نے اپنا شبہ ظاہر کیا۔ "ہم چاہتے ہیں کہ جس طرح مرنے والوں کی خبر ہماری چوکیوں پر دے دی جاتی ہے اسی طرح شادیوں کا بھی اندراج کیا جائے تاکہ لوگ بلاوجہ ہی ایک جگہ نہ اکٹھا ہو سکیں۔"

"اس شاہی فرمان کا کل ہی اعلان کر دیا جائے گا شاہ معظم۔" دوسرے غدار صادق نے کہا۔ "اس سلسلے میں ہم وفاداروں نے یہ انتظام اپنے طور پر کیا ہے کہ جب کہیں شادی ہوتی ہے تو ہم اُس کی تحقیق کر لیتے ہیں۔"

"تمہیں اس شادی کی خبر تھی؟" الیاس خواجہ نے ایک دم سوال کیا۔

"ہم اپنی ذمہ داریوں سے غافل نہیں ہیں خان اعظم۔" جعفر نے اپنی وفاداری کا اظہار کیا۔ "ہمارے مخبروں نے ہمیں اطلاع دی تھی کہ اس حویلی میں آج شادی کی تقریب منعقد ہوگی۔"

الیاس خواجہ نے مسلمانوں کی شادی کی رسومات کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا لیکن اُس نے کبھی شادی کی کسی تقریب میں شرکت نہیں کی تھی۔ اُسے شوق پیدا ہوا کہ اس تقریب میں شریک ہو کر خود رسومات کو ادا ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ بولا۔

"کیا ہم تقریب میں شریک ہو سکتے ہیں؟ ہماری شرکت سے مسلمانوں کے مذہب کو تو کوئی نقصان نہ پہنچے گا؟"

"نہیں مغل بادشاہ۔" صادق نے کہا۔ "شادی میں تو ہر مذہب و ملت کے لوگ شریک ہو سکتے ہیں۔ میں ابھی آپ کے لیے انتظام کرتا ہوں۔"

صادق گھوڑا بڑھا کر حویلی کے پھاٹک پر پہنچا۔ گیٹ پر دو مسلح تاتاری پہرہ دے رہے تھے۔ پہریداروں نے صادق کو فوراً پہچان لیا۔ صادق اور جعفر دونوں مشہور غدار تھے اور اُن سے تاتاریوں کا بچہ بچہ واقف تھا۔ مغلوں نے ان دونوں کو اہم عہدے سپرد کر رکھے تھے۔ تاتاری پہریداروں نے جھک کر انہیں سلام کیا۔

"پھاٹک کھول دو، مغل بادشاہ شادی میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔" صادق نے بڑے غرور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے حکم دیا۔

تاتاری بہر بیدار اُسے تاڑ کر ہی گھبرا گئے تھے مگر انہوں نے ہمت سے کام۔ ایک بولا

"خوش آمدید سردار صادق۔ یہ تو ہماری بڑی عزت افزائی ہوگی کہ شادی میں بادشاہ شریک ہوں اندر کچھ پردہ دار خواتین بھی موجود ہیں۔ میں ابھی انہیں پردے میں بھیج کے مغل بادشاہ کے لیے مسند کا انتظام کرتا ہوں۔"

پہرے دار نے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا اور بھاگ کے اندر چلا گیا۔ اندر جا کر اس نے چھوٹے دروازے کو اندر سے بند کر لیا پھر دوڑتا ہوا اُس کمرے میں پہنچا جہاں سو کے قریب تاتاری جوان اور بوڑھے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ بدحواس پہرے دار کو دیکھ کر وہ لوگ گھبرا کے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"غضب ہو گیا مولانا" پہرے دار نے مولانا زین الدین کو مخاطب کیا۔ "مغل بادشاہ غداروں کے ساتھ پھاٹک کے باہر کھڑا ہے۔ وہ شادی میں شریک ہونا چاہتا ہے۔"

تاتاری گھبرا اٹھے۔ انہوں نے بڑی حیرت سے مولانا کو دیکھا۔ مولانا بولے

"گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ صادق اور جعفر جیسے غداروں کی موجودگی میں یہ وقت تو ایک دن پہلے کا ہی تھا ہم اس دن کے لیے پہلے سے تیار ہیں۔"

مولانا نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ انہیں سامنے عاصم کھڑا دکھائی دیا۔ وہی عاصم جو کفن پہن کے قبر میں دفن ہونے کے لیے تیار ہوا تھا۔ مولانا نے بڑھ کے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"عاصم آج کی بارات کے تم دُولہا ہو۔"

عاصم نے مولانا پر حیرت بھری ایک نظر ڈالی پھر تعمیلِ حکم میں سر جھکا لیا۔

"عاصم کو دولہا بنایا جائے۔" مولانا نے قریب کھڑے کسی آدمی سے کہا۔ پھر لوگوں سے مخاطب ہو کر

"آپ حضرات میرے ساتھ مغلوں کے استقبال کے لیے چلیے۔"

مولانا نے کمرے سے قدم نکالا۔ تمام باراتی جو کہ حقیقت میں تاتاری مجاہد اور سرفروش تھے، اُن کے پیچھے ہو لیے حویلی کا گیٹ کھول دیا گیا۔ مولانا زین الدین نے تمام باراتیوں کے ساتھ الیاس خواجہ کا استقبال کیا۔ جعفر اور صادق کو الیاس خواجہ کے ساتھ دیکھ کر مولانا کا خون کھول گیا لیکن اُن غداروں پر توجہ دینے کے بجائے مولانا نے آگے بڑھ کر الیاس خواجہ کو خوش آمدید کہا۔

"زہے نصیب۔ مغل بادشاہ ہم غریبوں کی محفل میں تشریف لائے۔ اس عزت افزائی کے لیے ہم لوگ آپ کے بہت بہت شکر گزار ہیں۔" اُسی وقت مولانا کی نظر چند مغل سواروں پر پڑی جو الچی بہادر اور جاکو برلاس کو گھیرے کھڑے تھے۔ مولانا کی سمجھ میں فوراً سارا معاملہ آگیا۔ انہوں نے فوراً کہا

"اے شاہِ تاتار۔ آپ کے سواروں نے ہمارے مہمانوں کو کیوں گھیر رکھا ہے؟"

الیاس خواجہ کے بولنے سے پہلے ہی بیک جب کا بھیانک قہقہہ بلند ہوا۔ وہ گھوڑا بڑھا کر مولانا کے پاس پہنچا اور بولا۔

"یہ دونوں تیمور کے دوست ہیں اور حکومت کے باغی۔ ہم انہیں سزا دیں گے۔"

مولانا تو سر سے کفن باندھے ہوئے تھے۔ کڑک کے بولے "اے حاکمِ تاتار یہ تو ہمارے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔ تیمور اسی شہر کا رہنے والا تھا اُسے ہم جانتے ہیں لیکن غلطی تیمور نے کی ہے آپ اسے پکڑ کے چاہے سزا دیجیے ہم پر امن شہریوں پر زیادتی کرنا کہاں کا انصاف ہے؟"

"ہم تیمور کے دوست کو زندہ نہ چھوڑیں گے۔ اگر تم بھی تیمور کے دوست ہو تو تمہیں بھی ابھی قتل کر دیا جائے گا۔" اور بیک جب نے تلوار کھینچ لی۔

تاتاریوں نے مولانا زین الدین کو خطرے میں دیکھا تو اُن کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی اور ان کے ہاتھ بھی تلوار تک پہنچ گئے۔ مولانا نے بڑی دانائی سے حالات کو سنبھالا۔ بولے

"اے شاہِ تاتار اگر آپ الچی بہادر اور جاکو برلاس کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں تو کم از کم انہیں اتنی مہلت ضرور دیجیے کہ یہ دونوں اس شادی کی رسم کو مکمل کر لیں۔"

الیاس خواجہ دیکھ رہا تھا کہ بیک جب کی بیہودہ گفتگو نے تاتاریوں کو مشتعل کر دیا ہے اور وہ مارنے مرنے پر تل گئے ہیں اگر اس وقت خون خرابہ ہوا تو اس کی خبر خانِ اعظم تک ضرور پہنچے گی۔ تاتاری شکایت لے کر جائیں گے کہ مغلوں نے ایک مذہبی فرض کی ادائیگی سے انہیں روکا ہے اور قتل و غارت کرنے لگے۔ بیک جب کا دوسرا قہقہہ بھی اس وقت تک بلند ہو چکا تھا اور اب وہ کوئی اور بے ہودہ بات کہنے والا تھا۔ الیاس خواجہ نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور مولانا سے نرمی سے بولا۔

"اے بزرگ اگر یہ دو تاتاری اس رسم میں شریک نہ ہوں تو کیا یہ شادی نہیں ہوگی؟"

"اے شاہِ تاتار ان دونوں کی شادی میں شرکت اس لیے ضروری ہے کہ نکاح کے گواہ ہیں۔" مولانا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے بڑی متانت سے وضاحت کی۔ "ہم مسلمان شادی کے وقت دولہا اور دلہن کی رضامندی حاصل کرتے ہیں۔ یہ رضامندی گواہوں کے سامنے حاصل کی جاتی ہے۔ اس نکاح کے لیے ایلچی برادر اور جاکو برلاس منتخب ہو چکے ہیں۔ ان کی گواہی کے بغیر نکاح نہیں پڑھا جا سکتا۔"

"ان مسلمانوں کی رسمیں بھی کس قدر واہیات ہیں۔" بیک جک نے قہقہہ لگاتے ہوئے پھر دخل دیا۔

"مغل سپہ سالار اپنی زبان بند رکھو۔" مولانا چیخ پڑے۔ پھر وہ الیاس خواجہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولے "شاہ تاتار۔ سپہ سالار کو ہمارے مذہب کی توہین سے روکا جائے۔ ہم مغلوں کے وفادار ہیں۔ خان اعظم نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ تاتاریوں کے مذہب میں کوئی دخل نہ دیا جائے گا۔"

الیاس خواجہ بیک جک کی باتوں سے چڑ گیا تھا۔ اس نے صادق سے پوچھا۔

"تاتاری سردار۔ یہ بزرگ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا شادی میں گواہوں کی شرکت ضروری ہے؟"

"یہ بزرگ ہمارے مذہبی پیشوا ہیں۔" صادق، مولانا سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔ "مذہب کے معاملے میں ان کا کہنا حرفِ آخر ہے۔ گواہ کے بغیر شادی نہیں ہو سکتی۔ مولانا درست فرماتے ہیں۔"

"انہیں چھوڑ دیا جائے۔" الیاس خواجہ نے فوراً حکم صادر کر دیا۔ "اور آئندہ سے کسی تاتاری کو اس وقت تک گرفتار نہ کیا جائے جب تک اس کے خلاف ثبوت نہ حاصل ہو جائے۔"

مولانا کی بروقت فراست نے ایلچی برادر اور جاکو برلاس کی جان بچائی۔ اگر وہ بیک جک کے ہتھے چڑھ جاتے تو وہ شاید انہیں زندہ نہ چھوڑتا۔ ایلچی بہادر نے بعد میں مولانا کو بنایا کردہ دونوں منصبے کے مطابق اجلاس میں شرکت کے لیے آرہے تھے۔ انہوں نے مغل سواروں کو حویلی کے باہر کھڑے دیکھا۔ انہیں خطرہ محسوس ہوا تو وہ اُلٹے پیروں واپس ہوئے۔ مغلوں کو شبہ ہوا اور انہوں نے گھوڑے دوڑا کر پکڑ لیا۔ پھر جعفر اور صادق نے مغلوں کو یہ بتایا کہ ہم دونوں تیمور کے خاص آدمی ہیں بس اس جرم میں انہیں گرفتار کر لیا گیا۔

اندر کمرے میں صاف ستھرا فرش بچھا دیا گیا تھا۔ مولانا، الیاس خواجہ اور چیدہ چیدہ مغل سرداروں کو ساتھ لے کر کمرے میں آ گئے۔ مغل محافظ دستوں نے کمرے کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور چوکس ہو کر پہرہ دینے لگے۔ عاصم سر پر سہرا باندھے فرش پر ایک طرف بیٹھا تھا۔ الیاس خواجہ اور بیک جک دولہا کے سامنے بیٹھ گئے۔ جعفر اور صادق نے دولہا کے بائیں جانب نشست سنبھال لی۔ مولانا صاحب خانہ کو ساتھ لے کر وضو

کرنے کے بہانے کمرے سے نکل گئے۔ مولانا اور صاحب خانہ دونوں کے سر ڈگمگا رہے تھے۔

صاحب خانہ نے آہستہ سے پوچھا۔ "اب کیا ہوگا مولانا؟"

"تمہارے کوئی لڑکی ہے؟" مولانا نے صاحب خانہ سے دوسرا ہی سوال کیا۔

"نہیں مولانا میرے تو لڑکے ہی لڑکے ہیں۔" صاحب خانہ نے حقیقت بیان کر دی۔

"گھر میں کوئی بھی جوان لڑکی موجود ہے؟"

"جی وہ کچھ خواتین مہمان آئی ہیں۔ ان کے ساتھ شاید کوئی لڑکی ہو۔" صاحب خانہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"چلو مجھے زنان خانے میں لے چلو۔" مولانا نے صاحب خانہ کو حکم دیا۔

مولانا زین الدین کو شہر سبز میں سب ہی جانتے تھے۔ ان کا ہر گھر میں بلا تکلف آنا جانا تھا۔ فاتحہ درود کے لیے مولانا کو گھروں میں جانا پڑتا تھا۔ صاحب خانہ اور مولانا زنان خانے میں پہنچے تو تمام خواتین نے انہیں اٹھ کر سلام کیا۔ مولانا نے دعا دے کر پوچھا۔

"تم میں کوئی کنواری لڑکی ہے؟"

خواتین نے مولانا کے اس عجیب سوال پر حیرت سے ان کے چہرے کو دیکھا۔ مولانا نے پھر اپنا سوال دہراتے ہوئے کہا۔

"میری بہنو اور بیٹیو۔ اس وقت ایک سو تاتاریوں کی جان خطرے میں ہے۔ یہ تاتاری محبِ وطن اور آزادی کے پروانے ہیں۔ یہ ملک تاتار کو مغلوں کی غلامی سے نجات دلانا چاہتے ہیں لیکن وہ مغلوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے ہیں۔ ان جاں فروشوں کو ہم نہیں بچا سکتے۔ صرف ایک کنواری لڑکی ذرا سی قربانی دے کر انہیں بچا سکتی ہے۔ میری کوئی ایسی بیٹی جو آزادی کے سو پروانوں کو مغلوں کے ہاتھ سے بچا لے۔"

عورتوں میں سے ایک نوخیز لڑکی آگے بڑھی۔ برابر کھڑی ہوئی عورت نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لڑکی نے آہستہ سے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ بولی۔

"ماں اگر میں اپنی جان دے کر بھی سو مجاہدوں کو شہید ہونے سے بچا سکوں تو تمہیں فخر ہونا چاہیے۔"

"شاباش بیٹی۔" مولانا کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

ماں نے بیٹی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ لڑکی بڑھ کے مولانا کے پاس آئی۔ "فرمایئے بزرگ مولانا۔ آپ ہماری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جنگ آزادی کے رہبر ہیں۔ میں آپ کے حکم پر سر کٹانے پر آمادہ ہوں۔"

"خدا ہر تاتاری دوشیزہ کو تم جیسا حوصلہ دے۔" مولانا نے دعا کی اور عورتوں نے "آمین" کہہ کر اس دعا میں شرکت کی۔ مولانا نے لڑکی سے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے بیٹی؟"

"جمالی۔" لڑکی نے حیا سے نظر جھکا لیں۔

"اور تمہارے خوش نصیب باپ کا نام کیا ہے؟"

"وہ تو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں مولانا۔" لڑکی کی ماں نے درد بھرے لہجے میں کہا جو لڑکی کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"سنو بیٹی جمالی۔ ہم سو آدمی شادی کا اعلان کر کے اس جگہ اکٹھے ہوئے تھے لیکن غداروں نے مغلوں سے مخبری کر دی۔ مغل سواروں نے حویلی کو گھیر لیا ہے۔ اگر ہم اس اجتماع کو شادی ثابت نہ کر سکے تو ہم سب کو قتل کر دیا جائے گا۔ میں نے عاصم داماد عبدالرحمن کو دولہا بنا کر محفل میں بٹھا دیا ہے۔ تم اس کی دلہن ہو گی۔ گواہوں کے سامنے تمہیں عاصم کو قبول کرنا ہو گا۔"

"جی۔ مولانا۔ مگر۔" لڑکی گھبرا گئی۔

"بیٹی۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ تم جو بچ ہو گی وہی ہو گا لیکن اس وقت تمہیں تاتاریوں کو بچانے کے لیے عاصم کو قبول کرنا ہو گا۔" مولانا لڑکی کو تسلی دیتے ہوئے واپس ہوئے۔ دو قدم چل کے اک دم رکے لڑکی کی ماں سے پوچھا۔ "مرحوم کا نام کیا تھا؟"

"الغ بیگ۔" لڑکی کی ماں نے جواب دیا

مولانا صاحب خانہ کو لیے بڑی تیزی سے زنان خانے سے باہر آ گئے۔ مولانا نے باہر آ کر پانی سے تین گلیاں کیں۔ پھر محفل میں جا کر بیٹھ گئے۔ جعفر اور صادق اس محفل میں بڑی بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ ہر تاتاری انہیں حقارت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا وہ وہاں سے جلد رخصت ہونا چاہتے تھے۔ اس لیے صادق نے مولانا سے کہا۔

"مولانا۔ محترم بسم اللہ کیجیے۔ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔"

مولانا نے ایسی قہر آلود نظروں سے جعفر اور صادق کو دیکھا کہ وہ سٹپٹا گئے۔ ایک طرف الچی بہادر اور

ابو برلاس دبکے ہوئے بیٹھے تھے۔ مولانا نے انہیں قریب بلا کر کہا۔

"جاؤ۔ اندر سے اجازت لے آؤ۔ لڑکے کا نام عاصم ولد عبدالرحمن اور تاتخدا کا نام جمالی بنت الغ بیگ شرعی۔" الچی اور جا کو چلنے لگے تو مولانا نے روک کر کہا۔ "دو گواہوں کو اور ساتھ لیتے جاؤ۔"

اس وقت صادق جھٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں گواہ کی حیثیت سے جاؤں گا۔"

صادق کی دیکھا دیکھی جعفر نے بھی خود کو دوسرے گواہ کی حیثیت سے پیش کر دیا۔ مولانا خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ چاروں وکیل و گواہ صاحب خانہ کے ساتھ اجازت لینے کے لیے اندر چلے گئے۔ مولانا اس وقت بہت پریشان تھے۔ انہوں نے کچھ اور سوچ رکھا تھا مگر صادق اور جعفر کے اندر جانے سے ان کے تمام منصوبے پر پانی پھر گیا تھوڑی دیر بعد گواہ اور وکیل دلہن کی اجازت لے کر واپس آ گئے۔

"مولانا نکاح پڑھیے۔" صادق نے واپس آتے ہی تحکمانہ انداز میں کہا۔

مولانا کے لیے سوائے نکاح پڑھنے کے اور کوئی چارہ نہ رہ گیا۔ دولہا سے پوچھنے کے بعد انہوں نے بلند آواز سے نکاح پڑھا جس کے بعد ہر طرف سے مبارک باد کی آواز بلند ہوئی۔ جعفر اور صادق فوراً جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ الچی خواجہ بھی اپنے مغل سرداروں کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ مولانا نے رسمی طور پر انہیں ضیافت کی پیش کش کی مگر انہوں نے معذرت کر لی۔ دراصل جعفر اور صادق میں اب بپھرے ہوئے تاتاریوں سے آنکھ ملانے کا حوصلہ باقی نہ رہا تھا۔

○

عاصم اور جمالی کی شادی کا ڈرامہ مکمل ہو گیا۔ مولانا زین الدین نے ایک سو تاتاریوں کو موت کے چنگل سے نکال لیا لیکن جب مولانا مغلوں کے واپس جانے کے بعد جمالی اور اس کی والدہ کا تعاون کا شکریہ ادا کرنے ان کے پاس گئے تو وہاں اس ڈرامے نے ایک دوسری ہی صورت اختیار کر لی۔ مولانا نے جو قدم اٹھایا تھا وہ سراسر قومی مفاد کے تحت تھا۔ اس میں ان کا کوئی ذاتی مفاد یا خواہش پوشیدہ نہ تھی عاصم اور جمالی نے جو تعاون کیا۔ وہ بھی ایک قومی تقاضا تھا۔

مولانا زین الدین خوش خوش اندر پہنچے اور جمالی کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"جمالی بیٹی۔ تم نے اور تمہاری والدہ نے جس تعاون اور قومی ہمدردی کا مظاہرہ کیا اس کے لیے میں اور تمام تاتاری مجاہدین تمہارے شکرگزار رہیں گے۔ اب تمہارے سامنے ایک شرعی نکتہ بیان کرتا ہوں جو تمہارے شکوک و شبہات دور کر کے تمہیں مطمئن کر دے گا۔ شرع محمدی میں یہ گنجائش موجود ہے کہ اگر کسی بے گناہ کی جان بچانے کے لیے تمہیں جھوٹ بولنا پڑے اور اس جھوٹ بولنے میں تمہارا کوئی ذاتی مفاد پوشیدہ نہ ہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس جھوٹ کے عذاب سے محفوظ رکھے گا۔ تمہیں معلوم ہے کہ یہ نکاح محض تاتاریوں کی جان بچانے کے لیے پڑھا گیا تھا اس لیے اس کی کوئی شرعی حیثیت یا حقیقت نہیں۔ تم پہلے ہی کی طرح ناکتخدا اور دوشیزہ ہو تم قطعی آزاد ہو جہاں چاہو اپنی مرضی سے شادی کر سکتی ہو۔"

جمالی جیسے خواب سے چونک پڑی۔ اس نے مولانا کو حیران نظروں سے دیکھا اور بولی۔

"بزرگ مولانا یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ آپ نے مجھ سے قربانی مانگی میں نے سچے دل سے پیش کر دی اور اس سچے دل سے میں نے عاصم کو اپنا شوہر قبول کر لیا ہے۔ اب میں شرعی حیثیت سے عاصم کی بیوی ہوں اور کسی اور سے شادی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ نہ میں عاصم سے آزادی چاہتی ہوں۔ عاصم جب چاہیں مجھے رخصت کرا کے لے جا سکتے ہیں۔"

مولانا کو پیروں کے نیچے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ مولانا کا خیال تھا کہ وہ حقیقت بیان کر کے اس نکاح کو فسخ کرنے کا فتویٰ دے کر عاصم اور جمالی کو مطمئن کر دیں گے لیکن جمالی کا یہ اعلان کہ اس نے عاصم کو خلوص دل سے قبول کرتے ہوئے "ہمکاری" بھری تھی۔ مولانا کے لیے ایک نیا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ انہوں نے کہا۔

"جمالی بیٹی۔ تمہارے بیان کی روشنی میں، میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ کم از کم تمہاری طرف سے اس نکاح کو شرعی حیثیت حاصل ہو گئی ہے اور اسے فسخ نہیں کیا جا سکتا۔ میں اس سلسلے میں عاصم سے گفتگو کرتا ہوں اگر وہ بھی آمادہ ہے تو میں ابھی تمہاری رخصتی کا بندوبست کر دوں گا۔ تم بالکل اطمینان رکھو۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ تمہاری مرضی بہرصورت مقدم رہے گی۔"

مولانا جمالی کے پاس آنے سے پہلے اپنے ساتھیوں سے کہہ آئے تھے کہ وہ چاہیں تو اپنے گھوڑوں کو واپس چلے جائیں کیونکہ نئی صورت حال کے پیش نظر انہیں اپنی حکمت عملی کا ازسرنو ترتیب دینا ہوگا۔ چنانچہ جب مولانا واپس آئے تو تقریباً تمام لوگ واپس جا چکے تھے۔ اپنی سپاہ، جاکو برلاس اور کچھ تاتاری

کا انتظار کر رہے تھے۔ مولانا نے واپس آتے ہی بڑی رازداری سے پوچھا

"بیٹے عاصم۔ تمہاری قربانیاں ہمارے لیے قابل فخر ہیں۔ آپ نے جس فرمانبرداری کا ثبوت دیا اسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ہاں یہ بتاؤ اگر میں یہ کہوں کہ تمہارا نکاح جمالی بنت الغ بیگ سے شرعی حیثیت سے ہو گیا ہے تو کیا تم جمالی کو رخصت کرا کے اپنے گھر لے جانے پر تیار ہو۔"

عاصم نے بڑی حیرت سے مولانا کو دیکھا۔ بولا۔ "حضور آپ یہ کیا فرما رہے ہیں؟ آپ نے حکم دیا کہ جاؤ میں نے اس کی تعمیل کی۔ میں جانتا تھا کہ آپ جو کچھ کر رہے ہیں وہ مغلوں کو مطمئن کرنے کے لیے ایک دکھاوا ہے اس لیے میں نے اسے دل سے قبول نہ کیا تھا۔ جمالی میری طرف سے آزاد ہے۔ اس پر میرا کوئی حق نہیں جتاؤں گا۔ اس کے ساتھ میں یہ ضرور کہوں گا کہ جمالی واقعی بڑی حوصلہ مند لڑکی ہے جس نے بقول اس فرضی عقد کے ہمارے ساتھ تعاون کیا۔"

مولانا کے لیے عاصم کا جواب قطعی غیر متوقع تھا۔ ان کی الجھن میں پہلے سے کہیں زیادہ اضافہ ہو گیا۔ "عاصم۔ شاید تم نے جمالی کو نہیں دیکھا۔ میرے خیال میں اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جن کی خواہش ہر جوان کو ہونا چاہیے۔ جمالی ایک نیک طینت، سمجھ دار اور خوب صورت بچی ہے۔ اگر تم اپنا اطمینان کرنا چاہو تو اس سے تمہاری بالمشافہ گفتگو کا انتظام کر سکتا ہوں۔ شرع اس کی ہمیں اجازت دیتی ہے۔"

عاصم بڑے اضطراب اور تذبذب کے عالم میں تھا۔ وہ مولانا جیسے فرشتہ صفت سراپا ایثار ہستی کے سامنے انکار بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن اسے مولانا کو بھی مطمئن بھی کرنا تھا۔ اس نے نہایت ادب سے کہا۔

"بزرگ محترم۔ جمالی واقعی قابل قدر لڑکی ہے۔ میں اس کی جرأت اور حوصلے کا قائل ہوں لیکن جب جمالی کو نکاح کے وقت دل سے قبول ہی نہیں کیا تو یہ عقد ہوا ہی نہیں۔ میں جمالی سے گفتگو کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔"

"عاصم بیٹے بات سمجھنے کی کوشش کرو۔" مولانا نے اسے سمجھایا۔ "بیٹے بات یہ ہے کہ میں نے جمالی کو یہ بتایا تھا کہ تمہارا نکاح عاصم کے ساتھ مصلحت وقت کے تحت کیا جا رہا ہے اور بعد میں اسے منسوخ کیا جا سکے گا۔ وہ معصوم اسے سچ مچ کا نکاح سمجھ بیٹھی۔ اب وہ کہتی ہے کہ عاصم میرے شرعی شوہر ہیں اور وہ تم سے جدا ہونے کے لیے کسی طرح تیار نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اسے رخصت کرا کے گھر لے جاؤ بہتر ہوگا شاید تمہیں نہ مل سکے۔ اگر تم یہ کہتے ہو کہ تم نے جمالی کو نکاح کے وقت دل سے قبول نہ کیا تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو اس کا حل یہ ہے کہ ہم ایجاب و قبول کی رسم دوبارہ ادا کرا لیتے ہیں۔"

"لیکن مولانائے محترم۔" عاصم بڑی بے بسی سے بولا۔ "میں کسی دوسری لڑکی سے کیسے شادی کر سکتا ہوں جبکہ صرف چھ ماہ پیشتر میرا نکاح ہو چکا ہے۔ میں تو ان ہنگامی حالات میں شادی کرنے کے لیے آمادہ ہی نہیں تھا وہ چچا زاد۔۔۔ اور بچپن کی منگیتر ہے۔ میرے چچا سخت بیمار تھے اور چاہتے تھے کہ ان کی بیٹی ان کے سامنے ہی اپنے گھر کی ہو جائے۔ ان کو مجبور کرنے پر میں نے نکاح تو کر لیا لیکن رخصتی کے لیے یہ شرط لگا دی کہ جب تک میرا ملک مغلوں کی غلامی سے آزاد نہیں ہو جاتا میں بیوی کو رخصت کرا کے گھر نہ لاؤں گا۔ آپ میری مجبوری محسوس کیجیے اور جمالی کو سمجھا بجھا کر اس ارادے سے باز رکھیے۔"

"عاصم تمہاری مجبوریاں اپنی جگہ درست ہیں۔" مولانا نے سوچتے ہوئے کہا۔ "مگر ہماری شریعت ہر مسئلے کا حل موجود ہے۔ اسلام نے ایک وقت میں چار بیویوں کی اجازت دی ہے۔ تم جمالی سے دوسری شادی کر سکتے ہو۔ شرع اس میں مانع نہیں ہے۔"

عاصم کو دراصل اپنی چچا زاد بہن سے بڑی محبت تھی۔ دونوں بچپن سے ایک ساتھ کھیلتے ہوئے جوان ہوئے تھے۔ ایک دوسرے کے مزاج سے واقف تھے۔ عاصم کا دل کسی طرح گوارہ نہ کر رہا تھا کہ وہ ایک محبت کرنے والی لڑکی کا دل دکھائے جو گھر میں اس کی سلامتی کی دعا مانگ رہی ہے۔ پھر نہ تو اس کی مالی حالت ایسی تھی کہ وہ بیک وقت دو عورتوں کی ذمہ داری اٹھا سکے اور نہ ہی پہلی بیوی میں کوئی ایسی کمی یا نقص تھا کہ وہ دوسرا نکاح کر لے۔ مولانا سے وہ کھل کر انکار بھی نہ کر سکتا تھا۔ اس نے ادب سے کہا۔

"حضرت مولانا یہ آپ کا حکم ہے تو مجھے اس کی تعمیل میں کوئی عذر نہیں لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے آپ نے اپنے ہر وعظ میں یہ فرمایا ہے کہ مرد کو اس صورت میں دوسری شادی کرنا چاہیے جب کہ انتہائی مجبوری ہو اور وہ بیویوں کے درمیان مساوات اور برابری قائم رکھ سکے۔ جمالی میری دوسری ہو گی جو کہ میرے لیے بالکل اجنبی ہے۔ اس صورت میں، میں دونوں کے ساتھ یکساں سلوک نہ کر سکوں اور میں یقیناً گنہگار ہو جاؤں گا۔"

"میں تمہارے خیالات سے پوری طرح متفق ہوں عاصم۔" مولانا حقائق سے انکار نہ کر سکے۔ "یہ میرے خیال میں اس مسئلے کا ایک اور حل بھی ہے لیکن میں اسے ذاتی طور پر پسند نہیں کرتا اور نہ میں تمہیں اس پر عمل کرنے پر مجبور کروں گا۔"

"مولانائے محترم۔" عاصم بڑی عقیدت سے بولا۔ "میں آپ کے حکم پر سر کٹانے کو تیار ہوں لیکن میں چاہتا ہوں اگر کوئی ایسی ترکیب یا حل موجود ہے جس سے جمالی مطمئن ہو سکے تو میں درخواست کروں گا کہ وہ ایسا کرے تاکہ یہ مسئلہ کوئی اور سنگین صورت اختیار نہ کر لے۔"

"عاصم بیٹے۔" مولانا فیصلہ کن انداز میں بولے۔ "میں تم سے طلاق لکھا کر جمالی کو ہمیشہ کے لیے آزاد نہیں کرا سکتا۔ جمالی اس بات پر تم سے شکوہ نہیں کر سکتی لیکن میں اور تم شاید اس قدر خود غرض کبھی نہ ہو سکیں۔ ہم اس لڑکی کا دل دکھائیں جس نے بڑی فراخدلی اور خلوص کے ساتھ ایک سوتا تاریوں کو بچانے کے لیے تم پر اندھا اور بے پناہ اعتماد کیا۔ تم اور عاصم کیا تم ایسا کر سکتے ہو؟"

"ہرگز نہیں حضور۔" عاصم نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "جمالی تو تاتاریوں کی نجات دہندہ ہے۔ میں اس کا دل دکھانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ہمارے ساتھیوں کو جب معلوم ہوگا کہ میں نے جمالی کے ساتھ سنگدلانہ سلوک کیا ہے تو وہ میرے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔ یہ تو جمالی کے ساتھ بیوفائی ہوگی۔ اس کی توہین ہوگی۔ مطلقہ ہونے کے بعد وہ اپنی ہم جولیوں کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گی۔"

"عاصم۔ اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس مسئلے کو حالات کے حوالے کر دیا جائے۔" مولانا اٹھتے ہوئے بولے۔ "تم نے اپنی بیوی کے سامنے یہ شرط رکھی ہے کہ اسے ملک آزاد ہونے سے پہلے رخصت کرا کے نہیں لے جاؤ گے۔ یہ شرط تم جمالی کے لیے بھی سمجھو۔ میں جمالی کو تمہارے حالات سے آگاہ کر دوں گا۔ وہ بڑی سمجھدار اور حوصلہ مند لڑکی معلوم ہوتی ہے اگر وہ اس بات پر آمادہ ہو گئی کہ اس کی رخصتی بھی شادی کے بعد کی جائے تو یہ مسئلہ ایک طویل مدت کے لیے دب جائے گا۔ ہم سب کی نیتیں اچھی ہیں اس لیے اس عرصہ میں اللہ خود ہی کوئی بہتر صورت پیدا کر دے گا۔"

عاصم نہایت سعادت مند جوان تھا۔ اس نے مولانا کو یقین دلایا کہ وہ کسی صورت میں کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے گا جو جمالی کی دلآزاری کا سبب بنے۔ مولانا نے حویلی سے جانے سے پہلے جمالی کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ وہ اس سلسلے میں جلد ہی جمالی سے دوبارہ ملاقات کریں گے۔ مزید یہ کہ جمالی کی خواہشات کا خیال رکھا جائے گا اور کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف نہ ہوگی۔

جمالی کے باپ کے انتقال کے وقت اس کے چچا نے جمالی اور بھتیجی کی کفالت کی رسمی طور پر پیشکش

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی تھی لیکن جمالی کی ماں نے یہ پیش کش قبول نہ کی۔ ایک تو اس کی وجہ اُس کے مزدور کی سخت گیر طبیعت تھی دوسرے اُس کے دیور کا لڑکا ہیراش ایک اوباش قسم کا جوان تھا۔ جمالی کی عمر اس وقت بارہ سال کی تھی اس کی ماں نے مناسب نہ سمجھا کہ وہ نوجوان بیٹی کو لے کر ایسے ماحول میں جائے جہاں کسی وقت بھی کوئی حادثہ ہو سکتا تھا۔ ان باتوں پر غور کرتے ہوئے اُس نے اپنے بڑے بھائی کی کفالت منظور کر لی۔ اس کا بھائی برا آدمی نہ تھا نیک دل انسان تھا۔ اُس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ جمالی جب ماموں کے گھر پہنچی تو ماموں ممانی نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنی بچی کی طرح اُس کی پرورش اور نگہداشت پر توجہ دی۔

بارہ سال کی جمالی نے جب سولھویں سال میں قدم رکھا تو اُس کا رنگ روپ کچھ ایسا نکھر آیا کہ گھر میں ایک گنی جانے لگی۔ جمالی کی ماں کو اُس کی اٹھتی جوانی دیکھ کر اُس کی شادی کی فکر ہوئی اور کسی اچھے رشتے کی تلاش میں لگ گئی۔ جمالی کے لیے رشتوں کی کوئی کمی نہ تھی لیکن اُس کے ماموں اور جمالی کی ممانی نامنظور کر دیتے کہ جمالی کی عمر ابھی ہی کیا ہے۔ دراصل انہیں جمالی سے اس درجہ محبت ہو گئی تھی کہ اتنی جلدی اُسے جدا کرنے پر تیار نہ تھے۔ جس وقت جمالی اور عاصم کی شادی حادثاتی طور پر ہوئی اس وقت اُس کے ماموں تجارت کے سلسلے میں سمرقند گئے ہوئے تھے۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ شہر میں موجود نہ تھے الجھنیں کچھ اور بڑھ جاتیں لیکن یہ بات ایسی نہ تھی کہ جمالی کی ماں اپنی بھاوج سے پوشیدہ رکھتی۔ واپس ہی اُس نے جمالی اور عاصم کی شادی کی پوری تفصیل بھاوج سے بیان کر دی۔ اُس کے بھائی اور بھاوج دونوں تاتاریوں کی آزادی کے زبردست حامی تھے۔ جمالی کی ممانی کو جب یہ معلوم ہوا کہ جمالی کا شوہر تحریک آزادی کا سرگرم کارکن ہے تو وہ بہت خوش ہوئی اور اُس نے جمالی کی ماں کو اطمینان دلایا کہ شوہر کو اس شادی پر رضامند کر لے گی اور اُن کے دل میں کوئی ملال نہ پیدا ہونے دے گی۔

مولانا زین الدین نے تاکید کر دی تھی کہ اس شادی کا چرچا نہ کیا جائے مگر یہ بات ایسی نہ تھی کہ زیادہ دیر تک پوشیدہ رہ سکتی۔ بات ایک منہ سے ہوتی ہوئی پورے شہر میں پھیل گئی۔ شہر سبز کوئی بڑا شہر نہ تھا۔ محلے قریب قریب آباد تھے۔ کوئی عام لڑکی ہوتی تو شاید لوگ اس پر توجہ نہ دیتے لیکن جمالی کا حسن تو شہر سبز کے ہر نوجوان کے دل میں گھر کیے ہوئے تھا۔ جمالی کا سب سے بڑا عاشق اس کا چچازاد بھائی تھا جو بزعم خود اپنے دوستوں میں کہتا پھرتا تھا کہ جمالی نے اُس سے شادی کا وعدہ کیا ہے اس لیے اس کو نامنظور کر دیتی ہے۔ پس جب اُسے جمالی اور عاصم کے عقد کی خبر ملی تو اُس کے دوستوں نے اُس

غصے سے بے قابو ہو گیا اور سیدھا جمالی کے گھر پہنچ گیا۔

جمالی باورچی خانے میں کام کر رہی تھی۔ اُس کی ماں آنگن میں بیٹھی تھی۔ ہیراش جانتے ہی اُن پر برس پڑا۔ "آپ نے یہ کیا کیا؟"

جمالی کی ماں نے اُسے حیرت اور غصے سے دیکھا۔ بولیں۔ "ہیراش تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نہ سلام نہ کلام بڑے بزرگوں سے اس طرح گفتگو کرتے ہیں۔ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"

ہیراش شرمندہ تو ہوا مگر بڑا ڈھیٹ تھا۔ اُس نے سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا اور کہا۔ "چچی جان۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں بھی تو خاندان میں موجود تھا۔ میرے ہوتے ہوئے آپ نے۔"

"پہیلیاں نہ بجھاؤ ہیراش۔" جمالی کی ماں کو بھی غصہ آ گیا۔ "میں نے کیا کیا اور اگر کچھ کیا ہے تو تم میرے بیچ دخل دینے والے کون ہو؟ تم مجھے کیا دینے ہو؟ کس بات کا حق جتا رہے ہو؟"

"ہیں۔ ہیں۔ آخر میں آپ کا بھتیجا ہوں۔" ہیراش اور ڈھٹائی سے بولا۔ "جمالی کا نکاح آپ نے کیوں نہیں کیا تھا؟ جمالی کا نکاح مجھ سے ہونا تھا۔"

"ہیراش۔ ہوش میں آؤ۔" جمالی کی ماں پہلو بدل کر بولیں۔ "جمالی کا نکاح ہو چکا ہے۔ اُس کے بارے میں تمہیں ایک لفظ کہنے کا حق نہیں۔ آخر وہ جوان تھی۔ اُس کا نکاح کہیں تو ہونا تھا۔ تم نے یا تمہارے گھر والوں نے کبھی آ کر پوچھا کہ ہم لوگ کس حال میں ہیں؟ اب خیال آیا ہے تمہیں۔"

جمالی کے کانوں میں ماں کے تیز تیز بولنے کی آواز پڑی تو وہ گھبرا کے باورچی خانے سے نکل آئی۔ اُسے دیکھتے ہی وہ سمجھ گئی کہ اُس نے ماں سے کوئی گستاخی کی ہوگی۔ ہیراش بھی اپنے باپ کی طرح تند خو اور بدمزاج کا آدمی تھا۔ پھر بھی اُس نے مسکرا کے ہیراش کو سلام کیا۔ "ہیراش بھائی خیریت تو ہے آج راستہ بھول گئے؟"

جمالی کے طنز بھرے لہجے سے ہیراش گھبرا گیا۔ "میں تو آتا جاتا رہتا ہوں جمالی۔ آج ہی تو نہیں آیا ہوں۔"

"جی آپ تو ایک فرار ہے ہیں ہیراش بھائی۔" جمالی نے طنز کا ایک اور تیر چلایا۔ "پچھلے تین سال سے تو میرا بھیرا ہے۔ یہی آپ کی بڑی مہربانی ہے۔ فرمایئے آپ کی کیا خدمت کی جائے۔"

جمالی کی ماں نے دیکھا کہ جمالی ہیراش کو آڑے ہاتھوں لے رہی ہے تو وہ اٹھ کے اندر چلی گئی۔ ہیراش نے جمالی سے نرم لہجے میں بولا۔ "جمالی۔ میں تو تمہارا عزیز ہوں، دوست ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مصیبت میں پھنس جاؤ۔"

"مصیبت بھی تو زندگی کا ایک حصہ ہے ہیراش بھائی۔" جمالی اسی طرح مسکرا رہی تھی۔ "آپ کسی کی مدد کا ذکر کر رہے ہیں کیا؟"

"ہاں جمالی۔" ہیراش جلدی سے بولا۔ "وہ تم نے جو عاصم سے نکاح کر لیا ہے فوراً ختم کرو۔ تمہیں بڑا افسوس ہوگا اس سے۔"

جمالی کی طبیعت میں شوخی کے ساتھ بڑا تحمل تھا۔ بولی۔ "ہیراش بھائی۔ سانپ نکل جائے تو لکیر پیٹنے سے کیا حاصل؟ جو ہو چکا اس پر خاک ڈالیے اور کوئی نئی بات سنایئے۔ ہاں وہ آپ کی شادی کا کیا بنا؟ ہماری تو دعائیں مانگتے مانگتے زبان گھس گئی ہے۔ اللہ کرے آپ اب شادی کر ہی ڈالیے۔" جمالی نے ہیراش کی کوفت کو مذاق میں ایسا اڑایا کہ وہ ہکا بکا رہ گیا۔

جھنجلا کے بولا۔ "میں تمہارے نکاح کی بات کر رہا ہوں اور تم میری شادی کا جھگڑا لے بیٹھیں۔ یہ شادی اب کہاں ہوگی؟"

"توبہ توبہ ہیراش بھائی۔" جمالی ہنسنے لگی۔ "خدا نہ کرے۔ آپ کے لیے کیا لڑکیوں کی کمی ہے۔ ایک سے ایک خوبصورت پہلی پڑی ہے۔ آپ اشارہ تو کریں۔"

"تم میرا مذاق اڑا رہی ہو جمالی۔" ہیراش چڑ گیا۔ "میں کہہ رہا ہوں عاصم سے تمہیں نقصان پہنچے گا۔ گاڑی نہیں چل سکتی۔"

"ہیراش بھائی۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔" جمالی پھر بھی سنجیدہ نہ ہوئی۔ "یہ گاڑی مجھے اور عاصم کو چلانی ہے۔ ہم آپ سے امداد نہیں طلب کریں گے۔"

"سنو جمالی۔" ہیراش ترش لہجے میں بولا۔ "عاصم کے ساتھ تمہارا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی جو وجہ ہے اس نے تمہیں دھوکہ دیا ہے۔"

"یہ میرے لیے نئی خبر نہیں ہے۔" جمالی بے پروائی سے بولی۔ "عاصم کا نکاح ہوا ہے۔ ابھی وہ اپنی بیوی کو رخصت کرا کے نہیں لایا۔ دو تلواریں ایک میان میں نہیں رہ سکتیں لیکن دو بیویاں ایک گھر میں رہ سکتی ہیں۔"

ہیراش کا خیال تھا کہ جمالی کو عاصم کی پہلی شادی کا علم نہیں لیکن جب جمالی پر اس انکشاف کا

کوئی اثر نہ ہوا تو ایک اور پینترا بدلا۔ بولا۔ "عاصم کی بہت کم زندگی ہے جمالی۔ وہ کسی وقت بھی قتل ہو سکتا ہے۔"

"ہیراش بھائی۔ آپ بھی سن لیجیے۔" جمالی بڑے وقار سے بولی۔ "آزادی کی آواز اٹھانا غداری نہیں۔ اگر اس جرم میں گرفتار ہو کر قتل ہو جائے تو مجھے اس کی بیوہ ہونے پر فخر ہوگا۔ غدار تو جعفر اور صادق ہیں یا وہ جو آزادی کی تحریک کے مخالف ہیں۔"

ہیراش کو یہاں ناکامی ہوئی تو اس نے عاصم کی پہلی بیوی صائمہ سے ملنے کا ارادہ کیا۔ یہ سب لوگ ایک قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور آپس میں دور کے عزیز بھی تھے۔ ہیراش پورے قبیلے میں بدنام تھا۔ اسے منہ نہ لگاتا تھا۔ صائمہ تو ہیراش کو گھر میں بلانے کی بھی روادار نہ تھی لیکن اس کی ماں نے کچھ مروت برتی اور معصوم صورت بنائے ان کے پاس جا کر ادب سے بیٹھ گیا۔

"ہیراش میں نے ملاقات کی تمہیں صرف اس وجہ سے اجازت دی ہے کہ تم ضرور کسی اہم گفتگو کے لیے آئے ہو۔" صائمہ کی ماں نے ہیراش کو خاموش دیکھ کر ذرا تلخی سے کہا۔ "تمہارا تعلق ہمارے قبیلے سے ہے اور تم جانتے ہو گے کہ مسلاوز قبیلے کے جوان کسی ایسے گھر میں تنہا نہیں جایا کرتے جہاں لڑکیاں موجود ہوں۔ اگر تمہیں کوئی خاص گفتگو نہیں کرنا ہے تو تم واپس جا سکتے ہو۔"

ہیراش کو یہاں بھی دال گلتی نظر نہ آئی۔ پھر بھی سنبھل کر بولا۔ "آپ کا کہنا بجا ہے لیکن میں کیا کروں میں جمالی کی ہمدرد لڑکی کو اپنی بہن سمجھتا ہوں اور اگر میری بہن کسی مصیبت میں گرفتار ہونے لگے تو میرا دل دکھنے لگتا ہے۔ صائمہ بھی میری بہن ہی ہے۔ عاصم نے اس کے ساتھ جو زیادتی کی ہے وہ میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔ اسی لیے آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔"

"عاصم نے کیا زیادتی کی صائمہ کے ساتھ؟" صائمہ کی ماں نے چونک کر پوچھا۔ "ابھی تو صائمہ کی رخصتی نہیں ہوئی پھر زیادتی کیسی؟" صائمہ کی ماں کو اس وقت تک عاصم کے دوسرے نکاح کی خبر نہ ہوئی تھی۔

"جی۔ میں یہی تو کہنے حاضر ہوا ہوں۔" ہیراش دل میں خوش ہوا کہ صائمہ کی ماں کو اب تک کچھ خبر نہیں ہے۔ رخصتی سے پہلے جو رویہ اختیار کیا ہے وہ آپ اور صائمہ کے لیے پریشان کن ہے۔ ایک بھائی کے ناتے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ آپ کو عاصم کی حرکتوں سے آگاہ کروں۔" ہیراش نے کھل کر بات نہ کی۔ وہ چاہتا تھا کہ صائمہ کی ماں کو پہلے خوب غصہ دلا دے تاکہ جب وہ انہیں مشورہ دینے کرے اس کے قبول کرنے میں پس و پیش نہ ہو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کچھ پتہ بھی تو چلے کیا کیا ہے عاصم نے؟" صائمہ کی ماں نے بے چینی سے پوچھا۔

"عاصم نے دوسری شادی کرلی ہے۔" ہیرائش نے بڑے غصے سے کہا۔ "میرا تو جی چاہتا تھا لیکن یہ کہ آپ جیسا حکم دیں مجھے....."

صائمہ کی ماں پہ تو غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ "کیا تم سچ کہہ رہے ہو ہیرائش؟" انہوں نے گھبرا کے پوچھا۔ "عاصم تو بڑا شریف لڑکا ہے۔ اُس کی طرف سے مجھے ایسی اُمید نہیں۔"

"بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔" ہیرائش بولا۔ "تعجب ہے آپ کو اب تک علم نہ ہو سکا۔ یہ بات تو شہر کے ہر شخص کو معلوم ہو چکی ہے۔ میں اپنی بہن پر یہ ظلم برداشت نہیں کر سکتا۔ آپ یقین کیجئے کہ میرا اس میں کوئی ذاتی مفاد نہیں۔ میں صائمہ کو اپنی حقیقی بہن سمجھتا ہوں۔ محض انسانی ہمدردی کے تحت میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ آگے آپ کی مرضی جیسا چاہیں کریں۔" یہ کہتے ہوئے ہیرائش اٹھ کے کھڑا ہو گیا جیسے اُسے اس معاملے سے مزید کوئی دلچسپی نہ ہو۔

"ذرا ٹھہرو ہیرائش۔" صائمہ کی ماں نے اُسے روکتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ عاصم نے ایسا کیوں کیا۔ ابھی تو صائمہ کی رخصتی بھی نہیں ہوئی۔ اُسے کیا شکایت پیدا ہو گئی ہم لوگوں سے۔ میرا دل کسی طرح نہیں مانتا لیکن تم؟ ہاں تمہیں یہ چھوٹی سی خبر پہنچانے سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔"

"دیکھیے میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ مجھے اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔" ہیرائش سوکھا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ "لیکن آپ کو اس سلسلے میں جلد کوئی قدم اٹھانا چاہیے ورنہ پھر صائمہ عمر بھر روتی رہے گی۔"

"لیکن اب کیا ہو سکتا ہے؟" وہ پریشان ہوتے ہوئے بولیں۔ "عاصم نے شادی کر لی ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ مرد چار شادیاں کر سکتے ہیں۔ ہم اُس کا کیا بگاڑ لیں گے؟"

"ابھی وقت ہے بشرطیکہ آپ کوشش کریں۔" ہیرائش نے انہیں سہارا دیا۔

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ انہوں نے فوراً پوچھا۔ "کیا صورت ہو سکتی ہے اس کی، ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"میں تو آپ کو صرف مشورہ دے سکتا ہوں۔ عمل کرنا آپ کا کام ہے۔" ہیرائش نے اور زیادہ ہمدردی کا اظہار کیا۔

"ہاں ہاں بتاؤ نا ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" انہوں نے بے صبری سے پوچھا۔

"عاصم نے ابھی نکاح کیا ہے۔" ہیرائش نے اپنے منصوبے کا آغاز کیا۔ "عاصم نے ابھی تک جمالی کو ت نہیں کرایا ہے اور رخصتی سے پہلے نکاح آسانی سے توڑا جا سکتا ہے۔ آپ عاصم کو بلا کے سمجھائیں ہی نے بہکا دیا ہے۔ آپ محبت سے سمجھائیں گی تو وہ ضرور مان جائے گا۔"

"یہ جمالی کس کی بیٹی ہے؟" صائمہ کی ماں نے تحقیق کی۔

"وہ بھی صائمہ کی طرح میری بہن ہے مگر ہے بڑی فسادی۔" ہیرائش نے ٹھہر ٹھہر کے کہنا شروع کیا۔ "جمالی یتیم ہوئی تو ہم نے اُسے اپنے گھر میں رہنے اور اُس کے اخراجات برداشت کرنے کی پیش کش لیکن وہ ماں بیٹی کسی طرح رضامند نہ ہوئیں اور جمالی ماموں کے گھر چلی گئی۔ اگر وہ ہمارے گھر ہوتیں ایسا ہرگز نہ ہونے دیتے۔"

"تو کیا اُس لڑکی کو علم نہیں تھا کہ عاصم کا نکاح ہو چکا ہے؟" صائمہ کی ماں بوکھلا بوکھلا کر سوال کر تھی۔

"پتہ کیوں نہیں تھا جمالی کو سب کچھ معلوم تھا۔" ہیرائش کا تیر نشانے پر بیٹھ گیا۔ "مگر پتہ نہیں کہ ں کو عاصم میں کیا خوبی نظر آئی کہ وہ سب کچھ جانتے ہوئے رضامند ہو گئیں۔"

صائمہ کی ماں فکر میں پڑ گئیں۔ ہیرائش نے جس وثوق کے ساتھ یہ بات کی تھی اُس سے انہیں یقین پڑا لیکن اُن کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ عاصم نے ایسا کیوں کیا۔ وہ صائمہ کو رخصت کرانے پہ رہا تھا پھر اُس نے یہ دوسرا نکاح کیسے پڑھایا۔ "کہیں عاصم اور جمالی میں کوئی؟" ان کا دماغ اُلجھ رہ گیا۔

"اب مجھے اجازت دیجئے۔" ہیرائش نے اپنا کام پورا کر دیا تھا۔

"اچھا بیٹے۔" صائمہ کی ماں ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔ "دو چار دن بعد چکر لگا لینا۔ میں صائمہ سے ان کر رکھوں گی پھر جیسا تم کہو گے قدم اٹھائیں گے۔"

اسی وقت دوسرے کمرے سے آواز آئی۔ "امی جان ان سے کہہ دیجئے کہ اب اِدھر کا رُخ نہ لائیں۔" اس کے ساتھ ہی صائمہ کمرے میں آ گئی۔ "یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے اسے ہم خود سلجھائیں گے۔ کسی دوسرے کے مشورے کی ضرورت نہیں۔"

صائمہ کے لہجے میں تلخی کے ساتھ ساتھ بڑا استقلال تھا۔ ہیرائش اُس کی جرأت پہ حیران رہ گیا۔ ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو صائمہ کا یوں بے دھڑک کمرے میں چلے آنا پھر اس حوصلے سے بات کرنا یقیناً بڑا تعجب خیز تھا۔ میراشی نے صائمہ کو پہلی بار دیکھا تھا اُس کے اٹھتے ہوئے قدم رک گئے اور سوچنے لگا کہ اس وحشی ہرنی کو کس طرح ڈھیر پر لگایا جائے۔

"میراشی بھائی آپ جا سکتے ہیں۔" صائمہ نے کرخت لہجے میں کہا۔ "عاصم میرا شوہر ہے وہ خود جتنی چاہے شادیاں کرے۔ آپ کو میری ہمدردی کرنے کی ضرورت نہیں مجھے کسی مشورے کی بھی ضرورت نہیں۔ شکریہ آپ تشریف لے جائیں اور خیال رہے کہ یہ عاصم کی بیوی صائمہ کا گھر ہے۔ یہاں کوئی نامحرم داخل نہیں ہو سکتا۔"

میراشی کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ وہ کچھ بھی نہ بول سکا اور ہارے ہوئے جواری کی طرح تھکے قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔

"بیٹی۔ ناحق تم نے اُسے ڈانٹ دیا وہ بے چارہ تو ہمدردی کرنے آیا تھا۔" صائمہ کی ماں نے بیٹی کو سمجھایا۔

"امی آپ نہیں جانتیں۔ میراشی پوری آبادی میں بدنام ہے۔" صائمہ ماں کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔ "ہمارے قبیلے کی یہاں آبادی ہی کتنی ہے پورے قبیلے کو بدنام کر رکھا ہے اس نے۔"

"تو کیا یہ غلط کہہ رہا تھا کہ عاصم نے دوسری شادی کی ہے؟" ماں نے بیٹی کو تیز نظروں سے گھورا پھر خود ہی جواب دیا۔ "اگر عاصم نے یہ کیا ہے تو اچھا نہیں ہوا۔ اُس نے تم میں کیا عیب دیکھا ہے؟ برا سہی لیکن عاصم نے دوسری شادی کر کے کون سا اچھا کام کیا ہے؟ وہ تو سلاوز ہے کیا اس سے قبیلہ بدنام نہیں ہوگا؟"

"امی۔" صائمہ لاجواب سی ہو گئی۔ "میں عاصم کی طرف داری نہیں کرتی۔ یہ بات میں نے بھی اڑتی اڑتی سنی ہے۔ اگر یہ سچ ہوا تو تم عاصم کو بلا کے پوچھ لینا کہ اُس نے یہ حرکت کیوں کی؟ میں نے صرف میراشی کا راستہ بند کیا ہے ورنہ وہ روز ہمارے گھر کے چکر لگانے لگتا۔"

"اچھا چھوڑو اسے۔ لیکن میں عاصم سے پوچھوں گی ضرور۔" صائمہ کی ماں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

صائمہ کی ماں کو معلوم تھا کہ عاصم اپنے گھر پر کم ہی ملتا ہے۔ اُس کا زیادہ وقت مولانا دین الدین کے حجرے میں گزرتا ہے۔ مولانا شہر سبزی کی بڑی مسجد کے ایک حجرے میں رہتے تھے۔ وہ پانچوں وقت کی نمازوں کی باقاعدہ امامت کرتے اور فجر اور عشا کے بعد مسجد کے اندر ہی درس و وعظ کی محفلیں جماتے تھے۔ مولانا کے زہد و تقویٰ اور تاثیر بیان پر اُن کے اثر سے سب ہی واقف تھے۔ اس لیے مغل اور اُن کے حواری مولانا پر خاص نظر رکھتے تھے۔ مولانا دین الدین کو بھی اس بات کا علم تھا وہ بڑی احتیاط برتتے اور درس و وعظ کے دوران کوئی ایسے بات نہ کہتے جس سے اُن پر بغاوت کا الزام لگ جاتا۔ عاصم تمام وقت مولانا ہی کے پاس گزارتا تھا۔ صائمہ کی ماں کا پیغام بھی اُسے مسجد ہی ملا۔ عاصم نے پیام لانے والے سے کہہ دیا کہ وہ مغرب کی نماز کے بعد صائمہ کے گھر آئے گا۔

نماز کے بعد عاصم، مولانا کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور آہستہ سے بولا۔ "بزرگ محترم مجھے آج ایک نئے طوفان کا سامنا ہے۔ سخت پریشان ہوں سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔"

"عاصم حوصلے سے کام لو۔" مولانا نے پہلے اُسے تسلی دی۔ "ہم نے جو راہ اختیار کی ہے اس میں قدم قدم پر پریشانیوں کا سامنا ہوگا۔ بہرحال بتاؤ، تمہاری نئی پریشانی کیا ہے؟ اس کے حل کی بھی کوئی تدبیر نکالی جائے گی۔"

"اپنے کام کے بارے میں مجھے کوئی پریشانی نہیں۔" عاصم نے متانت سے کہا۔ "لیکن ذہنی اور خاندانی پریشانی ہے۔ میری پہلی بیوی صائمہ کی ماں نے مجھے بلوایا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میری دوسری شادی کا مسئلہ اُٹھے گا۔"

"اوہ یہ بات ہے۔" مولانا نے اطمینان کا سانس لیا۔ "اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ جو کچھ ہوا وہ صاف صاف بتا دینا۔"

"مجھے صائمہ کا سامنا کرتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی ہے بزرگ محترم۔" عاصم کی اصل پریشانی یہی تھی۔ "امی جی کو تو میں مطمئن کر لوں گا لیکن صائمہ۔ اُسے میں کیا جواب دوں گا؟"

"بچوں جیسی باتیں نہ کرو عاصم۔" مولانا نے اُسے سمجھایا۔ "جب کوئی قوم آزادی کی جدوجہد شروع کرتی ہے تو اُسے بہت سی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ تمہاری بیوی کے سینے میں اگر ایک دردمند دل ہے تو وہ ناراض ہونے کے بجائے تمہارے اس قدم کو سراہے گی۔ ابھی تو نتیجہ نہیں کہ اس راستے میں کتنے سہاگ اجڑیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گے اور کتنے نونہال باپ کی شفقت سے محروم رہ جائیں گے۔ تم نے کوئی جرم نہیں کیا نہ تم گنہگار ہو۔ تم صائمہ سے آنکھیں ملا کے بات کر سکتے ہو۔ میرا خیال ہے وہ تمہارے راستے میں نہیں آئے گی۔"

عاصم میں مولانا کی باتوں سے بڑا حوصلہ پیدا ہو گیا اور وہ نئے عزم اور نئے جذبے کے ساتھ صائمہ کے گھر کی طرف چلا۔ اندھیرا پھیل جانے کی وجہ سے راستے اور گلیاں سنسان ہو گئی تھیں۔ مغلوں کے سخت پہرے کی وجہ سے بستی والے رات ہوتے ہی اپنے اپنے گھروں میں دبک جاتے تھے۔ عاصم اپنے خیالات میں کھویا ہوا ایک میدان سے گزر رہا تھا۔ میدان کے دوسری طرف صائمہ کا محلہ تھا۔ میدان پار کر کے جب عاصم صائمہ کے مکان میں جانے والی گلی میں داخل ہوا تو ایک دم پندرہ بیس سواروں نے اُسے گھیر لیا۔ عاصم گھبرا گیا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ سوار کدھر سے آ گئے۔ اُس پر اس قدر اچانک حملہ ہوا تھا کہ وہ نہ تو اپنی مدافعت کر سکا اور نہ ہی کسی کو پکار کر اپنی مدد کے لیے بُلا سکا۔ اس وقت اگر وہ کسی کو آواز بھی دیتا تو اُس کی مدد کو شاید کوئی نہ پہنچتا۔ میدان سائیں سائیں کر رہا تھا اور گلی ویران پڑی تھی۔ دوسری گلی میں کسی دکان پر ایک چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ دکاندار نے شاید سواروں کو دیکھ لیا تھا۔ اس کے بعد وہ جلدی سے چراغ بجھا کر اندر چلا گیا تھا۔ عاصم پر حملہ کرنے والوں کا مقصد شاید اُسے قتل کرنا نہیں تھا۔ اسی لیے انہوں نے سیاہ چادر ڈال کر اُسے بے بس کر دیا اور گٹھڑی بنا کے گھوڑے پر لاد کر دم کے دم میں غائب ہو گئے۔

صائمہ اور اُس کی ماں عاصم کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھیں۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور اُسی رفتار سے صائمہ کی ماں کا غصہ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ گلی میں کھلنے والی کھڑکی کو چوپٹ کھولے اُس سے لگی بیٹھی تھی اور ذرا ذرا دیر بعد عاصم کو ایک نہ ایک جلی کٹی سناتی جاتی تھی۔ صائمہ آنگن میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ جب اس کی ماں عاصم کو بہت ہی سخت بات کہتی تو اُس کے قدم رک جاتے اور وہ ماں کو گھورنے لگتی لیکن منہ سے کچھ نہ بولتی۔ اُسے بھی عاصم پر غصہ تھا کہ اُس نے وعدہ کرنے کے باوجود آنے میں اتنی دیر کی۔

"شکر ہے کہ وہ آ رہا ہے۔" صائمہ کی ماں کھڑکی سے پوری گردن باہر نکالتی ہوئی بولی۔ "گھوڑے پر آ رہا ہے تمہارا دُولہا۔"

"گھوڑے پر؟" صائمہ نے حیران ہو کر پوچھا۔ "عجیب آدمی ہے عاصم بھی۔ دن میں کبھی آئین تو پیدل اور

سنسان رات میں گھوڑے پر سوار ہو کے آ رہے ہیں۔ محلے والے کیا سوچیں گے۔"

صائمہ کی ماں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ متجسس نظروں سے گلی میں گھوڑے جا رہی تھی۔ گلی میں جلنے والی مدھم روشنی میں آپ دیکھ رہی تھی۔ ذرا دیر بعد گردن اندر کرتے ہوئے بولی۔ "کوئی بھی نہیں ہے۔ مجھے دھوکا ہوا ہے۔"

صائمہ کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ رات بھیگتی رہی مگر عاصم کا کہیں پتہ نہ تھا۔ صائمہ کی ماں نے بڑبڑاتے ہوئے کھڑکی بند کر دی۔ "سو جائیں اب وہ نہیں آئے گا اتنی رات تو ہو گئی۔" کھڑکی بند کر کے صائمہ کی ماں بستر پر آ کر بیٹھی ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ صائمہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ ماں نے دہائی دی۔ "آواز دی۔ "تو رہنے دے۔ دروازہ میں کھولوں گی۔" اور وہ بستر سے اٹھ کر لپ چھپ کرتی دروازے کے پاس پہنچ گئی۔

"کون ہے؟" صائمہ کی ماں نے دروازہ کھولنے سے پہلے پوچھا۔

"اور کون ہو گا میرے سوا۔" باہر سے ہنسنے کی آواز آئی۔

صائمہ کی ماں نے دروازہ کھول دیا۔ صائمہ کے والد ہنستے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ "کیا بات ہے صائمہ بیٹی بھی اب تک جاگ رہی ہے؟"

صائمہ کے والد دوسرے محلے میں مطب کرتے تھے۔ وہ صبح کے نکلے رات ہی کو گھر میں گھستے تھے۔ بارہ واپس آتے تو صائمہ عام طور پر نہیں سوئی ہوئی ملتی تھی۔

"آج آپ نے بھی اتنی دیر کر دی۔" صائمہ کی ماں نے بُرا سا منہ بنا کے شوہر سے شکوہ کیا۔

"بھئی تم لوگ میرے لیے پریشان نہ ہوا کرو۔" وہ سادگی سے بولے۔ "مہمان اور مریض کا کوئی وقت ہوتا ہے۔ آج زیادہ مریض آ گئے تھے انہیں نمٹاتے نمٹاتے دیر ہو گئی۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہیں مریض اور مہمان کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔" صائمہ کی ماں کو ہنسی آ گئی۔ "آپ کے مریض تو نمٹا آئے لیکن مہمان اب تک نہیں آیا۔"

"مہمان۔ کوئی آنے والا تھا کیا؟"

"ہاں عاصم کو بلوایا تھا میں نے۔"

"لیکن بُلانے کی کیا ضرورت تھی؟ اُسے جب اپنے کاموں سے فرصت ملتی ہے تو خود ہی آ جاتا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"آپ کھانا کھا لیجئے پھر بتاؤں گی کیا ضرورت تھی اُسے بلانے کی۔" صائمہ کی ماں کھانا لینے چلیں۔ صائمہ اُن سے پہلے ہی کھانا نکالنے چلی گئی تھی۔ اُس نے ماں کو آتے دیکھا تو بولی۔ "آپ وہیں بیٹھیں میں کھانا لا رہی ہوں۔"

صائمہ کی ماں شوہر کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔ سوچنے لگیں بات کس طرح شروع کریں۔

"کچھ بولو نا۔ عاصم کو کیوں بلایا تھا؟" شوہر نے پریشانی سے پوچھا۔

"آپ کو اپنے مطب سے فرصت ہی نہیں۔" بیوی جل کے بولی۔ "پتہ ہے عاصم نے کیا گل کھلایا ہے؟ کچھ کہو گی بھی؟"

صائمہ کھانا لے کے آئی اور باپ کے سامنے رکھ کر چپ چاپ اپنے بستر پر جا کر لیٹ گئی۔

"عاصم نے دوسرا نکاح پڑھا لیا ہے۔" بیوی نے سرگوشی کی۔

شوہر کے ہاتھ کا نوالہ ہاتھ ہی میں رہ گیا۔ "کسی نے افواہ تو نہیں اُڑائی؟" انہوں نے آہستہ سے پوچھا۔

"میں نے بھی پوچھنے کو بلایا تھا اُسے۔" وہ پلو سنبھالتے ہوئے بولی۔ "اُس کے دل میں چور ہے جو تو نہیں آ رہا تھا پر۔"

"عاصم ایسا تو نہیں۔" صائمہ کے باپ کو کسی طرح یقین نہیں آ رہا تھا۔ "وہ مولانا زین الدین کے پاس بیٹھتا ہے۔ مجھے تو یقین نہیں آتا۔ کل میں مولانا کے پاس جاؤں گا۔"

"آپ کے جانے سے شاید بات زیادہ بگڑ جائے۔" بیوی نے میاں کو سمجھایا۔ "صبح کو میں خود اُس کے پاس جاؤں گی۔ کہ ابھی عاصم نے صرف نکاح کیا ہے۔ رخصتی نہیں کرائی ہے۔ اللہ شاید کوئی بہتر صورت نکال دے۔"

صائمہ کے باپ بھی اس خبر سے پریشان ہو گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ عاصم تحریک میں نمایاں حصہ لے رہا ہے۔ وہ خود بھی تحریک کے ہمدرد تھے لیکن عاصم کی اس حرکت سے اُن کے دل کو بڑا دھچکا لگا۔ اُن سے ٹھیک طرح کھانا بھی نہ کھایا گیا۔

صائمہ کی ماں کے تو دل کو لگی ہوئی تھی صبح نماز کے بعد وہ چادر اوڑھ کر سیدھی بڑی مسجد پہنچ گئیں اور مولانا کے حجرے کے پاس جا کر دم لیا۔ مولانا درس کی تیاری کر رہے تھے۔ اُن کی نظر حجرے کے باہر کی طرف

ئے وہاں پہنچے۔

صائمہ کی ماں نے ادب سے سلام کیا۔

مولانا دعا دینے کے بعد بولے۔ "خاتون درس کا وقت ہو رہا ہے۔ اجازت دو کہ میں پہلے اس سے فارغ ہو لوں۔"

"مولانا میں انتظار کر لوں گی۔" صائمہ کی ماں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے ایک مسئلے پر آپ سے مشورے کی ضرورت ہے۔"

"اچھا تم حجرے میں بیٹھو جاؤ فکر نہ کرو اللہ مشکل آسان کر دے گا۔" مولانا تسلیاں دیتے ہوئے چلے گئے اور درس میں مصروف ہو گئے۔ ایک گھنٹے کے درس کے بعد وہ واپس آئے۔ بولے۔ "ہاں خاتون بتاؤ میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

"میں صائمہ کی ماں ہوں مولانا صاحب۔" صائمہ کی ماں نے اپنا تعارف کرایا۔

"صائمہ۔" مولانا ذہن پر زور دیتے ہوئے بولے۔ "یہ نام سنا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن کچھ یاد نہیں آ رہا ہے۔"

"عاصم کو تو آپ جانتے ہیں۔" صائمہ کی ماں نے بات بڑھاتے ہوئے کہا۔ "صائمہ سے عاصم نے پہلا نکاح کیا تھا۔ اب سنا ہے کہ اُس نے کسی دوسری لڑکی سے نکاح کر لیا ہے۔"

"بس میں سمجھ گیا۔ آپ حکیم صاحب کی بیگم ہیں۔" مولانا معاملے کی تہہ تک فوراً پہنچ گئے۔ "آپ کو جواب دینے کے لیے پہلے میں ایک سوال پوچھتا ہوں۔ کیا آپ جواب دینا پسند کریں گی؟"

"مولانا صاحب۔" وہ فوراً بولیں۔ "آپ ہمارے روحانی پیشوا ہیں۔ اسی لیے تو میں آپ کے پاس حاضر ہوئی ہوں۔ اگر آپ یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ میری بیٹی میں وہ کون سا عیب ہے جس کی وجہ سے عاصم نے دوسرا نکاح کیا تو میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ صائمہ میں ظاہری یا باطنی کوئی ایسی بات نہیں کہ جس کی وجہ سے عاصم نے اُسے ناپسند کیا ہو پھر ابھی تو رخصتی بھی نہیں ہوئی۔"

"خاتون۔" مولانا قطع کلام کرتے ہوئے بولے۔ "صائمہ کے بارے میں عاصم اور خود میں پوری طرح مطمئن ہوں۔ دوسرے نکاح کی یہ وجہ ہرگز نہیں۔ میں تو صرف آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ مغلوں کی حکومت پسند کرتی ہیں؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اللہ کی مار ہو ان مغلوں پر۔" صائمہ کی ماں نے حقارت کا اظہار کیا۔ "میں تو اُس دن کا انتظار کر رہی ہوں جب ہم آزاد ہوں گے اور ہماری بہو بیٹیاں سر اٹھا کر گلی کوچوں میں بے خوف نکل سکیں گی۔"

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔" مولانا بولے۔ "بس تم یہ سمجھو کہ جو کچھ ہوا بالکل حادثاتی طور پر ہوا اس میں نہ تو عاصم کی مرضی کو دخل تھا اور نہ کوئی دباؤ تھا۔" پھر مولانا نے عاصم اور جمالی کے نکاح کی پوری تفصیل اُس کے سامنے بیان کر دی۔ آخر میں کہا۔

"اگر عاصم اُس وقت ہم سے تعاون نہ کرتا تو تحریک آزادی کے تمام مجاہد قتل کر دیے جاتے اور یہ تحریک ہمیشہ کے لیے دم توڑ دیتی۔ عاصم نے صرف ایک سو قانونیوں کو موت کے منہ سے نہیں بچایا بلکہ اُنہوں نے قربانی کی ایک نئی مثال قائم کی ہے۔ صائمہ بیٹی کو اپنے شوہر پر فخر کرنا چاہیئے۔ جس طرح صائمہ کی رخصتی آزادی سے مشروط ہے اسی طرح جمالی کی رخصتی کا معاملہ بھی آزادی کے بعد اُٹھے گا۔ تمہیں وقت کا صبر و شکر کے ساتھ انتظار کرنا چاہیئے لیکن صائمہ بیٹی کو میری طرف سے یہ اطمینان دلا دینا کہ کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف نہ ہوگا۔ عاصم اُسے دل سے چاہتا ہے اور خدا نے وہ دن دکھایا تو اُسے رخصت کرا کے میں خود اُس کے گھر پہنچاؤں گا۔"

مولانا نے اپنی باتوں سے صائمہ کی ماں کو پوری طرح مطمئن کر دیا۔ عاصم کی طرف سے اُس کے دل میں جو وسوسے پیدا ہوئے تھے وہ ختم ہو گئے۔ وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔ "عاصم آپ کے پاس آئے تو اُسے میرے پاس ضرور بھیجیے گا۔ میں اُس سے کوئی گلہ نہیں کروں گی۔ اگر وہ کل شام میرے پاس آ کر یہی باتیں مجھے بتا دیتا تو مجھے آپ کے پاس آنے کی ضرورت نہ پڑتی۔"

"کل رات عاصم تمہارے پاس نہیں گیا؟" مولانا چونک پڑے۔ "یہاں سے تو وہ یہی کہہ کر گیا تھا کہ وہ صائمہ کے گھر جا رہا ہے۔"

"جی نہیں مولانا۔" وہ بولیں۔ "میں تو آدھی رات تک اُس کا انتظار کرتی رہی۔"

"میں تو یہی سمجھا تھا کہ وہ تم سے ملا ہے اور شاید تمہیں مطمئن نہیں کر سکا اور تمہیں یہاں آنا پڑا۔" مگر مولانا کو کچھ بے چینی سی پیدا ہو گئی۔ "رات تمہارے یہاں نہیں گیا۔ صبح کی نماز میں بھی نہیں تھا۔" مولانا نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ صائمہ کی ماں اس سے پہلے ہی حجرے سے نکل چکی تھی۔

مولانا نے اسی وقت ایک آدمی عاصم کے گھر بھیجا کہ معلوم کرے عاصم کہاں ہے۔ آدمی نے آ کر بتایا

کہ عاصم رات گھر نہیں پہنچا۔ مولانا کی فکر بڑھ گئی۔ عاصم ایسا نہیں تھا کہ بغیر مولانا کو مطلع کیے کسی دوسرے شہر یا جا سکتا۔ عاصم کے گھر والے مطمئن تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ عاصم کو مولانا نے کسی کام میں لگا دیا ہوگا۔ وہ اکثر دن کو گھر سے غائب رہا کرتا تھا لیکن مولانا کے لیے یہ امر باعث تشویش بن گیا۔ دوپہر تک مولانا اِدھر اُدھر اپنے سے گھومتے رہے۔ ہر جاننے والے سے وہ عاصم کے بارے میں پوچھتے لیکن کسی کو علم نہ تھا کہ عاصم ہاں گیا۔ جمعہ کا دن تھا اور مولانا کو جمعۃ المبارک کی نماز پڑھانا تھی۔ وہ مسجد واپس آ گئے۔ نمازی آنا شروع ہو گئے تھے۔ مولانا اُن سے بھی عاصم کے بارے میں پوچھتے رہے۔ سب ہی نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ نماز کے بعد مولانا نے ایلچی بہادر جاکوبر لاس اور چند دوسرے معتمد کے آدمیوں کو اپنے حجرے میں بلایا اور عاصم کی یک گمشدگی کی انہیں اطلاع دی۔ ایلچی بہادر اور جاکوبر لاس کو عاصم کی تلاش پر لگا دیا گیا۔ وہ دونوں اپنے کام پر روانہ ہو گئے۔

ایلچی بہادر کو بتایا گیا تھا کہ عاصم مغرب کے بعد صائمہ کے گھر جانے کے لیے نکلا تھا۔ ایلچی نے اس کو گرہ میں باندھ کر عاصم کی تلاش شروع کی۔ وہ مسجد سے نکل کر اُس راستے پر چلا جو صائمہ کے گھر کو جاتا تھا۔ راستے میں جتنی دکانیں پڑتی تھیں وہاں سے ایلچی نے عاصم کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ ہر محلے کے لوگ جانتے تھے۔ رات کو بھی عاصم کئی آدمیوں سے سلام دعا ہوئی تھی۔ ایلچی کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ عاصم صائمہ کے گھر ہی کی طرف گیا تھا۔ اسی طور پر وہ اُس میدان میں پہنچ گیا جس کے ایک طرف صائمہ کے گھر جانے والی گلی تھی۔ اُس گلی کے برابر والی گلی کے نکڑ پر ایک دکان تھی۔ اُس سے جب ایلچی بہادر نے دریافت کیا تو اُسے واقعہ ڈرتے ڈرتے بتایا۔ اُس نے عاصم کو تو نہ دیکھا تھا لیکن اس نے چند سواروں کا واقعہ ذکر کیا جو صائمہ کی گلی سے نکلے تھے۔ ایلچی کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ اپنی رپورٹ لے کر مولانا کے پاس پہنچے۔

جاکوبر لاس مولانا کے پاس پہلے ہی پہنچ چکے تھے انہوں نے یہ خبر دی تھی کہ سردار صادق کی حویلی میں کل رات کسی شخص کو گرفتار کر کے لایا گیا ہے جسے گرفتار کیا گیا تھا وہ چادر میں لپٹا ہوا گھوڑے پر لایا گیا تھا اس لیے اُس کا منہ نہ دیکھا جا سکا۔ یہ خبر جاکوبر لاس کو حویلی کے ایک محافظ سوار نے دی جو کہ آزادی کا ممبر تھا۔ ایلچی بہادر نے جب اپنی روداد بیان کی تو بات کھل کر سامنے آ گئی۔ گرفتار ہونے والا عاصم ہی تھا جسے سردار صادق کے آدمیوں نے صائمہ کی گلی سے پکڑ کر اُس کی حویلی میں پہنچایا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مغلوں نے سردار جعفر اور سردار صادق کو گورنر مقرر کیا تھا لیکن وہ مغل سردار بیگ جک کے ماتحت تھا۔ مغل حاکم الیاس خواجہ نے جنوب کا تمام علاقہ بیگ جک کے سپرد کر دیا تھا اور خود سمرقند میں رہتا تھا۔ جعفر کو اس نے سمرقند کا گورنر مقرر کر کے اپنے ساتھ رکھا تھا۔

عاصم کی گمشدگی کی کوشش کے باوجود پوشیدہ نہ رہ سکی۔ لوگوں کو تفصیل تو نہ معلوم ہو سکی لیکن عاصم کی گمشدگی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل گئی۔ ہر تاتاری دوسرے سے کہتا "کیا معلوم ہے کہ عاصم کو مغل نے گرفتار کر لیا ہے۔" بعض جگہ تو یہ افواہ پھیل گئی کہ عاصم کو قتل کر کے اس کی لاش بھی غائب کر دی گئی ہے۔ رات ہونے ہونے یہ خبر عاصم کی دونوں بیویوں کے گھر بھی پہنچ گئی اور وہاں صف ماتم بچھ گئی۔ جمالی اور صائمہ کے گھر ملنے کی عورتوں نے جمع ہو کر یوں رونا شروع کر دیا جیسے واقعی عاصم مر گیا ہو۔

عاصم کی گرفتاری کی وجہ کچھ بھی نہیں آ رہی تھی۔ شہر سبز میں صرف دو ہی ہستیاں تھیں جو اس راز سے کسی حد تک پردہ اٹھا سکتی تھیں اور وہ تھیں عاصم کی دونوں بیویاں جمالی اور صائمہ۔ جس وقت ان کے کانوں میں عاصم کی گرفتاری کی خبر پہنچی تو بیگ۔ وقت ان کا خیال ہیراش کی طرف گیا۔ ہیراش کو انہوں نے ناامید بلکہ ذلیل کیا تھا۔ وہ تھا بھی اسی قابل۔ یہ سب اسی کا کیا دھرا تھا۔

ہیراش کو جمالی اور صائمہ دونوں کے گھر منہ کی کھانا پڑی تو اس کی بدطینتی عود کر آئی۔ اس نے انتقام کا ایک خطرناک منصوبہ تیار کیا۔ اس کے خیال میں اس تمام جھگڑے کی اصل جڑ عاصم تھا۔ اس نے سب سے پہلے عاصم کو راستے سے ہٹانے کا ارادہ کیا۔ ہیراش سیدھا سردار صادق کے پاس گیا اور اسے اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ سردار صادق کو تو ایسے غداروں کی ضرورت ہی تھی۔ تاتاری کسے بالکل پسند نہ کرتے تھے۔ اس لیے وہ تاتاریوں کو اپنا ہم خیال اور دوست بنانے پر ہر وقت تیار رہتا تھا۔ ہیراش تو شہر بھر کا ایک نامی گرامی بدمعاش اور غنڈہ تھا۔ ایسے شخص کا تعاون تو وہ ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ہیراش کی خوب پذیرائی کی اور اسے ہر قسم کی مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہیراش تو یہی کچھ تھا اسی لیے اس نے سردار صادق سے تاتاریوں کے بارے میں خوب الٹی سیدھی لگائیں۔ اس نے عاصم کو تحریک کا روحِ رواں ظاہر کیا اور صادق کو مشورہ دیا کہ اگر عاصم کو گرفتار کر لیا جائے تو اس سے تحریک میں حصہ لینے والوں کے نام بھی معلوم ہو جائیں گے اور تحریک اس کے بغیر بے جان ہو جائے گی۔ سردار صادق، تحریک آزادی کے ممبران سے سخت خائف تھا اور چاہتا تھا کہ ان پر بغاوت کا الزام ثابت کر کے قتل کرا دے۔ ہیراش کے

کہنے پر عاصم کے پیچھے اپنے آدمی لگا دیے اور اس کی مخبری پر صادق کے سواروں نے عاصم کو گرفتار کر کے حویلی میں پہنچا دیا۔

عاصم کو رات بھر ایک اندھیری کوٹھڑی میں بند رکھا گیا۔ صبح ہوئی تو اسے سردار کے سامنے پیش کیا گیا۔ صادق ایک زرنگار مسند پر ٹیک لگائے بڑی شان سے بیٹھا تھا۔ یہ مسند قصرِ سفید میں تیمور کی بڑائی ہونی پائش گاہ سے اٹھوائی گئی تھی۔ تیمور کی حویلی پر مغلوں کے قبضے کے وقت سردار صادق نے اپنی غداری کے عوض وہ کے تمام سامان پر اپنا قبضہ کر لیا تھا۔ یہ مسند تیمور نے خاص اپنے لیے بنوائی تھی۔ مغلوں نے اس مسند کے علاوہ سارے قیمتی جواہرات تو لے لیے تھے مگر اب بھی اس میں موتیوں کی بیش قیمت جھالر لگی ہوئی تھی۔

عاصم کو صادق کے سامنے لایا گیا تو سردار صادق نے ہنس کر کہا۔ "کہو عاصم۔ رات خیریت سے گزری۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہیں رات اندھیرے میں گزارنا پڑی لیکن ابھی تو یہ آغاز ہے اگر تم نے ہم سے تعاون نہ کیا پھر تمہاری راتیں اس سے بھی زیادہ بری گزریں گی۔"

"میں نے کیا جرم کیا ہے سردار صادق؟" عاصم آہستہ سے بولا۔ "آپ تاتاری ہیں۔ میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔ میں نے آپ کی کہیں برائی نہیں کی۔"

"ہم بھی تمہارے ساتھ کوئی برائی کرنا نہیں چاہتے۔" صادق بولا۔ "پھر ہم تو تمہاری شادی کے گواہ بھی ہیں۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ تم اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کرو۔"

"پھر مجھے کیوں گرفتار کیا گیا ہے؟" عاصم نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"تم اس عذاب سے رہائی حاصل کر سکتے ہو عاصم۔" صادق نے نرم لہجہ اپنایا۔ "ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمیں ان لوگوں کو پکڑ کر ہمارے سامنے لے آؤ۔ ہم مغل سپہ سالار سے کہہ کر تمہیں ایک اچھا عہدہ دلا دیں گے۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہو گا۔"

"سردار صادق۔" عاصم کے لہجے میں سختی آ گئی۔ "آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟ باغیوں سے آپ کی کیا مراد ہے؟ کوئی تاتاری باغی نہیں ہے۔"

"یہ کرامت عاصم۔" صادق بھی تیز ہو گیا۔ "مغل ہمارے حاکم اور بادشاہ ہیں۔ ان کے خلاف ایک لفظ بھی بغاوت ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم لوگ مغلوں کے خلاف سازش کر رہے ہو۔ مجھے تمہاری نگرانی کا حکم آیا ہے اگر تم اپنے ساتھیوں کے نام بتا دو تو ہم یقین دلاتے ہیں تمہیں آزاد کر کے انعام و اکرام سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی نوازیں گے۔"

"سردار صادق آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔" عاصم تلخی سے بولا۔ "اپنے ملک اور قوم سے محبت کرنا تو سازش ہے اور نہ بغاوت۔ کیا آپ کو تاتاریوں سے محبت نہیں؟"

"کون کہتا ہے کہ مجھے تاتاریوں سے محبت نہیں۔" صادق زور دے کر بولا۔ "یہ میری تاتاریوں سے محبت کا نتیجہ ہے کہ ملک میں امن و امان ہے۔ اگر میں اور سردار جعفر مغلوں کو نہ روکیں تو وہ ایک دن میں تاتاریوں کو تباہ کر کے رکھ دیں۔ شہر ویران ہو جائیں اور کسی کی عزت و ناموس برقرار نہ رہے۔"

"نہیں آپ کی طرح تجربہ کار نہیں سردار صادق۔" عاصم اکڑ کے بولا۔ "لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ غیر ملکی آقاؤں کے ہاتھ مضبوط کرنا تاتاریوں سے محبت نہیں بلکہ غداری ہے۔ قوم سے غداری ہے۔"

"کمینے۔" صادق کے مسند سے اٹھ کر عاصم کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ جما دیا۔ عاصم کے ہاتھ زنجیروں میں جکڑے تھے وہ خون کے آنسو پی کر رہ گیا۔ "اب تو اس کوٹھڑی میں گھٹ گھٹ کے مر جائے گا اور کسی کو خبر بھی نہ ہو گی کہ تو کہاں گیا؟"

"جسے خبر ہونا تھی اُسے خبر ہو چکی ہے سردار صادق۔" عاصم نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ "عاصم مر جائے گا لیکن تاتاری قوم تو نہیں مرے گی۔ تم کس کس کو پکڑو گے کہاں تک لوگوں کو قتل کرو گے یاد رکھو سردار۔ مغل تمہارا زیادہ دن تک ساتھ نہ دیں گے۔ خوارزم کا رُخ کسی وقت پلٹ سکتا ہے۔ اُس وقت سے ڈرو جب ملک تاتار کی زمین تم پر تنگ ہو جائے اور تاتاری تم پر تھوکنا بھی پسند نہ کریں۔"

"لے جاؤ اس کتے کو۔" صادق دھاڑا۔ "باغیوں کا ٹھکانہ قید خانہ ہے اور انجام موت۔ عرفہ نے عاصم کو پھر اُسی تاریک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔

○

مولانا زین الدین حسب معمول درس سے فارغ ہو کر اپنے حجرے میں بیٹھے ایلچی بہادر اور جاگیر سے گفتگو کر رہے تھے۔ عاصم کی گرفتاری کی وجہ سے تحریک کا کام التواء میں پڑ گیا تھا اور ان کے پیش نظر سب سے اہم مسئلہ عاصم کی رہائی کا تھا۔ یہ بات تو طے تھی کہ عاصم کی گرفتاری میں مغلوں کا کوئی ہاتھ نہیں لیکن یہ

سردار صادق نے اپنے طور پر اٹھایا ہے کیونکہ مغل حاکم الیاس نوئن نے صاف طور پر اعلان کر دیا تھا کہ کسی تاری کو اُس وقت تک گرفتار نہ کیا جائے جب تک اُس کے خلاف بغاوت کا کوئی ثبوت نہ مل جائے۔ اس صورت میں اگر ایاس خواجہ کو اس گرفتاری کی اطلاع پہنچائی جائے تو ہو سکتا ہے کہ عاصم کو رہا کر دیا جائے لیکن سوال یہ ہے کہ مغل حاکم کے پاس سمرقند کون جائے۔ تحریک کے کسی کارکن کا ایاس خواجہ کے پاس جانا مناسب نہ تھا اس کا اُلٹا اثر بھی ہو سکتا تھا۔

یہ لوگ اس مسئلے پر غور کر رہے تھے کہ مولانا کو اطلاع دی گئی کہ کوئی عورت اُن سے ملنا چاہتی ہے۔ مولانا نے ایلچی اور جاگیر کو رخصت کر دیا اور آنے والی کو اندر بلا لیا۔ عورت نے اندر آ کر پہلے سے بھائی اور غمناک لہجے میں بولی۔ "بزرگ پیشوا۔ میں عاصم کی بیوی جمالی ہوں۔"

مولانا نے نظر اٹھا کر اُسے دیکھا۔ جمالی کی آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کئی راتوں سوئی نہیں ہے اور شاید مسلسل روتی رہی ہے۔ مولانا بڑے غم زدہ لہجے میں بولے۔ "بیٹی ہم عاصم ہی کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ عاصم کو سردار صادق نے گرفتار کر کے کسی جگہ رکھا ہے۔ عاصم کے خلاف صادق کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے اس لیے اُس کی گرفتاری کا کوئی جواز نہیں۔ ہم یہ سوچ رہے تھے کہ کسی کو سمرقند بھیج کر مغل حاکم کو اطلاع دی جائے ممکن ہے کہ اس صورت میں عاصم کی رہائی کا حکم جاری ہو۔"

جمالی نے مولانا کی باتیں بڑے تحمل سے سنیں۔ اس کی آنکھیں اس وقت آنسو بہا رہی تھیں۔ رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "بزرگ پیشوا میں جانتی ہوں کہ آپ لوگ بھی عاصم کی گرفتاری سے فکرمند ہوں گے۔ مجھے بھی یقین ہے کہ عاصم سردار صادق کی قید میں ہے۔ لیکن اس کی گرفتاری میں چچا زاد بھائی ہیرانش کا بھی ہاتھ ہے۔ گرفتاری سے ایک دن پہلے وہ میرے پاس آیا تھا اور عاصم کے خلاف بھڑکا رہا تھا۔ میں نے اُسے سخت سست کہہ کے بھگا دیا تھا۔ اُس نے مجھ سے بدلہ لینے کے لیے عاصم کو گرفتار کرایا ہو گا۔"

"میں تمہارے خیال سے اتفاق کرتا ہوں بیٹی۔" مولانا سوچتے ہوئے بولے۔ "ہیرانش کی شکایتیں تمہارے پاس آئی تھیں۔ ضرور اسی نے یہ حرکت کی ہو گی۔ اس سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ ہیرانش مغلوں کے گروہ میں شامل ہو گیا ہے۔ اب ہمیں اُس سے بھی محتاط رہنا پڑے گا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جمالی ابھی کچھ کہنے والی تھی کہ جاکو نے حجرے کے دروازے پر آکر کہا۔ "مولانا نے محترم! ایک ان خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔"

مولانا اس اطلاع سے کچھ اور پریشان ہوئے۔ وہ جمالی کو پوری طرح مطمئن کرکے واپس کرنا چاہتے تھے تاکہ اُس کے غم کا کچھ مداوا ہو جائے۔ مولانا نے جاکو سے پوچھا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ میں ایک خاتون سے گفتگو کر رہا ہوں تم اُن سے کسی اور وقت آنے کو کہہ دیتے۔"

"میں نے اُن سے یہی کہا تھا۔" جاکو نے جواب دیا۔ "لیکن وہ اسی وقت ملنا چاہتی ہیں، کہتی ہیں وہ کسی اور وقت نہ آسکیں گی۔ انہیں عاصم کے بارے میں کوئی بات کرنا ہے۔"

عاصم کے نام پر مولانا اور جمالی دونوں چونک پڑے۔ مولانا کی سمجھ میں نہ آیا کہ دوسری عورت کون ہو سکتی ہے۔ انہوں نے جمالی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ جمالی نے فوراً کہا۔ "بزرگ پیشوا! آپ یہیں بلوا لیں ممکن ہے کہ وہ عاصم کے بارے میں کوئی خاص خبر لائی ہوں۔"

"اچھا جمالی بیٹی تم پیٹھ گھما کے بیٹھ جاؤ۔" مولانا بولے۔ "میرا خیال ہے کہ یہ خاتون صائمہ کی ماں ہوں گی۔ عاصم کی خوش دامن۔ میں نہیں چاہتا کہ یہاں کوئی ناخوشگوار صورت پیدا ہو۔ میں تمہارا اُن سے تعارف نہیں کراؤں گا۔ تم ہماری باتوں میں ہرگز دخل نہ دینا خواہ وہ تمہارے خلاف ہی کیوں نہ گفتگو کریں۔"

"آپ اطمینان رکھیے۔" جمالی نے سعادت مندی سے کہا۔ "عاصم پر صائمہ کا حق مجھ سے زیادہ ہے اور صائمہ کی ماں یا خود صائمہ بھی اگر مجھے بُرا بھلا کہیں تو مجھے ناگوار نہ ہوگا۔"

"خدا تمہیں خوش رکھے جمالی۔" مولانا نے اُسے دعا دی۔ جمالی مولانا کی طرف پشت کرکے بیٹھ گئی۔ مولانا نے عورت کو اندر بلایا۔ وہ اندر آئی۔ ادب سے سلام کیا۔ پھر چادر ہٹا کے بولی۔ "مولانا صاحب میں عاصم کی بیوی صائمہ ہوں۔"

مولانا نے حیرت سے صائمہ کو دیکھا۔ جمالی کا دل چاہا کہ وہ پلٹ کر صائمہ کو دیکھے۔ اُس صائمہ کو جس کی سوکن تھی لیکن اس وقت وہ بھی اُسی کی طرح پریشان تھی۔

"بیٹھو بیٹی صائمہ۔" مولانا نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ اُن کے حجرے میں اس وقت دو لڑکیاں موجود تھیں اور اُن کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کیا کہیں اور کیا کریں۔

"مولانا صاحب۔" صائمہ نے روتے ہوئے کہا۔ "میرے شوہر کو ہیرا شش نے پکڑوایا ہے۔"

...یا تھا اور عاصم کی برائیاں کر رہا تھا۔ میں نے اُسے ڈانٹ دیا تو وہ بگڑ کے گیا تھا۔ اُسی نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ آپ ہیرا شش کا کوئی بندوبست کریں ورنہ میں اُس کا خون پی لوں گی۔"

مولانا کو اب قطعی یقین ہو گیا کہ یہ سب کیا دھرا ہیرا شش ہی کا ہے۔ اس نے جمالی اور صائمہ کو الگ الگ ورغلانے کی کوشش کی اور جب ناکام رہا تو اُس نے یہ قدم اٹھایا لیکن اس وقت جمالی اور صائمہ کی موجودگی سے اُنہیں ایک اور ہی خیال پیدا ہوا۔ انہوں نے صائمہ سے پوچھا۔ "بیٹی تمہیں معلوم ہے عاصم نے جمالی نام کی ایک لڑکی سے نکاح کر لیا ہے۔"

"مجھے سب کچھ معلوم ہے مولانا صاحب۔" صائمہ سسکیوں میں بولی۔ "میں عاصم کو بچپن سے جانتی ہوں میرے ساتھ ناانصافی نہیں کرے گا۔ میں تو اُس کی دوسری بیوی کے ساتھ بھی رہنے کے لیے تیار ہوں۔"

صائمہ نے آخری جملہ کچھ ایسی فراخدلی اور خلوص سے کہا کہ جمالی کا دل چاہا کہ وہ دوڑ کر صائمہ کے گلے لگ جائے لیکن اُس نے ضبط سے کام لیا اور اُسی طرح منہ پھیرے ہوئے مولانا سے کہا۔ "بزرگ پیشوا۔ اگر انہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو مجھے ان سے مل کے بہت خوشی ہوگی۔"

صائمہ کی نظر اب تک جمالی پر نہ پڑی تھی۔ وہ حجرے کے ایک کونے میں گٹھڑی بنی بیٹھی تھی۔ اُس نے مولانا سے کہا۔ "مولانا صاحب یہ کون خاتون ہیں؟ مجھے بھی ان سے مل کر خوشی ہوگی۔"

"اور تم دونوں کی ملاقات سے مجھے سب سے زیادہ خوشی ہوگی۔" مولانا مسرت سے بولے۔ "صائمہ بیٹی اگر تم سے ملنا چاہتی ہیں وہ بھی اسی درد میں مبتلا ہیں جو درد تمہیں یہاں لے آیا ہے۔"

"تو کیا یہ بہن جمالی ہیں مولانا صاحب؟" صائمہ نے حیرانگی سے مولانا کو دیکھا اور اُٹھ کے کھڑی ہو...

جمالی کو صائمہ کی آواز میں اپنائیت اور محبت محسوس ہوئی۔ اُس نے بھی منہ گھما کر صائمہ کو دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ مولانا اس منظر کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ صائمہ اور جمالی ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھیں اور پھر دوڑ کر آپس میں لپٹ گئیں۔ اُن کے ساتھ ہی اُن کی برسوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ وہ خوب پھوٹ پھوٹ کر روئیں۔ مولانا چپ چاپ کھڑے دیکھ رہے تھے۔ جب ان کے دل پر چھائے ہوئے غم کے بادل چھٹ گئے تو پھر وہ سگی بہنوں کی طرح سر جوڑ کر بیٹھ گئیں اور بڑی محبت سے ایک دوسرے کا حال پوچھنے لگیں۔ مولانا انہیں وہیں چھوڑ کر باہر نکل آئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُسی شام سردار صادق کی حویلی کے سامنے بڑا زبردست ہنگامہ ہوا۔ شہر سبز کی پچاس ساٹھ عورتیں چیختی چلاتی اور نعرے لگاتی صادق کی حویلی پر پہنچ گئیں اور انہوں نے عاصم کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ عورتوں کے اس جلوس کی قیادت صائمہ اور جمالی کر رہی تھیں۔ سردار صادق کی حویلی پر مسلح سواروں کا زبردست پہرہ لگا رہتا تھا۔ انہوں نے عورتوں کو روکا مگر عورتیں بپھری ہوئی شیرنیوں کی طرح اُن پر جھپٹ پڑیں اور جس کے ہاتھ میں جو آیا وہ سواروں پر پھینک مارا۔ اس کش مکش میں کچھ عورتیں زخمی ہو گئیں۔ اس ہنگامے کو دیکھنے کے لیے بہت سے تاتاری بھی وہاں جمع ہو گئے۔ انہیں بھی غصہ آگیا اور وہ تلواریں کھینچ کر مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔ سردار صادق حویلی کے اندر کھڑا یہ ہنگامہ دیکھ رہا تھا مگر عورتوں اور تاتاریوں کو دیکھ کر اس کی ہمت نہ پڑی کہ باہر نکلے۔ تاتاری اب تک عورتوں کی مدافعت کر رہے تھے مگر کسی لمحے بھی وہ سردار صادق کے سواروں پر حملہ کر سکتے تھے۔

قبل اس کے کہ حالات بے قابو ہو جائیں کسی نے مغل سپہ سالار بیک جک کو اطلاع کر دی۔ وہ فوراً پانچ ہزار سواروں کو لے کر سردار صادق کی حویلی پہنچ گیا۔ اُس کو بتایا گیا تھا کہ شہر سبز کے تاتاریوں نے مغلوں کے خلاف بغاوت کر دی ہے اور انہوں نے سردار صادق کو گھیر لیا ہے لیکن جب انہوں نے یہاں آکر دیکھا تو اُسے آگے آگے عورتیں نظر آئیں جنہیں سردار صادق کے سوار پیٹ رہے تھے۔ بیک جک بڑا بد دماغ اور ظالم مغل تھا لیکن جب اس نے کئی ہزار تاتاریوں کا مجمع دیکھا تو اس نے سردار صادق کے سواروں کو ڈانٹ کر الگ کر دیا۔ پھر خود گھوڑا بڑھا کر مجمع کے پاس پہنچا۔ تاتاریوں نے مغلوں کو آتے دیکھ کر اپنی تلواریں نیام میں کر لی تھیں اور بالکل پُرامن ہو کر کھڑے ہو گئے۔

"تم لوگ کیوں اکٹھے ہوئے ہو۔ کیا چاہتے ہو؟" بیک جک نے بھاری آواز میں مجمع کو مخاطب کیا۔

جمالی اور صائمہ آگے بڑھیں۔ ان کے کپڑے کئی جگہ سے پھٹ گئے تھے اور سر سے خون بہہ رہا تھا۔ جمالی نے بڑی جرات سے کہا۔ "ہم باغی نہیں ہیں مغل سردار۔ عاصم کو چھوڑ دو ہم اور کچھ نہیں چاہتے۔"

"عاصم یہاں شہر میں ہے؟" صائمہ نے وضاحت کی۔ "ہم تمہارے وفادار ہیں۔ ہمارا عاصم ہمیں واپس کر دو۔ اُس نے کچھ نہیں کیا۔ ہم امن چاہتے ہیں۔ انصاف چاہتے ہیں۔"

"عاصم کہاں ہے۔ کس نے پکڑا ہے اسے؟" بیک جک کے موٹے دماغ میں یہ بات نہ آئی کہ یہ سب جھگڑا کسی عاصم کی وجہ سے ہو رہا ہے۔

"عاصم کو سردار صادق نے اغوا کرایا ہے۔" جمالی نے بڑے جوش سے کہا۔

"عاصم اسی حویلی میں قید ہے۔" صائمہ بھی چیخ کے بولی۔

"کہاں ہے نمک حرام صادق؟" بیک جک نے پلٹ کر اپنے ایک سردار سے کہا۔

مغل سردار نے حویلی کے گیٹ کی طرف گھوڑا بڑھایا۔ اُس وقت اُسے سردار صادق گیٹ سے ادھر آتا دکھائی دیا۔

"بھاگ کے جا نمک حرام سپہ سالار بلا رہے ہیں۔" مغل سردار نے بیک جک کے الفاظ دہرائے۔

صادق دوڑ کے بیک جک کے گھوڑے کے پاس پہنچ گیا۔

"عاصم کون ہے۔ تُو نے کیوں پکڑا ہے اسے؟" بیک جک زور سے گرجا۔

"وہ باغی ہے سپہ سالار۔" سردار صادق ڈرتے ڈرتے بولا۔

"کیا یہ سب باغی ہیں۔ یہ تو کہہ رہے ہیں کہ مغلوں کے وفادار ہیں۔" بیک جک کو اور غصہ آگیا۔

"سب تو باغی نہیں ہیں سپہ سالار لیکن۔"

"چپ رہ گدھے۔" بیک جک نے اُسے ڈانٹ کے خاموش کر دیا۔ "ہم نے تجھے شہر سبز کا ناظم اس لیے بنایا تھا کہ تو یہاں امن و امان رکھ۔ تُو ایک آدمی کی وجہ سے سب سے جھگڑا کر رہا ہے۔ ہمیں جھگڑا چاہیے۔ بلا عاصم کو۔ ان کے حوالے کر۔"

"مغل سپہ سالار آپ کا بہت بہت شکریہ۔" جمالی اور صائمہ نے ایک آواز ہو کر کہا۔

عاصم کو اندھیری کوٹھڑی سے نکالا گیا۔ اُس کے ہاتھ پیر کھولے گئے۔ اُسے بیک جک کے سامنے لایا گیا۔ بیک جک نے عاصم کو دیکھتے ہی ایک بھیانک قہقہہ لگایا۔ "یہ باغی ہے۔ اس نے بغاوت کی ہے؟"

سردار صادق کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ وہ سر جھکائے کھڑا رہا۔ بیک جک کے قہقہوں کا جیسے ہوٹ پڑا۔ ایک دو، چار پھر وہ قہقہے پر قہقہہ لگاتا رہا جیسے دل کا غبار نکال رہا ہو۔ پھر رک کے "جا جا۔ بھاگ جا۔ اپنے گھر۔" اور پھر قہقہہ۔

صائمہ اور جمالی نے بڑھ کر عاصم کو اپنے حلقے میں لے لیا۔ ایک نے دایاں اور دوسری نے بایاں بازو پکڑا اور عاصم کو لیے ہوئے مجمع کی طرف واپس ہو گئیں۔ تاتاری عاصم کو زندہ سلامت واپس آتے دیکھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر بہت خوش ہوئے انہوں نے اس خوشی میں نعرے بلند کیے اور بیک جک نے ان نعروں کے جواب میں قہقہوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ادھر سے ایک قہقہہ لگتا اور اُدھر سے دو قہقہے بلند ہوتے یوں ا طرح خوشی خوشی ادھر پیلے پھرے ہوئے تاتاری ہنسی خوشی اپنے گھر واپس چلے گئے۔ صائمہ اور جمالی نے اپنے سا آنے والی سہیلیوں اور دوسری عورتوں کو بہت بہت شکریہ ادا کر کے انہیں رخصت کر دیا۔

جب صائمہ، جمالی اور عاصم رہ گئے تو عاصم نے جمالی کی طرف دیکھتے ہوئے صائمہ سے کہا "تمہیں ا تمہاری سہیلی کے سر میں چوٹ آئی ہے۔ تمہیں فوراً گھر واپس جانا چاہیئے۔"

"آپ نے میری سہیلی کو پہلے کبھی نہیں دیکھا؟" وہ بولی۔

"شاید کبھی نہیں۔" عاصم نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"صائمہ بہن۔ میں نے بھی عاصم کو آج پہلی بار دیکھا ہے۔" جمالی چور نظروں سے عاصم کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم عاصم کو بالکل نہیں جانتیں؟" صائمہ نے جمالی کو چھیڑا۔

"نہیں صائمہ بہن۔ یہ بات نہیں۔" جمالی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں تو اب عاصم صاحب واقف ہو گئی ہوں لیکن یہ عاصم اب تک مجھے نہیں پہچانے۔"

"اچھا۔ تو میں تم دونوں کا تعارف کرائی ہوں۔" صائمہ کے چہرے پر نفرت یا جلن کے قطعی آثا نہیں تھے۔ "پہلے تم بڑھاؤ اپنا ہاتھ۔" صائمہ نے جمالی سے کہا۔

جمالی نے نظریں جھکا کر آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ آگے بڑھایا

"عاصم صاحب۔" صائمہ شوخ نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "آپ بھی اپنا ہاتھ اُدھر بڑھا تاکہ میں تعارف کرا سکوں۔"

"ہاں عاصم صاحب۔ یہ میری سہیلی ہیں۔" صائمہ نے عاصم کا ہاتھ پکڑ کر جمالی کی طرف بڑھایا۔ "میری ایسی سہیلی ہیں جن کا ہاتھ آپ کو پکڑنا ہوگا بالکل اُسی طرح جس طرح میں نے آپ کا ہاتھ پکڑا ہے۔ لیں اب تکلف نہ کیجئے اور ان کا ہاتھ پکڑ لیجئے۔"

"صائمہ تم پاگل ہو گئی ہو۔" عاصم نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ "میں اب ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔"

"ان کا ہاتھ پکڑنے میں کوئی حرج نہیں۔" صائمہ ہنستے ہوئے بولی۔ "میری سہیلی کوئی غیر نہیں۔ تمہ

ہماری بیوی جمالی ہے۔ تم نے بھری محفل میں اسے قبول کیا تھا۔"

عاصم نے گھبرا کر جمالی کی طرف دیکھا۔ جمالی سر جھکائے شرمائی ہوئی کھڑی تھی۔ وہ دیر تک جمالی کو پلکوں سے دیکھتا رہا۔

"عاصم۔" صائمہ نے کہنا شروع کیا۔ "تمہاری رہائی کا منصوبہ جمالی نے بنایا تھا۔ ہم نے اپنے گھر والوں کو اس کی خبر نہ ہونے دی۔ ہماری سہیلیوں اور شہر سبز کی عورتوں نے بھی ہمارا ساتھ دیا۔ اللہ نے ہمیں کامیابی عطا کی ورنہ یہ غدار صادق معلوم نہیں تمہارے ساتھ کیا سلوک کرتا۔"

"مجھے تم دونوں پر فخر ہے۔" عاصم پُرمسرت لہجے میں بولا۔ "جس قوم کی عورتیں اتنی بیدار ہو جائیں وہ زیادہ دیر تک غلام نہیں رہ سکتی۔"

یہ تینوں باتیں کرتے ہوئے مولانا دین الدین کی مسجد میں پہنچے۔ وہاں جمالی اور صائمہ کے تمام عزیز و اقارب اکٹھے تھے۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ جمالی اور صائمہ نے سردار صادق کی حویلی کو گھیر لیا ہے۔ مولانا دین الدین بھی اس خبر سے پریشان تھے انہیں دیکھ کر ان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ صائمہ اور جمالی نے آگے بڑھ کر اس واقعے کی تفصیل بیان کی۔ مولانا نے دونوں لڑکیوں کی بہت تعریف کی اور انہیں دعا دی۔

مغل سپہ سالار بیک جک نے عاصم کو رہائی دلا کر وقتی طور پر شہر سبز کے تاتاریوں کی ہمدردیاں حاصل کر لیں لیکن اس کی وجہ تاتاریوں سے محبت نہ تھی بلکہ اُس نے اس سلسلے میں جو قدم اٹھایا اس کا حکم مغل حاکم نے اُسے دیا تھا۔ الیاس خواجہ خان کو جاسوسوں کے ذریعے معلوم ہوا تھا کہ تیمور اپنے ملک میں خفیہ طور پر داخل ہو گیا ہے اور اب شہر سبز کی طرف آ رہا ہے۔ اس نے بیک جک کو ایک خفیہ پیغام کے ذریعے حکم دیا تھا کہ شہر سبز کے لوگوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرو اور ان کی ہمدردیاں حاصل کر کے کسی طرح تیمور کو گرفتار کر لو۔ الیاس خواجہ نے شہر سبز کی حفاظت کے لیے سمرقند سے پانچ ہزار سواروں کا ایک مضبوط دستہ کمک کے طور پر شہر سبز بھیج دیا تھا۔

الیاس خواجہ خان کی یہ احتیاطی تدابیر بروقت تھیں..... تیمور کی واپسی کی اطلاع بھی درست تھی اور واقعی اپنے ملک وطن واپس آ گیا تھا پہلے اُس کا ارادہ بھی شہر سبز ہی جانے کا تھا لیکن دوران سفر اس نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا اور بجائے شہر سبز جانے کے وہ مغلوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتا ہوا سمرقند

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہنچ گیا۔ سمرقند میں بھی حفاظتی انتظامات سخت کر دیے گئے تھے لیکن ان تمام انتظامات کے باوجود تیمور سمرقند کی گلیوں میں آزادانہ گھوم رہا تھا۔ وہ کسی مسجد میں جا بیٹھتا اور جتہ سردار الیاس خواجہ خان کو مغل سواروں کے ساتھ مسجد کی گلی سے گزرتا دیکھتا رہتا۔

خطرناک دوست

امیر حسین کی دائیں جانب اس کی خوش جمال بیوی دلشاد آغا گھوڑے سے گھوڑا ملائے کھڑی تھی۔ نیچے وادی میں مغلوں کے خیمے دور دور تک پھیلے نظر آ رہے تھے۔

"خدا کی قسم! میں ان مغلوں کا پہلے ہی حملہ میں صفایا کر دوں گا۔" امیر حسین نے بغیر کسی کو مخاطب کیے آپ ہی آپ کہا۔

"خدا کی قسم! ہم کامیاب ہوں گے۔" بائیں طرف سے اس کے قابل اعتماد سردار امیر موسیٰ نے اس کی تائید کی۔

"بغیر سوچے سمجھے دشمن پر حملہ کرنا بہت بڑی غلطی ہے۔"

دلشاد آغا نے بگڑ کر کہا۔

"پہاڑی کے دونوں طرف راستے ہیں۔ ہمیں نہیں پتہ کہ پہاڑی کی پشت پر کیا ہے۔"

"دلشاد۔ تم ان باتوں میں دخل نہ دیا کرو۔"

امیر حسین نے برا سا منہ بنایا:

"دشمن غفلت میں مارا جاتا ہے۔ اسے مہلت دینا سب سے بڑی بے وقوفی ہے۔"

"لیکن امیر۔۔۔۔ ہمارے لشکری تھکے ہوئے ہیں۔" دلشاد اپنے شوہر کی ضدی طبیعت سے کماحقہ واقف تھی۔ اس نے بات گھما کر اسے حملے سے روکنے کی کوشش کی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تمہارا کیا خیال ہے موسیٰ!" امیر حسین نے بیوی کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اپنے معتمد سے پوچھا۔

امیر موسیٰ کی نظریں مغل خیموں کے سامنے رکھے ہوئے جڑی تھیلوں پر لگی ہوئی تھیں۔ مغل ان میں شراب بھرا کرتے تھے۔ امیر موسیٰ شراب کا بڑا رسیا تھا۔ تھیلوں کو دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا تھا اور دل میں شراب کے تھیلوں کے حصول کی خواہش انگڑائی لینے لگی تھی۔

"میرا خیال ہے....."

موسیٰ اپنے خیال میں کھویا ہوا بولا:

"ان تھیلوں میں ضرور شراب بھری ہوئی ہے۔"

"موسیٰ!....."

امیر حسین زور سے چیخا:

"شراب۔ شراب۔ یہ شراب تمہیں پاگل کر کے رہے گی۔ میں کیا پوچھ رہا ہوں اور تمہاری نظروں میں شراب گھوم رہی ہے۔"

موسیٰ کھسیانا ہو گیا۔ اس نے امیر حسین کے سوال کو صحیح طرح نہیں سنا تھا:

"سردار۔ آپ کس کے بارے میں حکم دے رہے تھے؟"

امیر حسین کو معلوم تھا کہ موسیٰ کا دماغ ہر وقت شراب اور عورت کے گرد گھومتا رہتا ہے لیکن اسے ہمیشہ موسیٰ کی اس کمزوری سے چشم پوشی کرنا پڑتی تھی کیونکہ امیر موسیٰ بڑا بہادر اور نڈر سردار تھا۔ وہ کئی اہم موقعوں پر اپنی بہادری کی داد وصول کر چکا تھا۔ اس کے علاوہ امیر موسیٰ، امیر حسین کا سب سے زیادہ وفادار ساتھی تھا۔

امیر حسین نے نرمی سے کہا:

"موسیٰ! ہم ان مغلوں کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ کیا ہم انہیں زیر نہیں کر سکتے؟"

"کیوں نہیں سردار۔"

موسیٰ تلوار پر ہاتھ رکھ کر بولا:

"اگر حکم ہو تو یہ مغل کیا، میں سامنے کے پہاڑ کو بھی ریزہ ریزہ کر سکتا ہوں۔"

"شاباش موسیٰ۔" امیر حسین خوش ہو کر بولا:

"تمہاری بہادری اور وفاداری پہ مجھے ہمیشہ ناز رہا ہے۔"

پھر دلشاد کی طرف دیکھ کے بولا:

"خانم کا خیال ہے کہ ہم تھکے ہوئے ہیں۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد حملہ کرنا چاہیے۔ خانم کا یہ بھی خیال ہے کہ پہاڑی کی پشت پر کیا ہے، اس کا بھی ہمیں علم نہیں۔"

"تھکن کی ہمیں کوئی فکر نہیں۔"

موسیٰ بڑی شان سے بولا:

"ہاں اگر یہ اطمینان کر لیا جائے کہ ان کی پشت پر کوئی کمک تو نہیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔"

"اس طرح مغلوں کے ہوشیار ہو جانے کا بھی تو امکان ہے موسیٰ!" امیر حسین اپنی ضد سے ہٹنے پر تیار نہ تھا۔

"مغل ابھی غافل ہیں۔ اگر اس وقت ہلہ بولا جائے تو دم کے دم میں ان کا قلع قمع ہو سکتا ہے۔"

"یہ خیال اور زیادہ بہتر ہے سردار۔"

امیر موسیٰ کا وتیرہ تھا کہ وہ امیر حسین کی کسی بات کی مخالفت نہ کرتا۔ اسی وجہ سے امیر حسین کی نظروں میں اس کی بڑی عزت اور قدر تھی۔

"دیکھا تم نے دلشاد۔"

امیر حسین نے دلشاد کا مضحکہ اڑایا:

"ہم نہ کہتے تھے کہ تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتیں۔ امیر موسیٰ نے بھی ہماری بات کی تائید کر دی۔ اب تو اطمینان ہوا؟"

دلشاد خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ وہ جانتی تھی کہ امیر حسین کو اس کے مشورے سے باز رکھنا ناممکن ہے۔

امیر حسین نے اپنے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ دایاں بازو امیر موسیٰ کے حوالے کیا اور بائیں طرف سے خود لشکر لے کر بڑھا۔

مغلوں کی پوزیشن بڑی کمزور تھی۔ ان کی پشت پہ اور سامنے پہاڑیاں تھیں۔ یہ وادی دراصل ایک چوڑا راستہ تھا۔ جب دائیں بائیں سے امیر حسین کا لشکر نمودار ہوا تو وہ گھیرے میں آ گئے۔ ..... وہ بے خبری کے عالم میں اس عرصے میں انہیں اتنا موقع بھی نہ ملا کہ اچھی طرح ہتھیار سنبھال سکیں۔ انہیں گھوڑوں پر بیٹھنا بھی نصیب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہ ہوا تھا کہ امیر حسین اور امیر موسیٰ نے پوری قوت سے ان پر یلغار کر دی۔

مغل اچھے شہ سوار ہوتے ہیں۔ بغیر گھوڑے کے ان کی طاقت نصف رہ جاتی ہے۔ امیر حسین نے پیش کر رکھ دیا۔ مغل جان بچانے کے لیے دائیں بائیں بھاگتے اور اس کوشش میں قتل ہوتے رہے۔ بہت کم مغل اس درّہ سے صحیح سلامت بچ کر نکل سکے۔

مغلوں کے خیمے لوٹ لیے گئے۔ بہت سا سامان ہاتھ آیا۔ امیر موسیٰ نے سامان کے بجائے شراب کے ذخیرے پر قبضہ کیا اور جلے ہوئے خیموں میں بیٹھ کر شراب پینا شروع کر دی۔ امیر حسین کے شور، ترکی اور سیستانی لشکری بھی مسلمان ہونے کے باوجود شراب پیتے تھے۔ انہوں نے بھی شراب کی محفل جمائی۔ جانور ذبح کر کے گوشت بھونا گیا اور ایک عام ضیافت کا سماں پیدا ہو گیا۔

امیر حسین کو مغلوں پر یہ پہلی فتح حاصل ہوئی تھی۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس کے ساتھ لشکر بھی کافی اکٹھا ہو گیا تھا۔ مغل درّے میں پھنس کے بری طرح شکست کھا چکے تھے۔ اس کی کامیابی پر کون شبہ کر سکتا تھا۔ وہ ٹہلتا ہوا دلشاد کے پاس آیا۔

دلشاد اگرچہ اس فتح پر مسرور تھی لیکن اس کا دل ایک نامعلوم خوف سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مغلوں نے اس درّے میں پڑاؤ کیوں ڈالا۔ مغل بہت چالاک تھے۔ ان سے ایسی غلطی کی امید نہ تھی۔

"کیوں دلشاد۔ مانتی ہو ہماری حکمتِ عملی کو؟"

امیر حسین ہنستے ہوئے بولا:

"اگر مغلوں کو مہلت دی جاتی تو ہم اتنی کامیابی سے فتح حاصل نہیں کر سکتے تھے۔"

"چلو۔ جو ہوا اچھا ہوا۔"

دلشاد نے اپنی شرمندگی چھپائی۔

"لیکن مغلوں کی حماقت سمجھ میں نہیں آئی۔"

"کیسی حماقت؟" امیر حسین نے چونک کر پوچھا۔

"یہی کہ چالاک مغلوں نے اس درّے میں خود کو محصور کیوں کر لیا؟"

دلشاد گہری سنجیدگی سے بولی:

"آج تک کسی لشکر نے درّے کے درمیان پڑاؤ ڈالنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔"

دلشاد کی بات بہت اہم تھی۔ امیر حسین اس کا مذاق اڑانے آیا تھا لیکن یہ بات سن کر وہ بھی سوچ میں پڑ گیا۔

"یہ بات ہے تو تعجب خیز!"

امیر حسین سوچتے ہوئے بولا:

"ممکن ہے انہیں یہ امید ہی نہ ہو کہ ہم اتنی جلدی یہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔"

"کچھ بھی سہی..... لیکن مغلوں نے یہ شکست اپنی غلطی کی وجہ سے اٹھائی ہے۔" دلشاد جواب دینے کے بعد مغلوں کے اجڑے اور جلے ہوئے خیموں کی طرف دیکھنے لگی۔

امیر حسین کے نصف سے زیادہ لشکری شراب پینے میں مصروف تھے۔ مغلوں کے لائے ہوئے شراب کے تھیلے انہوں نے تقریباً خالی کر دیے تھے۔ وہ قہقہے لگا رہے تھے اور خوشی سے ناچ رہے تھے۔ مغلوں کا تعاقب کرنے والے تھوڑی دور پیچھا کرنے کے بعد جلد ہی واپس آ گئے تھے تاکہ مالِ غنیمت میں اپنا حصہ وصول کر سکیں اور مغلوں کی شراب کے مزے بھی اڑائیں۔

مغل بہت تیز شراب بناتے اور پیتے تھے۔ گھوڑی کے دودھ کا بھی ان کے ہاں رواج تھا۔ امیر حسین کے لشکریوں نے دودھ کے تھیلوں میں شراب ملا کر ایک مخلوط بنا کر لیا تھا اور خوش ہو ہو کے پی رہے تھے۔ امیر حسین بھی شراب پیتا تھا لیکن وہ اپنی خوبرو بیوی کا بہت لحاظ کرتا تھا۔ دلشاد کے سامنے وہ شراب پینے سے پرہیز کرتا تھا۔ دلشاد کو شراب کی بدبو سے سخت نفرت تھی۔ اس وقت بھی وہ اس ہنگامے کو دور ایک اونچی جگہ بیٹھی دیکھ رہی تھی۔

"شراب انسان کے دماغ اور دل کو مجہول کر دیتی ہے امیر حسین۔" دلشاد نے بدمست شرابیوں کو حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن شراب پینے کے بعد انسان میں شیروں جیسی طاقت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔" امیر حسین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جب دل اور دماغ ہی قابو میں نہ رہیں تو طاقت سے کیا فائدہ؟"

دلشاد نے اس کے تجزیے کی سختی سے مخالفت کی:

"فرض کرو کہ اس وقت مغل فوج آ جائے تو کیا یہ نشے میں ڈوبے ہوئے لشکری اس کا مقابلہ کر سکیں گے۔"

"دلشاد..... ایک تو یہ فرض کرنا ہی غلط ہے۔" امیر حسین نے دلیل دی:

"مغل شکست کھا کر بھاگے ہیں۔ ان کے تین چوتھائی لشکری مارے گئے ہیں۔ وہ واپس آنے کی جرأت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں کر سکتے۔"

"لیکن فرض کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔"

دلشاد جیسے آج امیر حسین کو قائل کرنے پر آمادہ تھی۔ اسے علم تھا کہ امیر حسین شراب پیتا ہے لیکن اس کے سامنے پینے سے گریز کرتا ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ امیر حسین شراب پینا بند کر دے اور ایک پرہیزگار مسلمان بن جائے۔

امیر حسین نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ للچائی ہوئی نظروں سے شرابیوں کو دیکھ رہا تھا۔ دلشاد کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ اس نے کہا:

"امیر حسین، ان شرابیوں کی حالت اس وقت مٹی کے کھلونوں سے زیادہ نہیں۔ ان کی طاقت سلب ہو چکی ہے اور دماغ معطل ہو چکے ہیں۔ انہیں بغیر اسلحے کے مارا جا سکتا ہے۔"

دلشاد اپنی رو میں کہتی رہی لیکن امیر حسین کی نظریں اُدھر سے نہ ہٹیں۔ اس کے کان جیسے بند ہو گئے۔ وہ دلشاد کی کوئی بات نہ سن سکا۔

امیر حسین کے لشکریوں کو شراب کا شغل کرتے چھ گھنٹے گزر چکے تھے۔ اس نے اپنے اور دلشاد کے لیے بھنا ہوا گوشت منگوایا تھا۔ اب اسے شراب کی سخت خواہش ہو رہی تھی لیکن وہ صبر کیے بیٹھا رہا۔ وہ دلشاد کی نظروں سے گرنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ دونوں کھانے سے فارغ ہو کر پتھروں کے سہارے نیم دراز ہو گئے۔ دلشاد کا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ اس پر غنودگی سی طاری ہو گئی لیکن امیر حسین بار بار چونک کر اپنے سپاہیوں کو دیکھنے لگتا جن میں سے بیشتر مدہوش ہو کر زمین پر آڑے ترچھے پڑے تھے۔

امیر حسین اپنی خواہش پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس نے دلشاد کی طرف دیکھا۔ دلشاد کا سر ایک پتھر پر ٹکا ہوا تھا اور وہ شاید سو گئی تھی۔ امیر حسین اور دلشاد کے گھوڑے قریب بندھے تھے۔ گھوڑے پر سوار ہو کے جانے سے دلشاد کی آنکھ کھل سکتی تھی۔ اس نے ادھر سے نظر ہٹائی اور آہستہ آہستہ ڈھلان اترنے لگا۔

امیر حسین بار بار پلٹ کر دلشاد کو دیکھتا جاتا تھا کہ کہیں وہ جاگ تو نہیں پڑی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ نیچے جا کر شراب کی دو چار چُسکیاں بھرے گا۔ پھر اسی طرح خاموشی سے واپس آ جائے گا۔ شراب پینے کے بعد امیر حسین ہمیشہ دلشاد سے دور دور رہتا اور اگر اتفاقیہ اس کا سامنا دلشاد سے ہو جاتا تو وہ بظاہر یوں ہو جاتی جیسے اسے امیر حسین کے شراب پینے کا علم ہی نہیں ہے۔ امیر حسین کی اس احتیاط کو بھی وہ غنیمت جانتی تھی۔ اگر وہ

ی سے الجھ پڑتی تو لحاظ کا یہ کمزور اور باریک پردہ بھی اٹھ جاتا۔ امیر حسین کی ضد کے سامنے اس کی پھر ایک نہ چلتی۔

امیر حسین آدھی ڈھلان طے کر چکا تھا کہ اسے گھوڑوں کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے قدم رک گئے۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھنا شروع کیا۔ اس وقت اس کی نظر درّے کے دائیں طرف کے راستے پر پڑی۔ گھوڑوں پر سوار مغل بڑی تیزی سے بڑھے چلے آ رہے تھے۔

امیر حسین کا رنگ فق ہو گیا۔

تیر کمان وہ اوپر چھوڑ آیا تھا۔ کمر سے صرف تلوار لٹک رہی تھی۔ گھوڑا بھی اس کے پاس نہ تھا۔ اوپر جا کر گھوڑے پر سوار ہونا تاخیر کا باعث ہو سکتا تھا۔ امیر حسین نے وہیں سے چیخ کر امیر موسیٰ کو آواز دی اور پھر تیزی سے نیچے کو بھاگا۔ ایک طرف اس کے لشکر کے بہت سے گھوڑے بندھے تھے۔ وہ اسی طرف بڑھا تاکہ اپنے لیے گھوڑا حاصل کر سکے۔

امیر حسین کو پتہ نہیں کہ اس کی آواز کا امیر موسیٰ پر کیا اثر ہوا۔ وہ گھوڑوں کی طرف بھاگ رہا تھا کہ درّے کے دوسرے کنارے سے بھی مغل نمودار ہو گئے۔ امیر حسین کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ لیکن وہ بلا کا جری تھا۔ وہ چیختا ہوا نیچے کی طرف بھاگتا رہا۔ مغل دونوں طرف سے درّے میں داخل ہو چکے تھے۔ اور یہ ترائی امیر حسین کے لشکر کے لیے پنجرہ بن گئی تھی۔ سات گھنٹے پہلے اس نے جس طرح غافل مغلوں کو گھیرا تھا اس وقت بالکل اسی طرح اس کا مدہوش لشکر مغلوں کے گھیرے میں آ گئے تھے۔ ان میں افراتفری اور بدحواسی پھیل گئی تھی۔ انہوں نے جلدی جلدی ہتھیار سنبھالے مگر حواسوں پر تو شراب کا گہرا نشہ چھایا ہوا تھا۔

انہوں نے مقابلہ شروع کیا۔ کچھ گھوڑوں پر سوار ہو سکے تو کچھ پیدل لڑنے لگے۔ لڑنے کیا لگے بس اپنی حفاظت کرنے لگے اور اس کوشش میں گاجر مولی کی طرح کٹنے لگے۔

امیر حسین گھوڑے تک نہ پہنچ سکا۔ اس کے سامنے مغل سوار آ گئے۔ امیر حسین تلوار سونت کر ایک جگہ جم کر کھڑا ہو گیا اور مغلوں سے لڑنے لگا۔

دلشاد کی آنکھ امیر حسین کی پہلی ہی آواز پر کھل گئی تھی۔ اس نے گھبرا کر نیچے کی طرف دیکھا۔ ان کا لشکر مغلوں کے درمیان پھنس کر رہ گیا تھا۔ اس کی نظر امیر حسین پر پڑی جو بڑی بہادری سے ایک ابھری ہوئی چٹان کو پشت بنائے مغل سواروں سے لڑ رہا تھا۔ وہ تڑپ اٹھی۔ اس نے دونوں گھوڑے کھولے۔ ایک پر خود سوار ہوئی اور دوسرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی راسیں پکڑ کے نیچے اترنے لگی۔

ڈھلان پر وہ گھوڑوں کو سنبھال سنبھال کے اتار رہی تھی۔ اس کی نظریں امیر حسین پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ جلد اس تک گھوڑا پہنچانا چاہتی تھی لیکن اپنی رفتار تیز بھی نہ کر سکتی تھی۔

یکایک امیر حسین کے خالی گھوڑے نے ٹھوکر کھائی۔ امیر حسین کے گھوڑے کی راسیں دلشاد کے ہاتھ میں تھیں۔ جھٹکا لگنے سے راسیں اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئیں۔ اتنا وقت نہ تھا کہ وہ اتر کر گھوڑے کو پکڑتی۔ اس نے بہتر یہی خیال کیا کہ کسی طرح امیر حسین کے پاس پہنچ کر اپنا گھوڑا اس کے حوالے کر دے۔ دلشاد اسی طرح کئی بار میدانِ جنگ میں امیر حسین کو گھوڑا پہنچا چکی تھی۔ آخر وہ گھوڑا بڑھا کر امیر حسین کے پاس پہنچ گئی۔ قریب پہنچ کر اس نے آہستہ سے سیٹی بجائی۔ یہ اس کا مخصوص اشارہ تھا اور میدانِ جنگ میں اسی اشارے سے دلشاد اپنے شوہر کو مخاطب اور خبردار کیا کرتی تھی۔

سیٹی سن کر امیر حسین تیزی سے پیچھے ہٹا۔ دلشاد نے خود اُس گھوڑے سے کود کر راسیں شوہر کو پکڑا دیں۔ امیر حسین گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ ایڑ دی اور مغلوں کے غول میں گھس گیا۔

گھوڑوں کی کاٹھیاں بڑی تیزی سے خالی ہو رہی تھیں اور بغیر سوار کے گھوڑے دوڑے میں ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔

دلشاد جس جگہ دبکی کھڑی تھی، وہ جگہ قدرے اونچی تھی اس لیے ادھر کوئی خالی گھوڑا نہ آ رہا تھا۔ پھر دلشاد کو اوپر سے چھوٹے چھوٹے پتھر لڑھکتے ہوئے دکھائی دیے۔ اس نے اوپر نظر دوڑائی تو اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ امیر حسین کا گھوڑا جو ٹھوکر کھا کر اوپر ہی رہ گیا تھا وہ تیزی سے نیچے آ رہا تھا۔ دلشاد نے دو قدم آگے بڑھ کر اسے پکارا۔ گھوڑے نے کان کھڑے کیے۔ اس نے دلشاد کی آواز پہچان لی۔ دلشاد اکثر امیر حسین کے گھوڑے پر سواری کیا کرتی تھی۔

دلشاد اچک کر گھوڑے پر بیٹھی اور تلوار کھینچ کر وہ بھی مغلوں پر جا پڑی۔ وہاں کے درمیان گھس کر امیر حسین کو تلاش کرتی رہی لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا۔

جنگ تو ختم ہو چکی تھی۔ امیر حسین کا لشکر شکست کھا کر بھاگ رہا تھا اور مغل اپنے آدمیوں کا جی بھر کے انتقام لے رہے تھے۔ انہوں نے دونوں راستے بند کر دیے تھے اور امیر حسین کے لشکریوں کو گھیر گھیر کر ختم کر رہے تھے۔

دلشاد نے اپنے سواروں کا ایک غول دیکھا جو بائیں راستے کی طرف مارتا کاٹتا بڑھ رہا تھا۔ یہ لوگ گھیرا کر بائیں راستے سے نکلنا چاہتے تھے۔ مغل ان کے سامنے دیوار بنے کھڑے تھے۔ دونوں طرف سے سخت مقابلہ ہو رہا تھا۔ ایک گروہ جان بچانے کے لیے جان کی بازی لگا رہا تھا تو دوسرا گروہ انتقامی جذبے سے مغلوب تھا اور زیادہ سے زیادہ سواروں کو قتل کرنا چاہتا تھا۔

دلشاد بھی موقع پا کر اپنے سواروں میں شامل ہو گئی۔ چونکہ ان کی جان پر بنی ہوئی تھی اس لیے یہ لوگ لڑتے ہوئے بڑھتے ہی رہے۔ ان کی بے شمار جانیں ضائع ہوئیں مگر انہوں نے مغلوں کا گھیرا توڑ دیا اور جان بچا کر نکل گئے۔

مغلوں نے بھی ان کا تعاقب نہ کیا۔ وہ پورا پورا بدلہ لے چکے تھے۔ امیر حسین کے کچھ آدمی دائیں راستے سے بھاگنے میں بھی کامیاب ہو گئے۔

امیر حسین کے شکست خوردہ لشکر کے سوار آگے پیچھے بے تحاشہ بھاگ رہے تھے۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ کدھر جا رہے ہیں۔ بس جان بچانے کی فکر تھی۔ جدھر منہ اٹھ گیا تھا ادھر بھاگتے چلے گئے۔ شام ہو گئی اور مغلوں کے تعاقب کا خطرہ ختم ہوا تو انہوں نے گھوڑے روکے۔ بھاگنے والوں میں امیر حسین کا معتمد سردار امیر موسیٰ بھی تھا۔ تمام سوار اس کے گرد جمع ہو گئے۔ سب سے آخر میں دلشاد گھوڑا بھگاتی ان کے پاس پہنچی۔ دلشاد کو آتا دیکھ کر امیر موسیٰ گھوڑے سے اتر پڑا اور تعظیم بجا لایا۔

"ہمارے سپہ سالار، ہمارے بادشاہ کہاں ہیں خانم؟" امیر موسیٰ نے ادب سے پوچھا۔

"اب تمہیں اپنے بادشاہ کا خیال آیا۔۔۔۔" دلشاد نے جل کے کہا۔

"اپنے بادشاہ کو میدان میں اکیلا چھوڑ کر بھاگتے ہوئے تم لوگوں کو شرم نہ آئی؟"

امیر موسیٰ یا دوسرے سواروں کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ انہوں نے شرم سے گردنیں جھکا لیں۔ دلشاد نے میں انہیں پھٹکار تو دیا تھا مگر اس وقت اسے انہی لوگوں کا سہارا لینا تھا اس لیے نرم پڑ گئی۔ بولی:

"امیر حسین بغیر گھوڑے کے مغلوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ میں نے ان تک گھوڑا تو پہنچا دیا تھا اس کے بعد پتہ نہیں ان پر کیا گذری۔۔۔۔"

"انکا خانم۔۔۔۔"

امیر موسیٰ شرمندگی سے بولا: "آپ نے ٹھیک فرمایا تھا کہ ہمیں سوچ سمجھ کے حملہ کرنا چاہیے تھا۔ اگر ہم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس وقت گھوم پھر کر دیکھ لیتے تو ہمیں ضرور معلوم ہو جاتا کہ مغلوں کے اس لشکر کے پیچھے ان کا ایک اور بڑا لشکر بھی موجود ہے۔"

امیر موسیٰ کا نشہ ہرن ہو چکا تھا اور اب وہ بڑی سمجھ داری کی باتیں کر رہا تھا۔ امیر حسین نے درّے میں جس مغل لشکر پر حملہ کیا تھا وہ دراصل مغلوں کے ایک بڑے لشکر کا ہراول دستہ تھا۔ مغلوں کے بادشاہ الیاس خواجہ کو اس کے جاسوسوں نے خبر دی تھی کہ امیر حسین اور شہر سبز کا سردار تیمور گرگان سیر میں ایک لشکر اکٹھا کر کے شمال کی طرف آ رہے ہیں۔ الیاس خواجہ نے تیمور کو روکنے اور گرفتار کرنے کے لیے ایک بڑا لشکر اس طرف بھیجا جس کی سرداری پر اس نے اپنے سپہ سالار بیک جک کے بیٹے کو مقرر کیا تھا۔ یہ جوان سردار اپنے باپ سے بھی زیادہ وحشی مگر بڑا بہادر جنگجو تھا۔

"اب ہمیں کیا کرنا چاہیے امیر موسیٰ؟"

دلشاد آغا نے انہیں مزید شرمندگی سے بچانے کے لیے کہا: "رات سر پہ آ رہی ہے۔ پتہ نہیں ہم کہاں کے رہتے ہیں، ہیں۔"

"آغا خانم....."

امیر موسیٰ نے اپنی وفاداری ظاہر کرنے کے لیے کہا:

"ہمیں اپنے بادشاہ کا پتہ نہیں۔ کیوں نہ ہم یہیں ٹھہر کر ان کا انتظار کریں۔"

دلشاد سمجھ گئی کہ امیر موسیٰ نے اپنی شرمندگی مٹانے کے لیے یہ بات کہی ہے۔ اس نے فوراً جواب دیا:

"امیر موسیٰ! ابھی تم ایک غلطی کر چکے ہو اور اب دوسری غلطی کر کے ان بچے کھچے سواروں کو بھی ختم کر دینا چاہتے ہو۔ تم یہ کس طرح امید کرتے ہو کہ امیر حسین تمہیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں آ جائیں گے۔ ان کے بھاگتے مغلوں کا کوئی دستہ بھی تو ادھر آ سکتا ہے۔"

"آغا خانم آپ ٹھیک فرما رہی ہیں۔"

امیر موسیٰ نے فوراً مان لی:

"آپ حکم دیجیے۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

"ہمیں فوراً کسی بستی کو تلاش کرنا چاہیے۔" دلشاد پوری تمکنت سے بولی:

"ہمارے سوار تھکے ماندے اور بھوکے پیاسے ہیں۔ انہیں کھانے اور آرام کرنے کی ضرورت ہے۔"

موسیٰ نے فوراً چار سواروں کو مختلف سمتوں میں بھیجا تاکہ وہ کسی بستی کا پتہ لگائیں۔ باقی لوگ گھوڑوں سے اتر کر بیٹھ گئے۔ اور سواروں کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔

اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ دلشاد بہت فکرمند تھی۔ اسے سب سے زیادہ فکر مغلوں کی طرف سے تھی۔ وہ اُن کی فطرت سے واقف تھی۔ مغل شکست خوردہ لشکر کے ایک سپاہی کو بھی زندہ نہیں چھوڑتے تھے۔ انہیں بھاگنے والوں کی تلاش ضرور ہو گی۔

○

امیر موسیٰ کے بھیجے ہوئے تمام سوار سوائے ایک کے، ناکام واپس آ گئے۔ انہیں دور دور تک کسی بستی کا پتہ نہ ملا۔ اب صرف ایک سوار باقی تھا اور یہ لوگ اسی سے امیدیں لگائے بیٹھے تھے۔ انہیں یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں سوار راستہ نہ بھول گیا ہو کیونکہ وہ شام کے وقت گیا تھا اور اب رات ہو چکی تھی۔ پھر بھی ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق وہ امید باندھے بیٹھے تھے۔

رات کے لمحات تیزی سے گزر رہے تھے اور ان کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر تیسرے ہفتے کا چاند آہستہ آہستہ بلند ہونا شروع ہوا۔ کچھ روشنی پھیلی تو ان کی جان میں جان آئی۔

چاند اپنے ساتھ چاندنی ہی نہیں لایا تھا بلکہ ان کے لیے خوشی کا پیغام بھی لے کر آیا۔ دور سے گھوڑے کے بھاگنے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ پہلے تو ان کے چہروں پر مسرت کی لہریں دوڑ گئیں مگر فوراً ہی اس کی جگہ ناامیدی اور خوف نے لے لی۔ ان کا سوار تنہا گیا تھا لیکن آنے والوں کی تعداد ایک سے زیادہ معلوم ہوتی تھی۔

امیر موسیٰ نے اپنے آدمیوں کو تیار ہونے کا حکم دیا۔ وہ پہلے ہی تیار بیٹھے تھے۔ صرف تلواریں نیام سے نکالنے کی دیر تھی۔

دلشاد چٹکی ہوئی چاندنی میں اس راستے پر نظریں جمائے ہوئے تھی جدھر سے گھوڑوں کے بھاگنے کی آوازیں دم بدم بڑھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔

پھر کرب انگیز انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور امید نے اپنا چہرہ دکھایا۔ امیر موسیٰ کا سوار سامنے نمودار ہوا۔ اس کے پہلو بہ پہلو دو سوار اور آ رہے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

امیر موسیٰ کے ساتھ چالیس سوار تھے۔ وہ انہیں لے کر کھلی جگہ میں آ گیا۔ امیر موسیٰ کے سوار نے دور ہی سے آواز لگائی:

"نا امیر، مبارک ہو۔ ہمیں دوست مل گئے ہیں"۔

اس پُرمسرت آواز پر سب کے چہرے کھل اٹھے اور نیاموں سے جھانکتی ہوئی تلواروں نے پھر اپنے چہرے چھپا لیے۔

سوار کے ساتھ آنے والوں میں ایک مرد تھا اور ایک عورت۔ انہوں نے گھوڑوں سے اتر کر بلند آواز میں "السلام علیکم" کہا جو اُن کے مسلمان ہونے کی دلیل تھا۔ جواب میں سب نے وعلیکم السلام کہہ کر انہیں خوش آمدید کہا۔

امیر موسیٰ کے سوار نے دلشاد سے ان دونوں کا تعارف کراتے ہوئے کہا:

"یہ ہیں شاہِ کابل امیر حسین کی ملکہ دلشاد آغا بیگم"۔

ساتھ آنے والی عورت جس کی آنکھیں غزالوں جیسی کشادہ اور روشن تھیں، آگے بڑھی اور دلشاد کا اپنے ہاتھ میں محبت سے لیتے ہوئے اسے بوسہ دے کر آنکھوں سے لگایا۔

اس کے ساتھی مرد نے ادب سے کہا:

"ہماری خوش نصیبی ہوگی اگر ملکۂ کابل ہمیں اپنی مہمان نوازی کا فخر عطا کریں"۔

دلشاد نے عورت کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور درازیٔ عمر کی دعا دی۔

"میرا نام طغرہ ہے اور یہ میری بیوی غلغورا ہے"۔ مرد نے خود ہی اپنا تعارف کرایا۔

"اگر میں غلطی نہیں کرتی تو تم لوگ ترک معلوم ہوتے ہو"۔ دلشاد نے مسکرا کر کہا۔

آنے والے جوڑے نے دلشاد کو حیرت سے دیکھا۔ پھر وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

"اگر یہ صحیح ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں"۔

دلشاد اسی خوشدلی سے بولی:

"یہ اندازہ میں نے تم لوگوں کے چہروں سے لگایا ہے۔ پھر اجنبیوں سے "السلام علیکم" کہہ کر خود متعارف کرانا، ترک قبائل کا دستور ہے"۔

"ملکہ عالیہ کا اندازہ درست ہے"۔ غلغورا نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "کیا ہم امید کریں کہ آپ ہمیں اپنے

مہمان نوازی کی نعمت سے سرفراز کریں گی"۔

"کیوں نہیں غلغورا"۔

دلشاد نے کہا:

"اس پریشانی کے عالم میں تمہاری مہمان نوازی ہم پر ایک بڑا احسان ہوگا"۔

"ہمیں شرمندہ نہ کیجیے ملکہ عالیہ"۔

طغرہ نے دخل دیا:

"آپ کے سوار سے ہم تمام حالات سن چکے ہیں۔ اگرچہ ہم مغلوں کے حلیف ہیں لیکن اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد اور مہمان نوازی سے انکار کرنا ہماری اور اسلامی روایات کے خلاف ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی یقین دلاتے ہیں کہ اگر مغل لشکر آپ کی تلاش میں ہمارے دروازے تک پہنچ گیا تو یہ دروازہ صرف اس وقت کھلے گا جب ہمارے تمام سوار آپ پر قربان ہو چکے ہوں گے"۔

"اس خلوص کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں کہ شکریہ ادا کیا جا سکے"۔

دلشاد نے بھی اسی خلوص سے اظہارِ ممنونیت کیا۔

"ہم لوگ تمہیں زیادہ عرصہ تکلیف نہ دیں گے۔ صرف دو چار دن تمہیں زحمت ہوگی"۔

"ہمیں اس وقت زیادہ خوشی ہوگی جب ملکہ ہمیں مستقل خدمت کا موقع عطا کریں گی"۔

غزالی آنکھوں والی غلغورا نے کہا:

"وہ گھر کتنا خوش نصیب ہوگا جس میں ملکہ عالیہ کے قدم پڑیں گے"۔

دلشاد کو اک دم امیر موسیٰ کا خیال آیا جو اس کے قریب کھڑا غلغورا کو عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے طغرہ سے کہا:

"ترک سردار..... ان سے ملو..... یہ ہیں امیر موسیٰ۔ ہمارے لشکر کے سپہ سالار"۔

بدطینت امیر موسیٰ جو آنکھوں کے ذریعے غلغورا کے پیکر کو اپنے نہاں خانۂ دل میں اتارنے میں مصروف تھا اپنے نام پر چونکا۔ طغرہ نے مصافحہ کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ بولا:

"میں سپہ سالار کو خوش آمدید کہتے ہوئے اپنے غریب خانہ پر قیام کی دعوت دیتا ہوں"۔

"ہاں..... ہاں..... شکریہ"۔ امیر موسیٰ گھبرا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا اور کیسے جواب دے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دلشاد تیز نظروں سے امیر موسیٰ کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ اس کی جسامت سے اچھی طرح واقف تھی۔ ہرکلا نے جس انداز اور جن نظروں سے غلغورا کو دیکھا تھا اس سے دلشاد کے دل میں طرح طرح کے وسوسوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ اس نے وہاں کھڑے کھڑے گفتگو میں وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے سواروں کو لے کر طغز کے ساتھ چل پڑی۔

دلشاد کو امیر موسیٰ کی بوالہوس نظروں نے اس قدر پریشان کر دیا تھا کہ راستے بھر اس کا ذہن الجھا رہا اور وہ ٹھیک طرح غلغورا کی دلچسپ اور معصوم باتوں کا جواب بھی نہ دے سکی۔

نوجوان طغز اپنے قبیلے کا سردار تھا۔ اس کی شادی کو ابھی چھ ماہ گذرے تھے۔ طغز میں مردانہ وجاہت تھی۔ اس کی بیوی غلغورا میں وہ تمام رعنائیاں موجود تھیں جو ایک حسین اور خوبصورت عورت کا طرۂ امتیاز ہوتی ہیں۔ دونوں میاں بیوی میں بے انتہا محبت تھی۔

یہ ترک قبیلہ پہلے خانہ بدوش زندگی بسر کرتا تھا لیکن طغز کے باپ نے خانہ بدوشی چھوڑ کے اس جگہ مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس بستی میں زیادہ تر جھونپڑیاں تھیں۔ کچھ کچے پکے مکانات بھی تعمیر ہو گئے تھے۔ چھتا کمروں کی ایک وسیع حویلی میں طغز کی رہائش تھی۔

قبیلے میں جوان اور مسلح سواروں کی تعداد چالیس سے زیادہ نہ تھی مگر یہ سب کے سب بڑے بہادر اور جنگجو تھے۔ دوسرے قبیلوں سے محفوظ رہنے کے لیے انہوں نے بستی کے گرد ایک دیوار سی تعمیر کر لی تھی جو ایک شکستہ سی فصیل کا کام دیتی تھی۔ دور اور نزدیک کے بیشتر قبائل سے ان کے اچھے مراسم تھے۔ اس لیے لڑائی جھگڑے کا موقع کم ہی پیش آتا۔ یہ لوگ آرام اور سکون سے زندگی گزار رہے تھے۔

مہمانوں کے لیے بستی کے میدان میں حویلی کے قریب ہی خیمے لگا دیے گئے۔ امیر موسیٰ سپہ سالار تھا اس کے واسطے طغز نے ایک بڑا خیمہ نصب کرا دیا اور اس میں ضرورت کی تمام چیزیں پہنچا دی گئیں۔ اس دوران کھانا تیار ہو گیا تھا۔ تھکے ماندے سواروں نے خوب سیر ہو کے کھانا کھایا اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔

امیر موسیٰ کھانا کھانے کے بعد اپنے خیمے میں بے چین سا بیٹھا تھا۔ اس کے چار پانچ ہم مشرب بھی اس کے خیمے میں موجود تھے۔ امیر موسیٰ کا دماغ دو خواہشوں کے درمیان الجھا ہوا تھا۔ ایک خواہش تھی شراب کی اور دوسری خواہش ..... اس خواہش کی تکمیل کے لیے اس کی نظریں پہلے ہی غلغورا کے تراشے ہوئے سراپا کا جائزہ لے چکی تھیں۔

امیر موسیٰ نے بستی میں پہنچتے ہی اندازہ کر لیا تھا کہ یہاں مسلح سواروں کی تعداد زیادہ نہیں اور اس کے لشکر بڑی آسانی سے ان پر قابو پا سکتے ہیں۔ پھر بستی ان کے قبضے میں ہو گی اور وہ اپنی ہر خواہش پوری کر سکے گا۔

امیر موسیٰ کو فکرمند دیکھ کر اس کے ایک رازدار نے سرگوشی کی:

"میرے پاس تھوڑی سی دخترِ رز ہے۔ حکم ہو تو حاضر کروں۔"

دخترِ رز یعنی شراب کے نام پر امیر موسیٰ اچھل پڑا۔ کھانا کھانے کے بعد اسے شراب پینے کی عادت تھی۔ کھانا تو دیا گیا لیکن شراب پیش نہیں کی گئی۔ اس کا مطلب تھا میزبان شراب نہیں پیتا اور نہ شراب پینے والا مہمان کو شراب مزید پیش کرتا ہے۔

"تیرے پاس ہے تو جلد لے آ۔ ۔ ۔ ۔!" امیر موسیٰ نے خوش ہو کر کہا۔

سرگوشی کرنے والا وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں گیا اور کچھ دیر بعد پانی بھرنے والے تھیلے لٹکائے ہوئے واپس آ گیا۔ دستے میں مغلوں کو شکست دینے کے بعد جب یہ لوگ شراب کے تھیلے خالی کر رہے تھے تو اس سوار نے پانی کی تھیلی شراب سے بھر کر گلے میں لٹکا لی تھی۔ وہ تھیلی جنگ اور فرار کے دوران اس کے گلے میں لٹکی ہوئی بھی رہ گئی تھی۔

شراب دیکھ کر امیر موسیٰ کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ اس نے تھیلی لے کر منہ سے لگائی اور آہستہ آہستہ مزے لے لے کر شراب پینے لگا۔

اس کے شرابی احباب اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے مگر اس میں اتنی شراب نہ تھی کہ وہ اس کے دوسروں کو بھی شریک کرتا۔ پھر بھی اس نے دوستوں کی خاطر تھوڑی سی شراب تھیلی میں چھوڑ دی۔ اس کے احباب تھیلی پر بھوکے گدھوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔

طغز اور غلغورا بے انتہا مسرور تھے۔

وہ سوچ بھی سکتے تھے کہ مکہ کمال کے قدم ان کی حویلی میں آئیں گے۔ طغز مکہ کے سامنے آنکھیں بچھا رہا تھا اور غلغورا کنیزوں کی طرح مکہ کے آگے پیچھے دوڑ رہی تھی۔

طغز نے مکہ و دلشاد کو اپنے خاص کمرے میں اتارا تھا۔ اس میں طغز اور اس کی نئی بیاہی ہوئی بیوی رہتے تھے۔ نفاست پسند غلغورا نے یہ کمرہ صحرائی بود و باش کے مطابق سجایا تھا۔ دلشاد بھی ایسے محبت کرنے والوں کے درمیان پہنچ کر بہت خوش تھی اور بار بار ان دونوں کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھتی تھی۔ اس نے غلغورا کو اپنے ہی کمرے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹھہرا لیا تھا۔ غفورہ کمرے چھوڑ کر تیسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔

ظفر امیر موسیٰ کے خیمے میں زیادہ دیر نہ ٹھہرا تھا۔ جب ان لوگوں نے کھانا شروع کیا تھا تو وہ وہاں سے اٹھ آیا تھا تاکہ وہ کھانے کے بعد فوراً آرام کرنے کے لیے لیٹ جائیں۔ اس نے غفورا کو بھی تاکید کر دی تھی کہ وہ حکم سے زیادہ دیر گفتگو نہ کرے اور انہیں آرام کرنے کا موقع دے لیکن دلشاد کو غفورا کی بھولی بھالی باتوں میں بڑا لطف آ رہا تھا اس لیے وہ دیر تک جاگتی رہی۔

غفورا اور دلشاد کو باتیں کرتے بہت دیر ہو گئی تھی۔ غفورا نے پشت کی کھڑکی سے جھانک کے دیکھا، صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ اس نے اٹھ کے کمرے میں جلنے والی تمام مشعلوں کو گل کر دیا۔ صرف ایک مشعل جلتی رہنے دی۔ پھر وہ دونوں بھی سونے کے لیے لیٹ گئیں۔

ابھی وہ دونوں سونے کی کوشش کر رہی تھیں کہ باہر برآمدے میں کسی کے بولنے اور شور کرنے کی آواز سنائی دی۔ غفورا گھبرا کے اٹھ بیٹھی۔ دلشاد نے بھی پریشانی کے عالم میں دروازے کی جانب دیکھا۔

غفورا اٹھ کے دروازے کے پاس پہنچی۔ دلشاد بھی اس کے پیچھے پہنچ گئی۔ دونوں آگے پیچھے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گئیں۔

طویل برآمدے میں کئی مشعلیں روشن تھیں اور خوب اجالا پھیلا ہوا تھا۔ غفورا اور دلشاد نے ایک ساتھ دیکھا کہ امیر موسیٰ اپنے چند آدمیوں کے ساتھ جھومتا اور اول فول بکتا ادھر آ رہا ہے۔ غفورا نے گھبرا کر دلشاد کو دیکھا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر اس کے برابر کھڑی ہو گئی۔

دلشاد بڑی حیرت سے امیر موسیٰ کو اپنی طرف آتے دیکھ رہی تھی مگر اس کی حیرت جلد ہی دور ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ امیر موسیٰ نے شراب پی رکھی ہے اور اب وہ انسان سے شیطان بن چکا ہے۔

"یہیں ٹھہرو امیر موسیٰ"۔ دلشاد نے ڈپٹ کر کہا۔

امیر موسیٰ نے کوئی پرواہ نہ کی اور بڑھتا ہوا ان کے پاس آ گیا۔

"یہ کیا حرکت ہے امیر موسیٰ۔۔۔۔" دلشاد نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

اس کے جواب میں امیر موسیٰ کا ہاتھ بڑھا اور اس کا آہنی پنجہ غفورا کی کلائی پر پڑا۔ غفورا ابھی ترک عورت تھی۔ اس نے اپنے حواس بجا رکھے اور دایاں ہاتھ اٹھا کر امیر موسیٰ کے منہ پر اس زور کا طمانچہ مارا کہ موسیٰ جیسا شخص بھی گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا لیکن فوراً ہی سنبھلا اور غفورا کی طرف بڑھتے ہوئے دھاڑا:

"تو نے۔۔۔۔ تو نے امیر موسیٰ کو طمانچہ مارا ہے"۔

یہ کہتے ہوئے وہ پاگل ہوتا تھا کہ غفورا کی کلائی پھر سے پکڑ لے کہ دلشاد خنجر کھینچ کر ان دونوں کے درمیان آ گئی۔

"خبردار جو قدم آگے بڑھایا"۔

دلشاد نے گرج کر کہا:

"تم نے ہمیں ذلیل کر دیا ہے"۔

"ہٹ جاؤ آغا خانم"۔

امیر موسیٰ چیخ کر بولا:

"اس نے مجھے۔۔۔۔ امیر موسیٰ کو طمانچہ مارا ہے"۔

"تم اسی قابل ہو موسیٰ"۔

دلشاد بھی شیرنی کی طرح بپھر گئی تھی:

"تم احسان فراموش ہو جس نے تمہیں سہارا دیا۔ اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے تمہیں شرم نہ آئی"۔

"خانم۔۔۔۔ میں کہہ رہا ہوں ہٹ جاؤ میرے سامنے سے ورنہ۔۔۔۔" امیر موسیٰ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"موسیٰ۔۔۔۔ میں، امیر حسین والیِ کابل کی ملکہ تمہیں حکم دیتی ہوں کہ تم ہوش میں آ جاؤ ورنہ یہ خنجر تمہارے سینے میں اتر جائے گا"۔ دلشاد نے بڑی بے خوفی سے خنجر اونچا کر کے للکارا۔

امیر موسیٰ کے قدم رک گئے۔ وہ تذبذب میں مبتلا ہو گیا تھا۔

اس شور و غل سے بستی کے لوگ اور تماشا دیکھنے والے جاگ پڑے تھے۔ وہ تلواریں لہراتے ہوئے اسی طرف بھاگے۔ ظفر بھی اپنے کمرے میں جاگ پڑا۔ اور خطرہ محسوس کرتے ہوئے تلوار اٹھا کے برآمدے میں آیا۔ اس کی نظر دلشاد کے پیچھے دبکی ہوئی غفورا پر پڑی تو وہیں سے چلایا:

"گھبرانا نہیں غفورا۔ میں آ رہا ہوں"۔

امیر موسیٰ نے ظفر کو آتے دیکھا تو غفورا اور دلشاد کو چھوڑ کے تلوار کھینچتا ہوا ظفر کی طرف بڑھا:

"اچھا ہوا تو آ گیا۔ میں پہلے تیرا ہی خاتمہ کرتا ہوں"۔ اور امیر موسیٰ نے بڑی پھرتی سے ظفر پر وار کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طغرل بھی اچھا شمشیر زن تھا۔ اس نے موسیٰ کا وار خالی دیا۔ اور جھکائی دے کر اس نے جوابی حملہ کیا۔ دونوں تلواریں مل گئیں اور دو بدو جنگ شروع ہو گئی۔

بستی والوں نے اپنے سردار کو لڑتے دیکھا تو وہ بھی مغلوں پر ٹوٹ پڑے۔ برآمدے سے میدان تک ہر جگہ لڑائی چھڑ گئی۔ اور چیخ و پکار کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ لڑنے والوں کو قطعی علم نہ تھا کہ معاملے کا اصل نوعیت کیا ہے۔ وہ تو بس یہ سمجھ رہے تھے کہ فریقِ مخالف نے انہیں دھوکا دیا ہے۔

امیر موسیٰ کے ساتھ فرار ہو کر آنے والوں میں دس سوار امیر حسین کے خاص محافظ دستے کے تھے وہ جب اپنے خیمے سے نکل کے آئے اور میدانِ کارزار گرم دیکھا تو لڑنے کے بجائے سب کے سب دلشاد آغا کے پاس پہنچے اور سر جھکا کے کھڑے ہو گئے۔

"ہمارے لیے کیا حکم ہے خانم آغا۔ ایک نے ادب سے پوچھا

"کیا تم ہمارا ساتھ دو گے؟" دلشاد نے بڑی امیدوں سے کہا۔

"کیوں نہیں خانم..... ہم والیِ کابل کے وفادار ہیں۔ ہم صرف آپ کا حکم مانیں گے۔"

دلشاد کو اس جواب سے بڑا سکون ملا۔ وہ ایک لمحہ سوچتی رہی۔ پھر بولی:

"تم لوگ میرے ساتھ آؤ۔"

دلشاد نے غلفورا کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے ساتھ کمرے میں واپس آ گئی۔ محافظ تلواریں سونتے باہر پہرہ دینے لگے۔

"غلفورا۔ جلدی سے اپنے شوہر کے کپڑے پہن لو۔" دلشاد کے لہجے میں کچھ حکم کی گرمی اور کچھ التجا کی نرمی تھی۔

"مگر کیوں ملکہ..... شوہر کے کپڑے۔" غلفورا کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔

"وقت کم ہے غلفورا....."

دلشاد نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔

"میں تمہارے لیے جان دے سکتی ہوں لیکن فلدی عزت یہاں محفوظ نہ رہ سکے گی۔ تم مردانہ کپڑے پہن کر میرے آدمیوں کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤ میرے آدمی تمہیں جنوب میں سردار تیمور کے پاس پہنچا دیں گے۔ وہاں اور صرف وہاں تم محفوظ رہ سکتی ہو۔"

"لیکن میرا شوہر..... طغرل....." غلفورا ہچکچانے لگی۔

"اس کی حفاظت کی میں ذمے دار ہوں۔"

دلشاد کے لہجے میں بڑی گھبراہٹ تھی:

"غلفورا جلدی کرو۔ اپنی عزت بچاؤ۔"

"مجھے آپ پر بھروسہ ہے ملکہ....." کہتی ہوئی غلفورا شوہر کے کپڑے تلاش کرنے لگی۔

دلشاد دروازے پر گئی اور محافظوں کو ہدایت دینے لگی:

"تم میں سے پانچ آدمی میرے محسن کی بیوی کو اپنے ساتھ لے کر فوراً جنوب کی طرف روانہ ہو جائیں۔ باقی پانچ میرے پاس رہیں..... تمہارے ساتھ جانے والی عورت ہے جو مردانہ لباس میں سفر کرے گی۔ اس کی حفاظت تمہارا فرض ہے۔ جس قدر جلد ہو سکے اسے سردار تیمور کے پاس پہنچا دو۔ وہ اب تک گرم سیر کے علاقے میں ہیں۔"

دلشاد آغا نے اکھڑے اکھڑے اور بے ربط سے جملوں میں اپنا مفہوم سمجھانے کی کوشش کی مگر محافظوں نے کچھ دیکھا تھا اس سے انہیں معاملات کی سنگینی کا علم ہو گیا تھا۔

غلفورا کپڑے پہن کے آ گئی اور اس نے اپنے بال سامنے میں چھپا لیے تھے۔ اب وہ ایک نوعمر ترک لڑکا لگ رہی تھی۔

"خبردار۔ کوئی کوتاہی نہ ہو....." دلشاد آغا نے چلتے وقت تاکید کی۔

"خانم آغا..... آپ بے فکر رہیں۔ ہمارے جیتے جی ان پر کوئی آنچ نہ آ سکے گی۔" محافظوں میں سے ایک نے جواب دیا۔

پانچ محافظ غلفورا کو ساتھ لے کر برآمدے سے ہوتے ہوئے خیموں کی طرف بڑھ گئے۔ دلشاد نے بھی اپنی تلوار سنبھال لی اور باقی محافظوں کے ساتھ پھر اسی جگہ پر آ گئی جہاں کچھ دیر پہلے طغرل اور امیر موسیٰ ایک دوسرے سے گتھے ہوئے تھے۔

اس وقت تک امیر موسیٰ کے آدمیوں نے بستی والوں پر قابو پا لیا تھا۔ بستی کے کئی جوان مارے جا چکے تھے۔ باقی مجبور تھے۔ تمام لشکری امیر موسیٰ کے ساتھ تھے۔ دلشاد کے ساتھ اب صرف پانچ محافظ رہ گئے تھے۔

دلشاد میدان میں پہنچی۔ امیر موسیٰ ایک جگہ بیٹھا اپنے آدمیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ اب وہ اس بستی کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مالک تھا۔

سورج نکل رہا تھا۔ امیر موسیٰ کی آنکھوں میں خوف سائے صاف لہراتے نظر آ رہے تھے۔ امیر موسیٰ نے دلشاد کو آتے دیکھا لیکن وہ اس کی تعظیم کے لیے نہ اٹھا۔

دلشاد کے شاہانہ وقار کو صدمہ پہنچا۔ وہ امیر موسیٰ جو اس کے شوہر کے سامنے اس کے جوتے اٹھانے پر آمادہ رہتا تھا، اس وقت غرور سے سر اٹھائے اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

دلشاد نے بھی اس کی طرف توجہ نہ دی اور قریب پہنچ کر اس طرح ادھر ادھر دیکھنے لگی جیسے اس نے امیر موسیٰ کو نہ دیکھا ہو اور کسی اور کو تلاش کر رہی ہے۔ پھر اس کی نظر ایک جگہ ٹھہر کے رہ گئی۔ چار آدمی طغرل کو پکڑے لا رہے تھے۔

طغرل کے لباس پر خون کی چھینٹیں تھیں۔ طغرل کو بے بسی کے عالم میں دیکھ کر امیر موسیٰ نے ایک زور کا قہقہہ لگایا لیکن دلشاد کے دل سے ہوک سی اٹھی اور وہ تڑپ کے طغرل کے پاس پہنچ گئی۔

"چھوڑ دو اسے"۔۔۔۔ دلشاد نے پوری آواز سے چیختے ہوئے حکم دیا۔

طغرل کے ساتھ آنے والے دو سپاہی گھبرا کے پیچھے ہٹ گئے لیکن باقی دو اسے پکڑ کر کھڑے رہے۔ انہوں نے امیر موسیٰ کی طرف دیکھا جیسے وہ اس کے حکم کے منتظر ہوں۔

"چھوڑ دو میں حکم دیتی ہوں"۔

دلشاد پھر گرجی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے تلوار بلند کر لی:

"اگر تم نے اسے نہ چھوڑا تو میں تم دونوں کو قتل کر دوں گی"۔

"اسے نہیں چھوڑا جا سکتا خانم آغا"۔ امیر موسیٰ اپنی جگہ سے اٹھ کر دلشاد کی طرف بڑھا۔

"امیر موسیٰ قدم مت بڑھاؤ"۔

دلشاد نے پلٹ کر امیر موسیٰ سے کہا:

"میرے قریب آنا ہے تو تلوار لے کر آؤ۔ میں نہتے پر حملہ نہیں کرنا چاہتی"۔

امیر موسیٰ کے ہاتھ میں تلوار نہ تھی۔ وہ اپنی خونخوار تلوار وہیں چھوڑ کر آگے بڑھا تھا۔ دلشاد کی یاد داشت پر پردہ سا چھا گیا۔ اس نے دوڑ کر تلوار اٹھا لی۔ دلشاد کی تلوار پہلے ہی ہوا میں لہرا رہی تھی۔ پانچوں محافظ اس کے گرد دائرہ بنا کر کھڑے ہو گئے تھے۔

"میں امیر حسین کا نمک خوار ہوں۔ خانم آغا پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہتا"۔

امیر موسیٰ نے دلشاد کو مرعوب کرنے کی کوشش کی:

"خانم کی وجہ سے میں نے اس کی بیوی کو چھوڑ دیا لیکن اسے نہیں بخش سکتا"۔

"میں بھی ایک احسان فراموش کے گندے خون سے اپنی تلوار کو آلودہ نہیں کرنا چاہتی"۔

دلشاد نے اپنی تلوار کی نوک طغرل کے پکڑنے والوں میں سے ایک کے کاندھے سے لگا دی۔ وہ طغرل کو چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔ دوسرا بھی گھبرا گیا۔ اس نے بھی طغرل کو چھوڑ دیا۔

"طغرل تم میرے قریب آ جاؤ"۔ دلشاد نے بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔

طغرل قدم بڑھا کر محافظوں کے حلقے میں آ گیا۔ دلشاد نے سر اٹھا کر حویلی کی طرف دیکھا۔ امیر موسیٰ سمجھ گیا دلشاد حویلی میں جانا چاہتی ہے۔ وہ بڑھ کر دلشاد اور حویلی کے درمیان کھڑا ہو گیا۔

"یہ میرا مجرم ہے خانم۔۔۔۔" امیر موسیٰ نے طغرل کو خونخوار نظروں سے دیکھا۔

"یہ میرا محسن بھی ہے امیر موسیٰ۔۔۔۔ میں اس کی حفاظت کروں گی"۔

"خانم۔۔۔۔ مجھے گستاخی پر مجبور نہ کریں"۔

"میں احسان فراموشی نہیں کر سکتی امیر موسیٰ"۔

"میں اسے نہیں جانے دوں گا۔ مجرم کو میرے حوالے کر دو"۔

موسیٰ کے لہجے میں گستاخی آ گئی۔

"میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گی موسیٰ"۔

دلشاد نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"اگر تم طغرل کو مجرم سمجھتے ہو تو اپنا مقدمہ امیر حسین کے سامنے پیش کیا۔ ان کی واپسی کا انتظار کرو"۔

"تم اسے چھوڑ رہی ہو یا نہیں"۔ موسیٰ اور زیادہ گستاخی سے بولا۔

"موسیٰ۔۔۔۔"

دلشاد غصے سے بولی:

"تم پر اب تک نشہ سوار ہے۔ تم مجھ پر حکم چلانے والے کون ہوتے ہو؟ میں جو چاہے کروں گی۔ روک سکتے ہو تو روک لینا۔۔۔۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دلشاد نے محافظوں کے حلقے میں حویلی کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ موسیٰ کو مجبوراً راستہ دینا پڑا۔ وہ ایک طرف ہٹ گیا۔

دلشاد، طغرل کو حفاظت کے ساتھ کمرے میں لے آئی۔ موسیٰ بڑبڑاتا اور پیر پٹختا واپس ہوا لیکن واپسی سے پہلے اس نے پندرہ سپاہیوں کو دلشاد کا کمرہ گھیرنے کا حکم دے دیا۔

دلشاد نے اس سے پہلے ہی اپنی حفاظت کا انتظام کر لیا تھا۔ اس نے تین محافظ دروازے پر مقرر کیے اور دو کو پشت کی کھڑکی پر پہرہ دینے کے لیے بھیج دیا۔

"عظیم ملکہ....."

طغرل نے کمالِ ادب سے کہا:

"میں آپ کے احسان کو عمر بھر نہ بھول سکوں گا۔"

"نہیں طغرل....."

دلشاد آہستہ سے بولی:

"میں تم سے شرمندہ ہوں۔ میرے آدمیوں نے انتہائی گھناؤنا قدم اٹھایا ہے۔ احسان فراموشی کی ایسی مثال شاید تاریخ پیش نہ کر سکے۔ امیر موسیٰ ہمیشہ سے ایک خطرناک دوست ہے لیکن اس کی بہادری کی وجہ سے امیر حسین اسے ساتھ رکھتے ہیں۔"

طغرل نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی متجسس نظریں کمرے میں کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔

"شاید تم غلفورا کو تلاش کر رہے ہو؟"

دلشاد نے بیٹھتے ہوئے کہا:

"وہ ہم سے زیادہ محفوظ ہے۔ امیر موسیٰ کے ہاتھ شاید اس تک کبھی نہ پہنچ سکیں۔"

طغرل کی نظریں سوالیہ نشان بن کر دلشاد کے چہرے پر ٹک گئیں۔

"طغرل....."

دلشاد نے کہنا شروع کیا:

"مجھے تم سے زیادہ غلفورا کی فکر تھی۔ مرد اگر لڑ کر مر جائے تو اس کی عزت بڑھ جاتی ہے لیکن عورت اگر ایک بار عزت کھو دے تو پھر کبھی وقار حاصل نہیں کر سکتی۔ مجھے معلوم تھا کہ امیر موسیٰ تمہاری بستی والوں کو شکست دے

دے گا..... اس کا بھی امکان تھا کہ شاید اس دار و گیر میں تم بھی مارے جاؤ۔ اس کے باوجود میں نے غلفورا کو پہلے ترجیح دی..... اسے میں نے اپنے پانچ با اعتماد محافظوں کے ساتھ جنوب میں تاتاری سردار تیمور کے پاس علاقہ گرم سیر میں بھیج دیا ہے۔ خدا کرے وہ خیریت سے وہاں پہنچ جائے۔ اس کے لیے اس سے زیادہ محفوظ جگہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔"

"ملکہ عالیہ....."

طغرل بڑی رقت سے بولا:

"آپ کا یہ احسان میری جان بچانے سے بھی بڑا ہے۔ اب نہ مجھے اپنا علاقہ چھننے کا غم ہے اور نہ اپنی جان کی پروا۔ آپ کتنی عظیم ہیں ملکہ....."

○

امیر حسین نے نشہ کی حالت میں ایک بہت بڑی احسان فراموشی کی تھی لیکن یہ اس کے لیے مفید ثابت ہوئی۔ اس نے اپنے دل کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیا کہ جنگ میں ہر بات جائز ہے۔ جنگجو لوگو! کا یہ قول خواہ کتنا ہی درست ہو لیکن اس کا اطلاق ہر جگہ نہیں کیا جا سکتا۔ طغرل اور موسیٰ کے درمیان کوئی جنگ یا حالتِ جنگ نہ تھی۔ طغرل نے تو ملکہ کابل کا نام سن کر انہیں سہارا دیا تھا جس کے صلے میں اسے اپنے علاقے سے ہاتھ دھونا پڑے۔ وہ قید ہو گیا اور غلفورا کو جان بچا کر بھاگنا پڑا۔

موسیٰ کو کسی بات کا افسوس نہ تھا۔ اس نے اپنے سوار چاروں طرف پھیلا دیے اور تھوڑی دیر میں ہی امیر حسین کے مفرور لشکر کے سوار ادھر ادھر مارے پھر رہے تھے۔ موسیٰ نے اپنے سواروں کی تلاش میں بھیج دیے تھے۔ اس طرح روزانہ دو چار مفرور لشکری اس کے پاس پہنچ رہے تھے اور موسیٰ کی طاقت میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔

کچھ دن بعد امیر موسیٰ کے اہلِ خاندان اور بال بچے بھی اس کے پاس آ گئے۔ امیر حسین نے جس وقت معتوں پر حملہ کیا، لشکریوں کی خواتین رسد لانے والے دستوں کے ساتھ تھیں۔ انہیں جب امیر حسین کی شکست کی خبر ملی تو پہاڑوں میں روپوش ہو گئیں اور مغلوں کے آگے بڑھ جانے کے بعد اپنے لواحقین کو تلاش کرنے لگیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس طرح تمام مفرور لشکری ایک ایک کر کے امیر موسیٰ کے پاس پہنچ گئے۔

موسیٰ گمان مفرور لشکریوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امیر حسین بھی جان بچا کر نکل گیا تھا۔ اس کی تلاش میں موسیٰ نے بہت سے سوار دوڑا دیے۔ امیر حسین بہرحال موسیٰ کا امیر تھا۔ موسیٰ اس کی بہت عزت کرتا تھا اور اس سے ڈرتا بھی تھا لیکن اب اسے دلشاد کی طرف سے بھی ڈر پیدا ہو گیا تھا۔ تمام لشکریوں کو معلوم تھا کہ موسیٰ نے دلشاد کو قید کر رکھا ہے۔

امیر حسین کی واپسی پر کیا ہو گا؟

اس خیال سے موسیٰ بہت پریشان تھا۔ آخر موسیٰ نے بڑی سوچ بچار کے بعد دلشاد کے کمرے پر سے پہرہ اٹھا لیا۔

دلشاد عافیت کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔ اسے بھی معلوم ہو گیا تھا کہ امیر حسین زندہ ہے اور کسی وقت یہاں پہنچ سکتا ہے۔ موسیٰ کی یہ تمام پیش بندیاں اور مہربانیاں اسی وجہ سے ہیں۔

دلشاد کو اپنی زیادہ فکر نہ تھی۔ وہ طغر کی وجہ سے ہر وقت پریشان رہتی تھی۔ وہ خوب جانتی تھی کہ موسیٰ کی یہ مہربانی کسی وقت بھی تبدیل ہو سکتی ہے۔ دشمنی کے سلسلے میں امیر موسیٰ کیسی سے کیسی حرکت کر سکتا تھا۔ وہ طغر کو کمرے سے ایک منٹ کے لیے بھی نہ نکلنے دیتی تھی اور ہر وقت چوکنا رہتی تھی۔

ایک اندھیری رات میں دلشاد نے طغر کو تیار ہونے کا حکم دیا۔

طغر بھی اس قید سے تنگ آ گیا تھا اور اپنی آزادی کے لیے ہر قسم کا خطرہ مول لینے پر آمادہ تھا۔ دلشاد نے ایک گھوڑا مع ضروری سامان کے بستی سے دور بھجوا دیا تھا۔ طغر کے تیار ہونے کے بعد اسے اپنے ایک محافظ کے ساتھ پچھلی کھڑکی سے باہر نکالا۔

دلشاد نے دھڑکتے دل سے طغر کو خدا حافظ کہا اور اسے بھی گرم سیر کی طرف روانہ کر دیا۔

ایک تو اندھیری رات، پھر امیر موسیٰ پہرہ اٹھا کر اس طرف سے لاپروا ہو گیا تھا اس لیے طغر کو نہ تو کسی نے دیکھا اور نہ تعاقب کیا۔ وہ بڑی آسانی سے گھوڑے تک پہنچ گیا۔ یہ اس کا علاقہ تھا۔ راستے جانے پہچانے تھے اس نے محافظ کو واپس بھیج دیا اور ایک پُرپیچ مگر محفوظ راستے پر اپنا گھوڑا ڈال دیا۔

اس کا رخ گرم سیر کی طرف تھا۔

امیر حسین اور شہر سبز کے سردار تیمور نے مشترکہ لشکر کے ساتھ سیستانیوں کے ساتوں قلعوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ سامانِ رسد کے علاوہ ان کے ہاتھ بے شمار تازہ دم گھوڑے اور سیستانی سوار اور پیادے آ گئے۔

امیر حسین نے اپنے لشکر کے ساتھ فوراً شمال کا رخ کیا تھا مگر تیمور زخموں کی وجہ سے قریب کی پہاڑیوں میں ٹھہر گیا تھا۔ یہ مقام بڑا پُرفضا تھا۔ دور دور تک انگور کی بیلیں تھیں۔ ہوا کے خنک جھونکے مشامِ جان کو معطر کرتے تھے۔

تیمور کی بیوی الجائی خاتون آغا اور منگھا جہانگیر اس کے پاس پہنچ گئے تھے۔ الجائی خاتون اپنے شوہر کی خدمت میں لگی تھی۔ اسے تیمور کی خدمت کا بہت کم موقع ملتا۔ تیمور دو چار دن اس کے ساتھ گزار کر آگے بڑھ جاتا تھا اور جب کوئی سکون کی جگہ میسّر آتی تو الجائی کو بلوا لیتا۔

اس بار الجائی خاتون کو تیمور کے زخموں کی وجہ سے ایک اچھا موقع ہاتھ آیا۔ تیمور کے بازو کے زخم بھر گئے تھے لیکن پیر کا زخم بھرنے کا نام نہ لیتا تھا۔ کسی سیستانی کے تیر نے اس کے ایک پیر کو زخمی کر کے اسے ہمیشہ کے لیے لنگڑا کر دیا تھا۔

تیمور تقریباً ایک ماہ تک صاحبِ فراش رہا۔

یہ ایام الجائی کے لیے بڑے خوش گوار تھے۔ منگھا جہانگیر ہر دم ان کے گلے کا ہار بنا رہتا اور الجائی تیمور کے برابر قالین پر لیٹے ہوئے پہاڑیوں پر چڑھتے چاند کو دیکھتی رہتی۔ اس کا دل مسرتوں سے بھرا ہوا تھا۔ زندگی میں اسے پہلی بار ایک پُرسکون جگہ پر اتنے طویل عرصے تک تیمور کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع ملا تھا۔ کبھی کبھی وہ یہ سوچ کر کانپ اٹھتی تھی کہ اب جدائی کا وقت قریب آ رہا ہے۔ زخم بھرتے ہی تیمور اسے چھوڑ کر آگے چلا جائے گا۔

تیمور لنگڑا لنگڑا کے چلنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ پیر سیدھا پڑنے لگے لیکن زخم بھرنے اور پیر سیدھا ہونے کے باوجود اس کا لنگ ختم نہ ہو سکا۔

ایک دن وہ لنگڑا کے چل رہا تھا کہ ننھے جہانگیر نے تالیاں بجانا شروع کر دیں:

"آہا، بابا لنگڑے ہو گئے۔"

"چپ رہ....." الجائی خاتون نے جہانگیر کو گود میں اٹھا کر پیار کیا:

"بابا کا مذاق نہیں اڑاتے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تیمور نے پلٹ کر جہانگیر کو دیکھا اور بولا:

"الجائی اسے بولنے دو۔ صرف جہانگیر ہی میرے سامنے سچ بول سکتا ہے۔ میں واقعی لنگڑا ہو گیا ہوں لیکن کوئی بھی مجھے لنگڑا کہنے کی جرأت نہیں کرے گا۔"

اور یہ درست ثابت ہوا۔

تیمور تیزی سے ترقی اور عروج کے مدارج طے کرتا رہا۔ کسی نے اسے لنگڑا کہنے کی جرأت نہیں کی سوائے ایک اندھی بڑھیا کے جو تیمور کے پاس کسی کی شکایت لے کر آئی تھی۔

تیمور نے پوچھا تھا:

"اے نابینا خاتون۔ تیرا نام کیا ہے؟"

"میرا نام دولت ہے امیر تیمور....." بڑھیا نے بڑے وقار سے جواب دیا تھا۔

اس پر تیمور مسکرا دیا۔ بولا:

"عجب اتفاق ہے۔ کیا دولت اندھی ہو سکتی ہے؟"

"ہو سکتی نہیں بلکہ دولت ہمیشہ اندھی ہوتی ہے امیر....."

عورت نے سنبھل کر دو ٹوک جواب دیا:

"اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ دولت اندھی نہ ہوتی تو لنگڑے کے پاس فریاد لے کے نہ آتی۔"

تیمور دنگ رہ گیا اور اس نے اسی وقت بڑھیا کی داد رسی کی تھی۔ اندھے اور لنگڑے کا یہ لطیفہ آج تک زبان زد خاص و عام ہے۔

تیمور کے زخم بھر گئے تھے لیکن پیر کا زخم ابھی پوری طرح مندمل نہیں ہوا تھا کہ اسے امیر حسین کی شکست فاش کی اطلاع ملی۔ جب امیر حسین شمال کی طرف جا رہا تھا تو تیمور نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ مغلوں کی چال بازیوں سے ہوشیار رہنا۔ ان کا سامنا ہو جائے تو مقابلے میں پہل کبھی نہ کرنا۔ جنگ سے پہلے مغلوں کی صحیح تعداد کا اندازہ کرنا اور ان کے کمک کے راستوں کو پہلے سے بند کر دینا۔

امیر حسین نے اس کی کسی بات پر کان نہ دھرا تھا اور مغلوں کے ہاتھوں بری طرح پٹ کے پہاڑوں میں منہ چھپاتا پھر رہا تھا۔

تیمور کو امیر حسین کی حماقت پر سخت غصہ آیا لیکن اسے اس کی مدد کو پہنچنا تھا۔ اس نے فوراً روانگی کی تیاری

شروع کر دی۔ پھر ایک صبح اس نے الجائی خاتون کو ہتھیار ڈالنے کو کہا۔ الجائی سمجھ گئی..... اس کی مسرت کے دن ختم ہو گئے۔ وہ زرہ بکتر اور تلوار لے کر آئی۔ اپنے ہاتھوں سے تیمور کو زرہ پہنائی اور تلوار اس کی کمر سے لگائی۔ تیمور نے الجائی کو بغل میں دبا کر اسے تسلی دی۔ جہانگیر کا منہ چوما اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

الجائی جدائی کے تصور سے لرز رہی تھی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بوجھل ہو گئی تھیں۔ اس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا:

"میرے سرتاج۔ خدا تمہارا حافظ و ناصر....."

خدا کو حافظ و ناصر بنا کر تیمور کو رخصت کرنا الجائی خاتون کی زندگی کا دستور بن گیا تھا۔ تیمور کو رخصت کرتے وقت الجائی کا کلیجہ شق ہو جاتا۔ کیونکہ جن حالات سے تیمور گزر رہا تھا اس کے پیش نظر دوسری ملاقات کی مشکل ہی سے امید کی جا سکتی تھی۔

تیمور اپنی وفادار اور عالی ہمت بیوی کو ساتھ ہی رکھنا چاہتا تھا لیکن جہانگیر کی وجہ سے وہ اسے ہمیشہ پیچھے چھوڑ جاتا تھا۔ جہانگیر اس کا واحد سہارا اور مستقبل کا روشن ستارا تھا۔

گرم سیر سے روانہ ہوتے وقت اس کے ساتھ سواروں کا ایک مختصر دستہ تھا۔ جنگ پیشہ اور جنگ فطرت تاتاری نچلا بیٹھنا نہیں جانتے تھے۔ اسی لیے جب امیر حسین نے شمال میں جانے کا فیصلہ کیا تو تیمور کے بہت سے ساتھی قسمت آزمائی کے لیے امیر حسین کے ساتھ شمال کی طرف چلے گئے۔

تیمور کو ہستان بلخ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اسے ایک جگہ فوج ٹھہری ہوئی دکھائی دی۔ اس نے جاسوس بھیج کر پتہ لگایا تو معلوم ہوا کہ فرانچی نامی ایک تاتاری سردار جو مغلوں کا ملازم تھا ان سے ناراض ہو کر مع اپنے دستے کے ٹھہرا ہوا ہے اور اسے سردار تیمور کی تلاش ہے۔

اس خبر پر تیمور سجدۂ شکر بجا لایا۔ اور فرانچی کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ فرانچی حاضر ہو کر تعظیم بجا لایا اور اپنے وفاداری کا یقین دلایا۔ تیمور نے خوش ہو کر فرانچی کے سر پر اپنا رومال رکھ دیا۔ تاتاریوں میں اس طرح اپنے ماتحتوں کی عزت افزائی کی جاتی تھی۔

فرانچی کے سواروں کے شامل ہو جانے سے تیمور کے لشکریوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ تیمور وہاں سے زوار صف کی طرف بڑھا۔ اس نے درہ کے باہر گنجائی۔ صبح کی نماز سے فارغ ہو کر اس نے دست دعا بلند کیے۔ درگاہ الٰہی میں اس کی دعا اسی وقت قبول ہو گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہاں سے فارغ ہوا تو چٹان کی دوسری طرف سے ایک فوج گزرتی دکھائی دی۔ تیمور فوراً گھوڑا مانگ کر سوار ہوا اور خود دریافت حال کے لیے اس کی طرف چلا۔ قریب پہنچ کے اس نے سواروں کو گنا تو وہ تعداد میں سترہ اور تین دستوں میں تقسیم تھے۔ فوج ایک سوار کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر رک گئی۔ ابھی سورج نہ نکلا تھا اور صبح کی مدھم روشنی پھیل رہی تھی۔

"کون ہو تم؟ کہاں سے آئے ہو اور کدھر جانا چاہتے ہو؟" تیمور نے کڑک دار آواز میں للکارا۔

پہلے تو وہ اس تنہا مگر بارعب سوار کو گھورتے رہے۔ پھر ان میں سے ایک نے ذرا آگے آ کر کہا:

"ہم شہر سبز کے مرد ار تیمور کے سوار ہیں۔ انہیں تلاش کر رہے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ وہ لشکر میرے اس وادی کی طرف آ رہے ہیں۔"

تیمور نے اپنا نام سن کر انہیں غور سے دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کی لیکن وہ ان کے بارے میں صحیح اندازہ نہ لگا سکا۔ اس نے مزید اطمینان کے لیے کہا:

"سردار تیمور اسی وادی میں موجود ہیں۔ وہ میرے بھی آقا ہیں۔ اگر تم کہو تو میں تمہیں ان کے پاس لے جا سکتا ہوں۔"

اس آدمی نے پلٹ کر اپنے ساتھیوں سے پوچھا:

"کیا خیال ہے۔ اس رہبر کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جائے؟"

تیمور نے ذرا گھوڑا اڑھایا۔ اس نے قریب پہنچ کے ایک بار پھر انہیں شناخت کرنے کی کوشش کی۔ تیمور تو انہیں نہ پہچان سکا۔ لیکن ان لوگوں نے اسے پہچان لیا۔

"امیر تیمور..... یہ آپ ہیں۔"

ان کی زبان سے نکلا اور تینوں راستوں کے سردار گھوڑوں سے کود کے تیمور کے گھوڑے کے پاس آئے اور اس کی رکاب کو بوسہ دیا۔ یہ طریقہ اظہار اطاعت کا تھا۔

تیمور بھی گھوڑے سے اتر آیا اور ان سے بڑی گرمجوشی سے ملا۔ یہ تمام سوار قبیلہ برلاس سے تعلق رکھتے تھے تیمور کو ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ وہ انہیں ساتھ لے کر اپنے خیمے پر آیا۔ اپنے آدمیوں سے ان کا تعارف کرایا اور ضیافت کا اہتمام کیا گیا۔

دعوت کے بعد تیمور نے ان نوواردسرداروں کو تحائف دیے۔

پہلے دستے کا سردار تغلق خواجہ برلاس تھا۔ تیمور نے اسے اپنا خود تحفے میں دیا۔

دوسرے دستے کا امیر سیف الدین تھا جسے تیمور نے اپنی کمر کا پٹکا پیش کیا۔

تیسرا سردار امیر توبک بہادر تھا جس نے تحفے میں تیمور کی زرہ پائی۔

تیمور جس وقت شمال کی طرف چلا تھا تو اس کی طبیعت بہت مکدر تھی۔ ایک تو اس کی طویل بیماری نے اسے ملی سیاست اور جدوجہد سے دور رکھا تھا۔ دوسرے امیر حسین نے جلد بازی سے کام لے کر اپنی فوج کو تباہ کر یا تھا۔ اس کا ایک بڑا سہارا ٹوٹ گیا تھا لیکن یہ سفر اس کے لیے بہت مبارک ثابت ہوا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ سے غیبی مدد مل رہی ہے۔ وہ جس منزل پر قیام کرتا نئے اور پرانے دوست آ آ کر اس سے ملتے جلتے۔ ان میں یسے لوگ تھے جو مغلوں کی حکومت سے بددل ہو کر پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ بعض وہ تاتاری سردار بھی اس سے آملے جو اب تک کسی نہ کسی جگہ مغلوں کی ملازمت کر رہے تھے مگر ان کے جور و ستم سے نالاں تھے اور غلامی کا جوا اتار پھینکنے کے لیے موقعے کی تلاش میں تھے۔ انہیں ایک مضبوط مرکز اور ایک اصلاحی صلاحیتوں کے سردار کی تلاش تھی۔ یہ صلاحیت نہیں صرف تیمور میں نظر آئی تھی اور اب وہ اسے تلاش کرتے ہوئے اس تک آ پہنچے تھے۔

جس دن خواجہ برلاس، امیر سیف الدین اور توبک بہادر اس کے پاس پہنچے، اسی شام تیمور کا ایک پرانا دوست شیر بہرام بھی اسے ڈھونڈتا ہوا اس کے لشکر میں پہنچ گیا۔ شیر بہرام، تیمور کی جوانی کا دوست تھا اور اُس زمانے میں یہ دونوں ترقی کے منصوبے بنایا کرتے تھے۔ شیر بہرام کی طبیعت میں بڑا منچلا پن تھا اسے تیمور کی سنجیدگی اور دھیما پن پسند نہ تھا اس لیے وہ تقدیر آزمائی کے لیے ہندوستان چلا گیا تھا۔ وہاں اسے کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی تو پھر واپس آ گیا۔

کابل کے اطراف میں اسے معلوم ہوا کہ تیمور گرم سیر کے علاقے میں خیمے ڈالے پڑا ہے۔ شیر بہرام اگر امیر پہنچا مگر تیمور وہاں سے روانہ ہو چکا تھا اس لیے اس نے بھی شمال کا رخ کیا۔

شیر بہرام ایک رات ایک ویرانے میں ٹھہرا ہوا تھا کہ اسے ایک سوار آتا ہوا دکھائی دیا۔ شیر بہرام کو اس پر مغل سوار کا دھوکا ہوا۔ اس نے چاہا کہ اس پر حملہ کر کے اسے ختم کر دے۔ وہ ایک طرف چھپ کے کھڑا ہو گیا۔ سوار قریب پہنچا تو ایک گھوڑے کو پیڑ کی شاخ سے بندھا دیکھ کر بڑا حیران ہوا۔

چاندنی رات تھی۔ سوار نے دور دور تک نظریں دوڑائیں۔ کوئی نظر نہ آیا تو آواز دی:

"بھائی! میں مسافر ہوں۔ راستہ بھول کے ادھر آ گیا ہوں۔ تم پسند کرو گے تو رات تمہارے ساتھ بسر کروں گا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ورنہ کسی طرف نکل جاؤں گا۔"

شیر بہرام نے اس کے چہرے مہرے اور زبان سے اندازہ لگایا کہ وہ مغل نہیں ہے۔ وہ آڑے نکل کے اس کے سامنے آگیا۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ آنے والے کا مسلک کیا ہے، مذہب کیا ہے، اس نے زور سے کہا:

"السلام علیکم!"

آنے والے نے "وعلیکم السلام" کہہ کر اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت پیش کیا اور بولا:

"الحمدللہ، میں مسلمان ہوں اور اپنے مسلمان بھائی سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔"

شیر بہرام بھی اس سے بڑی خوش دلی اور خلوص سے ملا۔ دونوں نے ایک ساتھ بیٹھ کے کھانا کھایا۔ ایک کے پاس صرف پھل تھے دوسرے کی تھیلی میں شہد لگی روٹیاں تھیں۔ کھانا کھا کے دونوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ لیکن دونوں نے اب تک ایک دوسرے کا نام یا اس صحرا نوردی کا سبب نہ پوچھا تھا۔ وہ بے تکلف ہو جانے کے باوجود ایک دوسرے سے خائف تھے اور دوسرے کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے تھے۔ دونوں بڑی دیر تک موسم اور تکلیف دہ سفر کے بارے میں گفتگو کرتے رہے لیکن ایک دوسرے کا نام نہ پوچھ سکے۔

"تم کس طرف جانا چاہتے ہو سوار؟" آخر شیر بہرام نے اصل مطلب کی طرف قدم بڑھایا۔

"گرم سیر جانے کا ارادہ ہے لیکن راستہ بھول گیا ہوں۔۔۔۔"

آنے والے نے جواب دیا اور ساتھ ہی سوال کر بیٹھا:

"اور تم کس طرف جا رہے ہو دوست؟"

شیر بہرام کے کان گرم سیر کے نام پر پہلے ہی کھڑے ہو گئے تھے۔ اس نے اطمینان سے کہا:

"میں وہاں سے آ رہا ہوں جہاں تم جانا چاہتے ہو۔"

وہ دونوں برابر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ شیر بہرام کا جواب سن کر آنے والا چونک کر بیٹھ گیا:

"تم گرم سیر سے آ رہے ہو دوست؟"

"ہاں۔۔۔۔"

"تم نے دریائے ہلمند کے قریب کوئی لشکر دیکھا تھا؟" اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"تم شہر سبز کے سردار تیمور کے بارے میں تو نہیں پوچھ رہے ہو؟" شیر بہرام نے بالآخر کھل کر اس سے بات کر ڈالی۔

"ہاں دوست۔۔۔۔"

آنے والے نے ایک آہ بھری:

"ہم ایک مصیبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ میری بیوی پناہ حاصل کرنے کے لیے گرم سیر پہنچ چکی ہے میں بھی سردار تیمور کے پاس جا رہا ہوں۔"

شیر بہرام بھی بیٹھ گیا۔ بولا:

"تو پھر ہم دونوں دوست ہیں کیونکہ ہم دونوں ایک ہی شخص کو ڈھونڈ رہے ہیں۔" دونوں اٹھ کے بڑے پیار سے بغل گیر ہو گئے۔

"میرا نام شیر بہرام ہے۔"

شیر بہرام نے اپنا تعارف کرایا:

"تیمور میرے جوانی کے دوست ہیں۔ میں ان سے خفا ہو کر ہندوستان چلا گیا تھا۔ واپس آ کے انہیں گرم سیر میں تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ وہ بڑی تیزی سے اور تیاری کے ساتھ شمال کی طرف روانہ ہو گئے ہیں۔"

"تو کیا سردار تیمور گرم سیر میں نہیں ہیں؟"

آنے والے نے گھبرا کے سوال کیا۔ حالانکہ شیر بہرام اسے بتا چکا تھا کہ تیمور شمال کی طرف روانہ ہو چکا ہے آنے والا اور راستہ بھولنے والا یہ سوار طغرا تھا جو دلشاد آغا کے حکم کے بموجب گرم سیر جا رہا تھا جہاں اس کی بیوی ملغورا پہلے ہی جا چکی تھی۔

"معاف کرنا شیر بہرام۔"

طغرا نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا:

"دراصل میں اس خبر سے پریشان ہو گیا تھا۔ میرا نام طغرا ہے اور مجھے سردار تیمور کے سالے کی بیوی دلشاد آغا خاتون ملکہ کابل نے گرم سیر کی طرف بھیجا ہے۔"

"کیا تیمور نے شادی کر لی؟"

شیر بہرام کے لیے یہ نئی خبر تھی۔ اسے تیمور کو چھوڑے ہوئے کافی عرصہ گزر چکا تھا اور اس کے تصور میں تیمور اب تک ایک اکھڑ جوان تھا۔ لڑنے بھڑنے میں بہت تیز لیکن گفتگو میں سنجیدہ متین چہرے والا، جس کے لبوں پر مسکراہٹ مشکل سے ہی آتی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں شیر بہرام....." طغرل نے کہا۔

"مجھے ملکہ دلشاد نے بتایا تھا کہ تیمور کے ایک بیٹا بھی ہے۔"

شیر بہرام کچھ دیر سوچتا رہا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ سابق والیِ کابل امیر حسین، تیمور کا سالا ہے۔" اس نے دل ہی دل میں رشتے کا حساب لگاتے ہوئے کہا۔

شیر بہرام اور طغرل بڑی دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ طغرل نے اپنے بارے میں صرف موٹی موٹی باتیں بتائیں۔ اس نے شیر بہرام کو یہ نہیں بتایا کہ امیر حسین کے معتمد سردار امیر موسیٰ نے اس کے علاقہ پر قبضہ کر کے اسے دربدر پھرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

ان دونوں کو سردار تیمور کی تلاش تھی اس لیے دونوں ساتھ ہو گئے۔ طغرل نے گرم سیر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور صبح کو شیر بہرام کے ساتھ تیمور کو ڈھونڈنے چل پڑا۔

○

تیمور اپنے پرانے دوست شیر بہرام سے مل کر بہت خوش ہوا۔ شیر بہرام اس سے شرمندہ تھا لیکن تیمور نے اس سے کوئی شکوہ نہ کیا بلکہ بڑی محبت سے ملا۔ اور اس سے دیر تک ہندوستان کے حالات پوچھتا رہا۔

تیمور نے دوپہر میں تین تاتاری سرداروں کی آمد پر ضیافت کا انتظام کیا تھا۔ رات کو شیر بہرام کی آمد کی خوشی میں دوسری ضیافت کا اعلان کیا گیا۔

طغرل شیر بہرام کے ساتھ ہی تیمور کے سامنے پیش ہوا تھا لیکن تیمور نے اس پر کوئی توجہ نہ دی تھی۔ شیر بہرام سے گفتگو میں وہ اس قدر منہمک رہا کہ کسی اور طرف توجہ دے ہی نہ سکا۔ طغرل نے بھی صرف سلام کرنے پر اکتفا کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ کسی مہم دیرینہ کا ملنا امیر حسین اور خضر کی ملاقات سے کم نہیں ہوتا ہے۔ اس نے دونوں کی گفتگو میں نہ تو دخل دیا اور نہ اپنا حالِ دل بیان کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ وہ غلورا کے بارے میں پوچھنے کے لیے بہت بے چین تھا۔ تیمور کی طرح شیر بہرام بھی طغرل کو بالکل بھول گیا۔

تیمور کا دربار برخاست ہوا۔ اس نے اپنے دوست کو اپنے خاص دستے میں شامل کر لیا اور اس کے لیے

الگ خیمہ لگانے کا حکم دیا۔

شیر بہرام دربار سے اٹھ کر چلا تو اسے ایک دم طغرل کا خیال آیا جو سر جھکائے اس کے پیچھے خاموشی سے چلا آ رہا تھا۔

"طغرل....."

شیر بہرام نے رک کر کہا:

"یار تو بھی عجیب آدمی ہے۔ تیمور سے ملنے کے لیے تو اتنا بے چین تھا لیکن دربار میں خاموش بیٹھا رہا۔ اپنے بارے میں سردار کو بتایا ہوتا۔ بیوی کے بارے میں کچھ پوچھا ہوتا۔"

"بہرام دوست....."

طغرل افسردگی سے بولا:

"تم اور سردار تیمور پرانی یادیں تازہ کر رہے تھے۔ میں نے دخل دینا مناسب نہ سمجھا پھر تم تو سردار کے یارِ غار ہو اور میں ٹھہرا ایک معمولی آدمی....."

"اچھا چل میرے ساتھ....."

شیر بہرام نے مڑتے ہوئے کہا:

"میں تجھے سردار کے پاس پیش کروں گا۔ تو معمولی آدمی نہیں۔ میرا دوست ہے تیری اہمیت یوں بھی ہے کہ تو سردار تیمور کی سریج کا فرستادہ ہے۔ تیری بات تو وہ غور سے سنے گا۔"

"اس وقت نہیں دوست۔"

طغرل نے اسے روکتے ہوئے کہا:

"دربار برخواست ہو چکا ہے۔ رات کے کھانے پر اگر موقع ملا تو میں سردار سے بات کروں گا۔"

"موقع و وقع چھوڑ یار....."

شیر بہرام نے بے تکلفی سے کہا:

"رات کو میں خود تجھے سردار سے ملاؤں گا اور اگر تجھے سردار سے کوئی کام ہے تو وہ بھی پورا ہو گا۔ آخر میں تیرا دوست ہوں۔ میں تیرے کام نہ آؤں گا تو اور کون آئے گا۔"

شیر بہرام، طغرل کو اپنے ساتھ ہی اس خیمے میں لے گیا جو اس کے لیے لگایا گیا تھا۔ رات کھانے پر جانے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے پہلے طغرل نے شیر بہرام کو اعتماد میں لینے کے لیے کہا:

"شیر بہرام۔ کیا میں تم پر اعتماد کر سکتا ہوں؟"

شیر بہرام نے اسے تعجب سے دیکھا:

"طغرل میں تاتاری ہوں۔ تاتاری جسے دوست کہہ دیتے ہیں اس کا زندگی بھر ساتھ دیتے ہیں۔ اگر تمہارے دل میں کوئی راز ہے تو اسے بیان کرو میں تمہیں اپنے پورے تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔"

طغرل کے دل پر بڑا بوجھ تھا۔ اسے اس وقت سہارے اور مشورے کی ضرورت تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تیمور سے امیر موسیٰ کی شکایت کرے یا نہ کرے۔ امیر موسیٰ کے بارے میں اسے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ شاہ کابل امیر حسین کا سب سے زیادہ اعتماد کا آدمی تھا اور یہی چیز اسے شکایت کرنے سے روک رہی تھی۔

طغرل نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ اگر ذہن پر بوجھ ہو تو اسے دیواروں سے کہہ کر جی ہلکا کیا جا سکتا ہے۔ شیر بہرام تو تاتاری تھا اور اپنے تعاون کا یقین بھی دلا رہا تھا۔

یہ باتیں سوچنے کے بعد طغرل نے اپنی پوری داستان بے کم و کاست شیر بہرام کے سامنے اگل دی۔ شیر بہرام بڑی توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

طغرل اپنی طبیعت کا بوجھ ہلکا کر چکا تو یہ بوجھ اب اس کے دوست شیر بہرام پر پڑ گیا۔ سچ ہے ایک سچا دوست ہی اپنے دوست کا غم خوار ہوتا ہے۔

شیر بہرام نے غور کرنے کے بعد مشورہ دیا:

"طغرل پہلے تو ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ تمہاری بیوی اس لشکر کے ساتھ موجود ہے کہ نہیں۔ اگر وہ سردار کے پاس پہنچ چکی ہے تو اس نے امیر موسیٰ کے بارے میں ضرور بتایا ہوگا۔ اس لیے فی الحال تمہیں خاموشی اختیار کرنا چاہیے۔ تم خود کہتے ہو کہ امیر موسیٰ شاہِ کابل کا دستِ راست ہے۔ یہ بات تیمور کے علم میں بھی ہوگی۔ ممکن ہے کہ تیمور اس وقت تمہاری بات پر دھیان نہ دے۔"

شیر بہرام کی بات طغرل کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے سوچا کہ امیر موسیٰ کے مقابلے میں اس کی کیا وقعت ہے۔

"تمہاری بات میری سمجھ میں آ گئی ہے شیر بہرام۔"

طغرل نے کہا:

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ملکہ کابل اور امیر موسیٰ میں صلح ہو گئی ہو۔ اگر ان دونوں نے ملاقات کے وقت مجھے

جھٹلا دیا تو میں کیا کروں گا۔ کہاں سے ثبوت ڈھونڈتا پھروں گا۔ میری گواہی کون دے گا۔"

"یہی سب سوچ کے تو میں تمہیں انتظار کرنے کا مشورہ دے رہا ہوں۔"

شیر بہرام نے کہا:

"جہاں تک تمہاری حفاظت کا تعلق ہے اس کی ذمے داری میں لیتا ہوں۔ امیر موسیٰ کیا اس کا باپ بھی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔"

○

رات کے کھانے پر شیر بہرام طغرل کو اپنے ساتھ لے گیا۔ حالانکہ اس ضیافت میں تیمور نے صرف اپنے چیدہ چیدہ سرداروں کو بلایا تھا۔

شیر بہرام نے باتوں باتوں میں تیمور سے اس کی بیوی بچے کی خیریت پوچھی۔ تیمور نے اسے بتایا کہ وہ اپنے اہلِ خانہ کو احتیاطاً دو چار منزل پیچھے چھوڑ آیا ہے۔

یہ بات طغرل نے بھی سن لی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کی بیوی اب تک تیمور کے پاس نہیں پہنچ سکی تھی۔ ایک یہ بھی امکان تھا کہ غلغورا گرم سیر اس وقت پہنچی ہو جب تیمور وہاں سے روانہ ہو چکا۔ بہرحال یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ سردار تیمور کو امیر موسیٰ کے بارے میں کوئی علم نہیں۔

رخصت ہوتے وقت شیر بہرام نے خود ہی طغرل کا تیمور سے تعارف کرایا:

"اے شہرِ سبز کے عالی نسب سردار۔ یہ میرا ترک دوست طغرل ہے۔ کچھ لوگ اسے ختم کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی پناہ میں آنا چاہتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

تیمور نے کہا:

"اسے ہمارے ترک دوستوں میں شامل کرا دو۔"

"سردار تیمور۔۔۔۔"

شیر بہرام نے سنبھل سنبھل کر کہنا شروع کیا۔ "میرا دوست طغرل اس علاقے سے آیا ہے جہاں اس وقت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

امیر حسین کے لشکر کے شکست خوردہ سپاہی مقیم ہیں۔"

"اچھا، تم وہاں سے آرہے ہو۔"

تیمور نے براہِ راست طغرل سے سوال کیا:

"امیر حسین کیسا ہے۔ اس کی بیوی اور سپہ سالار سب خیریت سے تو ہیں نا....؟"

شیر بہرام نے طغرل کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود جلدی سے بول پڑا:

"دلشاد آغا اور امیر موسیٰ خیریت سے ہیں۔ امیر حسین اب تک وہاں نہیں پہنچ سکے۔ امیر موسیٰ کے آدمی انہیں تلاش کر رہے ہیں۔"

"بے وقوف امیر حسین!"

سردار تیمور نے زور سے ہنکارا بھرا:

"اس کی جلد بازی بنا بنایا کام بگاڑ دیتی ہے۔"

پھر تیمور نے شیر بہرام کو حکم دیا:

"تم اپنے دوست کو رکھو۔ یہاں سے قلعہ الاجو قریب ہے۔ اس کی فتح کے بعد ہم اس کی رہبری میں دلشاد آغا کے پاس پہنچیں گے۔"

پھر سردار تیمور اور شیر بہرام دیر تک قلعہ الاجو کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ گفتگو کے دوران جب تیمور نے بتایا کہ قلعہ الاجو مغلوں کے قبضے میں ہے اور مغل بادشاہ الیاس خواجہ کی طرف سے اس وقت الاجو کا حاکم منگلی بوغا ہے تو شیر بہرام چونک پڑا۔

منگلی بوغا کسی زمانے میں شیر بہرام کا بڑا گہرا دوست تھا۔

"سردار تیمور، منگلی تو میرا پرانا دوست ہے۔"

شیر بہرام نے مسرت سے کہا:

"اگر اجازت ہو تو میں منگلی سے ملنے جاؤں۔ ممکن ہے وہ بغیر لڑائی کے قلعہ ہمارے حوالے کر دے۔"

"اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے شیر بہرام۔"

تیمور خوش ہو کے بولا:

"تم اس سے ملنے جاؤ۔ ہم تمہاری واپسی کا انتظار کریں گے۔ سیدھی انگلیوں سے گھی نکل آئے تو انگلیاں ٹیڑھی

کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

دوسرے دن صبح کو شیر بہرام قلعہ الاجو کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ اپنے ساتھ طغرل کو بھی لیتا گیا۔

منگلی بوغا کو تیمور کے لشکر کی پیش قدمی کی خبر مل چکی تھی اور وہ قلعے کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں مصروف تھا۔ اس نے قلعہ میں فوج کی تعداد بڑھا لی تھی اور تمام حفاظتی انتظامات کر لیے تھے۔ اس دوران شیر بہرام اور طغرل نیزوں پر سفید پھریرا لہراتے ہوئے قلعے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ سفید پرچم کو دیکھ کر معمولی پوچھ گچھ کے بعد ان کو اندر آنے کی اجازت دیدی گئی۔

پہرے داروں نے فوراً منگلی بوغا کو خبر بھجوائی کہ شیر بہرام نام کا ایک سوار ملاقات کا خواہش مند ہے۔ منگلی بوغا اپنے پرانے دوست کا نام اور آنے کی خبر سن کر بہت خوش ہوا اور اپنے محل سے نکل کر اس کا استقبال کیا۔

منگلی بوغا ایک بہادر اور عالی ہمت سردار تھا۔ اس نے مغلوں کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ مغل بادشاہ الیاس خواجہ نے بھی اسے خوب نوازا تھا اور اسے دوسرے تاتاری سرداروں سے زیادہ مراعات دے رکھی تھیں۔ منگلی بوغا بہت ٹھاٹ باٹ سے رہتا تھا۔

کھانے کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ پھر شیر بہرام نے مطلب کی بات شروع کی۔ بولا:

"یار تمہاری شان و شوکت دیکھ کر دل بہت خوش ہوا..... یہ سب تمہیں مغلوں کی مہربانی سے حاصل ہوا ہے لیکن مغل قابلِ اعتماد نہیں۔ کسی وقت بھی وہ تمہارے خلاف ہو سکتے ہیں۔"

"مغلوں نے مجھے بھیک نہیں دی۔"

منگلی بوغا چڑ کر بولا:

"میں نے جو کچھ حاصل کیا ہے اپنی بہادری کے زور پہ حاصل کیا ہے۔ مغل لاکھ برے سہی لیکن وہ بہادری اور وفاداری کا صلہ ضرور دیتے ہیں۔"

"یہ تمہارا خیال ہے بوغا۔"

شیر بہرام نے نرمی سے جواب دیا:

"اگر یہ صحیح بھی ہے تو اب مغلوں کا دور ختم ہو رہا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ان کے خاتمے کے ساتھ تمہارا وقار بھی ختم ہو جائے۔ تمہیں اپنے تاتاری بھائیوں کا ساتھ دینا چاہیے۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو شیر بہرام؟" منگلی بوغا الجھتے ہوئے بولا۔ "تم سردار تیمور کی سفارش لے کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو نہیں آئے ہو۔"

"سفارش نہیں، میں سردار تیمور کا پیغام لایا ہوں۔"

شہر بہرام نے اور زیادہ نرمی کا اظہار کیا:

"سردار تیمور نے تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مغلوں کو ملکِ تاتار سے نکالنے میں تم ان کا ساتھ دو۔ وہ تمہیں تمہارے مرتبہ کے مطابق جاگیر دیں گے۔ جو علاقہ تم پسند کرو گے اس کا حاکم بنا دیں گے۔"

"نہیں شیر بہرام، ایسا نہیں ہو سکتا۔"

منگلی بوغا نے صاف انکار کر دیا:

"میں ایاس خواجہ کا وفادار ہوں۔ یہ بات مردانگی کے خلاف ہے کہ میں قلعہ الاجو، تیمور کے حوالے کر دوں۔"

شیر بہرام کو اس کے دوٹوک جواب پر غصہ آ گیا بولا:

"اچھے دوست بڑی مشکل سے ملتے ہیں منگلی! تیمور کی دوستی سے فائدہ اٹھاؤ۔ مخالفت تمہیں مہنگی بھی پڑ سکتی ہے۔"

"ہرگز نہیں شیر بہرام۔ میں قلعہ، تیمور کے حوالے نہیں کر سکتا۔"

منگلی بوغا نے پردوں پر پانی نہ پڑنے دیا۔

"قلعہ تو خیر تمہیں دینا ہو گا۔ تم تیمور کی طاقت سے واقف نہیں۔" شیر بہرام نے اسے ایک بار پھر مرعوب کرنے کی کوشش کی۔

"دیکھا جائے گا۔ میں نے بھی تیاری کر لی ہے۔" منگلی بوغا ویسے ہی اکڑا رہا۔

"جنگ سے باز آ جاؤ بوغا۔"

شیر بہرام نے اٹھتے ہوئے کہا:

"میں جا رہا ہوں۔ تم میرے دوست ہو اس لیے صلح کے دروازے اس وقت تک کھلے رہیں گے جب تک تیمور کا لشکر الاجو کے دروازے تک نہیں پہنچ جاتا۔"

"شیر بہرام۔ تم چاہو تو دوست بن کر قلعہ میں رہ سکتے ہو۔" منگلی بوغا نے بات کا رخ ہی موڑ دیا۔

"تمہارا جواب مل گیا مجھے۔"

شیر بہرام نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا:

"اگلی ملاقات میدانِ جنگ میں ہو گی۔"

منگلی بوغا نے اسے نہیں روکا۔

شیر بہرام اس تلخ و ترش گفت گو کے بعد واپس چل پڑا۔ اس کی سفارت ناکام ہو گئی تھی۔ اب سوائے جنگ کے دوسرا چارہ نہ رہ گیا تھا۔

اس نے واپس جا کر تیمور کو منگلی بوغا کے جواب سے آگاہ کر دیا۔ تیمور نے اسی وقت قلعہ الاجو کی طرف کوچ کا حکم دے دیا۔ اور پہنچتے ہی قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ پھر اس مضبوط اور بظاہر ناقابلِ تسخیر قلعہ کو سر کرنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔

قلعہ واقعی ناقابلِ تسخیر دکھائی دیتا تھا لیکن تیمور نے تو پہاڑوں سے ٹکرانے کا عزم باندھا تھا۔ یہ تو قلعہ تھا۔ محض ایک قلعہ!

○

امیر حسین اپنی بیوی دلشاد آغا اور امیر موسیٰ کے پاس پہنچا تو اس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ اس کے کپڑے تار تار ہو رہے تھے۔ چہرے سے برسوں کا بیمار معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ صرف پانچ سوار تھے۔ ان کا حال بھی بدتر تھا۔

برخلاف اس کے امیر موسیٰ نے کافی طاقت حاصل کر لی تھی۔ اس کے زیرِ کمان تین سو سے زیادہ سوار آ چکے تھے۔ مال و دولت بھی اس نے کافی اکٹھی کر لی تھی۔ اس نے اپنے طور پر دلشاد آغا سے مصالحت کر لی تھی۔

امیر موسیٰ کو معلوم ہو گیا تھا کہ دلشاد نے طغرا اور غلغورا کو اغوا کر کے فرار کرا دیا ہے۔ اسے ان کی زیادہ پروا تھی۔ وہ دلشاد سے شرمندہ تھا اور اس سے معذرت کرنا چاہتا تھا اس لیے طغرا اور غلغورا کے بارے میں اس سے سوال نہ کیا۔ اس نے دلشاد کی تمام شاہانہ مراعات بھی بحال کر دی تھیں۔ وہ روز صبح، دلشاد کے سلام اور اس سے دریافت کرنے حاضر ہوتا۔ یہ اور بات تھی کہ وہ تمام رات شراب و رباب کی محفلیں سجایا کرتا اور اودھم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مچلتا رہتا تھا۔

امیر موسیٰ کے معمولات میں یوں بھی فرق پڑ گیا تھا کہ اس کے اہلِ خانہ بھی اس کے پاس پہنچ گئے تھے اس کے بڑے بیٹے کی آمد سے موسیٰ کے رویّے میں کافی فرق پڑ گیا اور اس نے میانہ روی اختیار کر لی۔ پھر ایک دن امیر حسین اچانک ہی اس کے پاس پہنچ گیا۔ خلافِ امید امیر موسیٰ نے اس کا شاندار استقبال کیا اور اپنے تمام سواروں کے ساتھ اس کی پیشوائی کی۔

امیر حسین اپنے معتمد کے اس حسنِ سلوک سے بہت متاثر ہوا۔ پریشانی اور صحرانوردی کے ان دنوں میں تو اس کا سایہ بھی ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ دلشاد بھی امیر موسیٰ کے خلاف ہونے کے باوجود اس وقت اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہو گئی۔

امیر موسیٰ نے امیر حسین کی آمد پر شاہانہ ضیافت کا اہتمام کیا۔ امیر حسین نے کھانے کے دوران اس سے کہا:

"موسیٰ! تمہارے سلسلے میں میرا انتخاب درست تھا۔ تم نے وفاداری کی مثال قائم کی ہے۔ حالات درست ہوتے ہی میں تمہیں اعلیٰ مراتب سے نوازوں گا۔"

موسیٰ کن انکھیوں سے دلشاد کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید دلشاد اس کی مخالفت اور شکایت کرے گی۔ . . . . لیکن وہ ایک سمجھدار عورت تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس وقت موسیٰ کی شکایت کا امیر حسین پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ پھر امیر موسیٰ کے ہاتھ میں طاقت تھی۔ اس کی مخالفت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔

دلشاد کو خاموش دیکھ کر موسیٰ نے کہا:

"میں امیر اور ملکۂ کابل کا ہمیشہ غلام رہا ہوں اور عمر بھر اس غلامی پر فخر کرتا رہوں گا۔ میں انسان ہوں۔ مجھ سے غلطیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ خوشی کے اس موقعے پر میں چاہتا ہوں کہ امیر یا ملکہ کے حضور میں مجھ سے جو غلطیاں اور کوتاہیاں ہوئی ہیں انہیں معاف کر دیا جائے۔"

"کیا کہہ رہے ہو موسیٰ؟" امیر حسین جلدی سے بولا۔

"تمہاری وفاداری پر کون شبہ کر سکتا ہے۔ ہم تو تمہارے شکر گزار ہیں۔ تم نے ہماری عدم موجودگی میں ملکہ دلشاد کی خدمت میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔"

پھر اس نے دلشاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"کیوں دلشاد، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔"

مصلحت نے دلشاد کے منہ پر تالے لگا دیے تھے۔ خون کے گھونٹ پیتی ہوئی بولی:

"امیر۔ تمہاری عدم موجودگی نے جو کردار ادا کیا۔ وہ . . . . ."

دلشاد نے ایک لمحہ رک کر موسیٰ کی طرف دیکھا۔ موسیٰ کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور خوف سے شاید اسے پسینہ آ رہا تھا۔ دلشاد مسکرائی۔ بولی:

"امیر موسیٰ کا رویہ میرے ساتھ واقعی قابلِ تعریف رہا۔"

"دیکھا موسیٰ تم نے . . . ." امیر حسین خوش ہو کے بولا:

"ہم ہی نہیں، دلشاد بھی تمہاری تعریف کر رہی ہے۔"

دلشاد تو دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ موسیٰ کی اسی وقت گردن اڑا دیتی مگر وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ شکایت کے بجائے اسے موسیٰ کی تعریف کرنا پڑی۔

کچھ دن آرام کرنے کے بعد امیر حسین ایک بار پھر نئے جوش اور ولولے کے ساتھ لشکر لے کر چلا۔ اسے تیمور کی فتوحات کی مسلسل خبریں مل رہی تھیں۔ وہ ان میں اپنا حصہ بٹانا چاہتا تھا۔

اسے معلوم ہوا کہ تیمور قلعہ الاجو کا محاصرہ کیے ہوئے ہے۔ اس نے ادھر ہی کا رخ کیا۔ اس کے ساتھ چار سو سوار تھے لیکن وہ تیمور کے ساتھ جنگ میں شریک ہو کر مالِ غنیمت کا حصہ دار بننا چاہتا تھا۔

○

تیمور نے قلعہ الاجو کے محاصرے کو زیادہ طول نہ دیا۔ منگلی بوغا نے قلعہ بچانے کی بہت کوشش کی لیکن تیمور نے اسے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ تیمور کو قلعہ سے کئی ایسے سوار مل گئے جو کبھی اس کے ملازم رہ چکے تھے۔ تیمور وہاں سے تقریباً سو سوار لے کر صوف پہنچا۔ اس جگہ اسے دو اور حلیف مل گئے۔ اطلس خان اور تمو کہ بہادر اپنے چار سو سواروں کے ساتھ اس سے آن ملے۔

غرض یہ کہ تیمور آگے بڑھتا رہا اور نئے نئے دوست و حلیف اسے ملتے گئے۔ تاتاری سردار اور سوار اس کے حلم و ستم سے عاجز آ کر پہاڑوں میں روپوش ہو گئے۔ بعض سرداروں نے مغلوں کی غلامی کا جوا عارضی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طور پر آزمانا چھینکا۔

تیمور کو اپنے دیرانے سواروں پر زیادہ اعتماد تھا۔ ایک ضعیف العمر جاکو برلاس، جس کی نظروں میں تیمور کا درجہ ایک رہبر اور ولی سے کم نہ تھا۔ دوسرا ایلچی بہادر۔ کا مدار جوتے اور رنگین کپڑے پہننے والا۔ وہ شروع سے اب تک تیمور کا ساتھ دے رہا تھا اور اہم موقعوں پر بہادری اور وفاداری کا ثبوت دے چکا تھا۔ اب تیمور کو دو اور بااعتماد سوار مل گئے تھے۔ ایک شیر بہرام، اس کا پرانا یار جس نے جان پر کھیل کر قلعہ الاجو کے حاکم منگلی بوغا کے سامنے نہ صرف تیمور کی تعریف کی تھی بلکہ اسے ڈرایا اور دھمکایا بھی تھا۔ دوسرا سوار ترک جوان طغرل تھا جس نے قلعہ الاجو کے محاصرہ اور فتح کے دوران تیمور کے دل پر اپنی بہادری کا سکہ بٹھا دیا تھا۔

تیمور اکثر شیر بہرام سے طغرل کی تعریف کرتا۔ وہ طغرل کو کوئی اہم ذمے داری سونپنے یا اعزاز دینے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

اس عرصہ میں امیر سلیمان برلاس اور امیر ہندو کاکہ برلاس بھی ایک ہزار کا لشکر لے کر تیمور کے پاس پہنچ گئے تھے۔

تیمور کو اب اتنی طاقت حاصل ہو گئی تھی کہ وہ مغل لشکر سے براہِ راست مقابلہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ جب ایلچی خواجہ نے ایک بڑا لشکر تیمور کے مقابلے پر روانہ کیا تو تیمور نے اس سے ٹکر لینے کا فیصلہ کیا۔

مغل لشکر کا سپہ سالار یک جک کاجاغی الچون بہادر تھا۔ اس نے بڑی شان سے تیمور کے سامنے اپنا لشکر جمایا مگر حملہ کرنے کی اس کو ہمت نہ ہوئی۔

ایک ماہ تک آمنے سامنے ہونے کے باوجود کسی نے حملے کی کوشش نہ کی۔ الچون بہادر نے پسپائی میں اپنی خیریت سمجھی اور خیمے ڈیرے اٹھا کر واپس چلا گیا۔ تیمور کی یہ پہلی فتح تھی۔ مغل لشکر اس کے مقابلے سے جی چرا کر بھاگ گیا تھا۔

تیمور نے فوراً دریائے جیحون عبور کر کے بدخشاں کا رخ کیا۔ وہ موضع خلم میں خیمہ زن تھا کہ امیر حسین اپنے لشکر کے ساتھ تیمور کو ڈھونڈتا ہوا پہنچ گیا۔

تیمور کی شان اور لشکر کو دیکھ کر امیر حسین کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ دلشاد نے تیمور کے ساتھ اتنا بڑا لشکر دیکھا تو بہت خوش ہوئی۔ اسے امید بندھی کہ کابل کی چھنی ہوئی سلطنت اسے واپس مل جائے گی۔

تیمور نے بھی دلشاد کو اچٹتی ہوئی نظر سے دیکھا۔ اسے تعجب ہوا کہ دلشاد کی رعنائی اور شادابی میں اب بھی

کوئی فرق نہ پڑا تھا۔ وہ حسبِ عادت بلبل کی طرح چہک چہک کر باتیں کر رہی تھی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ ایلچی خاتون کے ساتھ نہیں آئی ہے تو وہ کچھ افسردہ ہو گئی۔

ترک جوان طغرل، تیمور کے لشکر میں موجود تھا اور دلشاد کا سامنا کسی نہ کسی موقعے پر ہونا لازمی تھا۔ ایک دن تیمور کے خیمے کی طرف جا رہی تھی کہ اسے طغرل نظر آیا۔ طغرل کو معلوم تھا کہ دلشاد یہاں آئی ہوئی ہے۔ اس نے دلشاد کو ایک دو بار دور سے دیکھا بھی تھا لیکن وہ خود دلشاد سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ شیر بہرام نے بھی اسے منع کر دیا تھا کہ وہ دلشاد سے خود ملنے کی کوشش نہ کرے اور اگر ملاقات ہو جائے تو امیر موسیٰ کے بارے میں اس سے خاموش رہنے کی درخواست کرے۔

"طغرل۔۔۔۔" دلشاد نے اسے دیکھتے ہی آواز دی۔

طغرل نے کترا کر نکل جانا چاہا لیکن دلشاد کی دوسری آواز پر اسے رکنا پڑا۔ وہ پلٹ کر اس کے پاس آیا۔

"ملکہ کابل کو ایک بدنصیب سلام پیش کرتا ہے"۔ طغرل نے دکھے دل سے کہا۔

دلشاد کو محسوس ہوا جیسے طغرل اپنے احسان کا طعنہ دے رہا ہے۔ وہ شرمندہ ہو گئی۔ بولی:

"طغرل۔۔۔۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اب تک تمہارے لیے کچھ نہ کر سکی۔ تمہارے احسان کو میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ میں موقع کے انتظار میں ہوں۔ موسیٰ نے جس احسان فراموشی کا مظاہرہ کیا ہے اسے ایک دن سب کے سامنے بے نقاب ہونا ہے۔ اسے سزا ضرور ملے گی"۔

"آپ نے شاہِ کابل سے اب تک اس کا ذکر تو نہیں کیا۔۔۔۔" طغرل نے سر جھکا کر ادب سے پوچھا۔

"نہیں طغرل۔۔۔۔" دلشاد نے ٹھنڈی سانس لی۔

"شاہِ کابل بڑی بری حالت میں ہمارے پاس پہنچے تھے۔ امیر موسیٰ نے ان کی بہت خاطر مدارات کی۔ ہمارے ساتھ لشکر آیا ہے یہ سب امیر موسیٰ کا ہے۔ ان حالات میں، میں انہیں موسیٰ کا اصلی چہرہ نہیں دکھا سکی لیکن اب مجھ سے مطمئن نہیں ہوتا۔ تمہیں دیکھ کر میری گردن شرم سے جھکی جاتی ہے"۔

"ملکہ کابل۔ آپ میری فکر نہ کریں"۔ طغرل نے کہا:

"میں بہت آرام سے ہوں۔ سردار تیمور بھی مجھ پر بہت مہربان ہیں۔ قلعہ الاجو کے محاصرے کے دوران میں نے ان کی بہت خدمت کی ہے۔ اس کے باوجود میں خاموش ہوں۔ میری درخواست ہے کہ آپ بھی فی الحال خاموشی اختیار کریں۔ سردار تیمور بھی امیر موسیٰ کے بہت مداح ہیں۔ انہیں مزید فتوحات کے لیے موسیٰ جیسے بہادر سرداروں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی ضرورت ہے۔ میں اس وقت کوئی جھگڑا نہیں چاہتا۔"

"تم آرام سے ہو۔ یہ سن کر مجھے بڑی مسرت ہوئی۔" دلشاد بولی۔

"غلغورا کیا تمہارے ساتھ ہے۔ وہ کیسی ہے۔ میں اس سے فوراً ملنا چاہتی ہوں۔" دلشاد نے کئی سوالات ایک ساتھ کر ڈالے۔

غلغورا کے ذکر پر طغرا اور زیادہ اداس ہو گیا۔ افسردگی سے بولا:

"میں اس سے نہیں مل سکا ملکہ! کابل! مجھے نہیں معلوم وہ غریب اس وقت کہاں اور کس حال میں ہے!"

"کیا غلغورا، سردار تیمور کے پاس نہیں پہنچ سکی؟" دلشاد نے بے تابی سے پوچھا۔

"اس کا بھی مجھے علم نہیں ملکہ! کابل ....." طغرا نے مضمحل لہجے میں کہا:

"میں گرم سیر پہنچ ہی نہیں سکا۔ سردار تیمور میرے وہاں پہنچنے سے قبل ہی چل چکے تھے۔ وہ بہت شمال میں پہنچ چکے تھے جب میں ان سے مل سکا۔"

دلشاد کچھ سوچنے لگی۔ پھر بولی:

"ملا چھٹانہ کر و طغرا جس طرح تم امیر تیمور کے پاس پہنچ گئے۔ اسی طرح مجھے امید ہے کہ غلغورا بھی گرم سیر پہنچ گئی ہو گی۔ وہاں تیمور کے اہل خانہ موجود ہیں۔ تیمور کی بیوی الجائی خاتون ایک نہایت نیک سیرت عورت ہے۔ اس نے بڑا دردمند دل پایا ہے۔ خدا کرے غلغورا اس کے پاس پہنچ گئی ہو!"

طغرا نے کوئی جواب نہ دیا۔ غلغورا کے تصور نے اسے بے چین کر دیا تھا۔ دلشاد کی نظریں اس پر تھیں۔ وہ سمجھ گئی کہ طغرا، غلغورا کے لیے پریشان ہے مگر وہ اس معاملے میں مجبور تھی۔

"اچھا طغرا....." دلشاد نے اسے چونکا دیا۔

"میں غلغورا کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی پوری کوشش کروں گی۔ جس وقت بھی اس کی کوئی خبر ملی میں تمہیں ضرور مطلع کروں گی۔"

دلشاد چلنے لگی پھر رکی اور پلٹ کر بولی:

"فی الحال تم موسیٰ کا سامنا کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ اگر اتفاقیہ ملاقات ہو جائے تو وہ کچھ کہے تو تم جواب نہ دینا۔ خاموشی ہزار بلائیں ٹال دیتی ہے۔"

اسی طرح ایک دن امیر موسیٰ اور طغرا کا سامنا ہو گیا۔

طغرا فوراً کترا کے اس طرح نکل گیا جیسے اس نے امیر موسیٰ کو دیکھا ہی نہ ہو۔ موسیٰ اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ کافی دور جا کر جب طغرا نے پلٹ کر دیکھا تو امیر موسیٰ اسے اسی جگہ کھڑا دکھائی دیا۔ شاید وہ طغرا کو یہاں دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا تھا لیکن موسیٰ نہ اس کے پیچھے آیا اور نہ اس نے طغرا کو بلانے کی کوشش کی۔

اس کے بعد کئی بار طغرا اور موسیٰ کا سامنا ہوا لیکن دونوں ایک دوسرے سے نظریں چراتے رہے۔ رفتہ رفتہ وہ ایک دوسرے سے لاپروا ہو گئے۔

جتہ سردار الچون بہادر کے اس طرح پسپا ہو جانے سے تیمور اور اس کے لشکر کے حوصلے بڑھ گئے تھے وہ بدخشاں کی طرف بڑھا۔

اس علاقے میں کئی بادشاہ تھے اور وہ مغلوں کے باجگزار تھے۔ تیمور کی آمد کی خبر سن کر انہوں نے مقابلے کی تیاریاں شروع کیں لیکن تیمور فاصلے قطع کرتا ہوا ان کے سر پر پہنچ گیا۔

بدخشاں کے بادشاہ گھبرا گئے اور انہوں نے حاضر ہو کر تیمور کی اطاعت قبول کر لی۔ بدخشاں کی فوج کے بہت سے سوار تیمور کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ کئی نئے سردار بھی اس کے پاس آ گئے۔ اس طرح اس کے لشکر کی تعداد آٹھ ہزار کے قریب ہو گئی۔

○

تیمور ابھی صحرائے کولاب میں جلگائے کے مقام پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا کہ اسے جاسوسوں نے خبر دی کہ جتہ سردار یک جک (بعض تذکروں کے مطابق بیک جک) کا بیٹا کوچ قوران تیس ہزار کے لشکر کے ساتھ شہر سبز سے نکل کر آبادیوں کو تہس نہس کرتا دریائے وخش کے کنارے پل سنگین تک پہنچ چکا ہے۔

تیمور نے مغلوں کا پیچھا کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کے سرداروں نے اس کی مخالفت کی کہ آٹھ ہزار اور تیس ہزار کا کیا مقابلہ۔ تیمور نے بڑی مشکل سے انہیں اپنا ہم خیال بنایا لیکن اسی وقت اس پر ایک اور افتاد پڑی۔

تیمور کے دو سردار، تغلق سلدز اور کیخسرو چھ ہزار مغلوں کا لشکر لے کر اس کی طرف آ رہے تھے۔ یہ دونوں کبھی تیمور کے ملازم رہ چکے تھے لیکن اب وہ مغلوں کے نوکر ہو کر، بڑے لشکر کے مالک ہو گئے تھے۔ تیمور نے پہلے انہی سے نمٹنے کا فیصلہ کیا۔

تیمور نے امیر حسین اور امیر موسیٰ کو تو پیچھے چھوڑا اور خود آگے بڑھ کر کیخسرو اور سلدز کے ہراول پر حملہ کر دیا۔ مغلوں کا ہراول شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ کیخسرو اور سلدز بھی میدان چھوڑ گئے اور یک جک کے پاس پل سنگین پر پہنچ گئے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تیمور کی قسمت کا پانسہ پلٹ گیا تھا۔ کامیابی اور فتح برابر اس کے قدم چوم رہی تھی۔ اس کے لشکر کی تعداد مغلوں کے مقابلے میں ایک چوتھائی تھی لیکن لشکر کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے اور مغلوں میں مراجعت کی پھیلی ہوئی تھی تیمور اپنے اس مختصر لشکر کے ساتھ پل سنگین پر پہنچا اور دریا کے دوسری طرف پڑاؤ ڈال دیا۔

اس کے سامنے سب سے زیادہ بڑا اور مضبوط لشکر تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ لڑائی فیصلہ کن ہوگی۔ اگر قسمت نے یاوری کی تو وہ مغلوں کو بھگا دے گا ورنہ تاتاریوں کے غلامی کے دنوں میں اور اضافہ ہو جائے گا۔

تیمور نے دو روز تک اپنے لشکر کے خیمے لگوا دیے تاکہ لشکر کی صحیح تعداد کا اندازہ نہ کر سکیں جو دریا پار کرنا زیادہ آسانیاں میسر تھیں۔ وہ دریا کے اس طرف آکر لڑنا نہیں چاہتے تھے۔ تیمور بھی پل سنگین عبور کر کے حملہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ بیک جک کی پشت پر پہاڑ تھے جبکہ تیمور کی پشت پر دریا تھا۔ شکست کی صورت میں بیک جک پسپا ہو کر پہاڑوں میں روپوش ہو سکتا تھا لیکن تیمور کی پشت پر کوئی پناہ گاہ نہ تھی۔ پھر وہ ایسا خطرہ کیوں مول لیتا۔

تیمور زیادہ عرصہ تک لڑائی سے گریز نہ کر سکتا تھا۔ اس کے لشکر میں روز بروز اضافہ تو ہو رہا تھا لیکن اناج کی رفتار بہت سست تھی۔ تاتاری اب تک مغلوں سے خوفزدہ تھے اور ڈر ڈر کے تیمور کے پاس آ رہے تھے مغلوں کو برابر کمک پہنچ رہی تھی۔ الیاس خواجہ نے بیک جک کو حکم بھیجا تھا کہ تیمور کو پیس کر رکھ دیا جائے۔ اس کا سر کاٹ کر پورے ملک تاتار میں پھرایا جائے تاکہ یہ فتنہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔

مغلوں نے تیمور کے سر کاٹنے والے کے لیے ایک بار پھر بھاری انعام کا اعلان کیا تھا لیکن تیمور ایسا نہ تھا جس کسی کا ہاتھ آسانی سے پہنچتا۔ وہ اپنے مردانوں سے مشورہ کرتا لیکن جنگی حکمت عملی خود ترتیب دیتا۔ دریائے وخش پر پل سنگین دونوں لشکروں کے درمیان حائل تھا اور اس جنگ میں مغلوں اور تاتاریوں کی قسمت کا فیصلہ ہمیشہ کے لیے ہو جانا تھا۔

پھر تیمور نے وہ جنگی چال چلی جس نے مغلوں کو حیران کر کے رکھ دیا۔

تیمور کے لشکر کے خیمے پل کے اس طرف دو روز تک پھیلے ہوئے تھے۔ تیمور نے اپنے تین مردانوں کو پل سنگین کی کمان سپرد کی یہ سردار امیر موسیٰ "اوچ قرا" اور امیر موسیٰ تھے تیمور نے امیر حسین کے لشکر سے صرف اس کے سپہ سالار امیر موسیٰ کو منتخب کیا تھا تاکہ اسے جنگ سے الگ رکھنے کا شکوہ نہ ہو سکے۔ اس جنگ میں تمام لشکر تیمور کا تھا۔ امیر حسین کے لشکری کھانے میں نمک کے برابر بھی نہ تھے۔ انہیں بھی تیمور نے ایک جگہ متعین کر کے جنگ سے الگ کر دیا تھا۔

ممکن ہے کہ تیمور اس سے امیر حسین کو یہ تاثر دینا چاہتا ہو کہ اب تک جتنی فتوحات ہوئی ہیں وہ اس کے کرنے حاصل کی ہیں اور آئندہ بھی بڑا معرکہ اسی کا لشکر سر کرے گا۔

تیمور نے ان سرداروں کی کمان میں صرف پانچ سو تاتاری سوار چھوڑے اور انہیں حکم دیا کہ خیموں کے گرد اسی طرح مستعد رہیں جیسے پورا لشکر یہاں موجود ہے۔

اس نے لشکر کے تمام خیموں کو اسی طرح رہنے دیا اور اپنے باقی تمام لشکر کے ساتھ رات کے وقت پل سنگین سے پار دور چڑھائی کی سمت بڑھ کر دریا کو بڑی خاموشی سے عبور کیا لیکن بجائے مغلوں کے سامنے مورچہ لگانے کے چکر کاٹ کے ان پہاڑیوں پر پہنچ گیا جو مغلوں کی پشت پر واقع تھیں۔

صبح بیک جک کو تیمور کے دریا عبور کرنے کی خبر ملی تو وہ فوراً اس جگہ آیا جہاں سے دریا عبور کیا گیا تھا صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ تاتاریوں کا ایک بڑا لشکر دریا پار کر آیا ہے۔

بیک جک نے واپس آ کر پل سنگین کو دیکھا تو اسے پل کے پار دور تک خیمے استادہ نظر آئے اور چاق و چوبند سوار ادھر ادھر پھرتے دکھائی دیے۔

بیک جک اس صورتحال سے سخت پریشان ہوا۔ وہ ابھی سواروں سے مشورہ کر ہی رہا تھا کہ پشت کی تمام پہاڑیوں سے دھواں اٹھتا دکھائی دیا۔ تیمور نے پہاڑیوں پر آگ روشن کرا دی تھی تاکہ مغلوں کو معلوم ہو جائے کہ تاتاری لشکر پہاڑیوں پر قابض ہو چکا ہے۔

بیک جک بڑا تجربہ کار سالار تھا۔ سینکڑوں لڑائیوں میں اس کی شجاعت دیکھ چکا تھا۔ لیکن تاتار پر خلوں کے قبضہ میں اس کی دور اندیشی اور بہادری کا سب سے زیادہ حصہ تھا مگر اب اس کا مقابلہ تیمور جیسے جنگجو شاطر سے تھا جس نے اپنی حکمت عملی سے اسے حیران و ششدر کر دیا تھا۔ سامنے تاتاری لشکر۔ پشت پر تاتاری لشکر۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کرے؟

اس نے فوراً دو طرفہ مورچے لگا لیے۔ اس کا خیال تھا کہ تیمور دونوں طرف سے حملہ کرے گا۔ نصف لشکر اس نے پل سنگین کی طرف لگایا کہ ادھر سے حملہ ہو تو اسے روکا جائے۔ اور باقی نصف لشکر کا منہ اس نے پشت کی پہاڑیوں کی طرف کر دیا۔ اس طرح اس نے دو افتی جنگ کا نقشہ جمایا۔

پورا دن اسی طرح گزر گیا۔

تاتاریوں نے نہ حملہ کیا اور نہ کوئی ایسی حرکت کی جس سے حملے کا شبہ ہو۔ رات کو تیمور نے پہاڑیوں پر اور زیادہ آگ روشن کرا دی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیک جک رات بھر گھوڑے پر سوار لشکر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھومتا رہا۔ اس کا بھی متوقع حملے سے رات بھر خوفزدہ رہا۔

تیمور کا اپنا بیان ہے کہ:

"میں نے وہ رات پہاڑی پر گزاری اور تمام شب خدائے قدوس کے سامنے سربسجود ہو کر دعا مانگتا رہا اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود و سلام بھیجتا رہا۔ رات کے کسی حصے میں مجھ پر جیسے نیند کا غلبہ ہوا۔ میں نہ تو پوری طرح سو رہا تھا اور نہ جاگ رہا تھا کہ میرے کانوں میں ایک غیبی آواز آئی۔۔۔۔ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کوئی کہہ رہا ہے۔۔۔۔

"اے تیمور۔ خداوند کریم نے فتح سندی تیرے ہی حصے میں لکھ دی ہے"۔

پل سنگین کی جنگ تاریخ تاتار میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس جنگ میں تیمور نے جس جنگی حکمت عملی مہارت کا مظاہرہ کیا۔ اس سے تیمور کا کردار بحیثیت ایک سپہ سالار کے کھل کر سامنے آتا ہے۔

تیمور کا حوصلہ غیبی آواز سے بہت بڑھ گیا تھا۔ صبح کو نماز باجماعت سے فارغ ہو کر اس نے مغل لشکر پر نگاہ ڈالی تو اس کے دل میں مسرت اور حیرت کے ملے جلے جذبات اور خیالات پیدا ہوئے۔ بیک جک اپنے لشکر کو صف در صف دستوں میں تقسیم کر کے کوچ کر رہا تھا۔

بظاہر یہ پسپائی تیمور کے لیے حملہ کا ایک بہترین موقع تھی۔ اس کے سرداروں نے بھی اسے مشورہ دیا کہ مغلوں پر فوراً حملہ کر کے انہیں منتشر کر دیا جائے لیکن اس نے سرداروں کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔

"سردار تیمور۔۔۔۔" شیر بہرام نے بے چین ہو کے کہا:

"مغلوں کو موقع نہ دیجیے۔ بچ کر نہ جانے پائیں"۔

"شیر بہرام۔ مغل لشکر کا سپہ سالار بیک جک ہے"۔ تیمور نے بڑے اطمینان سے کہا:

"جو بات تم سوچ رہے ہو وہ اس کے ذہن میں بھی ہوگی"۔

"مگر سردار۔ پسپا ہوتی ہوئی فوج اپنی مدافعت پوری طرح نہیں کر سکتی"۔ شیر بہرام نے اپنی بات پر زور دیا۔

"مجھے علم ہے شیر بہرام۔ مغل پسپائی کے وقت بہت کمزور ہوتے ہیں"۔ تیمور نے شیر بہرام کے دل کی بات کہہ دی۔

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں سردار"۔ شیر بہرام نے فوراً بات اچک لی۔

"پھر انتظار کس بات کا ہے"۔

"انتظار۔۔۔۔" تیمور گہری سانس لے کر بولا۔

"ہاں مجھے انتظار ہے۔ مجھے یہ دیکھنا ہے کہ یہ واقعی کوچ اور پسپائی ہے یا بیک جک کی جنگی چال کہیں وہ ہمیں پہاڑیاں چھوڑ کر میدان میں تو نہیں لانا چاہتا"۔

شیر بہرام حیران ہو کر تیمور کا منہ دیکھنے لگا۔ اس پہلو پر تو اس نے سوچا ہی نہ تھا۔

طغرا شیر بہرام کے پاس ہی موجود تھا۔ تیمور نے اس سے کہا:

"طغرا! تم چار سواروں کو لے کر مغلوں کے تعاقب میں جاؤ۔ کم از کم چار فرلانگ تک ان کا پیچھا کرو واپس آ کر ہمیں اطلاع دو"۔

طغرا حکم پا کر مغلوں کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ تیمور کو بیک جک کے فریب اور چالبازی کا اتنا یقین تھا کہ طغرا کے جانے کے بعد اس نے اپنے لشکر کو پہاڑیوں سے اتر کر دامن کوہ میں مورچہ بند ہونے کا حکم دیا۔ اس کے لشکر نے فوراً دامن کوہ میں اس طرح مورچے لگا لیے جیسے ان کے سامنے کوئی بڑا لشکر موجود ہو جبکہ سامنے کوئی نہ تھا۔

مغل دور جا چکے تھے۔ دوپہر ڈھلنے کے بعد طغرا اپنے سواروں کے ساتھ بہت تیز گھوڑا بھگاتا واپس آیا۔

"سردار۔ مغل واپس آ رہے ہیں"۔ طغرا سانس سنبھالتے ہوئے کہا۔

"کیوں شیر بہرام"۔ تیمور نے شیر بہرام کو مخاطب کیا:

"بیک جک تو مری سے زیادہ چالاک ہے"۔

"آپ عظیم ہیں سردار"۔ شیر بہرام نے شرمندگی سے کہا:

"تاتاریوں نے آپ پر صحیح اعتماد کیا ہے۔ مغلوں کو آپ ہی سمجھتے ہیں اور انہیں آپ ہی زیر کر سکتے ہیں"۔

طغرا کے واپس آنے کے تھوڑی دیر بعد مغل دستے آنا شروع ہو گئے۔ تیمور نے اپنے لشکر کو مورچوں میں تیار رہنے کا حکم دیا اور تیر اندازوں سے کہا کہ مغلوں کے دامن کوہ میں داخل ہوتے ہی ان پر تیروں کی بارش شروع کر دیں۔

بیک جک نے پورا لشکر جمع کر کے زبردست حملہ کیا۔ تیمور کے تیر اندازوں نے ان پر اس قدر تیر برسائے کہ ان کی پیش قدمی رک گئی۔ اندھیرا ہونے تک مغل آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہے لیکن تیر اندازوں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ان کا راستہ روکے رکھا۔

رات میں بیک جک نے اپنا لشکر پہاڑوں کے گرد دور تک پھیلا دیا۔ اس نے اپنے خیال میں تاتاریوں کو گھیرے میں لے لیا لیکن تیمور اس سے زیادہ چالاک تھا۔ اس نے اپنا لشکر چار حصوں میں تقسیم کیا۔ رات کے آخری حصے میں جب مغل لشکر کے بیشتر سوار سو گئے تھے، چاروں طرف سے مغلوں پر شب خون مارا۔ بیک جک کو اس کی توقع نہ تھی۔ وہ فوراً سوار ہو کے مقابلے کو نکلا مگر اس وقت تک تاتاری اس کے لشکر میں تباہی پھیلا چکے تھے اور اس کی حالت ابتر تھی۔ بیک جک نے انہیں غیرت دلا کر روکا اور جم کر لڑنے لگا۔

تیمور مغلوں کو مہلت نہ دینا چاہتا تھا۔ اس نے نظریں دوڑا کر بیک جک کو دیکھا اور گھوڑا بڑھا کر اس کی طرف چلا۔

تیمور کے دائیں بائیں شیر بہرام، طغرل، الجائی بہادر، جاکو برلاس اور ان بہادروں کے تمام سردار حلقہ باندھے لڑ رہے تھے۔ تیمور کو بڑھتے دیکھ کر انہوں نے بھی اپنے گھوڑے ادھر ہی موڑ لیے۔

بیک جک نے تیمور کو آتے دیکھا تو اپنے سرداروں کو اسے روکنے کا حکم دیا۔ بیک جک کو خطرے میں دیکھ کر اس کا بھائی الچون بہادر، بیٹا کوچ تمور، قتلق خواجہ، نوئیان، سارق اور شکم او غرہ بیک اور تیمور کے درمیان آہنی دیوار بن کر کھڑے ہو گئے۔ یہ دیوار قائم نہ رہ سکی۔ تیمور کے ساتھیوں نے آگے بڑھ کر ان پر حملہ کر کے منتشر کر دیا۔

تیمور کو راستہ ملا تو وہ بیک جک کے سر پر پہنچ گیا۔ بیک جک نے پوری قوت سے حملہ کیا۔ تیمور نے اس کی تلوار الجھا کر جھٹکا دیا تو بیک جک کی تلوار دور جا گری۔ اور بجلی جیسی تیزی سے تیمور کی تلوار اس کے سینے پر پہنچ گئی۔

"خبردار جو ذرا بھی حرکت کی۔" تیمور نے ڈپٹ کر کہا۔

بیک جک نے اظہارِ شکست کے طور پر گردن جھکا لی۔ تیمور نے گھوڑے سے اتر کر بیک جک کا ایک ہاتھ پکڑا اور گھوڑے سے نیچے کھینچ لیا۔ پھر تیمور نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ طغرل ایک مغل کو رسی کے ساتھ اپنی کمر سے باندھے اسے گھسیٹتا ہوا لا رہا تھا۔

"طغرل.... یہ مغل سپہ سالار ہے۔" تیمور نے طغرل سے کہا۔

"اسے حفاظت سے رکھو مگر عزت کے ساتھ۔"

طغرل نے اسی رسی سے بیک جک کے ہاتھ بھی باندھ دیے، جس سے ایک مغل پہلے ہی بندھا تھا۔ بیک جک کو باندھنے کے بعد طغرل نے مسکرا کر کہا:

"سردار۔ عجیب اتفاق ہے۔ اس وقت مغل سپہ سالار اور اس کا بیٹا ایک ہی رسی سے بندھے ہیں۔"

"تو کیا....؟" تیمور نے زمین پر گھسٹتے ہوئے مغل کو تعجب سے دیکھا۔

"جی ہاں سردار....." طغرل مسرت و خوشی کے عالم میں بولا:

"میں نے اس کے بیٹے کوچ تمور کو پہلے ہی قابو کر لیا تھا۔"

کوچ تمور کے نام پر بیک جک گھبرا گیا۔ اور زمین پر پڑے مغل کو دیکھنے لگا۔ کوچ تمور کا چہرہ گرد و خون سے اٹا ہوا تھا۔ زمین پر گھسٹنے سے اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ بیک جک کی آنکھیں میں شاید آنسو آ گئے۔ بندھے ہوئے ہاتھوں سے بیٹے کا چہرہ صاف کرنے لگا۔

تیمور یہ منظر دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ بولا:

"طغرل۔ خیمے میں لے جا کر ان کے ہاتھ کھول دینا۔ کوچ تمور کے زخم دھلوا کر پٹیاں بدلوا دینا۔"

بیک جک نے نظریں اٹھا کر تیمور کو دیکھا۔

پہلی مرتبہ جب اس نے تیمور کو شمال کے خانِ اعظم کے حضور میں سر قدند کی بارگاہ میں دیکھا تو اس کی نظروں میں تیمور کے لیے نفرت اور حقارت تھی لیکن اب اس کی نظریں احسان سے بوجھل ہو رہی تھیں۔

مغلوں کو شکست فاش ہوئی۔

بیک جک اور اس کے بیٹے کے علاوہ مغلوں کے تین اور بڑے سردار تیمور کی قید میں آ گئے۔ اس فتح عظیم کی خبر جنگل کی آگ کی طرح ہر طرف پھیل گئی۔

امیر حسین کو تیمور نے جنگ سے دور رکھا تھا اور پل پار اسے ایک جگہ پابند کر دیا تھا۔ فتح کی خبر پا کر وہ سوار ہوا اور پل سنگین پر آیا۔ یہاں اس کا سپہ سالار امیر موسیٰ متعین تھا۔ امیر موسیٰ نے امیر حسین کو فتح کی مبارکباد دی اور کہا کہ اس فتح میں امیر حسین کا کوئی دخل نہ تھا۔

وہاں سے دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کے تیمور سے ملنے چلے۔ تیمور داغی کوہ میں مغلوں کی بچی کھچی فوج کے صفائے میں مصروف تھا۔

یہ دونوں باتیں کرتے اور مستقبل کے منصوبے بناتے جا رہے تھے کہ موسیٰ کو طغرل دکھائی دیا۔ طغرل اپنے دوست شیر بہرام کے ساتھ بیک جک اور اس کے بیٹے کو خیمے میں پہنچا کر واپس آ رہا تھا۔ طغرل کو دیکھتے ہی امیر موسیٰ کو غصہ آ گیا۔ اس نے اپنا گھوڑا اس کی طرف بڑھایا۔ امیر حسین کی سمجھ میں کچھ نہ آیا لیکن وہ اس کے ساتھ ہو لیا۔

طغرل اور شیر بہرام پیدل تھے۔ موسیٰ نے طغرل کے پاس گھوڑا روکا اور ڈپٹ کر کہا:

"طغرل۔ اگر اپنی خیریت چاہتے ہو تو یہاں سے فوراً دفع ہو جاؤ۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طغر گھبرا گیا۔ شیر بہرام تمام حالات سے واقف تھا۔ اس نے اسی سختی سے موسیٰ کو جواب دیا:

"موسیٰ! تم فاتح لشکر کے ایک سوار کو حکم دینے والے کون ہوتے ہو؟ تم نے تو اس جنگ میں ایک چوہا بھی نہیں مارا۔ اور میرے نوجوان دوست نے مغلوں کی صفیں الٹ کے رکھ دیں۔"

"تم دخل نہ دو شیر بہرام ....." موسیٰ، شیر بہرام سے الجھ پڑا:

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ میں اس لشکر میں اس کی موجودگی پسند نہیں کرتا۔"

"موسیٰ۔ تم بول رہے ہو۔ طغر تمہارے امیر، امیر حسین کا ذاتی ملازم نہیں ہے۔" شیر بہرام نے کڑک کر کہا:

"طغر کو سردار تیمور نے ملازم رکھا ہے صرف وہ ہی اسے نکال سکتے ہیں۔"

امیر حسین کو یہ اپنی توہین محسوس ہوئی۔ چیخ کر بولا:

"شیر بہرام۔ اپنی زبان کو لگام دو۔ میں امیر قزغن کا پوتا اور کابل کا بادشاہ ہوں۔ میں یہ گستاخی برداشت نہیں کر سکتا۔"

"امیر حسین ....." شیر بہرام نے کاپسندیدگی سے کہا:

"اب کابل تمہارے قبضے میں نہیں ہے۔ ممکن ہے سردار تیمور مہربان ہو کر تمہیں کابل کی حکومت واپس دلا دے۔ میں تمہاری توہین نہیں کر رہا ہوں۔ جس امیر کی تم حمایت کر رہے ہو یہ بہت بڑا احسان فراموش اور بدطینت ہے۔ اس نے طغر کا علاقہ ضبط کر لیا۔ اس کی پاک طینت بیوی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہا۔ یہ طغر کا مجرم ہے۔ موسیٰ صرف طغر کا ہی مجرم نہیں۔ یہ تمہارا بھی مجرم ہے۔ اس نے مکہ کابل کے ساتھ بھی انتہائی تحقیر آمیز رویہ اختیار کیا تھا۔"

امیر حسین تو موسیٰ کا حامی تھا۔ وہ بھلا اس کی برائی کیسے برداشت کرتا۔ بولا:

"تم جھوٹے ہو شیر بہرام۔ اگر مکہ کابل کو موسیٰ سے کوئی شکایت ہوتی تو وہ مجھ سے ضرور کہتی۔ تم اپنے الفاظ واپس لو ....."

شیر بہرام اگرچہ پیدل تھا لیکن اس نے فوراً تلوار کھینچ لی۔ بولا:

"امیر حسین۔ میرے الفاظ نیام سے نکلی ہوئی تلوار ہے، جو بغیر فیصلہ کیے نیام میں واپس نہیں ہوتی۔"

موسیٰ کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ شیر بہرام، تیمور کا گہرا دوست ہے۔ اگر وہ مارا گیا تو تیمور آسانی سے کر دے گا۔ اس وقت پورا لشکر تیمور کے ساتھ ہے۔ امیر حسین اور اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس نے فوراً بیچ میں دخل دیا:

"امیر۔ آپ اس بدزبان کے منہ نہ لگیں۔ میں اس سے خود نپٹ لوں گا۔"

امیر حسین بھی تلوار نکال چکا تھا۔ بولا:

"میں اس کی زبان کاٹ دیتا ہوں۔"

موسیٰ نے خود ہی جھگڑا شروع کیا تھا اور خود ہی تیمور کے خوف کے پیش نظر اسے ختم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے امیر حسین کو ٹھنڈا کیا اور اسے ساتھ لے کر آگے بڑھ گیا۔ امیر حسین پھر بھی چلتے چلتے کہہ ہی گیا:

"شیر بہرام۔ میں تجھے اس گستاخی کی سزا ضرور دوں گا۔"

"میری تلوار بھی تمہارا انتظار کرے گی امیر حسین ....."

شیر بہرام بھی جواب دینے سے باز نہ رہا۔

امیر حسین وہاں سے جھلّا یا ہوا تیمور کے پاس پہنچا تو جاتے ہی اس سے الجھ پڑا۔ تیمور مغلوں کو پسپا کرنے کے بعد ان کے تعاقب میں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کا گھوڑا قریب ہی کھڑا تھا۔ اس نے راسیں پکڑ کے رکاب میں پیر رکھا ہی تھا کہ امیر حسین، امیر موسیٰ کو لیے ہوئے اس کے پاس پہنچ گیا۔

"کہاں جا رہے ہو سردار تیمور!" امیر حسین نے بڑے اکھڑپن سے پوچھا۔

تیمور نے جواب دینے کے بجائے اپنا منہ اس طرف کر دیا جدھر مغل بھاگ رہے تھے۔ تیمور اس سے الجھ کر فتح کی مسرت کو کم نہ کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے جواب دینے کے بجائے صرف اشارے سے کام لیا تھا۔

امیر حسین تو خواہ مخواہ مشورے دینے پر مصر تھا۔ بولا:

"تیمور۔ شکست خوردہ فوج کا تعاقب کرنا بڑی غلطی ہے۔"

تیمور رگڑ گیا۔ تیزی سے بولا:

"امیر حسین۔ اگر میں تمہارے مشوروں پر عمل کرتا تو آج میری بھی وہی حالت ہوتی جو تمہاری ہے۔ تم صرف اپنی بہادری کا دعویٰ کر سکتے ہو ورنہ جنگ کے معاملے میں تم بالکل کورے اور مبتدی ہو۔ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ مغل شکست کھا گئے ہیں۔ جب تک ان کا ایک سوار بھی ہماری سرزمین پر ہے وہ جنگ کرتے رہیں گے۔"

تیمور کا یہ خیال بھی درست نکلا۔ مغلوں کے تمام بڑے بڑے سردار یا تو قتل ہو گئے تھے یا تیمور نے انہیں گرفتار کر لیا تھا۔ اس کے باوجود تعاقب کے دوران وہ پلٹ پلٹ کر جوابی حملے کرتے رہے۔ تیمور نے ان کا تعاقب برابر جاری رکھا۔ وہ تاتاری جو مغلوں کے خوف سے جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپ گئے تھے، تیمور کو بھاری دینے آئے اور اس کے لشکر میں شامل ہوتے رہے۔ تیمور اپنے بچھڑے دوستوں اور بدترین دشمنوں کو بھی گلے لگاتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور ان سے نہایت خندہ پیشانی سے ملتا رہا۔

مغل بادشاہ الیاس خواجہ کو ایک جنگ کی شکست کی اور گرفتاری کی اطلاع ملی تو اس کے بھی ہوش اڑ گئے۔ بڑے بڑے مغلوں کو دھکیلتا ہوا تاتاری سرحد کے پار تک پہنچ گیا۔ الیاس خواجہ بھی خیمے اکھاڑ کر شمالی میدانوں میں پہنچ گیا۔ تیمور نے مغلوں کو سرزمین تاتار سے نکال کر ہی دم لیا۔ شمالی میدانوں میں آگے بڑھنے کی اس نے اپنے طور پر کوشش ہی نہ کی۔

اب وہ ماوراالنہر کی سب سے اہم شخصیت تھا۔

اس نے اپنے ملک کو مغلوں کے پنجے سے چھڑایا تھا۔ صرف شہر سبز، اس کا اپنا شہر ابھی تک مغلوں کے قبضے میں تھا۔

شہر سبز کے مغلوں کا رابطہ الیاس خواجہ سے کٹ گیا تھا اور انہیں باہر والوں کی کوئی خبر نہ تھی۔ بیگ تھوڑا لشکر وہاں چھوڑ گیا تھا۔ وہی لشکر اس وقت شہر سبز میں مورچہ بند تھا۔

تیمور اپنے شہر کے حسن کو اجاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ خوبصورت شہر اسے بغیر خونریزی اور تباہی کے حاصل ہو جائے۔ چنانچہ اس نے اس کی فتح الترا میں ڈال کر جشن منانے کا حکم دیا۔ وہ سرحد سے ہٹ کر اپنے علاقے میں واپس آ گیا تھا۔ اس نے ایلچی خانقان اور نئے جہانگیر کو بھی لانے کے لیے ایک دستہ گرمیز بھیج دیا تھا۔

تیمور کو ایک طویل عرصے کے بعد سکون حاصل ہوا تھا۔ اس لیے اس نے بڑے پیمانے پر ضیافت کا اہتمام کیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس کے تمام پرانے سردار اور اعیان اس کے گرد جمع ہو گئے۔ بے شمار حلیف بھی اسے مل گئے تھے۔ وہ تاکون نے سردار مقرر کرتا رہا۔ جنگ میں مارے جانے والوں کے ورثا کو نقد رقوم اور زمین عطا کی۔ امیروں کے آپس کے اختلافات دور کیے اور انہیں گلے لگا دیا۔

اسے امیروں کے جھگڑے نمٹانے سے اتنی فرصت بھی نہ ملی کہ ٹھیک سے کھانا کھاتا۔ اسی طرح دوپہر سے شام ہو گئی۔ رات کا کھانا بھی وہ مشکل ہی سے کھا سکا۔

جب نئے مہمان رخصت ہو گئے اور اس کے پرانے احباب ہی رہ گئے تو اسے ایک دم شیر بہرام کا خیال آیا۔ وہ اسے جشن سے نظر نہ آیا تھا۔ اور اب بھی موجود نہ تھا۔ شیر بہرام ہر کام میں آگے آگے رہتا تھا مگر اس وقت وہ دعوت اور دربار سے بھی غائب تھا۔

تیمور نے جکو برلاس سے شیر بہرام کے بارے میں پوچھا۔ اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ایلچی بہادر بھی کچھ نہ بتا سکا۔ تیمور کی پریشانی بڑھ گئی۔ اس محفل میں امیر حسین، امیر موسیٰ بھی موجود تھے لیکن کسی کو علم نہ تھا کہ شیر بہرام کہاں ہے؟

"ترک جوان کو حاضر کیا جائے۔" تیمور نے بڑے غصے سے حکم دیا۔

لوگ طغر کو ڈھونڈنے دوڑ پڑے۔ طغر کے نام پر امیر حسین اور امیر موسیٰ کے کان کھڑے ہوئے۔

تھوڑی دیر بعد طغر حاضر ہوا۔

"شیر بہرام کہاں ہے طغر.....؟" تیمور نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا۔

"سردار..... وہ..... واپس چلے گئے ہیں۔" طغر نے اٹک اٹک کر کہا۔

"کہاں چلے گئے۔ کب چلے گئے؟" تیمور چیخ پڑا۔ اسے شیر بہرام سے بڑا پیار تھا۔

"آج ہی صبح گئے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ میرا کام ختم ہو گیا۔ میں اپنے قبیلے میں واپس جا رہا ہوں۔" طغر نے مرجھائے ہوئے جواب دیا۔

"ہم سے مل کر کیوں نہیں گئے؟" تیمور کا غصہ اب کچھ کم نہ ہوا تھا۔

طغر کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ خاموش رہا۔

تیمور کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر نرم پڑتے ہوئے بولا:

"دیکھو طغر۔ تم سے وہ بہت پیار کرتا تھا۔ اس نے اپنے جانے کی وجہ ضرور بتائی ہو گی اور یہ بھی کہا ہو گا کہ اس کی اطلاع مجھے نہ دی جائے مگر وہ مجھے بہت عزیز تھا۔ اس جیسے مخلص دوست کو میں ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ اس کی بے لوثی اور بے باکی مجھے پسند ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حرف اس قدر خاموشی سے کیوں گیا۔ وہ بڑا حساس اور نازک مزاج تھا۔ یقیناً اسے کوئی بات ناگوار گزری ہو گی۔ ممکن ہے اسے مجھ سے کوئی شکایت ہو یا پھر کسی اور سے اختلاف پیدا ہوا ہو۔ مجھے اس کے جانے کی وجہ معلوم ہونی چاہیے۔"

شیر بہرام کا جس وقت امیر حسین اور موسیٰ سے جھگڑا ہوا تھا اسی وقت سے وہ دل برداشتہ ہو گیا تھا اور واپسی کا ارادہ کر چکا تھا۔ جاتے وقت اس نے طغر کو تاکید کی تھی کہ جہاں تک ہو سکے وہ اس کی روانگی کو تیمور سے پوشیدہ رکھے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی وجہ سے تیمور اور اس کے سالے امیر حسین میں کوئی اختلاف پیدا ہو۔

طغر کے لیے اب خاموش رہنا ممکن نہ رہا۔ اگر وہ انکار کرتا تو تیمور کے غصے کا بھی شکار ہو جاتا۔ اس نے سر اٹھایا اور بولا:

"سردار..... شیر بہرام اور....." اور طغر نے اپنی نظریں گاڑ کر امیر حسین پر جما دیں۔

"امیر حسین سے جھگڑا ہوا تھا....." تیمور نے طغر کی نظریں پڑھ لیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"جی سردار۔۔۔۔" طغرل نے نظریں پھر نیچی کر لیں۔

تیمور نے تیز نظروں سے امیر حسین کو دیکھا۔ امیر حسین بھلا یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ بگڑ کے بولا:

"اس نے مجھ سے سخت گستاخی کی تھی۔ میں اس کا سر قلم کر دیتا مگر میں نے اسے معاف کر دیا۔"

تیمور نے امیر حسین کو کوئی جواب نہ دیا مگر اس کے چہرے کے آثار چڑھاؤ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے امیر حسین پر سخت غصہ آیا۔ وہ کچھ ایسا پژمردہ ہوا کہ دربار برخاست کر کے اسی وقت خیمے میں چلا گیا۔

تیمور، امیر حسین کی احمقانہ حرکتوں سے پہلے ہی نالاں تھا۔ شیر بہرام کے چلے جانے کا اسے بڑا صدمہ ہوا۔ وہ ہر موقع پر اپنی بیوی الجائی خاتون کی وجہ سے امیر حسین کو معاف کر دیا کرتا تھا لیکن اب اس نے امیر حسین سے چھٹکارا حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

○

تیمور ابھی وہیں خیمے میں پڑا تھا کہ الجائی خاتون، جہانگیر کو لے کر آ گئی۔ طغرل کی بیوی غلغورا اس کے ساتھ تھی۔

غلغورا پانچ محافظوں کے ساتھ گرم سیر پہنچ گئی تھی مگر اس وقت تیمور وہاں سے روانہ ہو چکا تھا۔ غلغورا نے اپنی داستانِ الم الجائی خاتون سے بیان کر دی۔ الجائی نے اس کی بہت دلداری کی اور وعدہ کیا تھا کہ تیمور سے ملاقات ہونے پر وہ نہ صرف اس کا علاقہ واپس کرا دے گی بلکہ موسیٰ کو بھی قرار واقعی سزا بھی دلا دے گی۔ اب اس کا وقت آ گیا تھا۔

غلغورا، الجائی کے ساتھ تیمور کے لشکر میں آ گئی تھی۔ اسے آتے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ یہاں دلشاد آغا بھی ہیں۔ اور امیر موسیٰ بھی۔۔۔۔

الجائی خاتون کا استقبال کرنے والوں میں دلشاد آغا بھی تھی۔ امیر حسین اس قدر خود سر اور مغرور تھا کہ وہ بہن کے استقبال کے لیے بھی نہ آیا۔ وہ تو تیمور سے ملنے بھی نہ آتا تھا۔ تیمور اپنی بیوی کے لحاظ کی وجہ سے خود اس کے خیمے پر چلا جاتا تھا۔

اس وقت اس کے نہ آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شیر بہرام کے معاملے نے ان کے اختلاف کو ہوا دی تھی اور اس نے تیمور کے خیمے پر آنا جانا بالکل ہی چھوڑ دیا تھا۔ کوئی ضروری بات کرنا ہوتی تو وہ قاصد کے ذریعے پیغام بھیجتا تھا۔

الجائی خاتون اور غلغورا گاڑی میں آئی تھیں۔ تین گاڑیوں پر ان کا سامان لدا ہوا تھا۔ الجائی کی گاڑی سب سے

آگے تھی۔

گاڑی رکتے ہی دلشاد اور تیمور بڑھے۔ تیمور لنگڑا کر چل رہا تھا۔ جہانگیر گاڑی سے جھانک رہا تھا۔ اس نے وہیں سے صدا لگائی:

"بابا لنگڑے۔۔۔۔۔ بابا لنگڑے۔۔۔۔"

تیمور گاڑی کے پاس پہنچا۔ اس نے ایک نظر الجائی پر ڈالی پھر جہانگیر کو گود میں اٹھا لیا اور اسے پیار کرتا ہوا گاڑی سے کچھ دور چلا گیا۔

دلشاد نے سہارا دے کر الجائی خاتون کو اتارا۔ غلغورا نے دلشاد کو دیکھا مگر منہ گھما کر ایک طرف کو دیکھنے لگی۔

دلشاد، الجائی کو اتار رہی تھی، اس کی توجہ غلغورا کی طرف نہیں گئی۔

الجائی نے اترتے ہی دلشاد کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچتی ہوئی ایک طرف لے گئی۔

"ایک بات بتاؤ دلشاد۔" الجائی نے رازداری سے کہا۔

"کیسی بات باجی۔۔۔۔۔؟" دلشاد مسکرائی۔

"سو باتیں پوچھو مگر مجھے یہاں کیوں کھینچ لائی ہو؟"

"امیر موسیٰ نے تجھے کبھی قید کیا تھا؟" الجائی نے آہستہ سے پوچھا۔

دلشاد سنجیدہ ہو گئی۔ پچھلے تمام واقعات ایک لمحے میں اس کی نظروں میں گھوم گئے۔

"ہاں باجی۔" دلشاد گھٹی گھٹی آواز میں بولی:

"مگر تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ کیا غلغورا تمہارے پاس پہنچ گئی؟"

"پہلے یہ بتا کیا امیر موسیٰ نے غلغورا پر بری نظر ڈالی تھی؟"

الجائی نے پہلے اپنا اطمینان کرنا چاہا۔ غلغورا نے اس سے جو کچھ بیان کیا تھا الجائی نے اس پر اعتبار تو کر لیا تھا لیکن اب وہ دلشاد سے اس کی تصدیق بھی چاہتی تھی۔

"ہاں باجی۔ یہ سب سچ ہے۔" دلشاد ہچکچاتے ہوئے بولی:

"غلغورا نے تمہیں جو بھی بتایا ہوگا وہ ٹھیک ہے۔ وہ کہاں ہے۔ تم اسے ساتھ کیوں نہیں لائیں۔"

"وہ مظلوم میرے ساتھ ہی آئی ہے۔" الجائی خاتون نے دردمند دل پایا تھا۔ دوسروں کے مسائل پر اس کا دل رو پڑتا تھا۔

"کہاں ہے۔ کدھر ہے باجی وہ؟" دلشاد نے گاڑیوں کی طرف دیکھا۔

"میری گاڑی میں ہے۔ بہت مظلوم ہے دلشاد وہ۔۔۔۔۔ اس کا علاقہ چھن گیا۔۔۔۔ اس کا شوہر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس سے۔۔۔۔"

الجائی اور نہ جانے کیا کیا کہتی رہی لیکن دلشاد نے اس کی کوئی بات نہ سنی اور "غفورا۔۔۔۔ غفورا۔۔۔۔" پکارتی ہوئی بھاگ کر گاڑی کے پاس پہنچ گئی۔

غفورا گاڑی سے اتری اور دوڑ کر دلشاد سے چمٹ گئی۔ غفورا سسکیاں بھرنے لگی۔ دلشاد کے بھی آنسو نکل آئے۔ الجائی آہستہ آہستہ ان کے پاس آ گئی۔

"غفورا، خدا کا شکر ہے کہ تو خیریت سے باجی کے پاس پہنچ گئی۔" دلشاد نے اسے تسلی دیتے ہوئے اپنے سے الگ کیا:

"ہم تو تمہارے لیے سخت پریشان تھے۔"

"خاتون آغا نے جس محبت کا سلوک میرے ساتھ کیا ہے اسے میں زندگی بھر نہ بھلا سکوں گی۔" غفورا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"میں الجائی باجی کی طبیعت سے واقف تھی اسی لیے میں نے تمہیں رقم میسر بھیجا تھا۔" دلشاد نے احسان مند نظروں سے الجائی کو دیکھا۔

"اگر تم اور طغرا اس زمانے میں ہماری مدد نہ کرتے تو ہم جنگلوں اور پہاڑوں میں بھٹکتے رہتے اور پھر ایک ایک کر کے منگولوں کی تلواروں کا لقمہ بن جاتے مگر۔۔۔۔ مگر امیر موسیٰ نے جس احسان فراموشی کا ثبوت دیا تھا اس کبھی بھلائی نہیں جا سکتی۔ اس کے ساتھ ہی میں تمہارا احسان بھی کبھی نہیں بھول سکتی۔۔۔۔"

"اب ان باتوں اور ان دنوں کا ذکر نہ کیجیے بلکہ کامل۔" غفورا دلگیر لہجے میں بولی:

"مجھے خاتون آغا جیسی مشفق خاتون اور آپ جیسی قدر داں مل گئی۔ مجھے اور کیا چاہیے۔ بس کسی کسی وقت طغرل کا خیال آتا ہے تو۔۔۔۔"

"طغرل زندہ ہے غفورا۔۔۔۔" دلشاد کو جیسے یاد آ گیا۔

"طغرل زندہ ہے۔" غفورا اور الجائی کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"ہاں زندہ ہے الجائی باجی۔۔۔۔" دلشاد نے زور دے کر کہا۔

"طغرل نے اپنی بہادری سے سردار تیمور کے دل میں جگہ پیدا کر لی ہے۔ اس ترک جوان نے منگولوں کے سپہ سالار کے بیٹے کو میدانِ جنگ میں زیر کر کے گرفتار کیا تھا۔ سردار تیمور اس پر بہت مہربان ہیں۔ میں ابھی اسے بلواتی ہوں۔"

غفورا کے باغ جوانی پر جیسے دوبارہ بہار آ گئی۔ طغرل کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکی تھی۔ طغرل کی

سلامتی کی خبر سن کر اس کا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔

تیمور اپنے خیمے میں پہنچ چکا تھا۔ یہ تینوں پہنچیں تو پوچھا:

"باہر کیا کر رہی تھیں تم لوگ؟"

"سردار تیمور۔ اطمینان رکھیں، ہم آپ کی بیوی کو کہیں بھگا نہیں لے جائیں گے۔" دلشاد نے برجستہ کہا۔

تیمور جھینپ سا گیا۔

الجائی بولی:

"تو خود ہی میرے بھائی کے لیے بھاگی پھرتی ہے کسی اور کو کیا بھگائے گی۔" الجائی خاتون نے اپنے طور پر دلشاد کو منہ توڑ جواب دیا۔

دلشاد تو شوخی اور چنچل پن میں مشہور تھی۔ فوراً بولی:

"تو کیا میں آپ کے پاس آ جاؤں یا اسی خیمے میں رہا کروں؟"

الجائی اس شوخ جملے سے گھبرا گئی۔ بولی:

"میں۔۔۔۔ میں کب منع کرتی ہوں مگر میرے ایمان ڈگمگا جائے گا۔"

"یہ لڑکی کون ہے الجائی؟" تیمور نے دخل دیا۔

اس کی نظر غفورا پر پڑ گئی تھی جو دلشاد کے پیچھے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ ممکن ہے تیمور نے بات کا رخ بدلنے کے لیے یہ سوال کیا ہو۔

دلشاد نے ملجمہ سا لیتے ہوئے کہا:

"یہ معصوم اور مظلوم غفورا ہے۔ امیر موسیٰ کا زخم خوردہ شکار۔۔۔۔"

الجائی خاتون نے دیکھا کہ دلشاد جذباتی ہو گئی ہے اور اگر اس نے اس المناک واقعہ کی تفصیل بتائی تو شاید تیمور بھڑک اٹھے اور ممکن ہے کہ خانہ جنگی شروع ہو جائے۔ اسی لیے اس نے خود غفورا اور طغرل کی ہر دلناک داستان مختصراً اس تیمور کے گوش گزار کی۔

تیمور بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گئے۔ الجائی خاموش ہوئی تو تیمور نے دلشاد کو گھورتے ہوئے کہا:

"دلشاد۔ تعجب ہے کہ تم نے اتنے اہم واقعے کا مجھ سے ذکر تک نہیں کیا اور طغرل کتنا بہادر جوان ہے کہ زخم کا اتنا بڑا داغ سینے میں چھپائے میدانِ جنگ میں شجاعت دیتا رہا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"طغرکو میں نے روک دیا تھا۔" دلشاد نے بتایا:

"جس وقت امیر حسین ہمارے پاس آئے تو ان کے جسم پر چیتھڑے لگے تھے لیکن امیر موسیٰ نے اس وقت امیر حسین کا شاہانہ استقبال کیا۔ اس سے میں اپنا غم بھول گئی۔ میں نے امیر حسین کو بھی اب تک اس کی خبر نہیں ہونے دی۔ پھر اس وقت مغلوں کا خطرہ بھی ہمارے سر پر تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ آپ اور امیر حسین میں کوئی اختلاف پیدا ہو۔ امیر حسین امیر موسیٰ پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔ وہ امیر موسیٰ کی حمایت کرتے اور بات بگڑ جاتی۔ اب آپ فاتح ہیں۔ آپ کے پاس بے پناہ طاقت ہے جیسا چاہے کر سکتے ہیں۔"

"ہم تمہارے ساتھ پورا انصاف کریں گے خاتون۔" تیمور گمبھیر آواز میں بولا:

"ہم طغر کی شجاعت کی بھی قدر کرتے ہیں۔ تمہیں نہ صرف تمہاری عملداری واپس ملے گی بلکہ اس کے ساتھ ایک بڑی جاگیر بھی دی جائے گی۔ جہاں تک موسیٰ کا تعلق ہے وہ تمہارا مجرم ہے۔ ہم موسیٰ اور طغر کو تمہارے حوالے کر دیں گے۔ تم دونوں اسے خود سزا دینا۔۔۔۔"

"سردار محترم۔" غلفورا متانت سے بولی:

"خاتون آغا جیسی مہربان ہستی کے مل جانے کے بعد مجھے کسی عملداری اور جاگیر کی ضرورت نہیں۔ میں موسیٰ کو معاف کرتی ہوں۔ جس مصلحت کی بنا پر بلکہ کابل اور طغر نے اپنی زبان بند رکھی وہی مصلحت اب بھی درپیش ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ کا میری محسنہ کے بھائی سے کوئی اختلاف ہو۔ میری کائنات تو میرا شوہر طغر ہے اور آپ لوگوں کا سایہ۔ میں اس چھاؤں کو چھوڑ کر اب کسی اور جگہ نہیں جانا چاہتی۔"

"غلفورا۔"

الجائی خاتون نے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا:

"تم میری بہن ہو۔ میں بھی تمہیں اپنے سے جدا نہیں کرنا چاہتی۔"

غلفورا کو ایک خالی کمرے میں پہنچا کر طغر کو بلایا گیا۔

"اس سامنے کے خیمے میں چلے جاؤ۔" دلشاد نے اپنی دلی مسرت کو چھپاتے ہوئے کہا۔

طغر نے حیران نظروں سے دلشاد کو دیکھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔

"یہ ہمارا حکم ہے طغر۔۔۔۔"

طغر تیز قدم اٹھاتا ہوا خیمے کے پاس پہنچا۔ وہ رکا۔ پلٹ کر دلشاد اور تیمور کو دیکھا۔ پھر پردہ اٹھا کر خیمے میں داخل ہو گیا۔

اس کے بعد دوسرا حصہ پڑھیں